امام اعظم
اور
علم الحدیث
الناشر
حق
پاسبان
{ Telegram } >>> https://t.me/pasbanehaq1

امام اعظمؒ
اور
علم الحدیث
حضرت مولانا محمد علی صدیقی کاندھلویؒ
مکتبۃ الحسن
33-حق سٹریٹ
اردو بازار لاہور

◉ نام کتاب: امام اعظمؒ اور علم الحدیث

◉ نام مصنف: حضرت مولانا محمد علی صدیقی کاندھلویؒ

◉ باہتمام: حافظ زاہد علی

◉ صفحات: 796

◉ تاریخ اشاعت: رجب المرجب ۱۴۲۶ھ/ اگست ۲۰۰۵

◉ کمپوزرز: مسعود فرید، محمود فرید 0333-4331105

◉ تعداد: 1100

◉ ناشر: مکتبہ الحسن 33- حق سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

فون: 042-7241355

◉ قیمت: 450=/

انتساب

عالی جناب عباس حسین ملک رئیس اعظم شہر سیالکوٹ

کے نام

جن کی دینی حمیت اور محبت اسلام میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریادلی اور ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ رہین منت ہے اور جو اپنے دل میں آئندہ بھی انجمن کے فلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو پروان چڑھانے کا خاص جذبہ رکھتے ہیں۔

انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
بسم اللہ الرحمن الرحیم
IN THE NAME OF ALLAH, THE BENEFICIENT THE MERCIFUL

علمی طلب

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحبؒ کے رفیق ہیں نقل کرتے ہیں:

”میں امام اعظمؒ کا رفیق مدرسہ تھا وہ علم حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے۔ یہی حال زہد و تقویٰ میں ہوا۔ اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے۔“

(مناقب ذہبی : ص ۲۷)

علمی نسب نامہ

امام اعظمؒ نے سربراہ حکومت عباسیہ ابوجعفر منصور دوانیقی کے سامنے برسر دربار بتایا ہے۔

"ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیرالمؤمنین ابوجعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے۔ عیسیٰ نے امیرالمؤمنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیرالمؤمنین! ھذا عالم الدنیا الیوم ۔ یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں۔ ابوجعفر منصور نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ امیرالمؤمنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابوجعفر نے کہا کہ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔"

(تاریخ بغداد، جامع المسانید)

علمی شہرت

''امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظمؒ
کی شہرت سنتا تھا۔ ملنے کا بیحد مشتاق
تھا۔حسن اتفاق سے مکہ میں اس
طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا
کہ لوگ ایک شخص پر ٹوٹے پڑے جا
رہے ہیں۔ مجمع میں میں نے ایک
شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو
حنیفہ! میں نے جی میں کہا کہ تو تمنا بر
آئی۔ یہی امام ابو حنیفہ ہیں۔''

(مناقب ابی حنیفہ للذہبی: ص ۲۲)

علمی جامعیت

امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

''ہم مکہ میں امام اعظمؒ کے پاس رہتے تھے آپ کے پاس ارباب فقہ اور اصحاب حدیث کا ہجوم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ جو صاحب خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹوائے۔''

(مقدمہ اعلاء السنن: ص ۷۲)

علمی کمال

حافظ ابن عبدالبر نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظمؒ کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے:

”میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں۔ ان میں اولین مقام ابوحنیفہ کا ہے۔“

(جامع بیان العلم و فضلہ۔ الانتقاء: ص ١٦٢)

فہرست

امامِ اعظمؒ اور علمُ الحدیث

ے بہت سے ضمنی مضامین کو فہرست میں باقاعدہ عنوان دیا گیا ہے، جبکہ متن میں
ں ہے، ایک عام قاری اس سے الجھن محسوس کرتا ہے، فہرست چونکہ مصنف کی
ہے، اس لیے ہم نے فہرست میں کسی قسم رد و بدل کیے بغیر اس الجھن کو یوں دور
انات کو بڑے فونٹ میں اور ضمنی مضامین کے عنوانات کو چھوٹے فونٹ میں لکھا گیا
کے نمبر اور مضامین کا نمبر شمار مستقل عنوانات کے اعتبار سے دیا گیا ہے۔ زاہد علی

کلمات تشکر

اللہ جل شانہ نے انسانوں کی بلندی اور برتری کے لئے اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ پیدا فرمائے، انہی اخلاق حسنہ اور صفات عالیہ کی وجہ سے انسانیت اُجاگر ہوتی ہے اور جو مؤمن بندے ان سے متصف ہوتے ہیں ایسے افراد اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مقبول ہوتے ہیں اور اس کے بندوں کے یہاں بھی انہیں مقبولیت عامہ نصیب ہوتی ہے، ان صفات عالیہ میں صفت تواضع اور انکساری بڑی اہمیت رکھتی ہے، اکابر دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے علوم وافرہ کثیرہ سے بھی نوازا اور اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ سے بھی متصف فرمایا، ان حضرات نے تواضع اور انکساری کو ایسا اپنایا اور حرز جاں بنایا کہ قرن ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی، نیز ان حضرات میں زہد و استغناء بھی بڑے درجے کا تھا، تحریر و تقریر، شریعت وطریقت کی خدمات سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے تھیں، مخلوق سے کسی چیز کے طالب نہ تھے، کسی شخص نے خواہ کتنا ہی بڑا ہو، مال دار، صاحب اقتدار ہو، ذرا سا بھی لالچ نہیں رکھتے تھے، اہل مال جو اُن حضرات کے معتقد تھے وہ چاہتے تھے کہ کچھ پیش کریں، لیکن ان حضرات کا مزاج یہ تھا کہ قول وعمل سے یہ ظاہر فرما دیتے تھے کہ ہماری خوشی اس میں ہے کہ جس وجہ سے ہم سے تعلق ہے یعنی علم سیکھنا اور عملی زندگی کو اپنانا، ہم اس سے خوش ہوتے ہیں۔

اس کی ایک نظیر ضلع سیالکوٹ میں حضرت مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی کی ذات اقدس تھی کاندھلہ میں پیدا ہونے والا بچہ اور تعلیم و تربیت کا سفر مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم

دیوبند سے طے کرتا ہوا صرف اشاعت دین اور توحید و سنت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرتا ہوا سیالکوٹ میں آ بسا اور اپنی زندگی کے ستاون سال گزار کر سرخرو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

مولانا کے علمی تعمق اور وسعت علمی، اخلاص وللہیت کا اندازہ ان کے اساتذہ کرام اور تحریرات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور کسی اہل علم و دانش پر یہ پوشیدہ نہیں۔

میرے لیے یہ امر انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آج سے تقریباً دو سال قبل میرے محبی و محترمی جناب حکیم محمود احمد ظفر صاحب مدظلہ نے حضرت مولانا کی ایک انتہائی علمی کاوش ''امام اعظم اور علم الحدیث'' کی از سر نو کمپوزنگ اور ترتیب جدید کے ساتھ طباعت کا ذمہ مجھے سونپا جو اشغال کثیرہ کی وجہ سے بظاہر میرے لیے ممکن نہ تھا۔ مگر کتاب کی افادیت محوظ خاطر رکھتے ہوئے کام شروع کر دیا۔ جو الحمدللہ مختلف منازل طے کرتا ہوا پایۂ تکمیل کو پہنچا جو میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً مولاناؒ کی توجہ و فیض جاری ہی کا حصہ ہے۔

یہ کتاب کس درجے کی ہے اس کا اندازہ و مشاہیر عالم اور نابغۂ روزگار شخصیات کے ان تاثرات سے لگایا جا سکا ہے جو کتاب کے شروع میں منسلک ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس کتاب کی ستر و دن میں تالیف کو ایک کرامت فرمایا اور میرے ناقص علم کے مطابق اس قدر علمی اور ضخیم کتاب جس کے تمام مصادر و مراجع امہات الکتب ہیں اتنی قلیل مدت میں تالیف کی گئی ہے جس کی مثال شاید اس سے پہلے نہیں نہیں ملتی۔

اس کتاب کی ایک خاصیت جس کو میں نے نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ کمپوز کروایا اس کے شروع میں جناب حکیم محمود احمد ظفر صاحب مدظلہ کا انتہائی علمی اور شرح و بسط کے ساتھ مقدمہ ہے جو اس قدر تحقیق اور جانفشانی سے لکھا گیا ہے کہ وہ کتاب کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ اس کتاب ہی کا ایک حصہ تھا جو رہ گیا اور حکیم صاحب نے اسے مکمل فرما دیا جس نے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

چونکہ حضرت مولانا محمد علی صدیقی ہمارے درمیان نہیں ہیں اس لیے میری خواہش تھی کہ مولانا کی مختصر سوانح حیات بھی لکھ دی جائے تاکہ قاری صاحب کتاب سے متعارف ہو جائے۔ تو میں شکر گزار ہوں جناب انعام الحق غازی صاحب کا کہ انہوں نے یہ کام سرانجام دیا ہے اور تقریباً مولانا مرحوم کے متعلق تمام ضروری معلومات احاطہ قلم کر دی ہیں۔

اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ ہم نے اس کتاب کی صحت و درستگی کا انتہائی اہتمام کیا ہے پھر بھی انسان کمزور ہے کہیں غلطی رہ سکتی ہے آپ کا غلطی کا نشاندہی کرنا علم دوستی کا ثبوت ہوگا۔ اور جس کی آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔

میری دعا ہے کہ اللہ جل شانہ ہماری اس کاوش کو اپنی بارگاہ اقدس میں قبول فرمائے اور اس کتاب کو عوام خواص کے لیے نفع بخش بنائے آمین۔ اور مولانا مرحوم کے لیے باقیات الصالحات بنائے۔ آمین

آخر میں میری مولانا مرحوم کے سینکڑوں تلامذہ اور متبعین سے التماس ہے کہ مولانا مرحوم کے علمی ذخیرہ کو جمع کیا جائے اور زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے۔ تاکہ عوام و خواص مولانا کے علوم اور فیوض و برکات سے مستفید ہو سکیں یہ ان کی ذمہ داری بھی ہے اور مولانا مرحوم کا حق بھی ہے، اللہ جل شانہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کے لیے ہر قسم کے اسباب اور وسائل مہیا فرمائیں۔ آمین

طالب دعا

حافظ زاہد علی

استاذ الفنون جامعہ اشرفیہ، لاہور

لیکچرار شعبہ عربی گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

امام اعظمؒ اور علم الحدیث

کے متعلق

گرامی قدر آراء

حضرت مولانا علامہ
ابوالوفاء افغانی رحمہ اللہ
صدر مجلس
احیاء المعارف النعمانیہ
حیدرآباد (دکن بھارت)

ماشاء اللہ تعالیٰ آپ نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا کہ قوم کو مستغنی کر دیا۔ کتاب کی تحقیقات اور اس کی خوبیاں تو فوراً اس پر بھی واضح ہو جائیں گی جس نے اس کا سرسری مطالعہ بھی کیا چہ جائیکہ امعان وتعمق سے دیکھا ہو، جزاک اللہ تعالیٰ خیراً بڑی تحقیق کی اور تفصیل سے بیان کیا۔ کاش یہ کتاب عربی میں ہوتی تو اس کی منفعت عام ہوتی۔ اب اس کا فائدہ صرف ان کے لیے ہے جو اُردو سے واقف ہیں۔ میں کتاب پر تفصیلاً تو اس وقت کچھ لکھ سکوں گا کہ اس کا پورا مطالعہ کر سکوں۔ اشغال وامراض غور سے پوری کتاب کے مطالعہ کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ تاہم میں ضرور اس کے مطالعہ سے فارغ ہونے کی کوشش کروں گا بشرط زندگی، والموت ادنیٰ من شراک نعلہ، تبدیل آب و ہوا کیلیے افغانستان جانے کا قصد ہے دو ماہ بعد اگر میسر ہو تو شاید دیکھ سکوں۔ اب تو کتاب الحجہ جز ثانی کی طباعت میں مشغول ہوں، اکثر حصہ کی طباعت ہو چکی ہے، بحمد للہ، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اس قسم کی خدمتوں کی توفیق دے اور حیاتِ طیبہ نصیب فرمائے وفقکم اللہ لکل خیر، آپ کے تعارف کا مشتاق ہوں والسلام ودمتم بالخیر والعافیہ۔

حدیث اور امام اعظم، پونچی، ماشاء اللہ، ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

حضرت مولانا
نعمت اللہ شاہ صاحب
حیدر آباد
(دکن بھارت)

کتاب امام اعظم اور علم الحدیث، کے ابواب وفصول ایک مستقل کتاب کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر چاروں ائمہ کے فقہ کی تدوین کی جائے اور مختلف معروضات پر ضمیموں اور تذئیل اور ترتیب، تہذیب نگارش جو علم الحدیث نبوی خاطر جمع کیے گئے ہیں، کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، میں اس کتاب کو ہر مسلم یونیورسٹی اور ہر دار العلوم کے لیے لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ میں نے مواعظیت اور اپنے خطبات کے لیے اس کتاب کو نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ سینکڑوں اسماء الرجال، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کیوں نہ لکھی جائیں اس کتاب کی اہمیت پیدا نہیں کر سکتیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
صدر دار العلوم (کراچی)

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جلالت، شان اور علمی کمالات، ورع و تقویٰ، عبادت و زہادت ایسی چیز نہیں جس سے کوئی لکھا پڑھا مسلمان ناواقف ہو، اپنوں اور غیروں میں موافق اور مخالف سبھی ہیں۔ یہ چیز نا قابل اختلاف سمجھی گئی ہے لیکن ہر امام اور ہر عالم مقتدا علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو بحیثیت فن کے اپنے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر لیتا ہے یا منجانب اللہ ایسے اسباب ہو جاتے ہیں کہ یہ فن ان کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ وہ دنیا میں عام طور پر اسی فن کے ماہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب کہیں نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے علوم وفنون کا ماہر نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام علوم اسلامیہ، نقلیہ، تفسیر، حدیث وغیرہ میں بلکہ عقلیہ کلام وغیرہ میں بھی اعلیٰ کمال عطا فرمایا تھا۔ مگر ان تمام علوم وفنون میں سے جس چیز کو اپنے لیے خاص فن کی حیثیت سے انہوں نے اختیار فرمایا وہ فقہ فی الدین ہے، اس لیے دنیا میں ان کی عام شہرت تفقہ کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اہل بصیرت سے تو یہ بات مخفی نہیں کہ فقہ میں کوئی شخص مہارت و امامت کا درجہ اس وقت تک حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک قرآن و سنت میں مہارت تامہ حاصل نہ کرے۔ مگر بعض سطحی نظر والوں نے امام اعظم کی جلالت شان فی علم الحدیث پر کچھ شبہات کیے، کچھ دوسرے لوگوں نے اسے عوام میں پھیلایا اور بہت سے عوام غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر میری

دیرینہ تمنا تھی کہ حضرت امام اعظم کی مہارت علم حدیث اور ان کے اساتذہ و تلامذہ فی الحدیث پر کوئی کتاب لکھی جائے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے خود احقر نے محدثین حنفیہ کے نام سے ایک مقالہ ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیو بند میں شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

حال میں حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف جدید، امام اعظم اور علم الحدیث، نظر نواز ہوئی تو دیرینہ تمنا پوری ہونے کا وقت آ گیا۔ کتاب کو جوں جوں دیکھتا گیا مسرت بڑھتی گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ پوری شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بہترین اور مستند مواد جمع فرما دیا، اور اس کی افادیت اس سے اور بڑھ گئی کہ ہر جگہ اصل ماخذ کا حوالہ پوری وضاحت کے ساتھ دے دیا ہے۔ اور جب کتاب کے مقدمہ میں یہ پڑھا کہ اس کی تالیف کا زمانہ صرف وہ سترہ دن ہیں جن میں پاکستان ہندوستان کے حملہ پر دفاعی جہاد میں مصروف تھا اور مولانا مدظلہ کا محل قیام سیالکوٹ خصوصیت سے اس جنگ کا سخت ترین محاذ تھا انہی دنوں میں اس کتاب کی تالیف ہوئی تو معلوم ہوا کہ بلاشبہ یہ ایک کرامت ہے۔ اب کتاب چھپی ہوئی سامنے ہے سترہ دن میں کوئی متوسط آدمی اس کو اطمینان سے پڑھ کر بھی پورا نہیں کر سکتا۔ لکھنا اور وہ بھی سینکڑوں کتابوں کے حوالوں اور ان کی تشریحات کے ساتھ لکھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

بہرحال کتاب کو مختلف مقامات سے پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ الحمدللہ اس موضوع پر کافی، شافی اور بڑا قابل قدر ذخیرہ مولانا نے پیش فرما دیا ہے فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب

صدر شعبۂ تفسیر
اسلامی یونیورسٹی
بہاولپور

یہ کتاب حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی کا تصنیفی شاہکار ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع الکمالات تھی۔ آپ بیک وقت فقیہ اعظم اور مجتہد بھی تھے، عارف، زاہد، عابد اور متقی بھی تھے مفسر، متکلم اور سیاسی مبصر بھی تھے، اس کے ساتھ قضاء و افتاء کا سرچشمہ بھی تھے اور یہ کہ عظیم محدث اور ناقد حدیث بھی تھے، آخری وصف کے علاوہ باقی اوصاف امام کی تاریخی حیثیت اس قدر واضح تھی کہ ان پر کسی مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ ان میں کسی موافق مخالف کو تردد نہ تھا، البتہ آپ کا آخری کمال کہ آپ ایک عظیم محدث اور ناقد حدیث تھے۔ بعض حضرات کی نظروں سے پوشیدہ تھا اگرچہ آپ کا یہ کمال بھی واقعات اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر بالکل مسلّم تھا لیکن اس کے دلائل، کتب رجال، تاریخ و طبقات کے وسیع ذخیروں میں منتشر ہونے کی وجہ سے ناظرین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ حضرت مولانا موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ آپ نے ان ذخائر منتشرہ کو غطان بعیدہ سے فراہم کر کے نہایت عمدہ ترتیب، شگفتہ تعبیر اور موزوں اسلوب استدلال کی شکل میں پیش کیا اور ساتھ ہی جدید معیاری فہرست بھی منسلک کر دی۔ یہ کتاب صرف ایک تاریخی کتاب نہیں بلکہ دلائل حجیت حدیث مقاہت واجتہاد، شرائط وخصوصیات، کتب حدیث و احوال محدثین، علم اصول الحدیث، علم الرجال کے قیمتی مباحث کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ علماء اور مدرسین کے لیے بھی ضروری ہے اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔

حضرت مولانا **محمد سرفراز خان صاحب**
شیخ الحدیث
جامعہ نصرۃ العلوم
گوجرانوالہ

آپ کا ارسال کردہ گرامی قدر علمی تحفہ موصول ہوا، کچھ حصہ پڑھا اور سیر نہ ہوا، یہی خیال اور ارادہ تھا کہ ساری کتاب کو دفعتہً پڑھ کر اپنے تاثر کا اظہار بھی وصولی کے عریضہ میں بھیج دوں گا مگر افسوس کہ اچانک تین چار بیماریاں حملہ آور ہوئیں جن میں ایک عارضۂ قلب بھی ہے چند دن صاحب فراش رہا اور نماز کے لیے بھی گھر سے باہر نہ جا سکا، اب خدا خدا کر کے کل سے مسجد اور مدرسہ میں حاضری دیتا ہوں لیکن نظر جما کر مطالعہ مشکل ہے۔ جتنا حصہ کتاب کا پڑھا ہے بلا مبالغہ دل کی تہ سے دعائیں نکلتی رہی ہیں کہ ایسی مدلل، ٹھوس، اور لاجواب کتاب اپنے باب میں آگئی ہے جس کے بعد انشاء اللہ اس سلسلہ میں عنوان تو بدل سکتا ہے لیکن تحقیق حدِ آخر کو پہنچ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنجناب کو تمام اہل اسلام کی طرف سے عموماً اور حضرات احناف کی طرف سے خصوصاً جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

راقم کی صحت کے لیے خصوصی اوقات میں دعا فرمائیں۔

حضرت مولانا
محمد چراغ صاحب
شیخ الحدیث
مدرسہ عربیہ
گوجرانوالہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف ''امام اعظم اور علم الحدیث'' کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا، میرے خیال میں حضرت مؤلف کی یہ علمی کاوش داد تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مولانا نے یہ کتاب تصنیف کر کے ملت اسلامیہ کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔

امام اعظم کے علم حدیث سے استفادے اور تعلق کے بارے میں بعض لوگ جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اگر انہوں نے تعصب سے بالا تر ہو کر اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تو اُمید ہے کہ یہ تصنیف لطیف ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو جائے گی۔

مصنف محترم نے کتاب کے پیش لفظ میں جن تین امور کا ذکر کیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محترم کے قلم نے ان کا پورا پورا لحاظ کیا ہے اور ابتدائی دونوں امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو تمام مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور مصنف محترم کو دنیا و آخرت میں بہتر صلہ عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین۔

حضرت مولانا محمد بشیر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ صاحب

ہمارے محترم مولانا الحاج محمد علی صدیقی کاندھلوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''امام اعظم اور علم الحدیث'' کو بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے جس کا متن ۴۴۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ممدوح نے اس میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف علم فقہ میں ہی امام الائمہ نہیں بلکہ علم حدیث میں بھی ایک برترین اور قابل فخر مقام رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی کم علمی یا حاسدانہ نگاہ اسے معلوم نہ کر سکے تو ''چشمہ آفتاب راچہ گناہ۔''

موضوع کتاب کا دائرہ تحقیق اگرچہ صرف امام اعظم کی محدثانہ شان کا اظہار ہے مگر ضمناً بڑے بڑے مفید مباحث زیر قلم آ گئے ہیں، چنانچہ کہیں تو مقام حدیث کی اہمیت ہے اور کہیں قرآن وسنت کا باہمی تعلق نہایت لطیف پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ کہیں اس بات کی تشریح وتوضیح ہے کہ ابتداء میں کتابت حدیث کی ممانعت کیوں تھی پھر اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ حدیث کی تدوین وصال نبوی کے ایک سو سال بعد ہوئی اور اس کے ثبوت میں دور نبوت میں حدیث کے کتابی ذخیرے کی نشاندہی کر کے ثابت کر دکھایا ہے کہ تحریر حدیث کی ابتداء دور نبوت میں ہی شروع ہو چکی تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں اشاعت حدیث کی سب سے زیادہ کوشش فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کی۔

امام اعظم کے نام اور کنیت پر بحث کرتے ہوئے بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ آپ کے جد امجد غلام تھے۔ اور اس کی تائید میں خود امام موصوف کی تشریح پیش کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کے متعلق کہ (اگر ایمان یا علم) ثریا میں بھی ہوگا تو بھی فارس میں سے کچھ لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ سیر حاصل بحث کے بعد

ثابت کیا ہے کہ امام اعظم اس بشارت میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں بلکہ اس کا اولین مصداق آپ ہی ہیں۔

امام موصوف کی تابعیت کے ثبوت میں آپ کی روایت عن الصحابہ کو بھی بدلائل ثابت کیا ہے پھر آپ کی تعلیم و تربیت کے مبحث میں علم حدیث میں آپ کے شیوخ کی علمی عظمت و برتری ثابت کر کے کوفہ کی علمی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ان دنوں حدیث و فقہ کی تعلیم کا کس قدر چرچا تھا اور امام موصوف نے کتنے جلیل القدر شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا۔

امام اعظم کا حفاظ حدیث میں برترین مقام واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ناقدین نے راویوں کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں امام موصوف کی رائے کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔ گویا آپ علم جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے فن میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ کے تلامذۂ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کر دیا ہے کہ جلیل القدر ائمہ حدیث و فقہ کو آپ سے تلمذ کی نسبت ہے اور اصحاب صحاح ستہ بھی بالواسطہ آپ کی شاگردی کے دائرہ سے خارج نہیں۔

''حدیث میں امام اعظم کے اصول'' اور حدیث و قیاس کے باہمی تعارض کے مبحث اہل نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ الغرض زیر تبصرہ کتاب گوناگوں مبحث کو ضمن میں لیے ہوئے ہے جو صرف طلبۂ حدیث کے لیے ہی نہیں بلکہ طبقہ علماء کے لیے بھی بے حد مفید اور کارآمد ہے۔ اگر مولانا بعض علمی مباحث کو حذف کر کے صرف اس مواد کو شائع کر دیں جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ شان کے اظہار پر مشتمل ہے تو عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

مولانا کا طرز بیان شگفتہ اور دل آویز ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے ہر مکتب فکر کے علماء فضلاء کے نام بڑے ادب و احترام سے لیے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے جس سے ہمارے اکثر علماء تہی دست نظر آتے ہیں۔

دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے مواد اور عناوین کی ترتیب اور ان کے باہمی تعلق میں زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر مبحث ایک خاص دائرہ میں محدود ہو اور یہ بکھرے ہوئے درگراں مایہ ایک مسلسل مسلک مروارید نظر آئیں۔

سوانح حیات

حضرۃ مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی قدس سرہ

جناب
انعام الحق غازی
ایم فل (عربی)
اسسٹنٹ پروفیسر
بین الاقوامی یونیورسٹی
اسلام آباد

مولانا محمد علی صدیقی کی ولادت:

حضرت مولانا محمد علی کاندھلوی صدیقی قدس سرہ یکم ربیع الاول ۱۳۲۸ھ بمطابق ۱۲ مارچ ۱۹۱۰ء بروز پیر ضلع مظفر نگر کے مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے محلہ مولویان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ نے آپ کا نام احمد علی رکھا جب کہ لوگوں نے بعد میں محمد علی کہنا شروع کر دیا اور یہی نام مشہور ہو گیا۔

حضرت مولاناؒ کے والد ماجد کا نام مولانا حکیم احمد تھا۔ آپ امام ربانی حضرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ اور خلفاء میں سے تھے یعنی علم ظاہری اور علم باطنی دونوں میں حضرت گنگوہیؒ سے فیض یاب تھے۔ آپ نسبا سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے "صدیقی" کہلاتے تھے۔ زمینداری اور طبابت کے ساتھ ساتھ آپ کے والد ماجد شیخ طریقت بھی تھے اور آپ کا حلقہ ارادت کافی وسیع تھا۔ جمعہ کے روز خصوصی طور پر ارادت مندوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ حکیم صدیق احمد صاحب نے طبابت کا پیشہ اپنے شیخ طریقت حضرت گنگوہی کی ہدایت پر اختیار کیا تھا، لیکن یہ معلوم نہیں کہ علم طبابت آپ نے کس سے حاصل کیا تھا۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم رحیم اللہ ایک جید اور حاذق طبیب تھے اور دور دور

تک آپ کی شہرت تھی۔ آپ ان لوگوں میں شامل تھے جو حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے ساتھ بالاکوٹ کے جہاد میں شریک تھے۔ انہی حکیم رحیم اللہؒ کے والد حکیم عزیز اللہ اور دادا حکیم حفیظ اللہ بھی طبابت کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب کے والد مولانا صدیق احمد صاحبؒ نہ صرف طبیب حاذق تھے بلکہ آپ کو فقہ میں بھی ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے تمام ہم عصر علماء ان کی فقاہت کے قائل تھے۔ فقہ حنفی پر ان کی نظر صرف مقلدانہ نہیں تھی بلکہ محققانہ تھی۔ انہوں نے فقہ حنفیہ کا بڑا علمی اور تحقیقی مطالعہ کیا تھا اور دلائل کو عنوان بنا کر ایک مبسوط کتاب بھی لکھی تھی جو اکثر تو محفوظ نہ رہ سکی تاہم حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کی کاوش سے بچے کچھے اوراق اکٹھے کیے گئے تو پوری کتاب الطہارۃ بن گئی جو کہ دو سو (۲۰۰) صفحات پر مشتمل تھی اور اس کتاب الطہارت کی ترتیب میں انہوں نے کم و بیش ساٹھ حدیث کی کتابوں سے اور تیس فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ گویا آپ کے والد ماجد ایک جامعہ شخصیت تھے۔ وہ مفسر قرآن تھے، محدث تھے، فقیہ تھے۔ روحانی امراض کے لیے مرشد کامل اور جسمانی بیماریوں کے لیے ایک طبیب حاذق تھے۔ جب حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کی عمر گیارہ سال تھی تو آپ کے والد ۱۹۲۱ء میں اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرما گئے۔

حضرت مولاناؒ چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائیوں کے نام بالترتیب حسب ذیل ہیں:

حکیم حافظ محمد عمر، حکیم محمد عثمان، مولانا حافظ محمد علیؒ اور مولانا شبیر احمد

حضرت مولاناؒ کا خاندان ایک نہایت علمی خاندان تھا۔ چنانچہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے معروف عالم دین قاضی ضیاء الدین سنامیؒ جو کہ سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں محتسب کے منصب پر فائز رہے اور وہ برصغیر پاک و ہند میں احتساب کے ادارے کے بانی تھے۔ قاضی صاحبؒ زہد و تقویٰ اور دیانت و امامت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کی انہی خصوصیات کی وجہ سے حکومت کی جانب سے احتساب کا کام ان کے سپرد تھا۔ قاضی صاحبؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ میں ساری زندگی چپقلش رہی کیونکہ شیخؒ سماع کے قائل تھے اور قاضی صاحبؒ سخت مخالف، لیکن قاضی صاحبؒ کی وفات پر شیخ نظام الدینؒ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور فرمایا:

''ایک ہی ذات گرامی شریعت کی حمایت کرنے والی تھی، افسوس کہ وہ بھی نہ رہی۔''

حضرت قاضی صاحبؒ ایک مرتبہ احتساب کی غرض سے حضرت بوعلی قلندرؒ کے پاس بھی گئے۔ قلندر صاحبؒ نے دو تین بار تیز نظروں سے ان کی طرف دیکھا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ جب مولانا سنامیؒ چلے گئے تو لوگوں نے قلندر صاحب سے کہا کہ آج تو قاضی ضیاء الدین سنامیؒ نے آپ پر بڑی سختی کی۔ فرمایا:

''دو تین بار میں نے چاہا کہ اس پر حملہ کر دوں لیکن اس نے شریعت کی زرہ پہن رکھی تھی، میرے تیر نے اس پر اثر نہیں کیا۔''

قاضی سنامی صاحبؒ نے دہلی میں ایک ہفتہ وار درس قرآن حکیم کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جس میں معاشرہ کے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور مؤلف تاریخ فیروز شاہی کے مطابق اس میں شرکاء کی تعداد تین ہزار تک ہوتی تھی۔

بچپن:

اپنے علمی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود حضرت مولاناؒ کا بچپن عام بچوں کی طرح فضولیات میں کیسے گذر سکتا تھا۔ گھر اور باہر کا ماحول سارا علمی اور دیندارانہ تھا، اس وجہ سے شروع میں علم اور دین کی طرف آپ کو رغبت تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے پہلا روزہ رکھا جس پر گھر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ عمر کے اسی حصہ میں آپ حضرۃ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی بارات میں تھانہ بھون گئے۔ نماز عصر کے لیے خانقاہ امدادیہ گئے تو وہاں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی پہلی بار زیارت ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں جب حضرت مولاناؒ کی عمر دس سال تھی، آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی زیارت کے لیے گئے جو کہ اسی سال مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر دیو بند پہنچے تھے۔ اس ملاقات میں حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو ریوڑیاں دی تھیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ حضرت مولاناؒ کے والد اور حضرت شیخ الہند دونوں ہی حضرت گنگوہیؒ کے شاگرد، مرید اور خلفاء میں سے تھے۔

گیارہ سال کی عمر میں حضرت مولاناؒ کے سر سے والد ماجد کا سایہ اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد کا دور نہایت غربت اور معاشی تنگی کا دور تھا۔ ایک روز گھر میں دو روز سے فاقہ تھا

اور والدہ نے اپنے بچوں کو گھر سے باہر جانے سے منع کر دیا۔ کسی ذریعہ سے حضرت مولانا کی نانی صاحبہ کو پتہ چل گیا۔ وہ خورد و نوش کا سامان لے کر گھر آ گئیں لیکن حضرت مولانا کی والدہ نے وہ سامان لینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا "یہ سامان میں ہرگز نہیں لوں گی۔ دنیا کہے گی کہ اولاد کو بھائیوں کی مدد سے پالا ہے۔ میں اپنی اولاد کی نگاہیں نیچی نہیں کرنا چاہتی۔ اتفاق سے دو کرتے سلائی کے لیے آ گئے۔ والدہ نے ظہر کی نماز تک دونوں ہاتھ سے سی کر دے دیئے اور یوں شام تک کھانے کا انتظام ہو گیا۔

تعلیم و تربیت:

حضرت مولانا کی تعلیم و تربیت بڑے پاکیزہ ماحول میں ہوئی۔ حفظ قرآن پاک اپنی والدہ سے شروع کیا اور تیسویں پارہ کی سولہ (۱۶) سورتیں ان سے حفظ کیں۔ اس کے علاوہ قاعدہ بغدادی بھی اپنی والدہ محترمہ ہی سے پڑھا۔ بعد میں حافظ رحیم بخش صاحبؒ کے ہاں دس برس کی عمر میں مکمل قرآن حکیم حفظ کیا۔ پھر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۲ء تک بڑوت میں اپنے بڑے بھائی حکیم محمد عمر کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ اپنے ماموں حضرت مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی شارح نسائی و موطا امام مالک کی زیر تربیت رہے۔ پھر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک مدرسہ مظاہر العلوم، سہارنپور میں زیر تعلیم رہے۔ وہاں ان کے اساتذہ میں مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، قاری محمد داؤد اور حضرت مولانا مسعود احمد صاحبؒ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ پھر ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں حصول تعلیم کے لیے چلے گئے۔ پھر یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء تک جاری رہا جب کہ مولانا مرحوم کی عمر ۱۹ سال تھی۔ پھر ۱۹۳۷ء میں آپ نے مولوی فاضل، ۱۹۳۸ء میں منشی فاضل اور ۱۹۴۰ء میں عربی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔

جن دنوں حضرت مولانا بڑوت میں تھے ان دنوں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ براستہ بڑوت دہلی تشریف لے جا رہے تھے۔ مولانا مرحوم اپنے بڑے بھائی حکیم حافظ محمد عمر کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی زیارت کے لیے ریلوے اسٹیشن گئے۔ حضرت تھانوی نے دونوں بھائیوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ حضرت مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت تھانوی کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے کیف کو میں ایک عرصہ تک محسوس کرتا رہا۔

حضرت مولانا مرحوم کے اکابر و مشائخ:

حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی قدس سرہ کے اکابر و مشائخ وہ جلیل القدر اور تاریخ ساز شخصیات ہیں جنہوں نے دین اسلام کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی ساری زندگیاں لگا دیں۔ ان کے بارہ میں حضرۃ مولانا مرحوم نے اپنی وصیت میں لکھا ہے

''حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے بیعت ہوں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے پاس تو کم رہا ہوں، لیکن حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے پاس لگا تار دو دو ماہ شب و روز گذارے ہیں، اور ان بزرگوں کی خلوت و جلوت کا چشم دید گواہ ہوں۔ ان کے علاوہ جن بزرگوں کا فیضانِ نظر مجھے ملا ہے، جن کی صحبت سے مجھے دین کی صحیح نعمت اور قلب کی صحت نصیب ہوئی ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ان سے میں دہلی میں مدرسہ امینیہ کے کتب خانہ میں ۱۹۳۱ء میں ملا ہوں اور دیر تک پاس بیٹھا ہوں۔

(۲) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ: ان کی زیارت میں نے ان کی ہجرت مدینہ سے پہلے کاندھلہ کے ریلوے اسٹیشن پر کی ہے۔ آپ ظہر کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے۔ جس سال انہوں نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی اسی سال میں مظاہر العلوم میں داخل ہوا تھا۔

(۳) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیارت اور صحبت سے الحمد للہ کافی مستفید ہوا ہوں۔ سہارنپور سے بھی زیارت کے لیے تھانہ بھون جاتا رہا، اور ایک بار تو دیوبند سے تن تنہا پیدل چل کر صرف زیارت کے لیے تھانہ بھون گیا تھا۔

(۴) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیارت کا پہلا شرف مجھے قیام دیوبند ہی میں ہوا۔ مولانا عثمانیؒ ہی نے میرا پہلا نکاح پڑھایا تھا۔ مولانا اشفاق الرحمن صاحبؒ کی دعوت پر مولانا ادریس کاندھلویؒ لے کر انہیں کاندھلہ آئے تھے۔ نکاح کے دوسرے دن میں نے اور مولوی موسیٰ نے مولانا سے حدیث کا برکت کے لیے استفادہ کیا۔

(۵) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی زیارت میں نے ۱۹۲۹ء میں کی میں چھ ماہ مدرسہ امینیہ میں رہا۔ پھر ۱۹۴۸ء میں بھی ان کی زیارت نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالصمد بہاریؒ اور مولانا نورالدین بہاریؒ سے ۱۹۳۰ء میں شرف ملاقات نصیب ہوا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی زیارت سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے ہاں ہوئی۔ کھانا بھی کئی بار ساتھ کھایا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زیارت تو مجھے بچپنے ہی سے رہی۔ دہلی کے قیام میں نظام الدین جاتا۔ جس جمعرات کو ناغہ ہو جاتا تو حضرت جی ترا با بیرام خان دہلی میں جمعہ کے روز آجاتے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زیارت بھی ہوئی اور خط و کتابت بھی کافی عرصہ رہی لیکن سب سے اچھی اور طویل زیارت فیصل آباد میں ایک تبلیغی اجتماع میں ہوئی۔ مولانا نے نماز جمعہ میری امامت میں ادا کی۔ ایسے ہی دوسرے بزرگوں جیسے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ، حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ اور حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالویؒ سے کئی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

سیالکوٹ میں ورود:

حضرت مولانا مرحوم کا سیالکوٹ میں تشریف لانا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ جانا، اس کا ایک پس منظر ہے۔ جو انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''میرا ماہ و سال'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کی مختصر اور اجمالی داستان کچھ یوں ہے۔

۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا دیوبندؒ میں تھے کہ جمعیۃ علمائے ہند نے کانگرس کے ساتھ مل کر سول نافرمانی کی تحریک کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ جامع مسجد دیوبند میں ایک جلسۂ عام میں پرجوش تقریر کی جسے سن کر حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلویؒ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس تحریک میں ضرور حصہ لیں گے۔ چنانچہ وہ حضرت مدنیؒ کے اس سیاسی سفر میں قریباً ایک ماہ آپ کے ہم رکاب رہے۔ پھر والدہ سے اجازت لے کر ۱۹۳۰ء میں دہلی آگئے۔ اور دفعہ ۱۴۴ کی موجودگی کے باوجود کمپنی باغ میں جلسہ منعقد کیا، جس کے نتیجہ میں گرفتار ہو کر دہلی، ملتان اور لاہور کی جیلوں میں رہے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں رہا

ہوئے۔ اس عرصہ میں حضرت مولانا کو پنجاب کے علماء اور سیاسی زعماء سے ملاقات کا موقع ملا اور آپ کے ذہن میں اس علاقے میں دین کا کام کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔

۲۵ نومبر ۱۹۳۱ء جمعہ کے روز حضرت مولانا مرحوم مجلس احرار کی کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں دہلی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ سیالکوٹ آ کر ایک جلسہ میں تقریر کی جس کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کر رہے تھے۔ پھر سیالکوٹ کے مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ رام تلائی میں آپ نے مختلف اوقات میں بارہ تقریریں کیں۔ چنانچہ یہاں آپ گرفتار ہو گئے اور آپ کو اڑھائی سال کی قید سنائی گئی۔ سیالکوٹ جیل میں آپ کو مقامی لوگوں، علماء، سیاسی ورکروں اور دانشوروں سے مزید میل جول کا موقع ملا اور یہاں کے مذہبی اور فکری رویوں سے آشنائی اور آگہی ہوئی۔ جس سے یہ بات دل کی اتھاہ گہرائیوں پختہ ہوگئی کہ اس علاقہ میں دین کا کام کیا جائے۔

مارچ ۱۹۳۴ء کو جب حضرت مولانا جیل سے رہا ہو کر واپس کاندھلہ پہنچے تو والدہ ماجدہ کی حالت دیکھ کر یہ سوچ غالب آنے لگی کہ فکر معاش کی طرف توجہ کی جائے تا کہ والدہ کی خدمت کی جا سکے۔ انہی دنوں حضرت مولانا کے ایک مداح اور قریبی ساتھی ڈاکٹر حاجی فیروز الدین دہلی آئے اور انہوں نے حضرت مولانا کو بذریعہ خط اطلاع کر کے کاندھلہ سے دہلی بلا لیا اور پھر ایک دلچسپ ترکیب سے مولانا کو سیالکوٹ لے آئے۔ اس بارہ میں حضرت مولانا نے خود لکھا ہے:

"(ڈاکٹر فیروز دین) کا چار روز کا قیام تھا۔ میں چار روز ان کے ساتھ رہا۔ ۲۹ تاریخ کو ان کی روانگی تھی۔ رات کو وہ پیپے ایکسپریس میں جانے والے تھے۔ میں ان کو اسٹیشن روانہ کرنے گیا۔ اسٹیشن پر میں نے پلیٹ فارم لے لیا۔ ان کی مشایعت کی خاطر گاڑی چلنے تک بیٹھ گیا۔ گاڑی نے چلنے کا وسل کیا۔ میں نے اترنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ ابھی گاڑی کے چلنے میں دیر ہے۔ بالآخر میں اترنے لگا کہنے لگے ٹھیرو، ٹھیرو گاڑی تیز ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ اسٹیشن آیا، میں نے اترنے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ کہہ کر روک لیا کہ ٹھیرو جی گاڑی کافی ٹھیرے گی۔ گاڑی پھر چل دی۔ اب انہوں نے راز کھولا کہ میں نے آپ کا ٹکٹ لے لیا۔ اب میں پریشان ہوا۔ میں نے کہا کہ میں

پھر آؤں گا۔ اب میرے حالات اچھے نہیں ہیں۔ بولے کہ کیا حالات ہیں اور کیا چیز رکاوٹ ہے؟ میں نے کہا کہ میری والدہ بڑی عسرت اور تنگی سے زندگی گذار رہی ہیں۔ بولے فکر نہ کیجیے کہ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ بالفعل میں ان کو دو سو روپیہ کا منی آرڈر آپ کی جانب سے روانہ کرآیا ہوں۔ اب میں چپ ہو گیا۔''

سیالکوٹ میں قیام اور خدمت دین:

سیالکوٹ آنے کے بعد کچھ عرصہ تو ڈاکٹر فیروزالدین صاحب کے گھر قیام رہا جس کے دوران مطالعہ کے علاوہ یہاں کے مختلف مسالک کے علماء سے ملاقاتیں رہیں جن میں مولانا غلام فرید، مولانا محمد ابراہیم میر، مولانا احمد دین اور مولانا محمد یوسف سرفہرست ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۳۴ء کو مولانا محمد علی صاحبؒ نے مولانا غلام فرید کے مشورہ سے ائمہ مساجد کے بچوں کے لیے قصبہ چنی شیخاں میں ''فلاح دین و دنیا'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ حضرۃ مولاناؒ یہاں کے روایتی طریقوں سے چندہ جمع کرنے کو ناپسند فرماتے تھے، اس لیے یہ وقت نہایت تنگی میں گذرا۔ حضرت مولاناؒ اور پندرہ طلبہ کا گذارا ایک آنہ سیر کے حساب سے خریدی گئی سوکھی روٹیوں کو چھاچھ میں بھگو کر کھانے پر تھا۔

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر فیروز دین نے خادم علی روڈ پر ۲/۱ زمین خریدی اور اس میں مدرسہ کے لیے عارضی طور پر چار کمرے بنا دیئے اور مدرسہ فلاح دین و دنیا کو چنی شیخاں سے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ شہر میں آنے جانے کی وجہ سے حاجی محمد علی ایگزیکٹو انجینئر کی مسجد واقع ایبٹ روڈ میں جمعہ پڑھانے کی وجہ سے مولاناؒ کا یہاں تعارف اور شہرت بڑھنے لگی اور عام تعلیم یافتہ طبقہ مولاناؒ کے قریب ہونے لگا۔

سیالکوٹ شہر میں اس وقت کی مشہور کاروباری اور سماجی شخصیت حاجی شہاب الدین صاحب نے ایک دینی درس گاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ حاجی شہاب الدین کے حاجی محمد علی صاحب ایگزیکٹو انجینئر سے بہت تعلقات تھے۔ چنانچہ حاجی محمد علی مولانا مرحوم کو ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کو اپنے ساتھ لے کر حاجی شہاب الدین کے گھر گئے جہاں حضرت مولاناؒ اور حاجی شہاب الدین کے درمیان مدرسہ میں کام کرنے کے سلسلہ میں بڑی پرمغز اور دلچسپ گفتگو ہوئی جس میں دہلی سے

آئے ہوئے حاجی شہاب الدین کے ایک سمدھی بھی شامل ہو گئے۔اس گفتگو اور حاجی شہاب الدین کی مردم شناسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا محمد علی کاندھلوی اسی روز یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کو رات دس بجے تک بمع سامان دارالعلوم الشہابیہ تشریف لے آئے اور پھر اس سے دنیا سے عالم آخرت کے انتقال تک یعنی ۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تک یعنی ستاون (۵۷) سال یہیں قیام فرمایا۔

حضرت مولانا کے اندر خدمت دین کا جذبہ اور اخلاص اور دین کی لگن پچھ اس قدر رچ بس گئی تھی کہ ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کو رات دس بجے دارالعلوم الشہابیہ میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور اگلے ہی روز یعنی ۱۵ فروری کو درس قرآن پاک کا سلسلہ شروع فرما دیتے ہیں جس میں ہر مکتبۂ فکر کے حضرات دور دور سے آکر شامل ہوتے تھے۔ ماہ و سال کے لحاظ سے اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۶ سال تھی، لیکن آپ ہر مکتب فکر کے حضرات کے سوالات کے نہایت علمی جوابات دیتے اور انہیں مطمئن کرتے۔

دارالعلوم الشہابیہ میں اپنے اس ستاون سالہ قیام میں آپ نے ہر سیاسی اور مذہبی تحریک میں حصہ لیا۔۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف جو تحریک چلی تھی حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ نے اس میں بھی بھر پور حصہ لیا اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ان چھ ماہ میں بھی آپ نے اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

جنرل ضیاء الحق صاحبؒ نے آپ کو مجلس شوریٰ میں لینے کی بڑی کوشش کی لیکن آپ نے انکار کیا۔آپ حکام سے بہت کم ملا کرتے تھے کیونکہ طبیعت میں ان لوگوں کے بارہ میں بہت بے نیازی پائی جاتی تھی۔ پوری زندگی علماء کے وقار کو قائم رکھا۔کبھی کسی سے اپنی کسی حاجت کا اظہار نہیں کیا لیکن سب کی حاجتوں کو پورا کرنے والی ذات نے ان کی ہر حاجت کو پورا کیا۔ دارالعلوم الشہابیہ کو دو منزلہ کیا۔قدیم مسجد کو شہید کر کے اتنی بڑی مسجد اور مدرسہ بنا دیا لیکن کسی کے ہاں جا کر چندہ نہیں مانگا۔لوگ خود آکر چندہ دیتے اور کسی کو پتہ بھی نہ ہوتا کہ کون چندہ دے کر گیا ہے۔

تصانیف:

حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔مطبوعہ اور غیر مطبوعہ۔ یہاں صرف ان کی تصانیف کا مختصر ذکر کرنا مقصود ہے۔

مطبوعہ تصانیف:

(۱) معالم القرآن:

حضرت مولانا کی تحریر کردہ تفسیر قرآن کریم ہے جس کی تصنیف کا سلسلہ آپ نے ۱۹۷۴ء میں شروع کیا اور تادم واپسیں اس پر کام جاری تھا۔ آپ کی زندگی میں اس کی ۱۲ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ معالم القرآن کی ہر جلد ایک پارے پر مشتمل ہے۔ مولانا ہر جلد کے آغاز میں اصطلاحات قرآن اور شرعی اور قانونی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ معالم القرآن کی چیدہ چیدہ خصوصیات میں اس کا معاصرانہ اسلوب، شرعی مسائل کی تنقیح، استنباط کے طریقوں کی تشریح، جدید قانونی مسائل کا شریعت کی روشنی میں تجزیہ قابل ذکر ہے۔

بعض حضرات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی مقالات لکھے ہیں جو پنجاب یونیورسٹی اور علامہ اقبال یونیورسٹی کے علوم اسلامیہ کے شعبوں کے زیر نگرانی تیار کئے گئے یا کئے جارہے ہیں۔

(۲) امام اعظمؒ اور علم الحدیث:

یہ کتاب امام اعظم ابوحنیفہ کے علم الحدیث میں حقیقی مقام کی تعیین میں معرکۃ الآراء کتب کی فہرست میں بے حد نمایاں ہے بلکہ اردو زبان میں اس نوعیت کی تحقیقی کاوش شاید ہی کوئی اور ہو۔ حضرت مولانا نے اس کتاب کی تکمیل صرف ۱۷ روز میں کی۔ اس عمل میں غیر معمولی تیزی اس وقت دکھائی دیتی ہے جب مصنف ذہین، مخلص، صحبت یافتہ اور جذبہ قربانی سے معمور ہو۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران مولانا کو یہ فرصت ملی تو انہوں نے اس کتاب کی تکمیل صرف ۱۷ دنوں میں کر ڈالی۔

ان دو ضخیم کتابوں کے علاوہ ارمضان ایمان، نقوش زنداں، اسلام کا نظام اذکار اور دوسری کئی کتابیں اور مضامین آپ کی قلم سے نکلیں۔

غیر مطبوعہ تصانیف:

غیر مطبوعہ تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں ہیں

(۱) میرے ماہ و سال:

یہ حضرت مولاناؒ کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ لیکن اس مسودہ میں ۱۹۴۳ء تک کے واقعات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے واقعات کا مسودہ کہیں ضائع ہو گیا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب نہایت چاشنی دار ہے اور اس کے مطالعہ سے حضرت کی زندگی کے ایسے گوشے نمایاں ہوتے ہیں جن کا ان کے قریبی احباب کو بھی شاید علم نہ ہو۔ یہ کتاب حضرت مولانا نے غالباً ۱۹۸۰ء کو لکھنی شروع کی تھی۔

(۲) قاضی ضیاء الدین سنامیؒ اور ان کا عہد:

برصغیر پاک و ہند میں شریعت کے احتساب کی جدوجہد کرنے والوں میں قاضی ضیاء الدین سنامیؒ کی شخصیت ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ علاء الدین خلجی نے آپ کو محتسب مقرر کیا۔ آپ نے ''نظام الاحتساب'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ مزید برآں آپ کے فتاوی کو بعد میں ''الفتاویٰ الضیائیہ'' کے نام سے مرتب کیا گیا۔ قاضی صاحب حضرت مولانا کے جدامجد بھی ہیں۔ مولانا مرحوم نے قاضی صاحب کی شخصیت، افکار، جدوجہد، علمی مرتبے اور رقابتوں میں جرأت رندانہ کے متعلق بڑے سائز کے اپنے ہاتھ سے قریباً ۱۵۰ صفحات لکھے جو کتابی شکل میں قریباً تین ساڑھے تین سو صفحات ہو جائیں گے۔

مولانا محمد علی صدیقیؒ کی وفات:

مختصر یہ کہ حضرت مولانا محمد علی صدیقی کاندھلویؒ اپنی زندگی کی قریباً بیاسی منزلیں طے کر کے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے محبین کے دلوں میں اپنی جدائی کا غم چھوڑ گئے اور ان کے بارہ میں ہر شخص یہی کہتا ہے

مرنے والے تمہیں روئے گا زمانہ برسوں

بلاریب حضرت مولانا سلف کی ایک یادگار تھے۔ ان کو دیکھ کر علمائے دیوبند کے اخلاص وللّٰہیت کے واقعات یاد آتے تھے کیونکہ مولانا مرحوم نے بھی ستاون سال سیالکوٹ میں گذارنے کے بعد کوئی جائداد چھوڑی اور نہ ہی کوئی مکان

کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے، زبان سے زور بیاں گیا ہے

مقدمہ

سیدنا علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت میں پندرہ خصلتیں پیدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مصائب کی بارش شروع ہو جائے گی۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ وہ پندرہ خصلتیں کیا ہیں؟ فرمایا

''جب غنیمت کا مال دولت کا مال سمجھا جائے۔ (بادشاہ اور حکومتی عہدیدار ارکان قومی و صوبائی اسمبلی اس مال کو اپنے باپ کا مال سمجھیں اور غریب و نادار لوگوں میں تقسیم نہ کریں) اور امانت کے مال کو لوٹ کا مال سمجھیں (یعنی اس کو بغیر ڈکار لیے کھا جائیں جیسے سرکاری خزانہ اور بینکوں کا مال کھایا گیا ہے) اور زکوٰۃ کو تاوان اور ڈنڈ سمجھیں اور آدمی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے اور جب آدمی دوست کے ساتھ نیکی اور باپ کے ساتھ ظلم وستم اور برائی کرنے لگے اور مسجدوں میں (بات چیت یا ورد و وظائف کی شکل میں) آوازیں اونچی ہونے لگیں اور ہر قوم کا سردار اس کا ذلیل ترین آدمی ہو اور ایک انسان کی عزت اس کے شر سے بچنے کے لیے ہونے لگے اور شرابیں پی جانے لگیں اور ریشم (جس کو شریعت نے مسلمان مردوں کے لیے حرام قرار دیا ہے) پہنا جانے لگے۔ جب گانے والی عورتوں اور باجوں (آلات مزامیر) کو محبت کی جانے لگے اور امت کے پچھلے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں (یعنی سلف صالحین اور محدثین وفقہاء جیسے امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ پر طعن تشنیع کیا جانے لگے) جب ایسا ہونا شروع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو زمین میں دھنسا کر یا پھر ان کی صورتیں مسخ کر کے عذاب دیں گے۔'' (ترمذی حدیث نمبر ۲۲۱ کتاب الفتن)

اس حدیث میں جتنی علامات قیامت بیان کی گئی ہیں وہ قریباً سب پوری ہو گئی ہیں۔ اور یہ علامت ''پچھلے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کریں گے''۔ یہ علامت بھی اس صورت میں ظاہر ہو چکی ہے کہ ائمہ اسلام اور محدثین کرام کے بارہ میں طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخیاں کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب امام ابوحنیفہ کے غیر ثقہ ہونے کے بارہ میں لکھتے ہیں

''ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب کے کئی معاصر اہل علم اور بعد کے لوگوں نے امام صاحب کو مطلقاً غیر ثقہ (ناقابل اعتبار) قرار دیا ہے۔'' (لمحات حصہ ۲ ص ۱۲۷)

''امام صاحب نے اپنی باتوں کو غلط یا باطل یا شر سے تعبیر کیا ہے۔ انہیں ان کے غلط ہونے کا شک یا یقین تھا۔'' (لمحات حصہ ۲ ص ۱۳۴)

ایک اور صاحب جو محقق ہونے کے دعویدار ہیں یوں رقم طراز ہیں

''اس خصوص میں امام ابوحنیفہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہے۔ ایام طالب علمی ہی سے انہوں نے اپنا یہی مزاج بنا لیا تھا۔ نہ قرآن حفظ کیا نہ علوم قرآنیہ سے بہرہ ور ہوئے نہ علم حدیث سیکھا نہ حافظ حدیث کہلائے نہ نحو وصرف میں درک ملا نہ عربی زبان و ادب میں مہارت حاصل کی نہ شعر گوئی کا ملکہ تھا نہ علم کلام اور منطق و فلسفہ میں دسترس تھی بلکہ محض عوام کالانعام میں صدر نشینی کے مقصد سے رائے اور قیاس میں خوب مہارت پیدا کر لی۔''

(فضیحت ننگ از ابوالقاسم عبدالعظیم سلفی طبع دارالمطالعہ سلفیہ مئو بنارس)

ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔

''امام ابوحنیفہ پر ایک سے زائد مرتبہ کفر عائد ہوا جس سے توبہ کرانے کی بھی نوبت آئی۔'' (لمحات حصہ ۳ ص ۱۲۷)

ایک اور صاحب امام اعظم ابوحنیفہ کے بارہ میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

''کیونکہ یہ مسلمہ امر اور آخری اور قطعی حقیقت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نام کے ساتھ محدث و امام فن حدیث کا لفظ برائے نام بھی کتب تاریخ اسلام اور اسماء الرجال و طبقات میں نہیں ہے بلکہ امام صاحب کے معاصرین اور بعد والوں نے جس درجہ اشد ترین اور متعدد جرح حضرت امام پر کی ہے وہ امام دارقطنی کے تضعیف کرنے سے بہت زیادہ سنگین ہے۔ اصلیت

واقعہ یہ ہے کہ فن حدیث و رجال میں نہ ہی تو حضرت امام ابوحنیفہ کو کوئی مہارت و کمال ہے اور نہ ہی کسی حنفی کو اس موضوع پر کوئی کتاب لکھنے کی توفیق میسر ہوئی۔'' (تاریخ اہلحدیث ص ۱۸۹)

حال ہی میں ایک کتاب کراچی میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے خلاف شائع ہوئی۔ اس کتاب کی زبان بازاری اور نہایت گھٹیا ہے۔ اس کتاب میں ائمہ حدیث پر بھی نہایت مکروہ اور دل آزار الفاظ میں جرح کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ایک عنوان ہے۔

امام ابوحنیفہ کے مثالب (زخم جو انہوں نے امت کو دیے)

امام ابوحنیفہ کے فضول اور قبیح اقوال کے بیان میں وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو صرف چند ایک حوالے ہم نے نقل کیے ورنہ ایک فرقہ کے اکثر حضرات اس مرض کے مریض ہیں اور ان کے جاہل ترین لوگ جو معمولی عربی کی کتاب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے جب تک امام ابوحنیفہ کے بارہ میں گستاخانہ کلمات نہ کہہ لیں ان کے پیٹ کی ہوا ہی خارج نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی انہی گستاخانہ کارروائیوں کی وجہ سے ان کے علماء ان کے جہلاء سے سخت نالاں رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا داؤد غزنوی کے تذکرہ میں تذکرہ نویس مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ ایک دن میں ان کی (حضرت مولانا داؤد غزنوی) کی خدمت میں حاضر تھا کہ جماعت اہل حدیث کی تنظیم سے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ آپ نے بڑے دردناک لہجے میں فرمایا

''مولوی اسحاق! جماعت اہل حدیث کو حضرت امام ابوحنیفہ کی روحانی بددعا لے کر بیٹھ گئی ہے۔ ہر شخص ابوحنیفہ ابوحنیفہ کہہ رہا ہے۔ کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہ کہہ دیتا ہے۔ پھر ان کے بارہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ۔ اگر کوئی بڑا احسان کرے تو وہ سترہ (۱۷) احادیث کا علم گردانتا ہے۔ جو لوگ اتنے جلیل القدر امام کے بارہ میں یہ نقطہ نظر رکھتے ہوں ان میں اتحاد و یکجہتی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ یا غربة العلم انما اشکو بثی وحزنی الی الله۔'' (حضرت مولانا داؤد غزنوی ص ۱۳۶)

ایک اور جگہ فرمایا

''دوسرے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اہل حدیث حضرات ائمہ اربعہ کی توہین کرتے ہیں بلاوجہ نہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں عوام اس گمراہی میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے اقوال کا تذکرہ حقارت کے ساتھ بھی کرجاتے ہیں۔ یہ رجحان

سخت گمراہ کن اور خطرناک ہے اور ہمیں سختی کے ساتھ اس کو رد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" (حضرت مولانا داؤد غزنوی ص ۸۷)

اسی سلسلہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ نے اپنا ایک ذاتی واقعہ اپنی کتاب "تاریخ اہل حدیث" میں نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے دماغ میں بھی امام ابوحنیفہ کے خلاف کچھ لکھنے کا فتور پیدا ہوا' لیکن حضرت مولانا میر مرحوم نیک' متقی اور بزرگان دین سے محبت کرنے والے تھے' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کار بد سے محفوظ رکھا۔ چنانچہ اس واقعہ کو حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ کی الفاظ میں سنیئے۔ فرماتے ہیں:

"اس مقام پر اس کی صورت یوں ہوئی کہ جب میں نے اس مسئلہ کے لیے کتب متعلقہ الماری سے نکالیں اور حضرت امام صاحبؒ کے متعلق تحقیقات شروع کی تو مختلف کتب کی ورق گردانی سے میرے دل پر کچھ غبار آ گیا۔ اس کا اثر بیرونی طور پر یوں ہوا کہ دن دوپہر کے وقت جب سورج پوری طرح روشن تھا' یکایک میرے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ گویا **ظلمات بعضها فوق بعض** کا نظارہ ہو گیا۔ معاً خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ یہ حضرت امام صاحبؒ سے بدظنی کا نتیجہ ہے' اس سے استغفار کرو۔ میں نے کلمات استغفار دہرانے شروع کیے وہ اندھیرے فوراً کافور ہو گئے اور ان کی بجائے ایسا نور چمکا کہ اس نے دوپہر کی روشنی کو مات کر دیا۔ اس وقت سے میری حضرت امام صاحبؒ سے حسن عقیدت اور زیادہ بڑھ گئی اور میں ان شخصوں سے جن کو حضرت امام صاحب سے حسن عقیدت نہیں ہے کہا کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری مثال اس آیت کی مثال ہے کہ حق تعالیٰ منکرین معارج قدسیہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرماتا ہے: "**افتمارونه علیٰ مایری**" میں نے جو کچھ عالم بیداری اور ہوشیاری میں دیکھ لیا اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے۔" (تاریخ اہل حدیث ص ۷۲)

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میرؒ نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ صرف اس لیے نقل فرمایا کہ حضرت امام صاحبؒ کی شان میں گستاخیاں کرنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ان بزرگان دین کے بارہ میں نازیبا اور گستاخانہ الفاظ منہ سے نہ نکالیں نیز ؎

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل

چو خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

مولانا محمد ابراہیم صاحب نے اسی صفحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے

''مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری نے مجھ سے بیان کیا کہ جن ایام میں میں کانپور میں مولانا احمد حسن کانپوری سے علم منطق کی تحصیل کرتا تھا اختلاف مذہب و مشرب کے سبب احناف سے میری گفتگو رہتی تھی۔ ان لوگوں نے مجھ پر یہ الزام تھوپا کہ تم اہل حدیث لوگ ائمہ دین کے حق میں بے ادبی کرتے ہو۔ میں نے اس کے متعلق حضرت میاں صاحب مرحوم دہلوی یعنی شیخ الکل حضرت سید نذیر حسین صاحب مرحوم سے دریافت کیا تو آپ نے جواب میں کہا کہ ہم ایسے شخص کو جو ائمہ دین کے حق میں بے ادبی کرے ''چھوٹا رافضی'' جانتے ہیں۔ علاوہ بریں میاں صاحب مرحوم معیار الحق میں حضرت امام صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ''امامنا وسیدنا ابو حنیفه النعمان افاض الله علیه شابیب العفو والغفران'' (ص ۲) نیز فرماتے ہیں کہ ان کا مجتہد ہونا اور تبع سنت اور متقی اور پرہیزگار ہونا کافی ہے ان کے فضائل میں یہ آیہ کریمہ ''ان اکرمکم عندالله اتقاکم'' زینت بخش مراتب ان کے لیے ہے۔'' (ص ۵) (تاریخ اهل حدیث ص ۷۲ تعلیقه)

امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی وجہ:

یہ صرف چند حوالہ جات ہم نے پیش کیے ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ کی توہین اور ان کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایسا کیوں کیا گیا اور کیوں کہا جاتا ہے؟ اور کیوں ہر روز ان کے بارہ میں ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ گمان ہے کہ ہمیں حدیث آتی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو حدیث نہیں آتی تھی وہ یتیم فی الحدیث تھے یا بقول حضرت مولانا داود غزنوی ان کو تین یا سترہ حدیثیں آتی تھیں۔ چنانچہ حضرت مولانا داود غزنوی کے والد حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی سے ایک طالب علم نے مشکوۃ پڑھی۔ جس روز حدیث کی یہ کتاب ختم ہوئی تو اس نے ترنگ میں آکر کہا (کیونکہ اس نے اپنے جاہل علماء سے یہی سنا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کو صرف سترہ (۱۷) حدیثیں آتی تھیں) کہ مجھے امام ابوحنیفہ سے زیادہ احادیث آتی ہیں۔ کسی طالب علم نے اس کی یہ بات حضرت مولانا عبدالجبار صاحب سے جا کر کہہ دی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ طالب علم مرتد ہو کر مرے گا۔ چنانچہ دو آٹھ روز کے بعد قادیانی ہو گیا اور مہینے ڈیڑھ مہینے میں مر گیا۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے علم ہو گیا کہ یہ شخص مرتد ہو کر مرے

گا۔ فرمایا کہ جو ان ائمہ کی توہین کرتا ہے جن کی ساری زندگیاں خدمت دین میں گذریں ان کو بقول حدیث اللہ تعالیٰ جنگ کا الٹی میٹم دے دیتا ہے (من عادی لی ولیاً فقد آذنعه بالحرب) اور جس کو اللہ تعالیٰ جنگ کا الٹی میٹم دیں اس کا ایمان کبھی بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔

تو امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ کہنے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ گمان ہو گیا ہے کہ امام صاحب کو حدیث نہیں آتی تھی اور ہمیں آتی ہے ہم عامل بالحدیث ہیں اور وہ حدیث نہ آنے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت کرتے تھے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کے معاصرین ان کی مخالفت کرتے۔ جب پوچھا جائے کہ ان کو حدیث نہ آنے کی وجہ کیا تھی حالانکہ وہ تابعی تھے اور تابعین کے دور میں تو حدیث کا عام چرچا تھا اور اتنا بڑا امام اور حدیث سے ناواقف تو جواب یہ ملتا ہے کہ وہ تابعی نہ تھے اور دوسرے جس شہر کوفہ میں وہ رہتے تھے وہاں حدیث کا چلن اور چرچا نہیں تھا۔

امام ابوحنیفہ تابعی تھے:

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ تابعی تھے چنانچہ ابن ندیمؒ نے لکھا ہے۔

وکان من التابعین لقی عدة من الصحابة وکان من الورعین الزاهدین۔

(فهرست ابن ندیم جلد ۱ ص ۲۹۸)

امام ابوحنیفہؒ تابعین میں سے تھے کیونکہ آپ نے کئی ایک صحابہؓ سے ملاقات کی اور وہ (امت کے) پرہیزگار اور زاہد لوگوں میں سے تھے۔

ہمارے خیال میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت کا مسئلہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت جو عمر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کی تھی، قریباً وہی عمر سیدنا امام ابوحنیفہؒ کی تھی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہؓ موجود تھے۔ آپ کے صحابی سیدنا عبداللہ بن ابی اوفیٰ (م ۸۷ھ) تو رہتے ہی کوفہ میں تھے۔ سیدنا عامر بن واثلہ الاسقعؓ (م ۱۰۲ھ) بھی اس وقت زندہ تھے جب امام ابوحنیفہؒ کی عمر ۲۲ سال تھی کیونکہ آپ کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی۔ سہل بن سعد ساعدی کی وفات ۹۱ھ میں ہوئی اور سیدنا عبداللہ بن بسر المازنیؓ کی وفات ۹۶ھ میں ہوئی۔ اس وقت امام صاحب کی عمر بالترتیب ۱۱ اور ۱۶ سال تھی۔ اور حافظ ذہبی نے لکھا ہے

رأی انس بن مالک غیر مرة لما قدم علیهم الکوفة۔

(تذکرة الحفاظ جلد ۱ ص ۱۵۸)

آپ نے سیدنا انس ابن مالکؓ صحابی رسول کو کئی مرتبہ دیکھا جب وہ کوفہ گئے تھے۔

سیدنا انس بن مالکؓ کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔ اس وقت سیدنا امام ابوحنیفہؒ کی عمر تیرہ سال تھی۔ امام ابوحنیفہ ان کی مجلس میں کئی مرتبہ گئے اور ان سے ملاقات کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ جب ان سے ملے تو صحابہؓ کوئی دنیا کی باتیں تھوڑی کرتے تھے۔ وہ تو جس کو بھی ملتے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی احادیث ہی بیان کرتے تھے لہذا انہوں نے ضرور ان سے کوئی حدیث بیان کی۔ اگر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ گیارہ سال کی عمر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت لے سکتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ سیدنا انس بن مالکؓ سے حدیث رسول کیوں نہیں لے سکتے؟ آپ نے سیدنا انسؓ سے حدیث رسول ضرور سنی ہوگی لیکن اہل کوفہ حدیث رسول کے بارہ میں کچھ زیادہ ہی محتاط تھے اور وہ بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا باقاعدہ سماع نہیں کرتے تھے جیسا کہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ۔

ان اهل الکوفة لم یکن الواحد منهم یسمع الحدیث الا بعد استکماله عشرین سنة۔ (الکفایہ ص ۵۴)

کوئی بھی اہل کوفہ بیس سال کی عمر سے پہلے باقاعدہ سماع حدیث نہ کرتا تھا۔

اسی وجہ سے بعض محدثین نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالکؓ کو تو دیکھا لیکن ان سے روایت نہیں کی۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے بھی یحیٰی بن معینؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے سیدہ عائشہ بنت عجردؓ سے بھی حدیث کی سماعت کی ہے اور انہوں نے براہ راست سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت فرمائی۔ (ملاحظہ ہو لسان المیزان)

کیا کوفہ مرکز حدیث تھا:

بتایا یہ جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو اس لیے حدیث کم آتی تھی کہ وہ کوفہ میں رہتے تھے اور کوفہ میں علم حدیث بہت کم تھا۔ ایسا کہنا بھی جہالت کی وجہ سے ہے اس وجہ سے کہ کوفہ میں پندرہ سو کے قریب صحابہؓ فروکش ہوئے۔ (فتح القدیر جلد ۱ ص ۴۲) جن میں ستر بدری اور تین سو بیعت رضوان کے شرکاء تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۴) پھر یہ چار سال تک سیدنا علیؓ کا دارالخلافہ رہا اور آپ نے ان چار سالوں میں اپنے علوم و معارف اور اپنے علم و فقہ کو کوفہ میں پھیلایا

(منہاج السنہ جلد ٤ ص ۱۳۷) مختلف مقدمات کے فیصلے سیدنا علیؓ نے یہیں کیے۔ سیدنا علیؓ کے کوفہ تشریف لے جانے سے قبل سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ اور سیدنا عمار بن یاسرؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ کوفہ کے درودیوار کو اپنے علوم و معارف اور احادیث نبویہ سے منور کر چکے تھے۔ (منہاج السنہ جلد ٤ ص ۱۳۷) چنانچہ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ

''میں جب کوفہ پہنچا تو وہاں چار ہزار طلبہ حدیث موجود تھے جو حدیث پڑھ رہے تھے۔'' (تدریب الراوی ص ۲۷۵)

امام بخاریؒ جیسا محدث بھی کوفہ سے مستغنی نہ ہو سکا چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ وہ آٹھ مرتبہ بغداد طلب حدیث کے لیے تشریف لے گئے۔ (ارشاد الساری ص ۳۱) اور امام بخاریؒ کا خود اپنا قول ہے کہ

لا احصی کم دخلت الی الکوفۃ والبغداد مع المحدثین۔ (مقدمہ فتح الباری جلد ۲ ص ٤۷۹)

میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں کتنی مرتبہ محدثین کے ساتھ کوفہ و بغداد (طلب حدیث کے لیے) گیا۔

کوفہ کی اسی علمی فضیلت کی وجہ سے سیدنا حذیفہؓ صحابی رسول فرماتے ہیں **الکوفۃ قبۃ الاسلام** (مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۸۹)

اور امام نووی کوفہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وھی دار الفضل ومحل الفضلاء (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۵)

''کوفہ فضیلت کا گھر اور فضلاء کا شہر تھا۔''

''اسی کوفہ میں امام ابوحنیفہ پیدا ہوئے اور مختلف محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور حدیث میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ اور امام ذہبی جیسے محدث نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ نے عطاء، نافع، عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج، سلمہ بن کہیل، ابوجعفر محمد بن علی، قتادہ، عمرو بن دینار، ابواسحاق اور بہت سے لوگوں سے حدیث روایت کی۔ اور امام ابوحنیفہ سے وکیع، یزید بن ہارون، سعد بن صلت، ابوعاصم، عبدالرزاق، عبداللہ بن موسیٰ، ابونعیم، ابوعبدالرحمن المقری اور ان کے علاوہ خلق کثیر نے روایت کی ہے۔ ابوحنیفہ امام تھے اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔'' (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۶۸)

حافظ ذہبی نے امام صاحب کا تذکرۃ الحفاظ میں حدیث میں کیا ہے۔ یہ بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ امام ابوحنیفہ صرف سترہ حدیثیں نہیں جانتے بلکہ حافظ حدیث تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مشہور محدث عبدالرحمن المقری جب آپ سے روایت کرتے تو فرماتے کہ مجھ سے اس شخص نے حدیث بیان کی جو فن حدیث میں بادشاہوں کا بادشاہ (شہنشاہ) ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں

کان اذا حدث عن ابی حنیفة قال حدثنا شاھنشاہ۔

(تاریخ بغداد جلد ۳ ص ۲۴۵)

علامہ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں کہ امام علی بن مدینی فرماتے ہیں

''امام ابوحنیفہ سے حدیث روایت کرنے والے سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشام، وکیع بن جراح، عباد بن عوام اور جعفر بن عون ہیں۔ امام ابوحنیفہ ثقہ تھے اور ان سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ امام شعبہ امام ابوحنیفہ کے بارہ میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ (جامع بیان العلم جلد ۱ ص)

بلکہ حماد بن زید کے بارہ میں تو لکھا ہے

روی حماد بن زید عن ابی حنیفة احادیث کثیرہ۔ (الانتقاء ص ۱۳۰)

''حماد بن زید نے امام ابوحنیفہ سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔''

امام صدر الائمہ مکی لکھتے ہیں کہ

''امام ابوعبدالرحمن المقری عبداللہ بن یزید نے جو خود بھی حفاظ حدیث اور حدیث کے بڑے ائمہ میں سے تھے امام ابوحنیفہ سے حدیث کی بہت سی روایات لی ہیں۔''

(مناقب موفق جلد ۲ ص ۳۲)

مسعر بن کدام محدثین کرام میں اپنی جلالت قدر کے باعث ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔ یحیٰی بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ میں نے حدیث میں ان سے زیادہ ثابت اور کسی کو نہیں پایا۔ اور امام ذہبی نے لکھا ہے کہ امام مسعر بن کدام امام ابوحنیفہ کے ہم سبق تھے فرماتے ہیں کہ

''میں نے امام ابوحنیفہ کے ساتھ مل کے حدیث پڑھنی شروع کی لیکن وہ ہم پر غالب رہے اور پھر زہد میں مشغول ہوئے اس میں بھی وہ ہم پر سبقت لے گئے۔ پھر ہم

نے ان کے ساتھ فقہ پڑھنی شروع کی تو اس میں بھی وہ اس مقام پر پہنچے جو تم دیکھ رہے ہو۔" (مناقب ابی حنیفہ للذهبی ص ۲۷)

ملا علی قاریؒ امام محمد بن سماعہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں فرمایا:

"امام ابوحنیفہؒ نے اپنی تصانیف میں ستر ہزار سے زائد احادیث بیان کی ہیں اور چالیس ہزار احادیث سے کتاب الآثار کا انتخاب کیا ہے۔"

(مناقب ملا علی قاری بذیل الجواهر جلد ۲ ص ۴۷۴)

صدر الائمہ نے عقود الجمان میں بھی لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ نے کتاب الآثار کو چالیس ہزار احادیث سے منتخب کیا ہے۔" (مناقب الموفق جلد ۱ ص ۹۵)

امام ابوداؤد صاحب السنن فرماتے ہیں:

"**رحم الله مالكاً كان اماماً' رحم الله الشافعي كان اماماً' رحم الله ابا حنيفه كان اماماً**" (الانتقاء ص ۳۲)

اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے امام مالکؒ پر کیونکہ وہ امام تھے اللہ تعالیٰ رحم فرمائے امام شافعیؒ پر کیونکہ وہ امام تھے اور حق تعالیٰ شانہ رحمت فرمائیں امام ابوحنیفہؒ پر کیونکہ وہ امام تھے۔"

صاحب عقود الجمان نے لکھا ہے کہ

كان ابو حنيفة من كبار حفاظ الحديث واعيانهم' ولو لا كثرة اعتنائه بالحديث ماتهيا له استنباط مسائل الفقه۔

(عقود الجمان بحواله تانيب الخطيب ص ۱۵۲)

امام ابوحنیفہؒ بڑے حفاظ حدیث اور ان کے فضلاء میں سے شمار ہوتے تھے۔ اگر وہ حدیث نہ جانتے ہوتے تو مسائل فقہ میں ان کو استنباط کا ملکہ کیسے حاصل ہوتا؟

علامہ ابن خلدون اندلسیؒ اپنے مقدمہ تاریخ میں امام صاحبؒ کے بارہ میں فرماتے ہیں

"امام ابوحنیفہؒ کے علم حدیث میں کبار مجتہدین میں سے ہونے کی یہ دلیل ہے کہ ان کے مذہب پر رداً وقبولاً بھروسہ کیا گیا ہے۔" (مقدمہ ص ۴۴۵)

علم حدیث جاننے والا کون شخص ہے جو امام سفیان بن عیینہؒ سے واقف نہ ہو؟ وہ فرماتے ہیں:

اول من صیرنی محدثاً ابو حنیفہ۔

(الجواہر خلاء عن ابن خلکان جلد ۱ ص ۱۰۳)

"سب سے پہلے جس نے مجھے محدث بنایا وہ امام ابوحنیفہ تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ نہ صرف خود امام مالک الحدیث تھے بلکہ دوسروں کو بھی محدث بناتے تھے اور سفیان عیینہ جیسے کبار محدثین کو انہوں نے محدث بنایا جس کا اقرار وہ خود کرتے ہیں۔

امام وکیع بن الجراح محدث عراق نے ہشام بن عروہ، جعفر بن برقان، اعمش، سفیان ثوری اور امام اوزاعی سے حدیث سنی۔ اور آپ سے علی بن مدینی، یحییٰ بن معین اور امام احمد نے روایت لی۔ ان کے بارہ میں ابن عمار کہتے ہیں

"امام وکیع کے زمانہ میں کوفہ میں ان سے بڑا فقیہ اور بڑا محدث کوئی نہ تھا۔"

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۸۳)

ان وکیع بن جراح کے بارہ میں حافظ ابن عبدالبر نے امام یحییٰ بن معین، جو امام الجرح والتعدیل تھے فرماتے ہیں

"وکیع امام ابوحنیفہ کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور آپ کی روایت کردہ تمام احادیث یاد رکھتے تھے۔ اور انہوں نے امام ابوحنیفہ سے بہت سی احادیث کی سماعت کی تھی۔" (وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً)

(کتاب الانتقاء جلد ۲ ص ۱۵۰، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۴۹)

امام وکیع کا امام ابوحنیفہ کی فقہ کے مطابق فتویٰ دینے کا ذکر امام ذہبی نے بھی کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۸۲)

محمد بن عبدالکریم شافعی شہرستانی نے ایک بحث کے ضمن میں امام ابوحنیفہ کا جس انداز میں ذکر فرمایا ہے وہ ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کو کسی نے ائمہ حدیث میں شمار نہیں کیا۔ فرماتے ہیں

"حسن بن محمد بن ابی طالب، سعد بن جبیر، طلق بن حبیب، عمرو بن مرۃ، محارب بن دثار، مقاتل بن سلیمان، ذرہ، عمرو بن ذرہ، حماد بن سلیمان، ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد بن الحسن، قدید بن جعفر یہ سب ائمہ حدیث ہیں۔ اصحاب کبائر کو گناہ کبیرہ کی وجہ

سے کافر نہیں کہتے ہیں۔ اور یہ حکم نہیں دیتے ہیں کہ اصحاب کبائر ہمیشہ کے لیے جہنم میں ہوں گے اور خوارج اور قدریہ ان کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ اصحاب کبائر ہمیشہ جہنم میں ہوں گے۔"

(کتاب الملل والنحل للشہرستانی جلد ۱ ص ۱۹۵ برحاشیہ کتاب الفصل والنحل لابن حزم)

اس سلسلہ میں علامۃ النظار محمد ابن ابراہیم یمانیؒ کا بیان آج کل کے ان تمام حضرات کے اعتراضات کو ختم کر دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ حدیث میں کمزور تھے یا محدثین کی فہرست میں ان کا نام نہیں آتا۔ وزیر یمانی ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"امام ابوحنیفہؒ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ آپ کا علم حدیث کامل نہیں تھا اس لیے آپ نے ضعیف رواۃ سے روایت لی ہے۔ اس کہنے والے کی غرض صرف امام ابوحنیفہ کے علم حدیث میں شک ڈالنا ہے ورنہ امام ابوحنیفہ کا فضل و عدالت، تقویٰ و امانت تواتر سے ثابت ہے۔ اگر کسی نے علم اور تامل کے بغیر فتویٰ دیا ہے تو یہ اس کی عدالت میں جرح اور دیانت و امانت میں قدح اور اس کی عقل و مروت میں سبکی ہے۔ اس لیے جس شی کو انسان نہیں جانتا یا اچھی طرح نہیں جانتا اس کے جاننے اور اس میں حاذق ہونے کا دعویٰ کرنا جاہلوں اور بیوقوفوں کی عادت ہے۔ اہل خساست و دنائت میں حیاء اور مروت نہیں ہوتی۔ وہ ایسا دعویٰ اور ایسی جرأت کر سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے مناقب اور مناقب کی وجوہ میں ایسے قبیح عیب کی سمائی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے علم کی روایت و درایت کی کتابوں کو مدون کر کے اسلام کے خزانہ علمی میں داخل کیا گیا۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ علماء نے امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کو اچھا جانا اور پہچانا ہے اس لیے کہ علماء کے لیے ابوحنیفہؒ کے مذہب کی روایت ابوحنیفہؒ کے علم و اجتہاد کے جاننے کے بعد ہی جائز ہو سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے علم و اجتہاد پر امت مسلمہ کا اجماع ہے اور میری مراد اس بات سے یہ ہے کہ کبار علماء کے مابین امام ابوحنیفہؒ کے اقوال متداول ہیں۔ یمن، شام، مکہ، شرق و غرب میں تابعین کے زمانہ ۱۵۰ھ سے لے کر آج کے دن تک لوگوں میں اور تمام محکموں میں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت سے لے کر آج نویں صدی کے شروع تک امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پر اعتماد کیا ہے، ان پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ مسلمان یا تو امام ابوحنیفہؒ کے

اقوال پر عمل کرتے ہیں یا ان کے اقوال پر انکار کرنے سے خاموش ہیں۔ اور اس قسم کے مباحث میں اکثر مواضع پر اس طریقہ سے اجماع کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ اہل سنت اور غیر اہل سنت ہر دو فریق کو امام ابوحنیفہ کی تعظیم و احترام اور تقلید پر اتفاق ہے۔ اہل اعتزال میں ابوعلیؒ ابو ہاشمؒ ابوالحسن بصری اور زمخشری اس وقت امام ابوحنیفہؒ کی تقلید سے باہر ہو گئے ہیں جب انہوں نے طلب علم کے بعد اپنا فکر و نظر بدل دیا' مگر پھر بھی ان کو حنفیت کے انتساب میں عار نہ تھا۔ اگر امام ابوحنیفہ علم حدیث سے واقف اور علم حدیث میں کمال کے زیور سے آراستہ نہ ہوتے تو علم کے کوہ گراں علماء امام ابوحنیفہ کے مذہب میں ہرگز شامل نہ ہوتے' جیسے قاضی ابو یوسفؒ محمد بن الحسنؒ، امام طحاوی، ابوالحسن کرخی اور ان کے امثال و اضعاف ہند میں' شام میں' مصر میں' یمن میں' جزیرہ میں' حرمین شریفین اور عراق عرب اور عراق عجم میں ۱۵۰ھ سے لے کر آج تک چھ صدی سے زیادہ عرصہ میں ہزار با احاطہ نہیں کیے جا سکتے۔ جہاں جہاں تیں گنے نہیں جاتے۔ اہل علم و فتویٰ اور ارباب ورع و تقویٰ علماء احناف میں موجود ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا ضعفاء سے حدیث کی روایت کرنے کی وجہ علم حدیث کی معرفت کی کمی بتلانا فاحش وہم ہے بلکہ اس کی وجوہ اور ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ مجہول کی روایت کو بھی قبول کرتے ہیں۔ اور یہ امام ابوحنیفہؒ ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ دوسرے بھی کئی علماء کا یہی طریقہ ہے۔ اور اس میں شرط یہ ہے کہ ثقہ اور معلوم العدالت راوی کی روایت اس مجہول روایت کے معارض نہ ہو' اس لیے کہ جب معلوم العدالت روایت اور مجہول روایت کا معارضہ ہوتا ہے تو اس وقت ثقہ اور محفوظ پہلو کو ترجیح دینا متفق علیہ امر ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ ضعیف حدیث پر بھی عمل کرتے تھے بشرطیکہ اس کے مقابلہ میں صحیح حدیث اس کا معارض نہ ہوتی۔ اس وجہ سے امام احمدؒ اپنی مسند میں بہت سی ضعیف احادیث روایت کرتے ہیں۔ اور احتیاط کی وجہ سے ایسا کیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس روایت میں ضعف روایت کا علم نہیں ہوتا ہے یا ان وجوہات کا علم نہیں ہوتا جن کے سبب سے وہ حدیث قابل احتجاج اور لائق قبول نہیں ہوتی ہے یا اس کے قبول اور رد کرنے میں محدثین کو اختلاف ہے۔ حافظ ابن مندہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ضعیف سند سے بھی حدیث کو روایت کرتے ہیں یا

جب کہ اس ضعیف حدیث سے بہتر دوسری سند سے اس باب میں دوسری روایت نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ضعیف حدیث بھی رائے سے بہتر ہے اور یہ ایک صریح شہادت ہے کہ ضعیف حدیث کو روایت کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا ضعف اور اس کے ضعف کے اسباب کو وہ محدث نہیں جانتے تھے جس نے اس کو روایت کیا ہے۔ امام احمدؒ اور امام ابو داؤدؒ اس علم کے امام ہیں اور اس میدان کے شہسوار ہیں' اور وہ ضعیف روایت جس کو ان حضرات نے روایت کیا ہے اس قسم کی ضعیف روایت نہیں ہے جس کے راویوں میں کوئی بھی جھوٹا راوی اور معروف فاسق راوی ہو۔ ایسی روایت کو یہ حضرات جس میں جھوٹا اور مشہور فاسق راوی ہے' باطل یا موضوع یا ساقط یا متروک جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اور ایسی ضعیف روایت جس میں صرف اس قدر ضعف ہے کہ اس کا راوی سچا تو ہے مگر حافظ نہیں ہے یا اس حدیث کے رفع یا اسناد میں اختلاف ہے یا مثل اس کے مثلاً اس حدیث کے تعلیل یا راوی پر جرح کرنے میں علماء کو اختلاف ہے اور اس کے رد کرنے اور قبول کرنے کے لیے دونوں طرف قوی دلیل نہیں ہے' ایسی ضعیف حدیث کو اگر امام ابوحنیفہؒ نے لیا ہے جیسے امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ بھی امام ابوحنیفہؒ کے اس میں ہم نوا ہیں' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ قیاس اور اجتہاد کے مقابلہ پر ضعیف حدیث کو بھی امام ابوحنیفہؒ مقدم رکھتے ہیں اور دوسرے محدثین کا بھی یہی معمول ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ معمول اس وجہ سے نہیں ہے کہ آپ کو علم حدیث کی معرفت نہیں ہے ورنہ امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ اس عیب میں ابوحنیفہؒ سے دو قدم آگے ہیں۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ابوحنیفہؒ کے علم ونظر میں اس کا ضعف قابل اعتداد نہیں ہے بلکہ اس کی روایت کو قبول کرنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ اور اس معمول سے بڑے بڑے حفاظ حدیث بھی نہیں بچے ہیں۔ بخاریؒ اور مسلمؒ نے بھی ایسا کیا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح اس علم کے ائمہ میں امام شافعیؒ اکثر ابراہیم بن ابی یحییٰ سے روایت لیتے ہیں اور امام شافعیؒ نے اس کی توثیق کی ہے۔ اور دوسرے محدثین نے ابراہیم بن ابی یحییٰ کی توثیق کرنے میں امام شافعیؒ کی مخالفت کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ ابن ابی یحییٰ پر جرح کرنے میں محدثین کا اجماع

ہے اور جمہور نے اس کو ضعیف کہا ہے' لیکن ائمہ شوافع کے ہاں وہ صحیح ہے۔ اسی طرح امام شافعیؒ ابو خالد الزنجی سے روایت لیتے ہیں لیکن اس کی توثیق میں محدثین کو اختلاف ہے۔ علماء رجال نے اس بحث کو طول دیا ہے اور اپنی جگہ ایسے حضرات رواۃ معلوم کیے جا سکتے ہیں۔" (الروض الباسم ص ۱۵۸ تا ۱۶۳)

یہ اتنا طویل اقتباس صرف اس لیے نقل کیا گیا ہے تاکہ پتہ چلے وزیر یمانی کا امام ابو حنیفہؒ کے علم و اجتہاد اور روایت حدیث کے بارہ میں کیا نظریہ ہے۔ اور امام صاحبؒ کی علمی عظمت و جلالت نے اسلام کے علمی خزانہ میں کیا کچھ اضافہ کیا۔

امام شعرانیؒ شافعی ہونے کے باوجود اس بارہ میں امام ابو حنیفہؒ کا دفاع ان الفاظ میں کرتے ہیں

"جس نے یہ کہا کہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے دلائل کمزور اور ضعیف ہیں تو میں اس کو جواب دیتا ہوں کہ اے میرے بھائی! میں نے مذاہب اربعہ کے دلائل کا مطالعہ کیا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے دلائل کو خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ میں نے زیلعیؒ کی کتاب "تخریج ہدایہ" پڑھی ہے۔ میں نے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے دلائل کو دیکھا ہے۔ یا تو وہ صحیح احادیث ہیں یا حسن ہیں یا ایسی ضعیف احادیث ہیں جن کے طرق کثیرہ ہیں اور یا وہ حسن سے جا ملتے ہیں یا صحیح احادیث سے ملتے ہیں۔ اور جمہور محدثین نے ایسی ضعیف احادیث سے احتجاج کیا ہے جس کے طرق کثیر ہوں' اور اس قسم کی ضعیف احادیث بیہقی کی کتاب السنن الکبریٰ میں بہت پائی جاتی ہیں۔ جب امام بیہقیؒ کے پاس احتجاج کے لیے صحیح حدیث نہیں ہوتی ہے تو وہ ایسی ضعیف حدیث سے اپنے امام اور اپنے امام کے مقلدین کے لیے احتجاج کرتے ہیں۔ اور میں نے پہلے کہا ہے کہ میں حسن ظن یا باطن کے علم و اعتقاد سے امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے جواب نہیں دیتا ہوں بلکہ امام ابو حنیفہؒ کے اقوال اور آپ کے اصحاب کے اقوال کے تتبع اور گہرے مطالعہ کے بعد امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے میں نے جواب دیا ہے میں نے نہج المبین فی بیان ادلۃ مذاہب المجتہدین" نامی کتاب لکھی ہے اور میری یہ کتاب اس بات کی پوری ضمانت دیتی ہے کہ میں نے پوری تلاش اور دلائل کے جانچنے کے بعد امام ابو

حنیفہؒ کی طرف سے جواب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان فرمایا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کے تین مسندوں کے صحیح نسخوں کو پڑھا ہے۔ جن پر حفاظ کے خطوط ہیں اور آخر میں حفاظ دمیاطیؒ کا خط ہے۔ میں نے دیکھا کہ ابوحنیفہؒ ایسے عدول و ثقات تابعین سے حدیث کو روایت کرتے ہیں جن کے عہد کے خیر ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ان مسندوں میں اسودؒ، عقلمہؒ، عطاءؒ، عکرمہؒ، مجاہدؒ، مکحولؒ اور حسن بصریؒ جیسے حضرات سے حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین یہ کل رواۃ عدول' ثقہ اعلام اخیار ہیں۔ ان میں کوئی جھوٹا یا متہم بالکذب نہیں ہے' اور خصوصاً ان حضرات تابعین کے بارہ میں خوب غور وفکر کرلو جن کو امام حنیفہؒ نے روایت کے لیے پسند فرمایا ہے اور جن سے امام ابوحنیفہؒ شدت ورع وتقویٰ اور امت محمدیہ پر غایت شفقت کے ساتھ دین کے احکام کو لیتے ہیں۔ محدثین ائمہ مجتہدین کے رواۃ میں کوئی ایسا راوی نہیں ہے جو تعدیل وجرح سے بالاتر ہو اس لیے کہ وہ معصوم تو نہیں ہیں' لیکن علمائے شریعت محمدیہ کے امین ہیں۔ جنہوں نے جرح تا تعدیل کو مقدم کردیا ہے اس کے باوجود بھی اس میں جانب مخالف کا احتمال ہے تو اس پر عمل کیا گیا اور کیا جائے گا۔''

امام عبدالوہاب شعرانیؒ اس سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''ہدایت اور نیکی چاہنے والے تمام ائمہ اربعہ کا ادب واحترام رکھو اور جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے ان پر دھیان نہ دو سوائے اس صورت کے کہ جب ان کے خلاف واضح برہان اور دلیل موجود ہو۔ تم لوگوں کو برا کہنے اور نکتہ چینی کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو کہ دین کے ضروری اور لازمی امور میں مشغول رہو۔ میرے پاس ایک اچھا خاصا فہمی طالب علم ائمہ کے آپس کے اختلاف میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس کی سزا میں اس پر ایک عبرت ناک مصیبت پڑی اور اس کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ فرمایا کرتے تھے کہ : شخص ائمہ اربعہ کا اور خصوصی طور پر امام ابوحنیفہؒ کا گستاخ ہے اس کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا میر صاحبؒ نے مجھے تین چار مثالیں بھی دیں (جس کا ذکر یہاں نہ .

نہیں۔ظفر کان اللہ لہ) اور ثوری میں امام مالک اور ابن ابی ذئب میں احمد بن صالح اور شعبی میں امام احمد بن حنبل اور حارث محاسبی میں کیا پیش آیا ہے۔اگر تو ایسا کرے گا تو مجھے تیری تباہی کا ڈر ہے۔ یہ جماعت ائمہ اعلام کی جماعت ہے اور ان کے اقوال کے محامل ہیں۔ان کے آپس کے واقعات سے ہمیں اس طرح بچنا چاہیے جیسا کہ صحابہ کرام کے آپس کے واقعات سن کر ہم خاموش ہوتے ہیں۔اگرچہ بعض حفاظ نے امام ابوحنیفہ کے ادلہ پر جرح کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی جرح امام صاحب کے بعد اور نیچے کے رواۃ پر ہے اس لیے کہ میں نے تینوں مسندوں میں جتنی حدیثیں پڑھیں ہیں وہ صحیح ہیں اور اس لیے صحیح ہیں کہ اگر وہ صحیح نہ ہوتیں تو امام ابوحنیفہ ان سے استدلال نہ کرتے۔اور اگر امام ابوحنیفہ کے نیچے کے رواۃ میں کوئی کاذب یا متہم بالکذب ہے تو اس پر جرح وقدح کرنا اس روایت کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔امام ابوحنیفہ کا کسی حدیث سے استدلال کرنا اس حدیث کی صحت کے لیے کفایت کرتا ہے اس لیے کہ امام ابوحنیفہ کے علم واجتہاد میں وہ حدیث صحیح اور قابل احتجاج ہے۔اے میرے بھائی! امام ابوحنیفہ کے ادلہ میں جلدی نہ کرو جب تک مسانید ثلاثہ مذکورہ کا مطالعہ نہ کرو اور اس حدیث کو تم اس میں نہ پاؤ جس میں تمہیں ضعف کا شبہ ہے۔اور جس نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کے دلائل کو ضعیف کہا ہے تو وہ سن لے کہ وہ ان کے تلامذہ کے دلائل ہیں جو امام صاحب کے بعد ہوئے ہیں اور لوگوں نے حماقت سے ان دلائل کو امام ابوحنیفہ کے بیان کیے ہوئے دلائل جانا ہے۔اس جاہل نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ابوحنیفہ کا مذہب وہ ہے جو امام صاحب نے آخری وقت تک اس کو قائم رکھا ہے۔اور جس کو لوگوں نے امام ابوحنیفہ کے کلام سے خود سمجھا ہے وہ امام صاحب کا مذہب نہیں ہے۔یہ جہل اور حماقت اکثر طالبان علم میں ہے تو دوسروں کا کیا کہنا ہے؟

امام ابوحنیفہ نے خیار تابعین سے حدیث کو روایت کیا ہے جن میں کوئی کذاب نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے ساتھ تعصب کو چھوڑ دو اور امام صاحب کی برائی میں ان جاہلوں کی تقلید نہ کرو۔یہ جاہل امام ابوحنیفہ کے حالات اور ان کے علم واجتہاد کی رفعت و بلندی کو نہیں جانتے ہیں۔اگر تم لوگ امام ابوحنیفہ کے مذہب کا تتبع کرو جیسا کہ میں نے

کیا ہے تو تم جان لو گے کہ باقی مجتہدین کے مذاہب میں امام ابوحنیفہ کا مذہب سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آفتاب نصف النہار کی طرح امام ابوحنیفہ کے مذہب کا زیادہ صحیح ہونا تم پر ظاہر ہو جائے تو تم علم اور عمل میں اخلاص اور عقیدے کے ساتھ اہل اللہ اور بزرگانِ دین کے راستہ پر چلو۔" (میزان کبریٰ امام شعرانی ص [illegible])

امام شعرانیؒ کے اس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی مسانید کی تمام روایات صحیح ہیں اور ان مسانید پر حفاظ حدیث کی تصدیق ہے اور جن تابعین سے امام صاحبؒ نے احادیث کو روایت کیا ہے وہ تمام حفاظ محدثین تھے اور خیر القرون کے اہل علم تھے اور کوئی بھی ان میں سے کاذب یا متہم بالکذب نہ تھا۔ اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کے دلائل دوسرے تمام ائمہ سے زیادہ قوی اور مضبوط ہیں۔ اور یہ بھی پتہ چلا امام ابوحنیفہ کی شان میں گستاخی کرنے والا بالآخر ذلیل اور روسیاہ ہوتا ہے۔ اور امام صاحب کے دلائل پر جرح کرنے والا متعصب اور جاہل ہے۔

امام شعرانیؒ نے اس بارہ میں اپنی اس کتاب میں مزید لکھا ہے کہ۔

"میں نے جب مذاہب کے ادلہ میں "نہج المبین فی بیان ادلۃ المذاہب المجتہدین" نامی کتاب کی تالیف کی تو اس وقت میں نے بحمداللہ امام ابوحنیفہ کے اقوال اور ان کے اصحاب کے اقوال کا پورا تتبع کیا تھا۔ میں نے امام صاحبؒ اور آپ کے اصحاب کے اقوال میں جو قول بھی دیکھا اس کی مستند اور مستدل ہے یا تو قرآن حکیم کی آیت تھی یا حدیث یا کسی صحابہ کا اثر یا پھر قرآن حکیم یا حدیث یا اثر کا مفہوم اس کی سند ہے۔ یا ایسی ضعیف حدیث جس کے طرق متعدد ہیں یا صحیح قیاس جو صحیح اصل پر ہے یہ سب امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے اقوال کے دلائل ہیں۔ اور جو بھی اس کو خود معلوم کرنا چاہتا ہے تو وہ میری مذکورہ کتاب کا مطالعہ کرے۔ اور جس نے بھی تعصب کو چھوڑا ہے اور مجتہدین کے اقوال کو غور و فکر اور انصاف سے دیکھتا ہے تو اس کو معلوم ہو گا کہ ائمہ مجتہدین آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں اور ان پر اعتراض کرنے والا پانی کی سطح پر ان ستاروں کی عکس صورت دیکھتا ہے اور ان کی حقیقت کو نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ سب ائمہ مجتہدین کے ادب کی توفیق عطا فرمائے۔

"میں امام ابوحنیفہ کے مناقب لکھ رہا تھا اور ایک ایسا شخص میرے پاس آیا جس [illegible]

کا زعم تھا (جیسے آج کل بعض جہلا کو زعم ہے۔ ظفر) اور جب اس نے دیکھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں تو اس نے اپنی آستین سے کچھ اوراق نکالے اور مجھے کہا کہ ان اوراق کو پڑھ لیں۔ میں نے جب انہیں پڑھا تو اس میں امام ابوحنیفہؒ کے خلاف اعتراضات لکھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو کہا کیا تو بھی اس قابل ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے شخص پر اعتراض کر سکے۔ اس نے کہا "میں نے فخر الدین رازیؒ کے مؤلفات سے یہ اعتراضات لیے ہیں۔ میں نے کہا کہ رازیؒ کی امام ابوحنیفہؒ کے مقابلہ میں ایک طالب علم سے زیادہ حیثیت نہیں۔ یا رازی (امام ابوحنیفہؒ جیسے) سلطان اعظم کے سامنے رعایا کے ایک آدمی کی مانند ہے یا پھر جو نسبت ستارے کو آفتاب سے ہوتی ہے اسی طرح کی نسبت رازیؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہے۔ اور جس طرح اہل علم نے بادشاہ کے خلاف طعن کرنا رعایا پر حرام قرار دیا ہے' لیکن جب آفتاب کی طرح واضح دلیل موجود ہو' اسی طرح ائمہ دین پر طعن کرنا اور اعتراض کرنا مقلدین پر حرام ہے مگر جب نص صریح موجود ہو۔ اور میرے پاس بعض شوافع طلبہ آجایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کی بات کو نہیں سننا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو اس بات سے منع کیا لیکن وہ اس سے باز نہیں آتے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہی طلبہ ایک اونچی جگہ سے گرے اور پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کچھ عرصہ اسی مقہور حالت میں رہ کر آخر مر گئے اور مجھ سے ایک روز دعا کی درخواست کی' لیکن میں نے امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کے ادب کے مارے انکار کر دیا تھا۔ اور یاد رکھو کہ جس نے یہ کہا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں ایسا شخص امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں متعصب اور دین میں ہلاک ہونے والا ہے اور دین پر تہمت لگانے والا ہے' اور اپنی بات میں جھوٹ بولنے سے بھی نہیں بچتا ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت سے غافل ہے کہ " بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔" اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو بھی گلدستہ طاق نسیان بنا دیا ہے کہ زبان کے حصائد سے لوگ جہنم میں اوندھے منہ گرائے جائیں گے۔"

"امام ابوجعفر شیرازی شافعی متصل سند سے امام ابوحنیفہؒ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ امام

صاحبؒ نے فرمایا: اللہ کی قسم! لوگ مجھ پر جھوٹ بولتے ہیں کہ میں نے قیاس کو نص پر مقدم کر دیا ہے۔ اگر نص موجود ہے تو قیاس کی تو ضرورت ہی نہیں ہوتی ہے تو میں قیاس کرنے پر کیوں مجبور ہوتا ہوں۔ ہم اس وقت قیاس سے کام لیتے ہیں جب نص موجود نہیں ہوتی ہے اور شدید ضرورت کے وقت قیاس کرتے ہیں۔ ہم پہلے اللہ کی کتاب میں اور اس کے بعد حدیث رسول میں اور پھر صحابہ کرامؓ کے آثار میں غور و فکر کرتے ہیں اور دلیل کو تلاش کرتے ہیں۔ اگر ان میں کسی ایک میں بھی دلیل نہیں ملتی ہے تو پھر ہم علت جامعہ کی وجہ سے نص کے منطوق پر نص کے مسکوت عنہ کو قیاس کرتے ہیں اور ایک حکم کو دوسرے حکم پر علت کے اتحاد اور جامع کے اشتراک سے قیاس کرتے ہیں۔''

''ابو مطیع بلخیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ اگر آپ کی ایک رائے ہے اور ابو بکرؓ کی دوسری رائے ہے یا آپ کی اور عمرؓ کی رائے میں اختلاف ہے تو کیا آپ اپنی رائے کو ابو بکرؓ اور عمرؓ کی رائے پر مقدم رکھیں گے یا ابو بکرؓ اور عمرؓ کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم کریں گے؟ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا: ''میں ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور تمام صحابہؓ کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم کرتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں اپنی رائے کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو مطیعؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز کوفہ کی جامع مسجد میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سفیان ثوریؒ، مقاتلؒ، ابن حیانؒ، حماد بن سلمہؒ، جعفر صادقؒ وغیرہ حضرات فقہاء امام ابو حنیفہؒ کے پاس تشریف لائے اور آپ سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو پتہ چلا ہے کہ آپ دین میں زیادہ تر قیاس کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے ان سے صبح سے لے کر زوال تک بحث کی اور اپنا مسلک ان کے سامنے واضح کیا اور پڑھ کر سنایا اور فرمایا: ''میں پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں اس کے بعد سنت رسول کو لیتا ہوں اس کے بعد صحابہ کرامؓ کے آثار کو لیتا ہوں اور صحابہ کرامؓ کے ان آثار کو مقدم کرتا ہوں جن پر صحابہؓ کو اتفاق ہے۔ اور جب ان میں سے کوئی دلیل میرے پاس نہ ہو تو پھر قیاس کرتا ہوں۔ امام صاحبؒ کے اس موقف کو سن کر یہ سب حضرات اٹھے اور آپ کے ہاتھوں اور گھٹنوں کو بوسہ دیا (وقبلوا ایدہ ورکبتہ) اور فرمایا: آپ علماء کے سردار ہیں۔ (انت سید العلماء) اور ہم نے آپ سے معلوم کیے بغیر جو آپ کے بارہ

میں پہلے غلطی کی ہے اس کو معاف کر دیجئے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ حضرات کو معاف فرمائے سفیان ثوری نے پہلے اگر امام ابوحنیفہ کے بارہ میں کچھ کہا بھی تھا تو اب اپنی غلطی مان لی اور معذرت چاہتی۔ اور ان حضرات نے امام ابوحنیفہ کی سیادت علم کا اعتراف کر لیا۔ شقیق بلخی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اعلم الناس' اعبد الناس اور اکرم الناس" ہیں۔ امام ابوحنیفہ دین میں احتیاط کرنے والے اور دین میں رائے اور قیاس سے سب سے زیادہ احتراز کرنے والے ہیں۔ آپ کی مجلس میں ایک ایک مسئلہ پر پوری طرح بحث ہوتی تھی اور جب اہل مجلس کو اتفاق ہو جاتا تھا کہ وہ مسئلہ شریعت اسلامیہ کے موافق اور مطابق ہے تو اس کے بعد امام ابویوسف کو آپ اس کے لکھنے کو فرماتے تھے۔"

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں جب کوفہ پہنچا ہوں اور وہاں کے علماء سے دریافت کیا کہ تمہارے شہر میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اور جب پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ متقی اور عابد و زاہد کون ہے؟ اور جب پوچھا کہ علم میں سب سے زیادہ مشغول رہنے والا کون ہے؟ تو وہ لوگ ہر ایک سوال کا یہی جواب دیتے تھے کہ امام ابو حنیفہ سب سے بڑے عالم سب سے زیادہ زاہد و عبادت گذار اور سب سے زیادہ علم دین میں مشغول رہنے والے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو امام ابوحنیفہ جیسے امام اعظمؒ پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے علم و جلالت' ورع و زہد اور عفت و عبادت کی کثرت اور اللہ تعالیٰ عزوجل کے حضور مراقبہ پر تمام لوگوں کو اتفاق ہے۔ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرنے والا اللہ کی قسم! بصیرت میں اندھا ہے۔ جس نے بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کی تحقیق کی ہے اس نے دین میں امام صاحب کو بڑا محتاط پایا ہے اور اس نے جان لیا ہے کہ امام صاحب دین میں مذموم رائے سے پاک اور بیزار ہیں۔ اور جس نے ایسا کہا ہے وہ اپنے تعصب اور خطا کا رہے انمہ مدی پر انکار کرنے والا جاہل اور متعصب ہے۔" (عبدالوہاب شعرانی میزان کبریٰ ص [illegible])

امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب کا یہ اقتباس ان لوگوں کے لئے غور و فکر کا سامان مہیا کرتا ہے جو امام صاحب اور ان کے مسلک کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور ان پر قلت حدیث کا الزام عائد کرتے ہیں۔ امام شعرانی شافعی ہونے کے باوجود امام

ابوحنیفہؒ کا ان متعصب اور جاہل لوگوں کے اعتراضات کا دفاع فرماتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی امام ابوحنیفہؒ کی ایک بہت بڑی کرامت ہے کہ ان کی تحسین و تعریف، فضائل ومناقب اور ان پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں ان لوگوں نے کتابیں لکھیں جو غیر حنفی تھے۔ چنانچہ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی نے عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان، حافظ ابن عبدالبر المالکی نے الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ، علامہ ابن حجر مکی شافعی کی کتاب تبییض الصحیفۃ فی مناقب ابی حنیفہؒ، نے امام ابوحنیفہؒ کے فضائل ومناقب پر مستقل کتابیں لکھیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ بڑے بڑے محدثین نے آپ کے اقوال پر فتویٰ دیا اور آپ کے علم حدیث کو تسلیم کیا لیکن آج کل کے بعض جہلاء جو حدیث کی کتاب صحیح طریقہ سے پڑھ بھی سکتے اور اصول حدیث سے تو کلیۃً ناواقف ہیں، وہ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کو حدیث نہیں آتی تھی بلکہ وہ یتیم فی الحدیث تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

اہل گلشن کے لیے بھی باب گلشن بند ہے
اس قدر کم ظرف کوئی باغباں دیکھا نہیں

محدث اور فقیہ کا فرق:

اصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ کو چونکہ فقہاء کے زمرہ میں شمار کیا ہے اس وجہ سے یہ جہلاء لوگوں کو یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ فقیہ تھے محدث نہیں تھے۔ فقیہ اور محدث کے فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص صرف قرآن کے الفاظ کا حافظ ہے اور دوسرا شخص قرآن حکیم کے الفاظ کا حافظ بھی ہے اور معانی اور اس کی تفسیر سے بھی اس کو پوری آشنائی ہے۔ اب جو شخص صرف قرآن کے الفاظ کا حافظ ہے اس کو صرف حافظ کہتے ہیں اور جو قرآن حکیم کے معانی اور اس کی تفسیر بھی جانتا ہے اس کو ''عالم'' کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی احمق یہ کہے کہ فلاں شخص عالم ہے لیکن قرآن حکیم کے الفاظ سے ناواقف ہے تو لوگ اس کی اس بات کو مضحکہ خیز کہیں گے کیونکہ عالم ہوتا ہی وہ ہے جو قرآن حکیم سے واقف ہو۔ بالکل اسی طرح ایک محدث صرف حدیث کے الفاظ اور اس کی سند کا حافظ ہوتا ہے۔ حدیث کے معانی سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن ایک فقیہ حدیث کے الفاظ کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے

معانی کا بھی حافظ ہوتا ہے اور اس کے معانی کی گہرائی میں ڈوب کر مختلف مسائل کا استنباط کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل فتویٰ فقہاء ہوتے ہیں نہ کہ محدثین۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبرؒ نے عبیداللہ عمروؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ:

''میں امام اعمشؒ (جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے استاذ حدیث تھے اور ایک بہت بڑے محدث تھے) کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے ان سے آکر ایک مسئلہ پوچھا' لیکن امام اعمشؒ اس کو وہ مسئلہ نہ بتا سکے اور حیران ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ مجلس میں امام ابوحنیفہؒ بھی موجود تھے۔ آخر امام اعمشؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے فرمایا کہ اس شخص کو یہ مسئلہ بتائیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے سائل کو مسئلہ بتا دیا جس سے اس کی تشفی ہوگئی۔ امام اعمشؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے جواب پر تعجب ہوا اور فرمایا ''یہ مسئلہ آپ نے کس حدیث سے استنباط کیا ہے؟'' امام ابوحنیفہؒ نے کہا ''**حدثنا اعمش عن فلان عن فلان** ''یعنی امام اعمشؒ ہی کی بیان کردہ حدیث سنائی۔ یہ حدیث سن کر امام اعمشؒ نے فرمایا ''دراصل آپ لوگ اطباء ہیں اور ہم محض عطار ہیں۔''

(**انتم الاطباء و نحن الصیادلہ**)(جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۳۱)

امام اعمشؒ نے اپنے اس بیان میں محدث اور فقیہ کے فرق کو بیان فرما دیا۔ محدث عطار ہوتا ہے جو مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اپنی دوکان پر سجائے رکھتا ہے' لیکن اس کو ان جڑی بوٹیوں کے خواص اور ان کی تاثیرات کا علم نہیں ہوتا۔ ان کو صرف ایک طبیب ہی جان سکتا ہے اور وہ ان کو ملا کر ایک ایسا نسخہ تیار کرتا ہے جس سے مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ بیماری کا نسخہ لوگ طبیب ہی سے حاصل کرتے ہیں البتہ ان میں جو جڑی بوٹیاں استعمال ہوتی ہیں وہ ایک عطار کی دوکان سے مہیا ہوتی ہیں' لیکن طبیب ان جڑی بوٹیوں سے ناآشنا نہیں ہوتا۔ اگر ناآشنا ہوتو وہ نسخہ ترتیب ہی نہیں دے سکتا۔ حکیم الامت مولانا تھانویؒ فقہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ وہ ہے کیا؟ فرمایا:

''کتابوں کو پڑھ لینے کا نام فقہ نہیں ہے۔ فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے۔ اس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے اور اس کے نور کو حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کرلیں' وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے رہو مگر چونکہ دین کی سمجھ نہیں رہی' تم فقیہ نہیں ہو سکتے۔ اور وہ نور

فقہ طاعات سے بڑھتا ہے اور معاصی سے سلب ہو جاتا ہے۔ جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ صرف کتابوں کا فقیہ ہے حقیقی فقیہ نہیں اور نہ ہی اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو فقیہ کے واسطے حدیث میں مذکور ہے' اس لیے خاتمہ سے اطمینان کسی حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہو سکتا۔'' (التبلیغ' الحج المبرور جلد ۲ ص ۱۳۸)

یہیں سے حضرت تھانویؒ کی زبان سے محدث اور فقیہ کا فرق بھی سن لیجئے۔ فرمایا

''محدثین کا مطمح نظر روایت ہوتی ہے اور فقہاء درایت سے کام لیتے ہیں' جیسے غنا محدثین کے نزدیک بلا مزامیر جائز ہے کیونکہ حدیث میں لفظ ''معازف'' کا آیا ہے۔ اور فقہاء کے نزدیک بلا مزامیر بھی جائز نہیں کیونکہ وہ علت کو سمجھتے ہیں' اور وہ (علت) خوف فتنہ ہے' اور وہ جیسے مزامیر میں ہے صرف غناء میں بھی موجود ہے۔ محدثین نص سے تجاوز نہیں کرتے اور فقہاء اصل منشاء حکم کو معلوم کر کے دیگر مواقع تک حکم کو متعدی کرتے ہیں۔'' (حسن العزیز جلد ۴ ص ۳۴۵)

اسی وجہ سے میاں سید نذیر حسین صاحبؒ اپنی کتاب میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارہ میں فرماتے ہیں:

''ان (یعنی امام ابو حنیفہؒ) کا مجتہد ہونا اور متبع سنت ہونا اور متقی اور پرہیز گار ہونا کافی ہے ان کے فضائل میں۔'' (معیار الحق ص ۵)

اس عبارت میں حضرت میاں صاحبؒ نے امام صاحبؒ کو مجتہد تسلیم کیا ہے اور مجتہد وہ ہوتا ہے جس کی کم از کم تین لاکھ احادیث پر نظر ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شخص مجتہد ہے وہ نہ صرف ہزاروں بلکہ لاکھوں احادیث کا علم رکھتا ہے ورنہ وہ مجتہد ہو ہی نہیں سکتا۔ تو ایک طرف کسی شخص کو مجتہد تسلیم کرنا اور دوسری طرف اس کو علم حدیث میں یتیم ثابت کرنا' جہالت اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر آپ حدیث سے ناواقف ہوتے یا قلیل الحدیث ہوتے تو عبداللہ بن مبارک محدث امام ابو حنیفہؒ کی رائے کو ''تفسیر الحدیث'' نہ کہتا۔ (ذیل الجواہر جلد ۲ ص ۴۶۰)

اور نہ ہی اتنے بڑے بڑے محدثین آپ کی اتباع اور تقلید کرتے۔

یہاں پر یہ بات ذہن میں رہے کہ مجتہد وہ ہوتا ہے جو فقیہ ہو غیر فقیہ مجتہد نہیں ہوتا۔ اور فقہ اور فہم میں بھی فرق ہے جس کو حافظ ابن قیمؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

''حدیث اور کتاب میں فقہ خاص ہے اور فہم عام ہے۔ متکلم کی مراد کو اس کے کلام سے

سمجھ لینے کا نام فقہ ہے اور وضع سے لغت میں جو معنی مفہوم ہوتا ہے فقہ اس پر قدر زائد ہے۔ اور متکلم کے کلام سے اس کی مراد سمجھنے میں لوگوں کے مراتب متفاوت ہیں اور اس تفاوت کی وجہ سے فقہ اور علم میں لوگوں کے مراتب متفاوت ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے فہم اور فقہ کا رتبہ بہت اعلیٰ تھا اس لیے وہ کسی امر کے اذن اور اباحت پر وقت سے استدلال کرتے تھے۔ چونکہ وہ امر ایسے وقت کیا جا رہا ہے کہ وہ زمانہ وحی کا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس امر کے کرنے پر انکار نہیں فرمایا اس لیے وہ امر مباح اور جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ کا یہ استدلال ایسی مراد پر استدلال ہے کہ اس امر کو مباح سمجھا گیا کیونکہ حق تعالیٰ شانہ باطل پر ثابت نہیں رکھتا ہے۔ اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانا کہ آپ کو اللہ کبھی رسوا نہ کرے گا اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں مہمانوں کی ضیافت کا حق ادا کرتے ہیں اور حق بجانب امور میں آپ ہمیشہ مدد کرتے ہیں اور جس کی یہ شان ہے اس کو اللہ عزیز و رحیم اور احکم الحاکمین کبھی رسوا اور شیطان اس پر مسلط نہیں کرے گا۔ سیدہ خدیجہؓ کا یہ استدلال حضورؐ کی نبوت پر حضورؐ کی بعثت سے پیشتر ہے اور سیدہ خدیجہؓ نے یوں سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و حکمت محسنین سے اجر کو ضائع نہیں کرتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے مذکورہ شمائل معانی اور فضائل کو سامنے رکھ کر سیدہ خدیجہؓ نے حضورؐ کی صحت نبوت پر استدلال کیا ہے اور اس کی مراد کو سمجھا ہے۔ صحابہ کرامؓ سب سے زیادہ حضورؐ کی مراد کو جانتے تھے۔ آپ کی اتباع کرتے تھے اور آپ کی مراد اور مقصود کی معرفت کے درپے رہتے تھے متکلم کی مراد کا علم کبھی عموم لفظ سے ہوتا ہے اور کبھی عموم علت سے۔ ارباب الفاظ صرف عموم لفظ سے متکلم کی مراد کو سمجھتے ہیں اور ارباب معانی فہم و تدبر سے اور عموم علت سے بھی متکلم کی مراد کو سمجھ لیتے ہیں۔"

([illegible])

قرآن و حدیث میں فقہ کی فضیلت

فقیہ چونکہ قرآن و حدیث کے الفاظ کی گہرائی کا غواص اور اس کے معانی کا متلاشی ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں فقیہ اور فقہ دونوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (توبہ)

''اور ایسے تو نہیں کہ جہاد میں سب مسلمان نکل کھڑے ہوں تو کیوں نہ ہر طبقہ سے ایک گروہ نکلے جو دین میں تفقہ پیدا کریں (یعنی فقہ سنت سیکھیں) اور پھر جب وہ اپنے لوگوں کے پاس پہنچیں تو انہیں بتائیں تا کہ وہ بچیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امت میں ایک گروہ فقہاء کا ضرور ہونا چاہیے تا کہ وہ دوسروں کو دین کی باتیں بتائے۔ اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا کہ

واذا جاءھم امر من الامن والخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم۔ (نساء ۸۳)

''اور ان کے پاس جب امن اور خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اسے اللہ کے رسول کی طرف اور اپنے اولی الامر کی طرف لوٹا دیتے تو جو لوگ ان میں اہل استنباط ہیں وہ بات سمجھ پاتے۔''

اس آیت کی تفسیر میں امام فخر الدین رازیؒ نے کئی مسائل کا استنباط کیا ہے

- بعض احکام حوادث ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا حکم نصوص میں نظر نہیں آتا۔ ان کا حکم استنباط سے جانا جاتا ہے۔
- اس آیت سے استنباط کا حجت ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔
- تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ عامی پر علماء کی تقلید احکام حوادث میں واجب ہے۔

جب قرآن حکیم سے یہ ثابت ہو گیا کہ تفقہ فی الدین نہایت ضروری ہے اور کہا کہ ایک جماعت تحصیل فقہ میں لگی رہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ فقہ کتاب وسنت سے الگ نہیں بلکہ فقہ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی گہرائی میں لپٹے ہوئے مضامین کو تلاش کرنا اور ان کا سامنے آنا فقہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں مختلف مقامات میں فقہ کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مختلف احادیث میں فقیہ اور فقہ کی تعریف وتحسین فرمائی ہے۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

(ترمذی جلد ۲ ص ۸۹، مسلم جلد ۱ ص ۴۴۱، دارمی جلد ۱ ص ۸۵)

''حق تعالیٰ شانہ جس شخص سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین میں فقیہ بنا دیتے ہیں۔''

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی نے لکھا ہے

''علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے مگر فقہاء کو معلوم ہے کہ خدا کو ان کے ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے:''من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین ''جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا کرتے ہیں۔''

''امام محمد کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا۔ پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا ''اے محمد! مانگو کیا مانگتے ہو؟'' میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔ جواب ملا کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے۔ ہم نے تم کو فقہ اسی لیے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا' لیکن اس سے مامون العاقبت ہونا لازم نہیں آتا یعنی یہ نہ سمجھ جائے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں' اس لیے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ اگر حق تعالیٰ فقیہ کو عذاب دینا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کر لیں گے۔''

(تسہیل تصحیح المعمور جلد ۲ ص ۱۳۸)

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا اور یہ حدیث بھی سیدنا عبداللہ بن عباسؓ ہی سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد

(ترمذی جلد ۲ ص ۹۲' ابن ماجہ ص ۲۲)

''ایک فقیہ ہزار شیطانوں پر بھاری ہوتا ہے۔''

سیدنا ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا

ان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین' واذا اتوکم فاستوصوا بھم خیراً۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۸۹' ابن ماجہ ص ۲۲)

''بے شک اطراف عالم سے تمہارے پاس لوگ آئیں گے تاکہ وہ دین میں تفقہ

حاصل کریں اور جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم انہیں خیر کی نصیحت کرنا۔"

بخاری میں جریج راہب کا واقعہ مذکور ہے جس میں ہے کہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھا کہ اس کی والدہ نے اسے تین دفعہ آواز دی' اس نے والدہ کو کوئی جواب نہ دیا اور اپنی عبادت میں مصروف رہا۔ ماں نے اسے بددعا دی۔ وہ عبادت میں لگا رہا اور والدہ کی آواز کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو كان جريج راهب فقيهاً عالماً لعلم ان اجابة امه خير من عبادة ربه۔

(بخاری جلد ۱ ص ۱۶۱)

"اگر جریج راہب فقیہ عالم ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ ماں کی آواز کا جواب دینا خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے سے بہتر ہے۔"

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے پتہ چلا کہ ہر عالم فقیہ نہیں ہوتا اور جو فقیہ ہوتا ہے وہ صحیح معنوں میں عالم ہوتا ہے کیونکہ وہ کلام کی گہرائی میں پہنچ کر اس کے معانی کو تلاش کرتا ہے۔

سیدنا جبیر بن مطعمؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

نضر الله عبداً سمع مقالتى فوعاها ثم اداها الىٰ من لم يسمعها' فرب حامل فقه لا فقه له ورب حامل فقه الىٰ من هو افقه منه۔

(دارمی جلد ۱ ص ۷۵' ابن ماجه ص ۳۱)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے میری بات سنی اور اس کو خوب یاد کیا پھر وہ بات ان لوگوں کو سنائی جنہوں نے وہ بات مجھ سے نہیں سنی تھی کیونکہ بسا اوقات حامل فقہ (راوی حدیث) تو ہیں لیکن انہیں فقاہت حاصل نہیں ہوتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حامل فقہ اس درجہ کا فقیہ نہیں ہوتا' اور وہ روایت اس شخص تک پہنچا دے گا جو اس سے فقیہ تر ہوگا۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کی روایت کا اصل مقصد ان سے فقہ حاصل کرنا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ راوی حدیث کے پاس وہ حدیث ہو جس میں فقہ ہو اور خود وہ راوی صاحب فقہ نہ ہو۔ اس لیے وہ حدیث دوسروں

کو پہنچا دے تاکہ وہ اس کی فقہ سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے بھی اس سے استفادہ کریں۔ اور اگر وہ خود فقیہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ فقیہ ہو اور وہ اس حدیث سے زیادہ مسائل استنباط کر سکے جس سے دوسروں کو زیادہ فائدہ ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ تفقہ فی الدین ایک بہت بڑی خوبی ہے اور یہ خوبی حق تعالیٰ شانہٗ خاص خاص لوگوں کو عطا فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو خصلتیں ایسی ہیں جو کسی منافق میں جمع نہیں ہو پاتیں۔ ایک حسن سیرت اور دوسری تفقہ فی الدین۔ (**حسن سمت ولا فقه فی الدین**) (ترمذی جلد ۱ ص ۹۳)

اور شاید اسی وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے لیے جو دعا فرمائی وہ روایت حدیث کی نہیں تھی بلکہ تفقہ فی الدین کی تھی۔ فرمایا:

اللهم فقهه فی الدین و علم التاویل۔

(بخاری جلد ۱ ص، مسند احمد جلد ۱ ص ۲۲۸)

''اے اللہ! (ابن عباسؓ کو) تفقہ فی الدین اور علم تفسیر عطا فرما۔''

سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی شخص نے مجھ سے مسئلہ پوچھا تو میں نے جان لیا کہ وہ فقیہ ہے یا غیر فقیہ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۳۱۲)

فقہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر سیدنا عمر بن الخطابؓ فرمایا کرتے تھے

تفقهوا قبل ان تسودوا قال ابو عبدالله و بعد ان تسودوا۔

(بخاری جلد ۱ ص ۱۷)

''تم سردار بننے سے قبل فقہ حاصل کرو'' اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ سردار بننے کے بعد بھی فقہ کو حاصل کرو۔

ان تمام اقتباسات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں فقہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور جو لوگ فقہ کے منکر ہیں وہ صحیح معنوں میں قرآن و حدیث کو نہیں سمجھ سکتے اور روایت حدیث کا اصل مقصد بھی تفقہ فی الدین ہی ہے۔

لفظ اہل حدیث کا غلط استعمال:

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک امام ابوحنیفہ متقی تھے، پرہیزگار تھے، فقیہ تھے، اہل ورع میں سے تھے، مجتہد تھے، سب کچھ تھے لیکن علم حدیث سے

ناواقف تھے اگرچہ بڑے بڑے محدثین آپ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے لیکن خود امام ابوحنیفہ حدیث نہ جانتے تھے اور بقول حضرت مولانا داؤد غزنویؒ اگر کوئی بڑا احسان کرے صرف اتنا تسلیم کرتا ہے کہ امام صاحبؒ کو صرف سترہ احادیث آتی تھیں۔ یحییٰ بن سعید القطانؒ سے کون سا صاحب علم ہے جو واقف نہیں۔ ان کے بارہ میں علی بن المدینیؒ فرماتے ہیں "ما رایت احداً اعلم بالرجال منہ" (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۷۵) میں نے اسماء الرجال میں ان سے زیادہ عالم کسی کو نہیں دیکھا' لیکن حافظ ذہبیؒ ہی فرماتے ہیں کہ

کان یحییٰ القطان یفتی بقول ابی حنیفہ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲)

"یحییٰ بن سعید القطانؒ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔"

پھر یحییٰ بن معینؒ جو عبداللہ بن مبارکؒ، یحییٰ بن ابی زائدہؒ اور معتمر بن سلیمانؒ جیسے ائمہ حدیث کے شاگرد اور امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابی داؤدؒ اور امام ابوزرعہؒ جیسے محدثین کے استاذ تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ ان کے بارہ میں فرماتے تھے کہ "یحییٰ بن معینؒ ہم میں سب سے زیادہ علم اسماء الرجال کے ماہر تھے۔" اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو کسی صاحب علم کے سامنے حقیر نہیں سمجھا سوائے یحییٰ بن معین کے۔ ان یحییٰ بن معینؒ کے بارہ میں کتابوں میں مرقوم ہے کہ وہ فقہی لحاظ سے حنفی تھے اور امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ اسی طرح کے اور بہت سے علم حدیث کے جہابذہ فقہی پہلو سے حنفی المذہب تھے اور کیا وہ بھی اہل حدیث اور محدثین میں شمار نہ ہوتے تھے؟

لفظ اہل حدیث کا آج کل یہ کتنا غلط استعمال ہو رہا ہے کہ جو لوگ علم حدیث کی شدبد سے بھی ناواقف ہیں وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہہ رہے۔ اور بتایا یہ جاتا ہے کہ ہم چونکہ حدیث پر عمل کرتے ہیں اس وجہ سے ہم اہل حدیث ہیں' حالانکہ آج تک کسی نے حدیث پر عمل کرنے والوں کو اہل حدیث نہیں کہا۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہے جو حدیث پر عمل نہیں کرتا۔ کیا شوافع حدیث پر عمل نہیں کرتے؟ کیا امام مالکؒ کے پیروکار حدیث پر عمل نہیں کرتے؟ کیا سعودی عرب کے حنابلہ جو حرم مکی اور مسجد نبویؐ میں بیس تراویح پڑھتے ہیں' بسم اللہ بالجہر کے قائل نہیں' ایک وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ وہ حدیث پر عمل نہیں کرتے؟ حدیث پر عمل کرنے والے کو "اہل حدیث" کہنا یہ کوئی جدید اصطلاح ہے

کیونکہ قدیم اصطلاح میں تو اہل حدیث ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو علم حدیث میں ماہر ہوتے تھے نہ کہ حدیث پر عمل کرنے والوں کو چنانچہ حافظ وزیر یمانی لکھتے ہیں:

ومن المعلوم ان اهل الحديث اسم لمن عنى به وانقطع فى طلبه فهولاء هم اهل الحديث من اى مذهب كانوا۔

(الروض الباسم جلد ۱ ص ۱۲۲)

''یہ بات مسلمہ ہے کہ اہل حدیث اس طبقہ کا نام ہے جو اس فن کے درپے ہو اور ہمہ وقت اس کی طلب میں منہمک اور مشغول رہے۔ ایسے سب لوگ اہل الحدیث ہیں اگرچہ وہ کسی مسلک اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

لیکن آج کل اہل حدیث محدثین کا طبقہ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی نہیں کرتے' صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم حدیث پر عمل کرتے ہیں' ان میں پڑھے لکھے بھی ہیں اور چٹے ان پڑھ بھی ہیں جو قرآن حکیم ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے' حدیث کا جاننا اور سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ان حضرات نے حریت فکر کے نام سے ایک تحریک جاری کی اور ائمہ اربعہ کی تقلید کو شرک قرار دے کر ایک مستقل مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ مولانا محمد شاہ صاحب شاہجہانپوری فرماتے ہیں

''پچھلے زمانہ میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں' مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ ان کا نام ابھی تھوڑے ہی دنوں سے سنا ہے۔ اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی یا موحد کہتے ہیں' مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے۔'' (الارشاد الی سبیل الرشاد ص ۱۳)

مختصر یہ کہ آزادی فکر کی جو تحریک چلائی گئی تھی اس سے بڑے بڑے شگوفے نکلنے شروع ہوئے۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ یہ فکر و نظر کی آزادی صرف علماء تک نہ رہی بلکہ اس کا دائرہ غیر علماء تک بھی پھیل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ائمہ مجتہدین کے دامن تک دست درازیاں ہونے لگیں۔ ان کے اجتہاد میں کیڑے نکالے جانے لگے اور یہاں تک کہا جانے لگا کہ امام ابوحنیفہؒ کا دامن حدیث سے خالی تھا۔ ان کے قیاسات خلاف اسلام تھے اور ان کے مقلدین محمدی اسلام کے

قائل نہیں بلکہ حنفی اسلام کو مانتے ہیں۔ گویا۔ امام ابوحنیفہؒ کو (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل جانا جانے لگا۔ یہ روش بڑی غلط تھی اور اس کے نتائج بڑے زہر آلود تھے۔ اس بات کو سب سے پہلے مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے محسوس کیا۔ کیونکہ فکر و نظر کی اس آزادی کی وجہ سے وہ اس سے پہلے اپنے دوست مرزا غلام احمد قادیانی کا انجام دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ لاہور میں ایک مجلس اہل حدیث قائم ہوئی جس کا صدر مولانا محمد حسین بٹالویؒ کو نامزد کیا گیا۔ انہوں نے صدر انجمن کی حیثیت سے یہ تجویز پیش کی کہ مجلس اہل حدیث کے ساتھ بریکٹ میں حنفیہ کا لفظ بڑھا دیا جائے۔ (ماھنامہ الھدیٰ' ماہ ذی قعد ١٣٢٧ھ)

چنانچہ مولانا محمد حسین بٹالویؒ لکھتے ہیں:

''صدر انجمن خاکسار چونکہ باوجود اہل حدیث ہونے کے حنفی بھی کہلانا جائز رکھتا تھا' لہٰذا اس امر کا اظہار اپنے ماہوار رسالہ (اشاعۃ السنہ) اور سراج الاخبار کے ذریعہ کر دیا۔ یہ امر ہمارے روحانی فرزند (مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ) نوجوانوں کو جو صرف اہل حدیث کہلاتے ہیں اور وہ حنفی وغیرہ کہلوانا پسند نہیں کرتے' ناگوار گذرا اور انہوں نے خاکسار کے اس اظہار کے خلاف اپنے اخبار اہل حدیث میں یہ نوٹ شائع کرا دیا۔''

مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے کی بات کا مطلب یہ تھا کہ تقلید کی بندش کی نہ کسی حد تک ہونی چاہیے فکر و نظر کی یہ آزادی جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کی دینی تباہی کا باعث بنی اس طرح دوسرے علماء کی بربادی کا باعث نہ بن جائے' لیکن مولانا ثناء اللہؒ نے ان کی اس بات کی مخالفت کی' لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مولوی عبداللہ چکڑالویؒ اہل حدیث امام مسجد چینیاں' لاہور نے اسی ترک تقلید کے باعث انکار حدیث کر دیا تو پھر مولانا ثناء اللہ صاحبؒ میں بھی فکری تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ اپنی اس فکری تبدیلی کو مولوی عبداللہ چکڑالوی کے بارہ میں ان الفاظ کا جامہ پہنایا۔

''جب انہوں نے دیکھا کہ اب لوگ فقہ کی بندش سے تقریباً آزاد ہو گئے ہیں تو انہوں نے احادیث پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ اور جب کچھ دنوں میں یہ مرحلہ بھی طے ہو جانے گا تو وہ جمع و تدوین قرآن میں رخنے نکالنا شروع کر دیں گے۔ اور جب تک لوگوں کو اس عیاری کا پتہ نہ چلے گا وہ عوام اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ کو اتنا مسموم کر چکے ہوں گے کہ اس کا تدارک کسی سے نہ ہو سکے گا۔'' (فتاویٰ ثنائیہ حصہ ۱ ص ۲۸۰)

نواب صدیق حسن خان بھوپالی بھی ایک علمی شخصیت تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ترک تقلید نے لوگوں کے مزاجوں کو خراب اور زبانوں کو دراز کر دیا ہے اور چند فروعی اختلافات نے ائمہ مجتہدین کے بارہ میں بعض لوگ زبان درازی کر رہے ہیں اور انہی فروعی مسائل کو سارا دین سمجھنے لگے ہیں اور مقلدین کو برا سمجھا جانے لگا ہے اور عبدالحق بناری اور ابوالحسن محی الدین جیسے نومسلموں نے (جو اصلاً ہندو تھے) مسلمانوں کی صفوں میں تشتت و انتشار پھیلانا شروع کر دیا ہے اور تحریک حریت فکر غلط شاہراہ پر چل نکلی ہے تو انہوں نے بڑی حسرت اور نہایت افسوس سے لکھا:

''اس زمانہ میں ایک شہرت پسند اور ریاکار فرقہ زمین سے نکلا ہے۔ (نواب صاحبؒ نے "نبت" کا لفظ استعمال کیا ہے) جو ہر قسم کی خامیوں اور نقائص کے باوجود اپنے لیے قرآن و حدیث کا علم اور اس پر عامل ہونے کا دعویدار ہے حالانکہ اہل علم و عمل اور اہل عرفان سے ان کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ فرقہ ''علوم آلیہ'' سے جاہل اور ناآشنا ہے جن سے آشنائی ایک طالب حدیث کے لیے اس فن کی تکمیل کے لیے نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ فرقہ ''علوم عالیہ'' سے بھی جاہل ہے جن کے بغیر سنت کی شاہراہ پر چلنے کی کوئی گنجائش نہیں مثلاً صرف نحو لغت معانی اور بیان چہ جائیکہ دوسرے کمالات ان میں پائے جائیں   اسی لیے تم ان لوگوں کو دیکھو گے کہ یہ محض الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفا کرتے ہیں اور حدیث کے فہم اور اس کے معانی و مفاہیم میں غور و فکر کرنے کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ محض الفاظ حدیث کو نقل کر لینا ہی کافی ہے حالانکہ یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے کیونکہ حدیث سے مقصود تو حدیث کے فہم اور اس کے معانی میں غور و فکر کرنا ہے۔ نہ صرف الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفا کر لینا۔ پس سب سے پہلے تو حدیث میں اس کا سننا ہے پھر اس کو زبانی یاد رکھنا ہے پھر اس کو سمجھنا ہے پھر اس پر عمل کرنا ہے اور پھر اس کی نشر و اشاعت ہے۔ اور ان لوگوں نے فقط حدیث کو سن لینے اور اس کی نشر و اشاعت پر اکتفا کر لیا ہے حدیث کے یاد کرنے اور سمجھنے کے بغیر۔ حالانکہ اس پر

اکتفاء و اختصار کر لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پس حدیث اس زمانہ میں بچوں کو پڑھنا پڑھانا رہ گیا ہے نہ کہ اصحاب یقین کا، وہ اپنی غفلتوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

امام غزالی نے ابو سفیانؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ زائد بن احمد کی مجلس میں حاضر ہوئے تو سب سے پہلی حدیث جو ان سے سنی وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا کہ آدمی کے اسلام کی اچھائی اور اس کے حسن میں سے ہے اس کا بے کار کاموں کو چھوڑ دینا۔ آپ یہ حدیث سن کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: مجھے یہی حدیث کافی ہے۔ جب میں اس سے فارغ ہوں گا تو دوسری حدیث سنوں گا۔ عقل مند لوگوں کا سماع ایسا ہوتا تھا۔ رہے یہ جاہل تو ان کا حدیث کے ساتھ بڑے سے بڑا سلوک صرف یہ ہے کہ یہ لوگ چند ایسے مسائل کو اختیار کر لیتے ہیں جو عبادات کے اندر مجتہدین اور محدثین کے مابین اختلافی ہیں (جیسے رفع الیدین' آمین بالجہر' فاتحہ خلف الامام وغیرہ۔ مترجم) معاملات سے متعلق مسائل جو کہ روز مرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور ان کے سارے کا سارا اتباع حدیث فقط یہ ہے کہ یہ اس اختلاف کو نقل کرتے رہتے ہیں جو ائمہ مجتہدین اور محدثین کے درمیان عبادات کے اندر واقع ہوا ہے نہ کہ ارتفاقات کے اندر۔ اسی لیے یہ لوگ اس باب میں ائمہ حدیث کی جانچ پرکھ سے بے بہرہ اور معاملات کے بارہ میں حدیث کی سمجھ بوجھ سے ناواقف ہیں۔ ایسے ہی سنن اور اصحاب سنن کے اسلوب اور طریقہ کے مطابق کسی ایک مسئلہ کے استخراج اور کسی ایک حکم کے استنباط پر بھی قادر نہیں ہیں۔ اور انہیں اس کی توفیق بھی کیسے ہو کہ یہ حدیث پر عمل کرنے کی بجائے زبانی جمع خرچ پر اور سنت کی اتباع کے بجائے شیطانی تسویلات پر اکتفاء کرتے ہیں اور پھر اس کے عین دین ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور وہ اس بات پر خوش ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں۔ اور یہ ان میں سے ہر ایک کی عادت ہے۔ امیر ہو یا غریب' تندرست ہو یا بیمار' میں نے ان کو بار بار آزمایا' لیکن میں نے ان میں سے کسی کو ایسا نہیں پایا جسے صالحین کے طریقہ پر چلنے کی کوئی رغبت ہو یا وہ اہل ایمان کی سیرت کے مطابق چلتا ہو بلکہ میں نے تو ان میں سے ہر ایک کو مینی

دنیا میں منہمک اور اس کے ردی سازو سامان میں مستغرق، جاہ وجلال کو جمع کرنے والا، حلال وحرام کی تمیز کے بغیر مال کا حریص پایا۔ اسلام کی مٹھاس اور شیرینی سے خالی الذہن اور عام مسلمانوں کی نسبت شریر اور کمینے لوگوں کی طرح بہت سنگدل پایا۔''

نواب صاحبؒ چند سطروں کے بعد پھر یوں فرماتے ہیں

''بخدا یہ بات انتہائی تعجب خیز اور تحیر کا باعث ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو خالص موحد گردانتے ہیں اور اپنے علاوہ دوسرے سب مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ خود انتہائی متعصب اور دین میں غلو کرنے والے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کا دیکھنا آنکھوں کی چبھن اور گلوں کی گھٹن، جانوں کے کرب اور دکھ، روحوں کے بخار سینوں کا غم اور دلوں کی بیماری کا باعث ہے۔ اگر تم ان سے انصاف کی بات کرو تو ان کی طبیعتیں انصاف کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہیں۔ اس فرقے کی یہ سب صفات بیان کرنے کے بعد نواب صاحبؒ لکھتے ہیں

فما هذا دين ان هذا الا فتنة فى الارض و فساد كبير۔

''یہ کوئی دین نہیں ہے بلکہ یہ تو زمین میں ایک فتنہ اور فساد کبیر ہے۔''

(الحطہ ص ۱۵۲ - ۱۵۵)

اسی جماعت اہل حدیث کے ایک اور عالم اور صحاح ستہ کے مترجم مولانا وحید الزمان صاحبؒ حیدرآبادی نے فکر ونظر کی اس بے راہ روی کو محسوس کیا اور تقلید کے بندھن سے آزاد اور فکر و رائے کے اس انتشار کے نتائج سے آشنا ہونے کے بعد غم اور تاسف کے ملے جلے جذبات سے یہ لکھا

''غیر مقلدین کا گروہ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہلاتے ہیں، انہوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماعی کی پروا نہیں کرتے نہ سلف صالحین اور صحابہؓ اور تابعین کی ___ قرآن شریف کی تفسیر صرف لغت سے ___ اپنی من مانی کر لیتے ہیں۔ حدیث شریف میں جو تفسیر آ چکی ہے اس کو بھی نہیں مانتے۔''

(وحید اللغات و حیات وحید الزمان ص ۱۰۲)

اس زمانہ کے ایک اور جید اہل حدیث عالم مولانا عبدالاحد غازی پوری نے بھی اس

تحریک آزادیٔ فکر کے نتائج بد کو محسوس کرتے ہوئے لکھا

''اس زمانہ کے جھوٹے اہل حدیث مبتدعین مخالفین سلف صالحین جو حقیقت ما جاء به الرسول سے جاہل ہیں، وہ اس صفت میں وارث اور خلیفہ ہوئے شیعہ اور روافض کے، جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب و دہلیز کفر و نفاق کے تھے اور مدخل ملاحدہ اور زنادقہ کا تھے، اسی طرح یہ جاہل، بدعتی اہل حدیث اس زمانہ میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے جینہ مثل اہل تشیع کے۔''

(کتاب التوحید والسنہ فی رد اہل الالحاد والبدعہ ص ۲۶۲)

اس بارہ میں کہاں تک لکھا جائے کیونکہ جب فکر و رائے اس قدر آزاد ہو جائے تو پھر نہ صرف سلف صالحین پر تابڑ توڑ حملے ہوتے ہیں بلکہ پھر اپنوں کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں بھی برداشت نہیں ہوتیں اور ہر آدمی خواہ وہ عالم ہو یا غیر عالم اپنی رائے کے خلاف کوئی کام ہوتے دیکھتا ہے تو حد ادب کی تمام سرحدیں پھلانگ کر ہر شخص کی پگڑی اچھالنی شروع کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کسی کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ سلف صالحین کے دامن علم و عمل پر جو دست درازی ہوئی تو اب اپنوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ شروع ہوا اور ہر بڑے کا دامن عزت و عظمت تار تار ہونے لگا۔ غزنوی خاندان نے حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کے خلاف ''اربعین علیٰ ان ثناء اللہ لیس علیٰ مذہب المحدثین'' لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ مولانا ثناء اللہ صاحبؒ محدثین کے مذہب سے ہٹ گئے ہیں بلکہ مولانا عبدالاحد غازی پوریؒ نے تو "اظهار كفر ثناء الله جميع اصول آمنت بالله" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اول الذکر کتاب میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے علاوہ دوسرے بھی کئی علمائے اہل حدیث نے تائیدی دستخط کیے جن کی تعداد چالیس کے قریب تھی۔ علاوہ ازیں مولوی محمد جونا گڑھی نے مولانا عبداللہ روپڑیؒ کے بارہ میں ایک کتاب لکھی جس میں انہیں بدعقیدہ، علم دین بلکہ دین سے ناواقف قرار دیا۔ حضرت میاں نذیر حسین صاحبؒ کے ایک شاگرد اور مولوی محمد جونا گڑھی کے استاذ مولانا عبدالوہاب ملتانی کے خلاف بانوے اہل حدیث علماء نے دستخط کر کے کہا کہ یہ مدعی امامت گمراہ ہے اور مسلک اہل حدیث سے خارج ہے۔ باہمی

مخالفت کی رہی سہی کسر سیالکوٹ کے حکیم محمد صادق نے اپنے استاذ محترم جناب مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے خلاف "ایک مدنی امارت سے شرعی استفتاء" لکھ کر پوری کردی جس میں انہوں نے دنیا کی ہر برائی اپنے اس استاذ محترم میں ثابت کردی۔ اس قسم کا پمفلٹ مولانا میرؒ کے کسی مخالف کو نکالنے کی بھی جرأت نہ ہوئی جو جرأت ان کے شاگرد نے کی۔ قلم کو وہ تمام عیوب لکھنے کی بھی تاب نہیں جو ایک شاگرد نے اپنے استاذ میں نکالے۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی شہر کے رؤساء اور عمائدین میں سے تھے۔ ان کی زندگی ہر شخص کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھی اس پمفلٹ (ایک مدنی امارت سے شرعی استفتاء) سے ان کی شان میں تو کوئی کمی واقع نہ ہوئی لیکن حکیم صادق کی اس گستاخانہ جرأت سے ہر شخص نے یہ اندازہ لگایا کہ نصف صدی پیشتر ترک تقلید اور فکر ونظر کی آزادی کے نام سے جو تخم ریزی کی گئی تھی یہ سب اسی کے برگ و بار ہیں جس سے نہ صرف سلف صالحین کے دامنوں کو طعن وتشنیع کے تیروں سے خون آلود کیا گیا بلکہ اب ان کے اپنے بزرگوں کے دامن بھی ان زہر آلود اعتراضات سے تار تار ہو گئے ہیں۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اس تحریک آزادی فکر اور ترک تقلید نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھلا دی کہ اب ہمیں حریت فکر کی مادر پدر آزادی حاصل ہوگئی ہے لہٰذا صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ اور خود اس تحریک کے داعی حضرات پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی گئی۔ آپ حیران ہو گئے ہوں گے کہ ایک شاگرد نے جو بمنزلہ بیٹے کے ہوتا ہے اپنے استاذ پر جو بمنزلہ باپ ہوتا ہے ایسے گھناؤنے الزامات لگائے جن کو کان سننے اور آنکھیں پڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن یہ سب نتیجہ ہے ترک تقلید کا جو مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی کے نزدیک تحریک آزادی فکر ہے۔ گویا تقلید مقلدین کو فکر ونظر کی پابندیوں میں جکڑتی ہے جب کہ ترک تقلید اسلاف کی پابندیوں سے یک قلم آزاد کرتی ہے اور بزرگوں اور سلف صالحین کی عزتوں سے جو کھیلا گیا وہ ترک تقلید کا ایک منطقی نتیجہ تھا۔

بات کچھ لمبی ہوتی جا رہی ہے اور میں اس کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا لیکن صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ پر جو بعض حلقوں کی طرف سے حدیث رسولؐ سے ناآشنائی اور قلت حدیث کا جو الزام لگایا گیا تھا وہ بھی اسی ترک تقلید یا تحریک حریت فکر کا نتیجہ

تھا۔ اور یہ الزام لگا کر حضرت امام صاحبؒ کی شخصیت کو چھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی' لیکن جس کے علم و ورع اور زہد و تقویٰ اور فقاہت و اجتہاد کی شہادت سلف کے علمی جہابذہ نے دی ہو' موجودہ دور کے علمی بالشتیے ان کی شخصیت کو کس طرح چھوٹا ثابت کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے حضرت مولانا محمد علی کاندھلویؒ کو انہوں نے ''امام اعظمؒ اور علم الحدیث'' لکھ کر دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ سے یہ ثابت کر دیا کہ امام اعظمؒ کا علم الحدیث میں ایک خاص مقام تھا اور اس مقام کا حصول دوسرے محدثین کے لیے ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی امام ابوحنیفہؒ کی مقلد رہی ہے اور آج بھی ہے۔ بڑے بڑے محدثین نے آپ کے قول کے مطابق فتوے دیئے بلکہ امام ابوحنیفہؒ سے اپنی نسبت کو وہ باعث صد افتخار سمجھتے تھے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کرام پر تاریخ کے کئی ایسے جھرو کے کھلیں گے' اور امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت کے کئی ایسے واقعات ان کے علم میں آئیں گے جن سے وہ آج تک ناواقف و آشنا تھے۔ اور حضرت مولانا کاندھلویؒ کی تحقیق کی داد دیئے بغیر وہ نہیں رہ سکیں گے۔

محتاج دعا:

حکیم محمود احمد ظفر

مبارک پورہ، سیالکوٹ

باسمہ سبحانہ:-

۱۹۵۳ء میں جب مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک میں نظر بندی کے ایام سیالکوٹ جیل میں گذار رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ علم حدیث میں امام اعظم کی جلالت قدر اور اس فن میں ان کی عظمت کو شاہراہ عام پر لاؤں اور یہ تمنا اس لیے ہوئی کہ جیل ہی کی زندگی میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد اذکار مسنونہ میں مشغول تھا کہ اچانک میری جیل کی زندگی کے دو رفیق میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک کو میرے سے عقیدت اور دوسرے کو عقیدت نہیں مگر تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ بغیر کسی تمہید کے دونوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کس قدر عرصہ سے رہتے ہیں؟

میں نے جواباً بتایا کہ

۱۵ فروری ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم الشہابیہ سے وابستگی ہے اور اب ۱۹۵۳ء ہے حساب کرلو غالباً اٹھارواں سال ہے۔

اٹھارہ کا لفظ سنتے ہی دونوں کچھ چونک سے گئے اور باہم آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگے میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ

میں نے آج رات خواب دیکھا ہے کہ میں دارالعلوم گیا ہوں۔ دارالعلوم کا کتب خانہ بڑا شاندار ہے۔ شیشہ لگی ہوئی خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتب خانے میں

ایک نورانی صورت بزرگ ہستی سپید لباس میں جلوہ افروز ہے۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ ہیں۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کتنے عرصے سے قیام پذیر ہیں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے غالباً اٹھارواں سال ہے۔

میں نے یہ جواب سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا دو روز تک اسی پریشانی میں وقت گذرا۔ تیسرے دن میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ اس خواب کے بعد میرے قلب میں امام اعظمؒ کی محدثانہ شان اور علم حدیث میں ان کی عظمت کے موضوع پر کام کرنے کا داعیہ رونما ہوا اور اس داعیہ کا اپنے دوستوں میں اظہار بھی کر دیا۔ جب میں نے اپنے احباب کو یہ بات بتائی تو میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو تیرہ برس تک التوا میں پڑا رہے گا۔ لیکن حالات و واقعات کچھ اس طرح بن گئے۔

ارمغان ایمان:

جیل سے باہر آتے ہی دوستوں کے اصرار سے ارمغان ایمان پر نظر ثانی کی۔ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو دارالعلوم کی انتظامی اور اہتمامی مصروفیات سدراہ ہو گئیں۔ نئے انداز پر نئے طرز کے اسکول کا آغاز کیا۔ پرائمری پھر مڈل۔

اسلام کا نظام اذکار:

اسکول کی انتظامی مصروفیات ہی میں اسلام کا نظام اذکار نامی کتاب کی طباعت کا مرحلہ بھی پیش آ گیا۔ اس کے لیے جب مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے کمر ہمت باندھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری کتاب پر نظر ثانی کی جائے۔ اصلی کتاب صرف ۸۷ صفحات پر مشتمل تھی۔ نظر ثانی میں کتاب کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ہو گئی۔

نقوش زنداں:

جیل کی زندگی میں کچھ وقت خود ہی تفریح طبع کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور تفریح یہ ہوتی تھی کہ روزانہ قلم کی زبان سے کسی عزیز' کسی دوست اور کسی بزرگ کو مخاطب کر کے جو کچھ جی میں آتا تھا لکھ دیتا۔ مختلف بزرگوں' عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے ہوئے یہ خط میرے

بکس میں محفوظ تھے۔ میرا معمول تھا کہ جو کچھ بھی لکھتا تاریخی ترتیب کے ساتھ بکس میں رکھ دیتا۔ جیل سے آنے کے بعد کافی عرصہ یہ خطوط رکھے رہے۔ ایک روز میں نے یہ خطوط نکال کر مولوی محمد شریف قاسمی کو نقل کرنے کے لیے دیئے۔ مولوی صاحب نے ان کو اس طرح نقل کیا کہ ان کا حسن و جمال دوبالا ہو گیا۔ احباب نے پڑھے تو ان کی طباعت کے لیے متقاضی ہو گئے۔ بالآخر مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا بھی انتظام کیا۔

ان کاموں سے فراغت ہوئی تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ نے اپنی نگرانی میں مختلف ادارے کھول دیئے۔ پرائمری اسکول، مڈل اسکول، شعبہ حفظ قرآن، شعبہ علوم اسلامی، شعبہ تبلیغ، شعبہ نشر و اشاعت اور دارالافتاء۔ انتظامی و اہتمامی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ فرصت میرے لیے معدومات میں سے ہو گئی اور اس پر یہ سربراہی کہ اخراجات کے لیے آمد کے وسائل ساتھ نہ دیتے تھے۔ یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں پورا اتروں۔ انتظامی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ امام اعظمؒ پر کچھ لکھنے پر سکون زندگی کے بغیر ممکن نہ تھا اور زندگی کا سکون میرے لیے عنقا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کچھ سرمایہ جمع کیا جو کسی ترتیب کے لیے تیار ہوتا تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ کے مختلف اداروں کی پھیلی ہوئی پریشانیوں سے طبیعت میں انقباض آ جاتا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑتا۔

ستمبر ۶۵ء کی چھ تاریخ تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر ناپاک ارادوں سے حملہ کر دیا۔ دارالعلوم کے تمام ادارے بند ہو گئے اور

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

کے مطابق میں جس سکون کی تلاش میں تھا الحمد للہ مل گیا۔ تنہائی اور بالکل تنہائی۔ میں اور میری رفاقت کا کام دارالعلوم کے کتب خانے کی کتابیں کر رہی تھیں۔ الحمد للہ کہ ان کی شب و روز محنت کے بعد امام اعظمؒ اور امام الحدیث کی ہستی وجود میں آ گئی۔ ضروری ہے کہ امام اعظمؒ اور علم الحدیث کے متعلق چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

❁ کتاب کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ امام اعظمؒ کی محدثانہ شان کو خود محدثین کی زبانی شاہراہ عام پر لایا جائے لیکن محدثانہ شان کو بتانے کے لیے مؤلف نے محسوس کیا کہ علم حدیث کے تاریخی تعارف کے بغیر یہ مبحث اصولی حیثیت سے نامکمل رہے گا۔ اس لیے

اولاً علم حدیث کا تاریخی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

● مقصد کے پیش نظر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اول کوشش کی گئی ہے کہ حدیث میں امام اعظمؒ کی علمی زندگی کا کوئی گوشہ بغیر اشارہ و تشریح کے نہ رہ جائے اور جن جن مقامات کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس ہوئی ان پر مستقل مباحث لکھے گئے۔ یہ مباحث بعض مقامات پر قدرے طویل ہو گئے۔ مثلاً حدیث میں امام اعظمؒ کے اساتذہ پر پورے سو صفحات کا مبحث ہے۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت پر بیس صفحوں میں تبصرہ ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کا چونکہ امام اعظمؒ سے خاص تعلق ہے اس لیے یہ بحث ۲۹۳ سے شروع ہو کر ۳۲۶ تک آ گئی ہے۔ تصانیف کی تاریخ کے تذکرے میں کتاب الآثار پر مختلف حیثیتوں سے صفحہ ۳۲۷ سے ۳۷۶ تک بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ حدیث کی دوسری کتابوں مثلاً مؤطا، جامع معمر، جامع سفیان کے ساتھ اس دور کی تصانیف کا پورا تاریخی خاکہ صفحہ ۴۱۲ تک پیش کیا گیا ہے۔

علم حدیث میں مسانید کی حیثیت اور تاریخ لکھ کر مسند امام احمد اور مصنف عبدالرزاق کی تاریخی اور علمی حیثیت کی نشاندہی کی ہے۔ تیسری صدی میں صحاح کی تالیف پر ایک تفصیلی نوٹ ہے۔

الغرض تمام موضوعات میں تفصیل و تشریح کا یہی انداز رہا ہے۔ بلاشبہ یہ تفصیلات قاری کے لیے بار خاطر ہوں گی۔ مگر مؤلف اپنی افتادِ طبع سے کچھ مجبور ہے۔ زبان قلم پر بات آنے کے بعد روکنا مؤلف کے بس کی بات نہیں ہے۔

● کتاب میں جو علمی مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں مؤلف نے حوالہ کا التزام کیا ہے اور کتاب کے آخر میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے۔

کام کی علمی نوقیت کے پیش نظر کتابوں کی نایابی مؤلف کے لیے پریشان کن رہی ہے۔ اس پریشانی میں جس گرامی قدر شخصیت کی علمی محنتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور جن کے لیے میرے روئیں روئیں سے دعائیں نکل رہی ہیں وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہیں۔ موصوف کی تصانیف ماتمس بہ

الحاجۃ' امام ابن ماجہ اور علم حدیث' تعلیقات دراسات' تعلیقات ذب ذبابات میری قدم قدم پر رہنما رہی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ کتاب میں طبع اغلاط کافی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد طباعت کے وقت دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے۔ نہ میں تصحیح کر سکا ہوں اور نہ پروف پڑھ سکا ہوں اور نہ اس پر صحیح معنے میں نظر ثانی کر سکا ہوں۔ حتی کہ کتاب کی فہرستیں مرتب کرنے کا بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

فہرستوں کی ترتیب کے لیے میں عزیز امین اللہ وثیق ایم۔ اے لیکچرر پنجاب یونیورسٹی کے لیے خلوص قلب سے دعا گو ہوں۔ انہوں نے بڑی تندہی اور عرق ریزی سے کتاب کی فہرستیں مرتب کی ہیں۔

آخر میں میں اپنے ان احباب کا بھی صمیم قلب سے شکر گذار ہوں جنہوں نے میری صرف ایک آواز پر مصاریف طباعت کے لیے مطلوبہ رقم پیش کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ جزاھم اللہ۔

معذرت:۔

• تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی اور عدیم الفرصتی قدم قدم پر میرے خیالات کو میری خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی ہے۔

چونکہ ۱۹۶۶ء میں اس کتاب کو پیش کرنے کا اعلان ہو چکا تھا اس لیے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی مسودے کو میرے ایک عزیز مولوی محمد شریف قاسمی صاف کرتے تھے میں اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا تھا اور کاتب کے حوالہ کرنے کو کہہ دیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گذشتہ کا استحضار رہنا مشکل تھا۔ اس لیے عنوانات میں جس قدر ترتیب کا حسن قائم رہنا چاہیے تھا۔ قائم نہیں رہ سکا۔ ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا خیال رکھا جائے۔ اللھم تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔
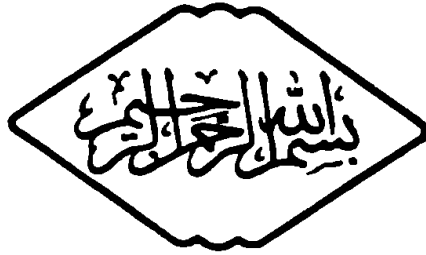
الحمدلله وسلام علیٰ عباده اللذین اصطفیٰ سب سے پہلے ایک ارشاد ربانی اور ایک حدیث سن لیجئے۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں:

قل هذه سبیلی ادعوا الی الله علیٰ بصیرة انا ومن اتبعنی وسبحان الله وما انا من المشرکین۔(۱)

"کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں روشنی کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری پیروی کی وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کی پاکی ہو میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔"

ارشاد ربانی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے۔ کہ اے پیغمبر کہہ دو۔ کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اسی روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے۔ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری پیروی کی ہے۔ وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ حافظ (۲) ابن کثیر فرماتے ہیں:

کل من اتبع یدعو الیٰ مادعاه صلی الله علیه وسلم۔(۳)

"جو شخص بھی حضورؐ کا پیروکار ہے اس کا کام اسی بات کی دعوت دینا ہے۔ جس کی حضور انورؐ نے دعوت دی ہے۔"

---

(۱) پارہ ۱۳ آیت ۱۰۸۔ (۲) ابوالفداء کنیت، عماد الدین لقب، اسماعیل بن عمر بن کثیر نام ہے۔ نسباً قرشی، وطن دمشق ہے۔ ولادت ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہوئی، حافظ جمال الدین المزی ۷۴۲ھ حافظ ابن تیمیہ ۷۲۸ھ حافظ شمس الدین ۷۴۸ھ کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے۔ ابن العماد حنبلی، حافظ ابن حجر حافظ سیوطی، حافظ ابن تغری حنفی اور شیخ ابن ناصر نے ان کے مناقب لکھے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ۷۷۴ھ میں وفات ہوئی۔ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔(۳) تفسیر ابن کثیر: ص ۴۲ ج ۳۔

اس آیت میں دعوت کو دونوں کا کام بتایا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے آپ کی پیروی کرنے والے آپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ دعوت دینا نبی کا کام اللہ کا نبی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور مومن کا صرف امتی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ نبی کا متبع اور پیروکار ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایسے ہی اطاعت میں بھی دونوں شریک ہیں۔ لیکن نبی کی طاعت نبی ہونے اور اس کے معصوم ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور امتی کی طاعت متبع رسول اور مجتہد ہونے کی وجہ سے ہے۔ شاطبی نے الموافقات میں الآمدی نے احکام میں اسے عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

اتباع محبت کی نشانی ہے:

بات بڑی معنی خیز ہے۔ اور اس کی معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس پر غور کیا جائے کہ نبوت کے اس کام میں نبوت کی اتباع کرنے والے شریک ہیں۔ صرف ایمان لانے والے نہیں۔

اتباع کے موضوع پر قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ کی محبت کی نشانی نبوت کا اتباع ہے۔ اور جو اس نشانی کو قائم کرنے میں پورا اترتے ہیں اللہ سبحانہ ان کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں:

ارشاد ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔

"کہہ دو تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو محبوب بنا لے گا اللہ تعالیٰ تم کو اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو اللہ بڑا بخشہار اور رحم کار ہے۔"(۱)

---

(۱) اس آیت میں محبوب الٰہی کے دعویٰ کی جانچ کے لیے کیا اچھا معیار بتایا ہے۔ یعنی اتباع رسول۔ جو جتنا متبع رسول ہوگا۔ اسی قدر اس کی محبت الٰہی کا دعویٰ زیادہ معتبر و مسلم ہوگا۔ اس کو اسی بنا پر آیت امتحان کہتے ہیں۔ ابو سلیمان الدرانی کہتے ہیں جب لوگوں نے محبت کے بلند بانگ دعوے کیے تو اللہ سبحانہ نے ﴿باقی ص: ۱۱۳ پر﴾

جو بات یہاں شرط و جزا کے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ اتباع کی سرشاریاں دیکھ کر یہی بات مقام مدح میں بولی گئی ہے۔ یحبھم و یحبونہ اور کہیں رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔

آیت دعوت کا اجمال اور اس کی حدیث سے تشریح:

آیت دعوت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نبوت کی پیروی کرنے والوں کا کام نبوت کے کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔ لیکن آیت ہاتھ بٹانے کی نوعیت میں مجمل ہے اس اجمال کے چہرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقاب اٹھائی ہے۔

''حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (۱) کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہدایت اور دین اللہ سبحانہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے۔ اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر بری زمین کے ایک حصے نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا گھاس اور سبزہ اچھا اگایا۔ اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا۔ لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا۔ اور نہ گھاس اُگایا۔

﴿بقیہ ص ۱۱۲﴾ آیت محبت نازل کی اس آیت میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ دلیل محبت اور فائدہ محبت۔ محبت الٰہی کی علامت اگر اتباع رسول کو قرار دیا۔ تو محبت کا فائدہ یہ بتایا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۱) نام عبداللہ بن قیسؓ کنیت ابو موسیٰ ہے۔ فتح خیبر کے زمانے میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے۔ حضور انورؐ نے ان کو حضرت معاذ کے ساتھ یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر رہے ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ بصرہ کے شہریوں کے قرأت اور فقہ میں استاد ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ علم کا ماخذ صحابہ میں چھ بزرگ ہیں۔ عمرؓ علیؓ ابیؓ ابن مسعودؓ زید اور ابو موسیٰ اشعریؓ۔ صفوان بن سلیم فرماتے ہیں کہ زمانہ نبوت میں یہ چار فتویٰ دیتے تھے۔ عمرؓ علیؓ معاذ اور ابو موسیٰ اشعریؓ۔ آواز اتنی اچھی تھی کہ قرآن پڑھتے تو سماں بند جاتا حضور انورؐ نے ایک دفعہ قرآن سنا تو فرمایا۔ قد اوتی مزمارا من مزامیر آل داؤد۔ سنہ ۴۴ھ ذی الحجہ کے مہینے میں انتقال ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ ص ۲۴ ج ۱)

یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہ کے دین میں تفقہ کیا اور اللہ سبحانہ نے اسے دین سے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا۔ اور دوسروں کو سکھایا۔ اور اس شخص کی مثال ہے۔ جس نے ادھر سر اٹھا کر نہیں دیکھا اور ہدایت ہی کو قبول نہیں کیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے۔''

اس حدیث کی مخاطب امت اجابت یعنی مسلمان ہیں نہ کہ امت دعوت یعنی عام انسان اسی بنا پر حضرت امام بخاری نے کتاب العلم میں عالم بننے اور عالم بنانے کی فضیلت کا عنوان قائم کر کے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور علم سکھانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کی آویزش میں حق کے بقا کا کیا قانون ہے۔ اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے ایک صاف اور عام الورود مثال پیش کی ہے۔ جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں۔ فرمایا: جب پانی برستا ہے۔ اور زمین کے لیے شادابی اور گل ریزی کا سامان مہیا ہونے لگتا ہے۔ تو تم دیکھتے ہو کہ زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

(الف) پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین۔

(ب) پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین۔

(ج) ناقابل کاشت اور ناقابل ذخیرہ۔

ٹھیک ایسے ہی علم و ہدایت کی بارش کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔

(الف) وہ جو قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔

(ب) وہ جو قرآن وسنت کے مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔

(ج) وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین:

جو لوگ قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یہ زمین کی وہ قسم ہے۔ جسے زبان نبوت نے

كانت منها اجادب امسكت الماء فنفع الله به الناس فشربوا وسقوا وزرعوا۔
''زمین کا ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو روکا اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔''
سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قرآن وسنت کی بالذات نگرانی کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اس طرح سمیٹے ہوئے ہیں کہ ان میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔ یہ ہیں اصحاب حدیث اور محدثین۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں

قسم ينتفع بعين علمه ذالک کاهل الحفظ والرواية۔ (۱)
''یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے۔ جیسے محدثین اور اصحاب روایت۔''

اس قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

نضر الله امرأ سمع مقالتي فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه الى من هو افقه منه۔ (رواہ الشافعی) (۲)
''خوش وخرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ رکھا اور پوری حفاظت سے آگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ کی بات رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھ دار تک پہنچاتے ہیں۔''

---

(۱) سندھی علی البخاری: ص ۲۶ ج ۱

(۲) یہ حدیث ان لفظوں میں بحوالہ ابن مسعود بیہقی میں ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں الفاظ یہ ہیں نضر الله امرأ سمع منا شيئاً كما سمع فرب مبلغ ادعى من سامع۔ یہی حدیث مسند بزاز میں بحوالہ ابوسعید خدری صحیح ابن بحوالہ زید بن ثابت آئی ہے۔ نیز دوسرے صحابہ مثلاً معاذ بن جبل نعمان بن بشیر جبیر بن مطعم اور ابوالدرداء کے حوالے سے بھی یہی حدیث مختلف الفاظ میں مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی خود بتا رہی ہے کہ علماء دو قسم کے ہیں۔ حفاظ اور فقہاء ہر حافظ حدیث فقیہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام شافعی نے اس حدیث پر یہ خاص نوٹ لکھا ہے۔ ودل على انه قد يحمل الفقه غير فقيه يكون له حافظاً ولا يكون فيه فقيهاً۔ (الرسالہ ص ۷۷)

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین:

کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں۔ بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط کا کام بھی کرتے ہیں اس کے ثمرات سے رائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ نتائج کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ یہ تمثیل میں زمین کی دو قسم ہے جسے زمین نبوت نے۔

نقیة قلبت الماء فانبتت الکلا و العشب الکثیر۔

''صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا۔ اور پانی کے ذریعے گھاس اور زیادہ سے زیادہ سبزہ اُگایا۔''

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ قرآن وسنت کے پانی سے اپنی قوت اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہ عام پر لانے والے ہیں یہی ارباب اجتہاد وفقہاء کرام۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں:(۱)

قسم ینفع بثمرات علمه ونتائجه کاهل الاجتهاد والاستخراج۔(۲)

''یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے مجتہدین اور فقہاء۔''

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین۔(۳)

''جس کے ساتھ اللہ سبحانہ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں فقاہت عطا فرماتے ہیں۔''

---

(۱) پورا نام ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی ہے۔ سندھ میں مقام ٹھٹھہ کے رہنے والے ہیں۔ یہیں نشوونما پائی تعلیم تستر میں حاصل کی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ حرم نبوی میں ان کا درس حدیث خاص شہرت رکھتا تھا۔ ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے۔ حدیث کی چھ کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔(۲) سندھی علی البخاری ص ۲۶ ج ۱۔
(۳) صحیح بخاری ج ۱۶ ص ۱۔ اس حدیث کو بخاری ومسلم نے حضرت معاویہؓ سے صرف مسلم نے سعد بن ابی وقاصؓ سے ابوداؤد مسلم ترمذی نے ثوبانؓ سے۔ ترمذی نے معاویہ بن قرہ سے۔ اور ابوداؤد نے عمران بن حصینؓ سے روایت کیا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشاد نبوت کی روشنی میں ارشادات نبوت کا ذخیرہ رکھنے والے ہوں یعنی محدثین یا ارشادات نبوت اور قرآن سے مسائل نکالنے والے ہوں یعنی فقہاء، دونوں اسلام کا سرمایہ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

ایک قسم وہ حفاظ ہیں۔ جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سنی ہیں۔ ویسی ہی آگے پہنچا دینا ہے۔ ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ سے مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو زرعہ اور ابو حاتم۔ اور دوسری قسم جیسے امام مالکؒ امام شافعی وغیرہ۔ خود صحابہ میں بھی حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ غور فرمایئے عبداللہ بن عباسؓ حبر امت اور قرآن کے ترجمان ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی ان حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے۔ جن میں ذاتی سماع اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کے صرف فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے فقاہت کا ایک چلو ہے۔ ذالک فضل الله یوتیه من یشاء۔ ان کے مقابلے میں ابو ہریرہؓ ہیں۔ حفظ روایت میں علی الاطلاق حافظ امت تو ہیں۔ مگر تفقہ اور استنباط میں ابن عباسؓ کے پاسنگ بھی نہیں۔ حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہی تقسیم امت کو صحابہ سے وراثت میں ملی ہے۔(۱)

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

التخریج علی کلام الفقهاء وتتبع لفظ الحدیث لکل منهما اصل اصیل فی الدین۔(۲)

''فقہاء کے انداز پر حدیث سے مسئلہ نکالنا اور الفاظ حدیث کا تتبع و تلاش دونوں کی دین میں بنیادی حیثیت ہے۔''

دونوں اس ارشاد نبویؐ کا منطوق ہیں۔ محدثین بھی اور فقہاء بھی۔ یا بالفاظ دیگر اصحاب روایت بھی اور اصحاب درایت بھی۔

---

(۱) الوابل الصیب: ص ۷۸ (۲) حجۃ اللہ البالغہ: ص ۱۵۲ ج ۱

ائمہ اجتہاد کی طاعت ضروری ہے:

اسی بنا پر حافظ ابن القیم جوزی نے اعلام میں دونوں کو الفاظ نبوت کو آگے پہنچانے والے ہوں یا الفاظ نبوت کو سمجھانے والے ہوں یہ کہہ کر کہ:

حضور انورؐ کی جانب سے تبلیغ دو طرح کی ہے الفاظ نبوت کی تبلیغ اور معانی کی تبلیغ۔

بتایا ہے کہ امت محمدیہؐ کے علماء دو قسموں میں منحصر ہیں۔ ایک حفاظ حدیث۔ یہ امت کے راہنما اور خلوق کے پیشوا ہیں۔ جنہوں نے امت کے لیے دین کو محفوظ رکھا ہے۔ اور اس کی ہر قسم کے ردو بدل سے حفاظت فرمائی ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

دوسری قسم ان فقہائے اسلام کی ہے۔ جن کے مسائل نکالنے کی نعمت ارزانی ہوئی اور جو حلال وحرام کے ضابطے بنانے کے لیے متوجہ ہوئے ان فقہاء کا مقام زمین میں ایسا ہے۔ جیسے ستارے آسمان میں۔ ان کے ذریعے ہی تاریکیوں میں سرگرداں راستہ معلوم کرتے ہیں لوگوں کو ان کی ضرورت کھانے اور پینے سے زیادہ ہے۔ اور ان کی طاعت والدین سے بھی زیادہ از روئے قرآن فرض ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے قرآن کی یہ آیت لکھی ہے

یاایھاالذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

''اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اولی الامر کا جو تم میں سے ہوں۔''

اور بتایا ہے کہ

اس آیت کی رو سے فقہاء اور مجتہدین کی اطاعت فرض ہے اور اس آیت میں عبداللہ بن عباسؓ جابر بن عبداللہؓ حسن بصریؒ ابوالعالیہؒ عطاء بن ابی رباحؒ ضحاکؒ اور مجاہد کے خیال میں اولی الامر سے حکام نہیں بلکہ فقہاء اسلام مراد ہیں۔ (۱)

صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین:

جو لوگ نہ قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہوں اور نہ قرآن وسنت سے مسائل نکالنے پر قدرت رکھتے ہوں اس ارشاد نبوت میں زمین کی دو قسم ہیں جسے زبان نبوت نے اس تمثیل

---

(۱) اعلام الموقعین ص ۳ ج ۱

میں انما ھی قیعان لاتمسک ماءً و لا تنبت کلأً سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی امت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علم نبوت سے بہرہ ورنہیں۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں: ھو من دخل فی الدین ولم یسمع العلم۔ یعنی وہ مسلمان ہو دین سیکھنے کے لیے زندگی بھر کچھ وقت بھی دین سیکھنے پر صرف نہیں کرتے۔ اور کوئی موقعہ بھی دین کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کے لیے نہیں نکالتے۔ وہ من لم یرفع بذالک راساً کا مصداق ہیں۔ امت اسلامیہ میں ان کی اکثریت ہے اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں جو جانتے ہیں۔ ان سے پوچھ پوچھ کر گذارہ کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ تقلید پر چونکیں اس لیے اس حقیقت کو آشکارا کرنا نہایت ضروری ہے۔ کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم صرف تحقیق کا نام ہے اور صدر اول میں صرف تحقیق تھی۔ تقلید کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ سخت غلط فہمی میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سنن ابن ماجہ کی حدیث انس بن مالکؓ

امتی علی خمس طبقات فاربعون سنة اهل برو۔

تقوی ثم الذین یلونهم الیٰ عشرین و مائة سنة اهل تراحم و تواصل ثم الذین یلونهم الیٰ ستین ومائة اهل تدابر وتقاطع ثم الهرج الهرج النجا النجا۔

''میری امت پانچ طبقوں پر ہے۔ چالیس برس تک تو نیک اور پرہیزگار لوگ ہوں گے پھر ان کے بعد ایک سو بیس برس تک آپس میں رحم کرنے والے اور حق قرابت ادا کرنے والے ہوں گے۔ پھر ان کے بعد والے لوگ ایک سو ساٹھ تک باہم ترک صحبت اور قطع تعلقات کرنے والے ہوں گے۔ پھر (ان طبقوں کے بعد) قتل ہی قتل ہے (اس زمانے سے) نجات طلب کرو نجات طلب کرو۔''

میں آئے ہوئے پانچ طبقوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ صحابہ کرامؓ میں مختلف مراتب اور مدارج تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

وآں جماعہ سلیم الفطرت برمنازل شتی بودہ اند طائفہ مخلوق براستعدادے کہ شبیہ باستعداد انبیاء بود ونمونہ از نبوت در جوہر طبیعت ایشاں مودع۔ ایشاں سردفتر امت آندو بشہادت دل آں داعیہ وآں علوم راتلقی نمودہ اندو پارہ از تحقیق نصیب ایشاں شد۔ وطائفہ استعداد تقلید تمام داشتند وقبول انعکاس آں داعیہ وآں علوم نمودند و حصہ از سعادت یافتند و کلاً وعد الله الحسنیٰ۔(۱)

پھر یہ فطرت سلیمہ والے بھی مختلف مراتب پر تھے۔ بعضے تو ایسے استعداد کے ساتھ مخلوق ہوئے تھے۔ کہ وہ (استعداد) انبیاء کی استعداد سے مشابہ تھی۔ اور ان کے جوہر طبیعت کے اندر نبوت کا نمونہ امانت رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ امت کے سردفتر ہوئے ان لوگوں نے اپنے دل کی شہادت سے اس داعیہ کو اور ان علوم کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے) لیا اور تحقیق کا ایک حصہ ان کو نصیب ہوا اور بعضے تقلید کی استعداد کامل رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اس داعیہ اور ان علوم کے عکس کو قبول کیا اور سعادت سے ایک حصہ پایا اور سب کے لیے اللہ نے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ علم تحقیقی ہو یا تقلیدی دونوں علم ہیں۔ اور دونوں امت کو صحابہ سے وراثت میں ملے ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید نے منصب امامت میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ

علم باحکام شرعیہ بہ دو طریق حاصل میشود تقلید وتحقیق وعلم انبیاء از جنس علم تقلیدی اصلاً نیست بلکہ آنچہ ایشاں را ازیں علم بدست آمد ہمہ بطریق تحقیق حاصل شد وتحقیق را دو طریق است اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول باشد والہام بشرطیکہ از مداخلت نفسانی محفوظ باشد پس مشابہ بانبیاء در علم احکام یا مجتہدین متبولین باشند یا ملہمین محفوظین واز بسکہ استناد احکام بسوئے کشف والہام دراوائل امت معروف نہ بود پس مشابہ بانبیاء دریں فن مجتہدین متبولین اند پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد

(۱) ازالۃ الخفاء ص ۵۶۸ ج ۱

مثل ائمہ اربعہ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گذشتہ اند فاما مقبول درمیان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ بناء علیہ درمیان جماہیر اہل اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند و بقوت اجتہاد موصوف۔(۱)

علم بہ احکام شرعیہ دو طریق پر حاصل ہوتا ہے۔ تقلیداً اور تحقیقاً۔ اور علم انبیاء منجملہ علم تقلیدی بالکل نہیں بلکہ جو کچھ ان کو علم حاصل ہوا تمام بطریق تحقیق حاصل ہوا۔ اور تحقیق کے دو طریق ہیں۔ اول اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو۔ دوم الہام بشرطیکہ مداخلت سے محفوظ ہو۔ پس انبیاء علیہم السلام کے مشابہ علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں۔ یا ملہمین محفوظین اور چونکہ کشف و الہام کی طرف احکام کی نسبت اوائل امت میں معروف و مشہور نہ تھی پس مشابہ بانبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین ہیں۔ سو ان کو ائمہ فن سے معلوم کرنا چاہیے۔ مثلاً ائمہ اربعہ۔ ہر چند کہ مجتہدین بہت کچھ گذرے ہیں۔ لیکن مقبول درمیان جمہور امت یہی چند اشخاص ہیں۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ اس فن میں انہیں کے نصیب ہوئی۔ نظر براں تمام اہل اسلام خواص و عوام میں بلقب امام معروف ہوئے اور بقوت اجتہاد موصوف۔

علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے کہ شریعت میں قابل اعتماد اور اعتبار وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان میں عمل پر آمادگی ہو۔ پھر فرماتے ہیں۔ کہ اہل علم تین قسم کے ہیں۔

- ایک وہ جن کا علم تقلیدی ہے۔ اور درجہ کمال حاصل نہیں ہے۔
- دوسرے وہ جن کا علم استدلالی ہے۔ اور دلائل و براہین سے واقف ہیں۔
- تیسرے وہ جن کا علم تحقیقی ہے۔ خود علم ان کے لیے ملکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ شریعت میں علم معتبر وہی ہے۔ جس کے ذریعے انسان عمل پر آمادہ ہو جائے تو پھر علم تقلیدی کے علم نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ مقلد اپنی عملی زندگی میں جن کی تقلید کرتا ہے۔ صرف اس لیے کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ قرآن و سنت کے ترجمان ہیں۔

---

(۱) منصب امامت: ص ۵۳

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ نے اہل السنت کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اہل السنت کے تقلیدی موقف کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ

الناس لم یاخذو اقول مالک والشافعی واحمد وغیرھم الا لکونھم یسندون اقوالھم الی ماجاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فان ھؤلاء من اعلم الناس بما جاء بہ واتبعھم لذالک واشد اجتھادا فی معرفۃ ذالک واتباع۔(۱)

"لوگوں نے امام مالکؒ شافعیؒ اور احمدؒ کی باتوں کو صرف اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ اکابر اپنی باتوں کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ائمہ تمام لوگوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی باتوں یعنی احادیث کے سب سے زیادہ عالم ہیں اور سب سے زیادہ احادیث کی پیروی کرنے والے اور احادیث کی معرفت اور اتباع میں سب سے اچھی قوت اجتہاد رکھنے والے ہیں۔"

اسی بناء پر شاہ ولی اللہؒ نے اصولیین کی بنائی ہوئی عام شاہراہ سے ہٹ کر تقلید کی یہ تعریف کی ہے۔ **ان یکون اتباع الروایۃ دلالۃ ۔(۲)** یعنی بات نبوت کی ہو اور الفاظ امام مجتہد کے ہوں اسے مان لینے کا نام تقلید ہے۔

الغرض ارشاد نبوت کی رو سے دونوں محدثین ہوں یا فقہاء۔ اسلام کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ منطوق میں محدثین سے اخذ کرنا اور مفہوم میں فقہاء کی تقلید کرنا اسلاف کا مسلک اور اکابر کا مذہب ہے۔

میری اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ امام اعظمؒ کی ذات گرامی صرف امام فقاہت ہی نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔ چونکہ امام اعظمؒ کی زیادہ شہرت فقاہت میں ہوئی اس لیے چھوٹے لوگوں کی نظروں سے امام اعظمؒ کی محدثانہ شان اوجھل ہوگئی اور فقاہت میں شہرت

---

(۱) منتقی من منہاج الاعتدال ص ۱۹　　(۲) عقد الجید ص ۲۹

کی وجہ میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ امام موصوف نے بطور فن جس چیز کو تمام علوم میں کمال پیدا کرنے کے بعد اپنایا وہ علم الفقہ تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص جس فن کو اپناتا ہے۔ شہرت اسی میں ہوتی ہے امام بخاری اور مسلم فقہی مسائل میں صاحب رائے تھے۔ مگر ان کو محدثین سے نکال کر فقہاء میں کسی نے شمار نہیں کیا کیونکہ فقہ کو انہوں نے بطور فن نہیں اپنایا تھا۔ تاریخ تو فن کے اپنانے کے لحاظ سے کسی شخص کا تعارف کراتی ہے۔ یہ بات ایک درجہ میں صحیح ہے کہ ایک شخص محدث ہو۔ مگر فقیہہ نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے۔ کہ ایک شخص فقیہہ اور مجتہد تو ہو مگر محدث نہ ہو۔ کیونکہ مجتہد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً اس کی نظر شریعت حقہ کے پورے کے پورے سسٹم قرآن حکیم اسوۂ نبوت اور اعمال صحابہ پر ہو اور اس کی نظر سے شریعت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ ہو۔ اور پھر ان سے مسائل نکالنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

چنانچہ شاطبی لکھتے ہیں:

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثاني من الاستنباط۔(۱)

"درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ جو دو صفتوں سے موصوف ہو۔ ایک یہ کہ پوری کی پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو دوسرے یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔"

یاد رہے کہ شریعت کے پورے سسٹم میں بصیرت ہونے اور اس سسٹم کے کسی ایک گوشے میں فنکار کی حیثیت سے نام آوری پیدا کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ محدثین نے ایک فنکار کی حیثیت سے حدیث میں نام پیدا کیا ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا فن علم حدیث میں یہ نہیں کہ حدیث کس کس سند سے آئی ہے۔ بلکہ ان کا مقام علم حدیث میں وہ ہے۔ جو علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے:

وان كان متمكناً من الاطلاع على مقاصدها كما قالوا في الشافعي وابي حنيفة في علم الحديث۔(۲)

---

(۱) الموافقات ص ۲۴ ج ۱ (۲) الموافقات ص ۱۰۹ ج ۳

''اگر شریعت کے مقاصد پر اطلاع رکھتا ہو۔ جیسا کہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے متعلق علم الحدیث کے بارے میں سب کی رائے ہے۔''

اور اجتہاد میں یہی وہ اسوہ ہے جو صحابہ نے چھوڑا تھا۔ الغرض میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی ذات گرامی صرف امام فقاہت نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔

حدیث کیا ہے

امام اعظمؒ کی محدثانہ شان اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کے تذکرے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ حدیث کے بارے میں بتایا جائے۔ اتنی بات تو کم وبیش سب ہی جانتے ہیں کہ قرآن میں اللہ پاک نے لوگوں کو صرف حضور انورؐ کی نبوت و رسالت سے روشناس نہیں کیا۔ بلاشبہ نبوت ایک عہدہ اور منصب ہونے کی وجہ سے ایمانیات سے متعلق یعنی ماننے اور باور کرنے کی چیز ہے۔ مگر قرآن نے منصب کے ساتھ نبی کے مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔

منصب تو یہی ہے کہ جناب سیدنا محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب الہاشمی المکی ثم المدنی نبی اور رسول ہیں جو قرآن کی صورت میں خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اور مقام یہ ہے کہ آپ رسول ہونے کے ساتھ اس پیغام الٰہی یعنی قرآن کے مبلغ' داعی' معلم اور مبین بھی ہیں۔ آپ طیبات کے محلل اور خبائث کے محرم ہیں۔ ان کے ذریعے آپ باہمی تنازعات کے حکم' قاضی اور معاشرے کی اسلامی زندگی کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھیئے کہ نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں امت سے آپ کے ماننے کا اور مقامات والی شخصیت ہونے کی وجہ سے امت سے آپ کی طاعت' اتباع' توقیر' تعظیم اور محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

منصب اور مقام دونوں کو سمجھ لینے کے بعد حضور کو نبی مانتے ہوئے آپ کے کاموں' باتوں' عادتوں اور حالتوں کی قانونی حیثیت کو نہ ماننے کا مطلب آپ با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ کہ یہ منصب کو مان کر مقام نبوت کا انکار ہے۔ کیونکہ اگر نبی کی باتوں' کاموں اور عادتوں کی قانونی حیثیت نہیں مانی جاتی تو پھر نبی کا نبی ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

قرآن وقائع کے تحت نازل ہوا ہے

رسولؐ کے مقامات ہی کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے قرآن کا نزول بتدریج اور آہستہ آہستہ ہوا۔ اگر یہ حقیقت ہے۔ اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے۔ جبکہ سینۂ قرآن سے اُبلی ہوئی صدا یہی ہے۔

وقرانا فرقناه لتقرءه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا۔(۱)

''اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے جدا جدا کر کے پڑھے تو اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر اور اس کو ہم نے اتارتے اتارا۔''

گویا آہستہ آہستہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ جیسے جیسے حالات پیش آئیں ان کے موافق ہدایات حاصل ہوتی رہیں۔ اور اس کے نتیجے میں وہ جماعت جسے آگے چل کر تمام دنیا کا معلم بننا ہے۔ قرآن کی ہر بات اور موقع ومحل کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے۔ اور آنے والی نسلوں کے لیے کسی بھی قرآنی بات کے لیے بے موقع اور بے جا استعمال کی گنجائش نہ رہے۔ اس طرح ان تیس سالہ نزول قرآن کے وقت میں پیش پا افتادہ حالات ووقائع کا نام یا صاحب قرآن کی تیئیس سالہ شب وروز میں قرآن ہی کی ہدایت پر اٹھی ہوئی عادتوں باتوں کاموں اور حالتوں کا نام السنۃ ہے۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک قرآن۔ دوسرے وہ وقائع جن کے تحت قرآن اترا ہے۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے۔ جو نقش اور نقاش میں۔ حکمت اور حکیم میں۔ پروردگاری میں۔ معمار اور عمارت میں۔ نظم اور ناظم میں ہوتا ہے۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے۔ تو پھر السنۃ کو قرآن سے یا قرآن کو السنۃ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ قرآن کو چراغ اور السنۃ کو اس کی روشنی یا السنۃ کو چراغ اور قرآن کو اس کی روشنی کہہ دیجئے۔ قرآن میں دونوں تعبیریں موجود ہیں۔ ایک مقام پر قرآن میں نبوت کو روشنی کہا گیا ہے۔

قد جاءكم من الله نور وكتاب مبين (۲)

''بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔''

---

(۱) پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل (۲) پارہ ۶ سورہ مائدہ

اور دوسری جگہ خود قرآن کو روشنی قرار دیا ہے۔

قد جاء کم برھان من ربکم و انزلنا الیکم نورًا مبیناً۔(۱)

''تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح۔''

دونوں نور ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب یا قرآن اور اسی وحی کی رہنمائی میں بنے ہوئے نقشۂ عمل کا نام اسوۂ حسنہ یا السنہ ہے۔

حدیث تاریخ سنت کا نام ہے

اگرچہ متاخرین نے اصطلاحی طور پر اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے لفظ السنۃ کو ایک سے زیادہ معانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ مثلاً

حضور انورؐ کے افعال واقوال اور آپ کی موجودگی میں ہونے والے کاموں باتوں کو السنۃ کہا گیا ہے۔ بدعت کے مقابلے پر لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔

حضورؐ کے کاموں' باتوں' عادتوں اور حالتوں کو بھی سنت کہا گیا ہے۔

لیکن فقہاء اور اسلامی قانونی کے علماء کی زبان میں نبوت کے اس محسوس جادۂ عمل کو سنت کہتے ہیں۔ جو ذات نبوت نے اسلامی معاشرے کی دینی زندگی کے لیے بطور پیمانہ عمل پیش کیا ہو اور جسے جماعت صحابہ نے دین بنا کر اختیار کیا ہو۔ چاہے یہ افعال اعمال ہوں یا اخلاق و معاملات اسی بنا پر صحابہ کے معمولات کو بھی سنت کہا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے قرآن کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں۔ ایسے ہی سنت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ (۲) کی روایات پر موقوف ہے۔

---

(۱) پارہ:۶ سورۂ مائدہ

(۲) قراء سبعہ قرآن پاک کے وہ سات قاری جن کی قرأت کے مطابق ساری دنیا میں تلاوت قرآن کی جاتی ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی الجواہر المضیئہ میں فرماتے ہیں۔ سات ماہتاب قراء یہ ہیں ﴿باقی صفحہ ۱۲۷ پر﴾

﴿بقیہ صفحہ:۱۲۶﴾

(۱) عبداللہ بن کثیر بن المطلب القرشی مولاہم ابومعبد تابعین میں سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے قرآن کا سماع کیا ہے۔ ۱۲۰ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے ۱۲۲ھ بتایا ہے۔

(۲) نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم اللیثی مدنی۔ ان کے بزرگ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ ابو رویم کنیت ہے۔ ۱۶۹ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(۳) ابن عامر یہ عبداللہ بن عامر بن یزید بن تمیم بن ربیعہ الیحصبی الدمشقی ہیں۔ دمشق کے قاضی تھے۔ کبار تابعین سے ہیں۔ ۲۱ھ کے آغاز میں ولادت ہوئی اور عاشوراء کے دن ۱۱۸ھ کو وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں تاریخ ولادت ۸ھ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ہوتی ہے۔

(۴) ابوعمرو بن العلاء بن عمار بن عبداللہ المقری البصری۔ ان کا نام کسی نے ریان کسی نے یحییٰ کسی نے عثمان کسی نے محبوب اور کسی نے کچھ اور بتایا ہے۔ ۱۵۴ھ میں کوفہ میں انتقال ہوا۔

(۵) عاصم بن ابی النجود ابوبکر الاسدی۔ ۱۲۷ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں سن وفات ۱۲۸ھ ہے۔ امام سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ بہدلہ ابوالنجود کا نام ہے۔ اور عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ یہ ان کی ماں کا نام ہے۔ مگر ابوبکر ابن ابی داؤد نے اسے غلط کہا ہے۔

(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارہ بن اسمٰعیل الزیات التیمی مولاہم الکوفی ابوعمارہ بمقام حلوان ۱۵۸ھ میں وفات پائی

(۷) کسائی ابوالحسن علی بن حمزہ الاسدی مولاہم الکوفی۔ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے حمزہ اسدی کے پاس قرأت کی تھی ان ساتوں میں بجز ابن عامر اور ابوعمرو کے کوئی عرب نہیں ہے۔

(الجواہر المضیۃ ص ۲۲۲-۲۲۳ ج ۲)

اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات محدثین پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کے نام سے اسناد و روایت کا کوئی بھی سلسلہ موجود نہ ہوتا۔ تو پھر بھی سنت اپنی جگہ ایسے ہی موجود ہوتی۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے۔ اس تاریخی اور روایتی سلسلہ سے پہلے بھی حدیث موجود تھی۔ اور اس کے بعد بھی موجود ہے۔ قرآن ہو یا سنت دونوں روایتی اور تاریخی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ ایک فکری اور علمی شاہکار ہے اس لیے وہ کتابی طور پر ہی متواتر ہے۔ اور سنت چونکہ ایک عملی چیز ہے۔ اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے۔ بلاشبہ اگر قرآن کا قرآن ہونا روایات قراء کا محتاج نہیں ہے تو سنت کا سنت ہونا بھی روایات محدثین کا محتاج نہیں ہے۔

اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ قرآن کے لیے ائمہ قرأت کی روایات بعد میں منصۂ وجود پر آئی ہیں۔ تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ سنت کے لیے بھی ائمہ حدیث کی روایات بعد میں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ تاریخ قرآن ہے۔ اور یہ تاریخ سنت ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے یہی بات کیسے لطیف انداز میں بیان فرمائی ہے۔

انما قولنا رواه البخاری کقولنا رواه القراء السبعة والقران منقول بنقل المواتر۔(۱)

''ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ایسا ہی ہے جیسا ہم کہیں کہ اسے ائمہ سبعہ قراء نے روایت کیا ہے۔ حالانکہ قرآن بتواتر منقول ہے۔''

اور یہاں تک فرما گئے:

لولم یخلق البخاری و مسلم لم ینقص من الدین شئی۔(۲)

''اگر بخاری اور مسلم پیدا نہ ہوتے تو دین میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔''

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دین میں جو چیز قرآن کے بعد حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سنت ہے حدیث نہیں ہے۔ حدیث تو تاریخ سنت کا نام ہے۔

معاملے کے اس پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ

(۱) منہاج السنۃ ص ۵۸ ج ۴ (۲) منہاج السنۃ ص ۵۸ ج ۴

قرآن کی حفاظت کے لیے جیسے دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ایک سینہ دوسرے صحیفہ۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح سنت کی حفاظت بھی دو طرح سے ہوئی ہے۔ ایک سینہ دوسرے عمل کا محسوس پیمانہ۔

چونکہ قرآن نازل ہی علم بن کر ہوا تھا۔ اس لیے اس کی حفاظت بھی علم ہی کی طرح سینہ اور صحیفہ سے ہوئی۔ اور سنت چونکہ اسی علم کے پرتو عکس کا نام تھا۔ اس لیے اس کی حفاظت عمل کی طرح سینہ کے ساتھ صحیفہ سے نہیں بلکہ رائے عامہ کی محسوس عملی زندگی کے ذریعے ہوئی صرف نوعیت کا فرق ہوا ورنہ نفس حفاظت تو قرآن و سنت دونوں کی ہوئی۔ اور نوعیت کا یہ فرق بھی خود قرآن و سنت کے باہمی فرق کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ قرآن سراسر علم کا نام ہے۔ اور سنت سراسر عمل اور کردار کا نام ہے۔ سنت سن سے ہے۔ سن الطریقۃ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں۔ سن فلان طریقاً من الخیر "فلاں نے نیکی کا کام کیا۔" اسی سے لفظ سنت طریقہ اور سیرت کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ جب یہ انسانی اعمال کے لیے بولا جاتا ہے۔ تو اس کے معنے شاہراہ عمل، طریق کار کے ہوتے ہیں۔ اسی سے ہے۔ سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب۔ "مجوسیوں سے اہل کتاب کا برتاؤ کرو۔"

تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ

اگرچہ لغت میں لفظ حدیث کا قریب قریب وہی مفہوم ہے۔ جو اردو میں بات کا ہے۔ مگر تاریخ سنت کے لیے یہ لفظ محدثین کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کے کاموں، عادتوں، باتوں اور حالتوں کے لیے قرآن میں اللہ پاک نے ایک سے زیادہ مقامات پر حدیث ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورہ ذرایات میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک واقعہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

هل اتاک حدیث ضیف ابراهیم المکرمین۔
کیا پہنچی تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے۔"
حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ فرمایا ہے۔

هل اتاک حدیث موسیٰ۔

''کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی۔''

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے لیے بھی قرآن میں لفظ حدیث آیا ہے۔

واذاسرا النبی الیٰ بعض ازواجه حدیثاً

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات

مزید براں یہ کہ اللہ پاک نے قرآن میں ایک مقام پر حضور انور کو حکم دیا۔

اما بنعمة ربک فحدث

جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن کی زبان میں دین کی نعمت کو پیش کرنے کا نام حدیث ہے۔ اللہ اکبر! امت کی علمی دیانت کو کن لفظوں میں سراہا جائے۔ جس نے اپنے رسول کی سنت کی تاریخی اور تعلیمی زندگی کے وقائع کے لیے قرآن سے الگ ہو کر نام بھی تجویز کرنا گوارا نہیں کیا۔

حدیث کا صحیح مقام

تشریحات بالا سے یہ امور واضح ہو گئے کہ:

- دین میں قرآن وسنت دونوں حجت ہیں۔ دونوں قطعی اور یقینی ہیں۔ دونوں کی حفاظت ہوئی ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو علم اور دوسرے کو عمل کی صورت میں امت کے پاس چھوڑا ہے۔ اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ دونوں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضور انورؐ کے بعد خلفائے راشدین نے دونوں کی حفاظت کی اور دونوں کی نشر واشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔
- حدیث تاریخ سنت کا نام ہے اور سنت شناسی کا ذریعہ ہے۔ اس کے فنکاروں کو محدثین کہتے ہیں اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا مقام دین کی زندگی میں کیا ہے؟ جنہوں نے منصب رسالت کی عظمت وعزت کو گھٹانے اور نبی کی سنت سے امت کا رشتہ

توڑنے اور سنت کی حیثیت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشتبہ بنانے کے لیے یہ بات گھڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف ایک ہی قسم کی وحی نازل ہوئی ہے۔ جو قرآن کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس سے الگ کسی قسم کی وحی کو ماننا یہودیت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی بنیاد پر سنت کی تقدیس کو داغدار بنانے کے لیے یہ عمارت بھی بنائی ہے کہ سنت چونکہ وحی نہیں ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک اجتہادی رائے ہے جسے قانونی لحاظ سے واجب الاتباع نہیں کہا جا سکتا۔ اس انداز فکر کی لغویت بالکل واضح ہے۔ کیونکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ وحی متلو کے علاوہ بھی بکثرت نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بلکہ خدا کے ہر پیغمبر پر وحی نازل ہوتی رہی ہے۔ جس پر خود عمل کرنا اور جس کی تعمیل پوری امت سے کرانا انبیاء علیہم السلام کے مقاصد بعثت میں شامل تھا۔

قرآن اور سنت میں فرق

لیکن وحی ہونے کے لحاظ سے قرآن وسنت میں علماء نے جو جوہری فرق بتایا ہے۔ وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے۔ اور قرآن کی بیان کردہ وحی کی قسموں میں قرآن وسنت دونوں کا مقام معلوم کر لیجئے۔

دراصل قرآن ہو یا سنت دونوں اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ وحی ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شان اعجاز بھی رکھتا ہے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا اہتمام فرمایا۔ برخلاف اس کے سنت چونکہ معجزہ نہ تھی۔ اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی ومطالب آپ پر نازل ہوئے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے۔ اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت مختلف ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کو مختلف طبائع اور مختلف مزاج کے لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا۔ اس لیے اس کے لفظوں کی بعینہ تلاوت کا حکم نہ تھا۔ بالفاظ دیگر قرآن وسنت میں وہی فرق ہے۔ جو دو زبان میں نامہ و پیام میں ہوتا ہے۔

امام الحرمین کا نظریہ

یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمین (۱) کے والد امام ابومحمد الجوینی سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریلؑ سے فرمائیں کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ اللہ سبحانہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں کام کرو۔ ایسے کرو۔ حضرت جبریلؑ رب العزت کا پیغام سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ بعد ازیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ قال له ماقال ربه ولم تكن العبادة تلك العبادة یعنی بات اللہ سبحانہ کی ہوتی ہے۔ اور عبادت حضرت جبریلؑ کی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے معتمد سے کہے کہ فلاں شخص سے کہو کہ بادشاہ کہتا ہے کام ٹھیک کیا کرو۔ فوج تیار رکھو۔ اس پیغام کو اگر قاصد اپنے الفاظ میں یوں پہنچا دے کہ سست مت ہو۔ محنت کرو اور فوجی نظام کو پامال نہ ہونے دو تو تعبیر کے اس اختلاف سے ادائے پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اور اسے فرض رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کا نام نہیں دیا جائے گا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ حضرت جبریلؑ سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر سناؤ اور اس کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں۔ اور بلا کم و کاست اور بغیر ردو بدل خط آ کر سنا دیتے ہیں اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔ (۲)

---

(۱)

(۲) حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے۔ ایک حنفی اور دوسرے شافعی۔ حنفی تو ابوالمظفر یوسف القاضی الجرجانی۔ اور دوسرے شافعی یعنی ابوالمعالی عبدالملک ابن الامام ابومحمد عبداللہ بن الجوینی المتوفی ۴۷۸ھ ہیں چونکہ آپ کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ قیام رہا۔ اور آپ نے دونوں جگہ تدریس و افتاء کا کام کیا۔ اس لیے آپ کو امام الحرمین کہتے ہیں۔ امام غزالی نیشاپور میں تشریف لائے تو امام الحرمین ہی کے پاس رہے۔ اور ان کی ہی محنت سے امام غزالی ہر فن مولا بن گئے۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ جن کے غزالی شاگرد ہوں خود ان کی جلالت علمی کا کیا حال ہوگا۔

حافظ جلال الدین السیوطی کی تائید

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ دوسری قسم قرآن اور پہلی قسم سنت ہے۔ اور امام جوینی کے نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں۔

وقد رایت من السلف مایعضد کلام الجوینی (۱)

"میں نے سلف سے ایسی چیز دیکھی ہے جس سے جوینی کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔"

گویا قرآن یعنی نامہ اپنے الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ سنت معجزہ نہیں ہے۔ قرآن میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ لیکن سنت یعنی پیام روایت بالمعنے ہے۔ یعنی اصل مقصود مولیٰ سبحانہ کا ہے۔ اور الفاظ کا جامہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہے۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ چونکہ سنت کا آغاز ہی روایت بالمعنی سے ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز ہے۔ اور قرآن پہلے ہی چونکہ روایت باللفظ میں وحی ہوا ہے۔ اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ پیام میں اگر پیامی آپ کا منشا اور مافی الضمیر صحیح طور پر مرسل الیہ تک پہنچا دیتا ہے تو پیام رسانی کا مقصد حاصل ہو گیا خواہ پیغام رساں اسے آپ کے الفاظ میں نہ پہنچائے بلکہ اکثر اوقات اس کے لیے الفاظ میں تبدل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن نامہ (۲) کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ان ہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر قاصد نے بیچ میں خط کو چاک کر ڈالا اور اسی مضمون کا دوسرا خط تحریر کر دیا یا اس کا مطلب ہی بالکل ٹھیک ٹھیک زبانی جا کر بیان کر دیا تو وہ کسی طرح اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا بلکہ الٹا خیانت کا ملزم اور بد دیانتی کا مرتکب ٹھہرا۔

---

(۱) ۔ الاتقان فی علوم القرآن ص ۴۴ ج ۱

(۲) علماء نے تصریح کی ہے کہ قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ باقی صفحہ ۱۳۴ پر

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے مگر اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے جس میں الفاظ کی بعینہ ادائیگی ضروری نہیں ہے اور قرآن حکیم کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل لفظ ہیں جو روح القدس کے ذریعے حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور آپ کے ذریعے امت تک پہنچے۔ ان میں نہ روایت بالمعنی کی اجازت ہے نہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اختیار۔ ہاں ترجمہ وتفسیر کی اجازت ہے لیکن اسے کلام الٰہی نہ کہا جائے گا۔ یہ بات بھی خود قرآن ہی کی بیان کردہ حقیقت ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

اذا قرأناه فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانه۔

''جب ہم پڑھیں تو ساتھ رہ اس پڑھنے کے بلاشبہ ہمارے ذمے ہے اس کا بیان۔''

یہاں دعویٰ یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد کا بیان بھی اللہ سبحانہ کے ذمے ہے۔ اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے کوئی علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لیے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی ضرورت ہوگی اور یہ

﴿بقیہ صفحہ ۱۳۳﴾

درایہ میں ہے۔ ان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعا۔ ابوالحسن مرغینانی رقمطراز ہیں۔ انا امرنا بحفظ اللفظ والمعنی فانه دلالة علی النبوة شرح اول میں علامہ عبدالعزیز بخاری لکھتے ہیں۔ القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً۔ ان تصریحات کا مقصد یہی بتانا ہے۔ کہ قرآن کی حیثیت نامہ کی ہے۔ نہ کہ پیام کی اسی بنا پر ترجمہ قرآن کو ہم نہیں کہہ سکتے۔ آلوسی لکھتے ہیں۔ فلاشک ان الترجمة لیست بالقرآن ۔نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم ہے نہ کہ ترجمہ قرآن کا۔ فاقرء وا ما تیسر من القرآن۔ اور قرآن نام ہے نظم ومعنی دونوں کا۔

سلسلہ ایک غیر متناہی ہو جائے گا۔ ماننا پڑے گا کہ بیان قرآن خود قرآن سے الگ ہے۔ جو قرآن نہیں ہے۔ اگر قرآن سے الگ ہے تو اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے۔ اور بذریعہ وحی ہے۔ یہ وحی جس کے ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے۔ کون سی ہے؟ خود قرآن نے نزول وحی کی تین صورتیں بتائی ہیں۔

ماکان بشرٍ ان یکلمه' الله الا وحیاً اومن وراء حجاب اویرسل رسولاً فیوحی باذنه مایشاءُ انه' علی حکیم۔

''کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے یا پردے کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچادے اس کے حکم سے جو وہ چاہیے۔ تحقیق وہ سب سے اوپر ہے حکمتوں والا۔''

- وحی۔
- **من وراءِ حجاب۔**
- **یرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاءُ۔**

نزول قرآن کے لیے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ تیسری ہے یعنی بواسطۂ فرشتہ اللہ سبحانہ وحی فرمائیں مگر فرشتہ آنکھوں سے نظر نہ ملائے بلکہ براہ راست نبی کے قلب پر فرشتہ کا نزول ہو۔ یہی صورت ہے۔ جسے حدیث میں **یاتینی مثل صلصلة الجرس** سے تعبیر فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ تر وحی اس طرح آتی تھی۔ اسی صورت کو حافظ سیوطی نے اصوب الحالین بتایا ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں۔ کہ نزول قرآن اس طرح ہوا ہے۔ کہ فرشتہ اللہ سبحانہ سے روحانی طور پر وحی حاصل کرتا ہے۔ اور اسے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے۔ اور آپ کو القاء کرتا ہے اس صورت میں یقیناً بیان قرآن کا نزول نہیں ہوا ہے۔ ایسی ہی وہ صورت نہیں ہے جسے قرآن میں **من وراء حجاب** کہا ہے۔ نزول بیان کے لیے اگر کوئی صورت ہے تو تیسری ہے جسے قرآن وحیاً کہہ رہا ہے جس میں **نفث فی الروع** 'الہام اور رویائے صادقہ سب داخل ہیں۔

حضرت امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے الرسالہ (۱) میں اب نہیں بلکہ اب سے بارہ سو سال پہلے بتا دیا ہے کہ نہ صرف سنت قرآن کا بیان ہے۔ اور یہ بیان اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ کلام الٰہی کی تین صورتوں میں سے جس صورت میں سنت آپ پر نازل ہوئی ہے۔ وہ وہی ہے جسے قرآن نے وحیاً کہا ہے۔ اور جس میں **نفث فی الروع** یا اراءت وغیرہ داخل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

الـقى فى روعه كل ماسن و سنته الحكمة الذى القى فى روعه من الله فكان بما القى فى روعه سنته۔

''آپ کی تمام سنت آپ پر القاء کی گئی۔ سنت ہی وہ حکمت ہے۔ جو آپ پر القاء ہوئی لہٰذا سنت نبوی اللہ سبحانہ کی جانب سے القاء شدہ ہے۔''

۱۔ الرسالہ۔ یہ اصول فقہ میں امام شافعی کی لکھی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ انصاف میں رقمطراز ہیں۔ مختلف نصوص میں مطابقت کرنے کے لیے قواعد نہ تھے۔ اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا۔ حضرت امام شافعی نے اس کے قواعد بتائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ **وهذا اول تدوين كان فى اصول الفقه۔** (ص ۲۸)

دراصل یہ کتاب امام شافعی نے امام عبدالرحمن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعی کے مشہور شاگرد ابوثور کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کہ امام عبدالرحمن بن مہدی نے امام شافعی کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں اور جس میں اخبار و احادیث کی اقسام حجت اجماع اور کتاب و سنت کے ناسخ و منسوخ کا تذکرہ ہو۔ امام ابوثور فرماتے ہیں۔ فوضع الرسالۃ۔ اس درخواست کے مطابق امام شافعی نے الرسالہ لکھا۔ (تاریخ بغداد ص ۶۵ ج ۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی توالی التاسیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے

كتب عبدالرحمن بن مهدى الى الشافعى وهو شاب ان يضع له كتابا فوضع له كتاب الرسالة۔ (ص ۵۵)

قرآن میں حکمت سے مراد سنت ہے

یہ صرف امام شافعی کی رائے نہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے بلکہ قرآن کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمت سے مراد سنت ہے۔ قرآن میں آپ کو ایک متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی قرآن کی طرح اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ سورۂ نساء میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم۔

''اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا۔''

سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا ہے:

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ۔

''اور یاد کرو اللہ کا حساب تم پر ہے اور اس کو کہ جو اتاری تم پر کتاب اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ۔''

ان آیات میں اور اس طرح کی دوسری آیات میں کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے۔ کیونکہ حکمت کا ذکر قرآن کے ساتھ آیا ہے۔ چنانچہ امام شافعی نے اپنے ایک مناظرے میں اسے دلائل سے ثابت کیا ہے اور جب ان سے پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اس قسم کی آیات میں حکمت سے کیا مراد ہے آپ نے جواباً فرمایا کہ:

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا کہ اس کا بھی امکان ہے کہ **یعلمھم الکتاب والحکمۃ** کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ اور خصوصی طور پر حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہوں۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایسے ہی بیان کرتا ہے جیسا کہ اس نے ان کے سامنے تمام فرائض نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ کو پیش کیا ہے اور اس طرح گویا خود اللہ

نے کتاب کے ذریعے فرائض کو محکم بتا دیا ہے۔ اور اللہ نے خود ہی بیان کر دیا کہ یہ فرائض زبان نبوت پر کیسے ہیں؟ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اگر یہی مطلب ہے تو پھر اس کا پتہ بغیر خبر نبی کے کیسے ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی ارشادات نبوت کی ضرورت ہو گی۔ سائل بولا اگر کتاب و حکمت دونوں سے مراد ایک چیز ہو اور کلام میں صرف تکرار ہی ہو۔ امام شافعی نے فرمایا یہ آپ ہی بتائیے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے کتاب وحکمت دونوں الگ ہوں یا دونوں کا مطلب ایک ہو۔ سائل نے جواب دیا دونوں کا احتمال ہے چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت ہو جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعی نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے۔ جیسا کہ میرا خیال ہے۔ اور اس پر قرآن میں شہادت ہے سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے۔ امام شافعی نے جواب میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ (۱)

سورۂ احزاب کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوتی تھی۔ اور تلاوت کا مطلب جیسا کہ امام شافعی نے بتایا ہے یہ ہے کہ:

انما معنی التلاوۃ ان ینطق بالسنۃ کماینطق بالقرآن۔

''تلاوت کے معنے یہ ہیں کہ سنت کو بھی ویسے ہی بولا جاتا ہے۔ جیسے قرآن کو۔''

ذرا سوچئے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کے سوا کیا سناتے تھے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ آپ کی سنت تھی اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے تذکر کا حکم ہے۔ اس لیے اسی آیت سے سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ

---

(۱) کتاب الام: جلد ۷ص ۲۵۱

بات بھی بدیہی ہے کہ علم وذکر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ عمل کے لیے مقصود ہیں۔ اس لیے اسی آیت سے سنت پر عمل کا وجوب بھی معلوم ہو گیا۔ اور جب سنت کا دوسرا نام حکمت ہے۔ تو ان آیات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن ہی کی ان تصریحات کی بنا پر تمام ائمہ اور علمائے سلف اس پر متفق ہیں۔ کہ **یعلمهم الكتاب والحكمة** اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد سنت ہی ہے۔ اور سنت بھی وحی الٰہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں۔ (۱)

اللہ سبحانہ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن و حکمت ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے وہی آیات پیش فرمائی ہیں جن میں کتاب وحکمت کی تنزیل وتعلیم کا ذکر ہے۔ ان آیات کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے پا کر جو خبر دی اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس کا انکار وہی کرے گا۔ جو ان میں سے نہیں ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی گئی یعنی سنت۔ (۲)

پھر یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان کو اپنا بیان بتایا ہے۔ مگر قرآن میں دوسری جگہ قرآن کے پڑھنے اور قرآن کے بیان کو حضورؐ کا کام بتایا ہے۔ لتقرأه علی الناس علیٰ مکث یعنی تاکہ آپ پڑھیں لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ اور انزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ بیان کر دے تو لوگوں کے سامنے وہ چیز جو

---

(۱) کتاب الروح: ص ۹۲ (۲) کتاب الروح: ص ۹۲

اتاری گئی ہے۔ ان کی طرف اس آیت میں للناس اور مانزل الیھم لاکر یہ بتایا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کی نبوت کے بیان کے ذریعے کتاب الٰہی کا منشا صاف اور واضح ہو کر آئے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر روانہ فرمایا تاکہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے۔ ان پر وہ کتاب اتاری جو عمل کرنے والوں کے لیے سراسر نور و ہدایت ہے۔ اور اپنے نبی کو یہ حق دیا ہے۔ کہ وہ قرآن کے ظاہر، باطن، خاص، عام اور ناسخ، منسوخ بتائیں۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب اللہ کے مفہوم و معنے کے مبین تھے۔ اس کام کو صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کو اللہ نے اپنے نبی کی رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان اور توضیح نقل کی ہے اس مشاہدہ کی وجہ سے وہی سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے والے اور اس بات سے واقف تھے کہ قرآن کی آیت میں اللہ کی مراد کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کی مراد بتانے والے صرف صحابہ کرام ہیں۔ (۱)

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ:

جو حدیثیں صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں۔ نیز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اس کو اپناتے ہیں۔ (۲)

حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی سند سے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے اس سے بھی حدیث کے قرآن کا بیان ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ذریعے مشہور ہوئی ہوں اور اگر یہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ میں جس کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں۔ (۳)

(۱) طبقات ابن جوزی ص ۳۲۵ (۲) الانتقاء ص ۱۴۲ (۳) مناقب از حافظ ذہبی ص ۲۰

صرف یہی نہیں بلکہ کئی دوسرے مواقع پر بھی انہوں نے فرمایا ہے۔ کہ فقہ اسلام اور قوانین اسلام تک پہنچنے کے لیے سنت ضروری ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے ایک سے زیادہ ارشادات میں اتباع رسول کا حکم دیا ہے اور حکم بھی اس بارے میں مطلق اور بے قید ہے۔ یعنی اتباع کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی خاص گوشے کی تعیین نہیں کی۔ یہ ایک طرف اگر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذات نبوت زندگی کے ہر گوشہ میں واجب الاتباع ہے تو دوسری طرف اس میں اس بات کی بھی رہنمائی ہے کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں معصوم ہوتا ہے جیسے آپ کی زندگی میں آپ کی پیروی ضروری تھی۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ارشادات، اخلاق، اعمال اور احوال کی روشنی میں زندگی کا نقشہ تیار کرنا ضروری ہے۔ غرض سنت قرآن کا بیان ہے۔ اس کے مجمل کی تبیین ہے۔ اس کے معنے کی توضیح و تائید کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ:

- اول: قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی شرح کی ہے۔ پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کے اقرار و انکار کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اس کا بیان بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک ماانزل اللہ (جو کچھ اللہ نے اتارا) اور دوسرا ما اراک اللہ (جو کچھ تم کو اللہ نے دکھایا) ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔
- دوم: یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے مفسر تھے۔ آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ آیات قرآن کی تفسیر و تاویل کرے۔ اس لیے صرف سنت ہی قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان سنت کے علاوہ کسی دوسری راہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔
- سوم: یہ کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اثر مروی نہ ہو تو صحابہ تفسیر کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے قرآن اترا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات قرآنی کی تاویل سنی اور جو سنت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔

بہرحال سنت بھی اللہ پاک کی وحی ہے مگر اس کی حیثیت پیام کی ہے اور قرآن بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے اور اس کی حیثیت نامہ کی ہے۔ سنت میں روایت بالمعنی جائز ہے مگر قرآن میں روایت بالمعنی جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں اعجاز کے ساتھ شان تعبد بھی ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین (۱) السیوطی فرماتے ہیں۔

والسر فی ذالک ان المقصود منه التعبد و الاعجاز به (۲)

''راز اس میں یہ ہے کہ قرآن سے مقصود تعبد اور اعجاز ہے۔''

---

(۱) جلال الدین لقب، ابوالفضل کنیت، عبدالرحمٰن بن الکمال نام ہے۔ اتوار کے دن یکم رجب ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا بعد ازاں علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی کاشغری نے طبقات میں خود ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ تین سو اساتذہ سے علمی استفادہ کیا ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم وفنون سے نہ صرف فارغ ہو چکے تھے بلکہ میدان تالیف میں بھی قدم زن ہو گئے تھے۔ عربی ادب اور حدیث میں علامہ تقی الدین شبلی حنفی کے شاگرد ہیں۔ چھ علموں میں اجتہادی شان رکھتے تھے: تفسیر ○ حدیث ○ فقہ ○ نحو ○ معانی ○ بیان۔

ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ اپنے تئیں اجتہاد کے مدعی تھے۔ مگر فرماتے تھے۔ کہ اجتہاد دو قسم کا ہوتا ہے۔ اجتہاد مطلق ○ اجتہاد نفسی۔

اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہے۔ اور دوم تا قیامت باقی ہے اور مجتہد منتسب ہونے کا ان کو دعویٰ تھا۔ ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق مسئلہ بتاتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ پوچھنے والا مذہب دریافت کرتا ہے میرا اجتہاد نہیں پوچھتا۔ اللہ اکبر! اللہ کے دین میں کس قدر احتیاط ہے۔ تبییض الصحیفہ کے نام سے امام اعظم کے مناقب پر کتاب لکھی ہے ۹۱۱ھ میں بعمر ۸۱ سال دس ماہ گیارہ دن وفات پائی۔ (اتحاف)

(۲) الاتقان فی علوم القرآن ص ۴۴ ج ۱

برخلاف سنت کے کہ اس کے الفاظ میں اعجاز نہیں بلکہ اس کے معانی میں شان تعبد ہے۔ اور سنت معنی ہی کے لحاظ سے متواتر بھی ہے۔ چنانچہ علامہ الجزائری رقمطراز ہیں۔

المرجح انه ليس في السنة متواتر الا التواتر في المعنى دون اللفظ۔(۱)

''راجح یہی ہے کہ سنت میں تواتر لفظی نہیں بلکہ تواتر معنوی ہے۔''

صرف عمل کے لیے معنی ہی کے متواتر ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں نہ تعبد ہے اور نہ اعجاز۔ اسی بنا پر متواتر سے بحث کرنا محدثین کا کام نہیں ہے۔

ان المحدثين لا يبحثون عن المتواتر لا ستغنائه بالتواتر عن ايراد سنده۔(۲)

''محدثین کے یہاں متواتر سے کوئی بحث نہیں ہوتی کیونکہ تواتر کو سند کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔''

اس موقعہ پر حافظ ابن تیمیہؒ بڑے پتے کی بات لکھ گئے فرماتے ہیں۔ کہ اس مقام پر دو اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

- قرآن اپنے الفاظ اور معانی میں ایک ایسی امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس میں کوئی کلام بھی کسی طرح اور کسی درجے میں قرآن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا نہ الفاظ میں اور نہ معنے میں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی غیر عربی میں قرأت ناجائز ہے۔ کیونکہ غیر عربی میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ ہے مگر قرآن ہرگز نہیں ہے۔ قرآن تو نظم اور معنے دونوں کا نام ہے۔ ترجمہ اگرچہ درست ہے مگر قرآن کی طرح اس کی قرأت وتلاوت ہرگز جائز نہیں۔
- قرآن میں الفاظ کے ساتھ معنی کی بھی ایک ایسی نمایاں حیثیت ہے کہ کوئی کلام بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے معنوی اعجاز میں یادہ قوت ہے۔ قرآن کی اس آیت میں جو تحدی کی گئی ہے وہ ہر قسم کے اعجاز کے پیش نظر کی گئی ہے۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن على ان ياتوا بمثل هذا القران لا ياتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيراً۔(۳)

---

(۱) توجیہ النظر: ص ۴۷ (۲) توجیہ النظر: ص ۶۴ (۳) رسالہ تسعیدیہ ص ۲۱۵

امام خطابی فرماتے ہیں:

کلام کی جان تین چیز ہیں۔ لفظ معنے اور نظم۔ قرآن ان تینوں میں بہت بلند اشرف اور افضل مقام رکھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ سے زیادہ فصیح، مختصر اور شیریں الفاظ آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ قرآن کا نظم اپنی مثال آپ ہے۔ حسن تالیف قرآن کی ذاتی خوبی ہے۔ معانی کے لحاظ سے عقلاء نے ہمیشہ قرآن کا لوہا مانا ہے۔ یہ تینوں خوبیاں الگ الگ تو ایک سے زیادہ مقامات پر موجود ہیں مگر یہ ساری خوبیاں یک جا قرآن کے سوا کہیں موجود نہیں ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ الفاظ کی سطح موتیوں سے لدی ہوئی ہے جس کی نظم کی تہہ میں سوتیں بہہ رہی ہیں اور گہرائی سے معانی اُبل رہے ہیں۔(۱)

اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق

اسی بنیادی اور جوہری فرق کو بتانے کے لیے قرآن میں وحی کے متعلق دو قسم کی حکم ہیں:

کہیں وحی الٰہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے۔ اور کہیں وحی الٰہی کی تلاوت کا حکم ہے مگر قرآن نے ان دونوں میں ایک جوہری فرق قائم رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت کا حکم ہے۔ وہاں مااوحی کے ساتھ الکتاب کی قید ضرور لگائی ہے۔ مثلاً اتل مااوحی الیک من کتاب ربک اور اتل ما اوحی الیک من الکتاب یا اسی قسم کے دوسرے مقامات، لیکن جہاں وحی کی اتباع کا مطالبہ ہے وہاں لفظ کتاب کو ہٹا دیا گیا مثلاً اتبع مااوحی الیک من ربک اور ان اتبع الا مایوحی الیک واصبر اور اتبع مایوحی الیک من ربک اور ان اتبع الا مایوحی الی من ربی اور لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا مایوحی الی۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے۔ لفظ کتاب نہیں لایا گیا۔

---

(۱) توجیہ النظر ص ۶

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں نے اپنے مطالعہ قرآنی میں یہی محسوس کیا ہے کہ قرآن یہ جتانا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آئی ہے۔ وہ کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور اس کے لفظوں میں اعجاز کے ساتھ شان تعبد بھی ہے۔ غیر کتابی وحی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے۔ اور اتباع کا دائرہ کتابی اور غیر کتابی وحی کے لیے عام ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ابی سعیدؓ کا منشاء

اس روشنی میں صحیح مسلم کی حدیث کا منشاء بھی واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت منقول ہے:

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہٗ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمد افلیتبوا مقعدہ من النار۔

''مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹا دے۔ مجھ سے حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس شخص نے میرے متعلق ارادتاً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنالے۔''

اگرچہ امام بخاری اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی (۱) فتح الباری میں لکھتے ہیں:

---

(۱) شہاب الدین لقب ابوالفضل کنیت احمد بن علی بن محمد بن علی الکنانی العسقلانی نام ہے۔ تاریخ پیدائش ۷۷۳ھ ہے ابن حجر سے مشہور ہیں۔ سیوطی طبقات میں رقمطراز ہیں کہ حافظ عراقی سے وفات کے وقت دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہے فرمایا کہ ابن حجر پھر ابوزرعہ نے نظم العقیان فی اعیان الاعیان میں ان کا تذکرہ اس طرح شروع کیا ہے۔ فریدہ زمانہ حال لواء السنۃ ذھبی ھذا العصر نضارہ وجوھرہ الذی ثبت بہ علی کثیر من الاعصار فخارہ امام ھذا الفن للمقتدمین و مقدم عساکر المسلمین وعمدۃ الوجود فی التوھین والتصحیح۔ ﴿باقی صفحہ ۱۴۶ پر﴾

منهم من اعل حديث ابی سعيد وقال الصواب وقفه علی ابی سعيد قاله البخاری۔

"کچھ لوگوں نے حدیث ابی سعید کو طول قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ابی سعید ہے۔"

یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ خود ابو سعید خدریؓ کے ہیں۔ جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کر دیا ہے لیکن بالفرض اگر اس روایت کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ممانعت وقتی اس لیے تھی کہ قرآن کے الفاظ میں تعبد ہے قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں جس کے الفاظ میں تعبد ہو اور تعبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو۔ خود اندازِ بیان بول رہا ہے۔ کہ مقصود یہی ہے فرمایا ہے **لا تكتبوا عنی غير القرآن** لفظ غیر عربی اسالیب میں اپنا موصوف چاہتا ہے۔ اس لیے عبارت یوں ہے۔ **لاتكتبوا عنی قرانا غير القران**۔ یعنی مجھ سے تلاوت کی چیز قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ اس ارشاد میں قرآن کی شانِ تعبدی کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تائید خود حضرت ابو سعید خدریؓ کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ جو حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں

عن ابی نضرة قل قلت لابی سعيد الخدری الا نكتب مانسمع منك قال اتريدون ان تجملوها مصاحف۔

"ابو نضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید سے دریافت کیا کہ کیا ہمیں آپ سے سنی ہوئی احادیث کو لکھنے کی اجازت ہے فرمایا کیا تم ان کو مصاحف بنانا چاہتے ہو۔"

(بقیہ صفحہ ۱۴۵) حافظ زین العراقی، الشیخ سراج الدین البلقینی، الشیخ برہان الدین الانباسی، علامہ عزالدین بن جماعہ علامہ مجد الدین فیروز آبادی جیسے اساطین علم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف میں فتح الباری شرح صحیح بخاری بڑے معرکہ کی شرح ہے۔ حافظ سیوطی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ اولین و آخرین میں اس جیسی کتاب نہیں ہے۔

ابونضرہ ؒ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے اس سوال کے جواب میں کہ ہمیں لکھنے کی اجازت دیجئے یہ بھی نقل کیا ہے۔

قال اردتم ان تجعلوه قرانا لا لا (۱)

''فرمایا کیا تم نے اسے قرآن بنانے کا ارادہ کیا ہے نہیں نہیں۔''

یہاں ڈاکٹر صبحی صالح استاذ اسلامیات دمشق یونیورسٹی کی رائے ہے۔ کہ ابو سعید خدریؓ کی روایت میں لکھنے کی جس ممانعت کا تذکرہ ہے۔ اس کا پس منظر زمانہ نزول وحی میں وحی اور اس کی تشریح میں التباس کا اندیشہ ہے۔(۲)

معالم السنن میں علامہ خطابی نے اس ممانعت کے عملی مصداق کی توضیح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سنت کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے۔ کہ اختلاط نہ ہو اور پڑھنے والے کے لیے سامان اشتباہ نہ ہو۔ علامہ خطابی کے اپنے الفاظ یہ ہیں

انما نهى ان يكتب الحديث مع القران فى صحيفة واحدة لئلا يختلط به ولیشتبه على القارى (۳)

''ایک صحیفہ میں قرآن کے ساتھ حدیث لکھنے سے اس لیے منع کیا تا کہ التباس نہ ہو اور قاری پر مشتبہ نہ ہو۔''

رامہرمزی نے المحدث الفاصل میں حدیث ابی سعید خدریؓ کا ذکر کر کے لکھا ہے

فاحسبه انه كان ممنوعاً فى اول الهجرة وحين كان لا يومن الاشتغال به عن القران (۴)

''میرا خیال ہے کہ آغاز ہجرت میں ممنوع تھا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اس میں لگ کر قرآن سے ہٹ جانے کا امکان تھا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت آغاز ہجرت میں ہوئی ہے اور معلوم ہے کہ ابو سعید خدریؓ ۳ھ میں جنگ احد میں اتنے کم عمر تھے کہ فوج میں بھرتی ہونے کے شوق میں آئے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔

---

(۱) جامع بیان العلم: ص ۶۴ ج ۱ (۲) علوم الحدیث: ص ۸

(۳) معالم السنن: ص ۱۸۴ ج ۴ (۴) تعلیق علوم الحدیث: ص ۹

یہاں اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک اور حدیث پیش نظر ہو تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت تشریف لائے جب ہم حضور انور کی باتیں لکھ رہے تھے۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا وہ باتیں جو ہم نے آپ سے سنی ہیں۔ فرمایا کیا تم کتاب اللہ کے سوا کوئی اور کتاب چاہتے ہو؟ تم سے پہلے امتوں کو اس کے سوا کسی چیز نے نہیں گمراہ کیا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ دیگر کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔ (۱)

ایک اور روایت اسی کے ہم معنے ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس مماثل حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ۷ھ یا اس کے بعد ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بہت ہی عجیب وغریب تقریر فرمائی ہے۔ یمن سے نو مسلموں کی ایک جماعت مدینے آئی ان میں کئی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو قرآن حکیم کی سورتیں یاد کرنے کے لے دی گئیں کہ پڑھیں اور یاد کریں۔ جب ان لوگوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سنی تو حسن عقیدت سے یہ تقریر بھی لکھ لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نے قرآن کے ان ہی اوراق پر جو انہیں یاد کرنے کے لیے دیئے گئے تھے لکھ لی۔ (۲)

اس بنا پر حضور انورؐ نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔ اور اسی موقعہ پر یہ بات فرمائی گئی **لاتکتبوا عنی غیر القران من کتب عنی غیر القران فلیمحه۔**

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل (۲) مقدمہ صحیفہ ہمام بن منبہ باختصار

حضرت ابو سعید خدریؓ نے حضور انورؐ کا یہی ارشاد حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا تو اسے بطور ارشاد نبوت بیان فرما دیا۔ شاید اسی علت دقیقہ کے پیش نظر امام بخاری نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔

اس صورت میں علت ممانعت صرف اختلاط اور قرآن وغیر قرآن کا التباس ہے۔ اس لیے یہ ان احادیث کے معارض نہیں ہے جن میں احادیث لکھنے کی صریح اجازت ہے۔ مثلاً جامع بیان العلم، تقیید العلم اور المحدث الفاصل میں حضور انورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ:

قیدوا العلم بالکتاب۔

''علم کو کتاب سے مقید کرو۔''

یا تدریب الراوی میں یہ واقعہ کہ:

عن رافع بن خدیج انه قال قلت یا رسول الله انا نسمع منک اشیاء افنکتبها قال اکتبوا ولا حرج۔(۱)

''رافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ سے کچھ سنتے رہتے ہیں کیا ہمیں لکھنے کی اجازت ہے فرمایا لکھو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

علامہ احمد محمد شاکر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

اگر حدیث ابی سعیدؓ ان احادیث کے بعد میں ہوتی تو تمام صحابہ کو پتہ ہوتا۔ پوری امت کا اس پر مجتمع ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ فیصلہ یہی ہے اور اجماع تواتر عمل سے ثابت ہے۔''(۲)

اور پھر جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے۔ وہ اس میں صاف اور صریح موجود ہے کہ حدثوا عنی مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو۔ ممانعت تو دراصل قرآن کے سوا کسی دوسری چیز کے لکھنے کی اس بناء پر کی گئی تھی کہ قرآن سے باہر کسی دوسری وحی میں نہ اعجاز ہے اور نہ شان تعبد۔ ورنہ نفس حدیث بیان کرنے کی اجازت تو خود ابو سعید خدریؓ کی یہ حدیث بھی دے رہی ہے اور کتابت ہی کے متعلق دوسری احادیث میں صاف اجازت آئی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

---

(۱) تدریب الراوی ص ۱۵۰　(۲) الباعث الحدیث ص ۱۳۳

ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رہتیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرتؐ سے کی کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ مگر میں انہیں یاد نہیں کر سکتا اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو اور اپنے دست مبارک سے ان کو لکھنے کا اشارہ فرمایا۔(۱)

سنن ابی داؤد (۲) اور مسند دارمی (۳) میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ:

---

(۱) جامع ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ فی کتابۃ العلم

(۲) سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر نام ابو داؤد کنیت۔ عرب کے مشہور قبیلہ ازد سے نسبی تعلق کی وجہ سے ازدی اور سجستان میں بود و باش کی وجہ سے سجستانی ہیں۔ سجستان دراصل مشہور مقام سیستان کی تعریب ہے۔ تاریخ ولادت ۲۰۲ھ ہے۔ امام احمد قعنبی ' ابو الولید طیالسی' مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ علامہ شیخ ابو اسحاق الشیرازی نے طبقات میں ان کو حنبلی قرار دیا ہے ان پر فقہی ذوق بہ نسبت دوسرے محدثین کے زیادہ غالب تھا۔ اسی لیے ان کی کتاب میں صرف احادیث ہیں اور فقہی احادیث کا جتنا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی المتوفی ۷۰۸ھ رقمطراز ہیں۔ احادیث فقہ کی حصر و استیعاب میں جو بات ابو داؤد کو حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح کو نہیں۔ ان کی وفات جمعہ کے دن ۱۶ شوال المکرم ۲۷۵ھ ہیں عمر ۷۳ سال ہوئی اور بصرہ میں دفن ہوئے۔

(۳) عبداللہ بن عبدالرحمٰن نام' ابو محمد کنیت' عرب کے قبیلہ دارم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے دارمی۔ سمرقند میں رہائش کی وجہ سے سمرقندی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۸۱ھ ہے۔ یزید بن ہارون (جو کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں) جعفر بن عون وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ امام مسلم' ابو داؤد' ترمذی اور محمد یحییٰ ذہلی نے ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ خراساں میں چار شخص حفاظ حدیث ہیں۔ ابو زرعہ' محمد بن اسماعیل بخاری۔ دارمی۔ حسن بن شجاع بلخی۔ عرفہ والے دن جمعرات کو بمقام مرو ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا۔ حفظ کرنے کے لیے اس کو لکھ لیتا تھا۔ پھر قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں غصہ میں بھی کلام فرماتے ہیں۔ اور خوشی میں بھی۔ یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آنحضرتؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنی انگشت سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم لکھو۔ قسم ہے۔ اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اس سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا۔ (۱)

یہ احادیث بتا رہی ہیں کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں آمدہ ممانعت خاص تھی اور خصوصیت یہی تھی۔ کہ الفاظ کا تعبد تلاوت کی حیثیت میں قرآن سے باہر کسی چیز میں نہیں ہے۔ اور قرآن و حدیث دونوں کی یہ حیثیتیں آج بھی قائم ہیں۔ اس لیے روایت ابی سعیدؓ ان روایات سے معارض نہیں جن میں کتابت کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔

اگرچہ علماء نے یہ فرض کر کے ابو سعیدؓ کی روایت معارض ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی جوابات دیے ہیں۔ مثلاً

- اول: یہ کہ حدیث ابی سعیدؓ موقوف ہے۔
- دوم: یہ کہ ممانعت خاص اس شخص کے لیے تھی جس کے حافظہ پر پورا اعتماد تھا۔
- سوم: یہ کہ ابو سعیدؓ کی حدیث منسوخ ہے۔

علامہ احمد محمد شاکر کا اصرار ہے کہ آخری جواب درست ہے۔ اور دوسرے علماء نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے۔ علامہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشے کے پیش نظر تھی۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں قرآن نے ابھی گھر نہیں کیا تھا اور حفاظ خال خال تھے۔ جب قرآن سے رائے عامہ میں پختگی پیدا ہوگئی اور قرآن کے اسالیب' کمال بالغت اور حسن نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیازی ملکہ پیدا ہو گیا کہ قرآن اور غیر قرآن میں امتیاز کرنے لگے اور التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی۔ (۲)

---

(۱) جامع بیان العلم: ص ۶۴ ج ۱ (۲) توضیح الافکار: ص ۲۶۵

لیکن حدیث ابی سعیدؓ کا جو محل ہم نے بتایا ہے اس کو مانتے ہوئے تعارض کا سوال ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کراہت کتابت پر استدلال کیا ہے۔ یہ ان کی رائے ہے۔ ارشاد نبوت کا یہ مصداق نہیں ہے۔ اس کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ جو خود کتابت حدیث کے سلسلے میں ایک سے زیادہ زمانہ نبوت میں پیش آئے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پورے دین کی حفاظت کے لیے وہی آسان طریقہ اختیار کیا گیا جو اس دور میں اہل عرب کا فطری اور رائج الوقت طریق تھا۔ قرآن حکیم جو دین کی تمام بنیادی اور اساسی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا علمبردار ہے۔ اس کا لفظ لفظ لوگوں نے نوک زبان کیا۔ مزید احتیاط کے لیے خود حضور اقدسؐ نے معتبر کاتبوں سے اس کو لکھوایا حدیث جو شریعت اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات کا نام ہے۔ اس کا قولی حصہ صحابہ نے اپنی عادت کے موافق اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے شاعروں کے قصیدے اور حکما کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے پر فوراً عملدرآمد شروع کر دیا گیا ظاہر ہے کہ اس وقت میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کو جب قرآن حکیم کا کافی حصہ نازل ہو چکا۔ اور عموماً آدمی قرآنی ذوق سے آشنا ہو گئی۔ ادھر غزوہ بدر کے بعد مدینے میں بہت سے لوگوں نے لکھنا سیکھ لیا۔ تو پھر حدیث کے لکھنے کا سلسلہ بھی جستہ جستہ زمانہ نبوت ہی میں شروع ہو گیا جہاں تک ان واقعات کی تفصیل کا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑی طویل داستان ہے۔ ہم یہاں اشارات کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ ارشادات نبوت کے لکھنے کا مسئلہ خود زمانہ نبوت ہی میں طے ہو گیا تھا۔

دور نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ

اسی کے نتیجے میں حدیث کی کتابت کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و سنن کے ساتھ دیوانہ اور فوجداری ضوابط لکھا کر لوگوں کو دیئے اور احکام و سنن کی یہ کتابیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے باہر کے

لوگوں کے لیے اسلامی شناسی کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر (۱) جامع بیان العلم میں رقمطراز ہیں۔

کتب رسول الله صلى الله عليه وسلم كتاب الصدقات والديات والفرائض والسنن (۲)

''حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات، خون بہا، فرائض اور سنن پر مشتمل دستاویز لکھی۔''

احکام کی یہ تحریری دستاویزیں سرکار نبوت کی جانب سے مدینہ سے باہر جانے والے گورنروں کو باقاعدہ ملتی تھیں۔

عمرو بن حزمؓ صحابی کی تالیف:

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور صحابی عمرو بن حزمؓ کو نجران کا کمشنر بنا کر روانہ فرمایا۔

استعمله النبي صلعم علىٰ نجران (۳) اور استیعاب میں ہے کہ وذالك سنة عشر۔ یہ واقعہ ۱۰ھ کا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ عمر اس وقت صرف سترہ (۴) سال تھی۔ روانگی کے وقت

---

(۱) یوسف بن عبداللہ بن محمد بن البر نام ابوعمر کنیت اور قرطبہ (اندلس) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرطبی ہیں۔ بارہ ربیع الاول ۳۶۸ھ تاریخ ولادت ہے۔ اپنے وطن ہی میں اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ بہترین تصانیف ان کا علمی کارنامہ ہیں۔ خصوصاً التمہید کے بارے میں حافظ ابن حزم کا فیصلہ ہے۔ کہ فقہ حدیث میں میرے علم میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ الاستذکار لمذاہب علماء الامصار۔ الاستیعاب لاسماء الصحابہ۔ ان کے علاوہ اور بے شمار کتابیں ہیں۔ امام مالک۔ امام شافعی اور امام اعظم کے فضائل ومناقب پر بھی الانتقاء کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ جمعہ کے دن ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو شہر شاطبہ میں وفات پائی۔

(۲) ابوداؤد باب کتابۃ العلم، مسند دارمی ص ۶۷، جامع بیان العلم ص ۷۱ ج ۱

(۳) اصابہ ص ۲۹۳ ج ۴ (۴) الاستیعاب ص ۴۳۷ ج ۲

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دستاویز کتابی شکل میں قلمبند کرا کر دی۔ اس دستاویز میں دیوانی فوجداری ضوابط کے ساتھ فرائض وسنن کی بھی تفصیل تھی۔

چنانچہ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

وکتب له کتابا فیه الفرائض والسنن والصدقات والدیات (۱)

''آپ نے ان کے لیے فرائض' سنن اور صدقات ودیات پر مشتمل کتاب لکھی۔''

حافظ عسقلانی نے تو نہیں مگر حافظ ابن عبدالبر نے یہ بھی انکشاف کیا ہے۔ کہ عمرو بن حزمؓ کو صرف عامل یعنی کمشنر اور انتظامی سربراہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کو **لیفقههم فی الدین ویعلم القران** ۔ معلم قرآن وفقہ بنا کر بھی روانہ فرمایا (۲) یعنی یہ کمشنر ہونے کے ساتھ دین کے مفتی اور قرآن کے معلم بھی تھے۔ اور تعلیم وافتاء ہی کے لیے اس دستاویز میں الفرائض' السنن قلمبند کیے گئے تھے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ کتاب چمڑے میں تحریر تھی۔ اور عمرو بن حزمؓ کے پوتے ابوبکر حزم کے پاس موجود تھی۔ ابوبکر خود یہ کتاب میرے پاس لے کر آئے تھے اور میں نے اس کو پڑھا ہے۔ (۳)

عمرو بن حزمؓ نے اس قیمتی دستاویز کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اکیس دیگر فرامین نبوی بھی فراہم کیے اور ان سب کی ایک کتاب تالیف کی جو زمانہ نبوت کی سیاسی دستاویزوں اور سرکاری پروانوں کا اولین مجموعہ ہے۔

اس کی روایت مشہور محدث ابوجعفر الدیبلی نے لی ہے۔ چنانچہ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین کے نام سے ابن طولون نے جو کتاب لکھی ہے اور جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس میں حضرت عمرو بن حزم کی یہ تالیف بطور ضمیمہ شامل اور محفوظ کر دی گئی ہے۔ آپ آئندہ پڑھیں گے کہ امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز نے ان ہی عمرو بن حزم کے پوتے قاضی ابوبکر کو تدوین حدیث کے کام پر مامور کیا تھا۔ نیز امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ ہونے کے بعد جب صدقات کے بارے میں نبوی دستاویز کی تلاش ہوئی تو یہی دستاویز امیر عمر کو عمرو بن حزمؓ کی اولاد کے پاس ملی تھی۔ چنانچہ حافظ دارقطنی فرماتے ہیں:

(۱) الاستیعاب: ص ۴۳۷ ج ۱ (۲) الاستیعاب: ص ۴۳۷ ج ۲ (۳) نسائی

ان عمر بن عبدالعزیز حین استخلف ارسل الی المدینة یلتمس عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الصدقات فوجده عندال عمرو بن حزم کتاب النبی صلی الله علیه وسلم الی عمرو بن حزم فی الصدقات (۱)

"عمرو بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ اس مقصد کے لیے قاصد روانہ کیا کہ صدقات کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دستاویز تلاش کرے۔ یہ دستاویز عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی۔"

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مالیاتی اور فوجداری حصہ کو ابوداؤد نسائی ابن حبان اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام زہری نے اس کو قاضی ابوبکر بن حزم سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں اسے درج کیا ہے۔ حافظ جمال الدین زیلعی نے مراسیل ابی داؤد کے حوالے سے یہ دستاویز نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

نسخة کتاب عمرو بن حزم تلقاها الائمة الاربعة بالقبول وحی معوارثة (۲)

"عمرو بن حزم کی کتاب کو چاروں اماموں نے قبول کیا ہے۔ اور یہ متوارث ہے۔"

بلکہ صاحب الروض الباسم نے بتایا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے ارشاد میں اس کے سارے طرق پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتاب ائمہ اسلام میں زمانہ جدید و قدیم دونوں میں برتی جاتی رہی ہے۔ اور اس پر لوگوں کا اعتماد رہا ہے۔

فهذا الکتاب متداول بین ائمة الاسلام قدیماً وحدیثاً یعتمدون علیه (۳)

اور حافظ یعقوب بن سفیان یہاں تک فرما گئے۔ میرے علم میں عمرو بن حزم کی کتاب سے زیادہ کوئی کتاب صحیح نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا بھی یہ کتاب مسائل میں مرجع تھی۔

کان الصحابة والتابعون یرجعون الیه ویدعون اراء هم (۴)

---

(۱) دار قطنی: ص ۲۱۰
(۲) نصب الرایہ للحافظ الزیلعی: ص ۳۴۲ ج ۲
(۳) الروض الباسم: ص ۳۴ ج ۱
(۴) الروض الباسم: ص ۳۴ ج ۱

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ عمرو بن حزم کی کتاب کی مقبولیت پر صدر اول کا اجماع تھا۔

اجماع الصدر الاول علی قبول حدیث عمرو بن حزم(۱)

احادیث کی کتابوں میں اس کتاب کی جستہ جستہ حدیثیں منقول ہیں اور امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث میں سلیمان بن داؤد الخولانی' امام احمد' ابو حاتم' ابو زرعہ' دارمی اور ابن عدی نے اسے خراج تحسین ادا کیا ہے(۲)

اور تنقیح الانظار میں حافظ ابن کثیر کے حوالے سے لکھا ہے

اسی حدیث کو مسنداً بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور مرسلاً بھی مسنداً جن ائمہ حدیث نے اس کو روایت کیا ہے وہ یہ ہیں۔ امام نسائی ۱ نے سنن میں امام احمد ۲ نے مسند میں' امام ۳ ابوداؤد نے مراسیل میں' امام دارمی ۴ امام یعقوب ۵ بن سفیان امام ابویعلی ۶ موصلی نے اپنے اپنے مسند میں نیز حسن بن ۷ سفیان' عثمان ۸ بن سعید' عبداللہ ۹ بن عبدالعزیز بغوی نے ابوزرعہ ۱۰ دمشقی' احمد بن ۱۱ الحسن ابن عبدالجبار صوفی حامد ۱۲ بن شعیب حافظ طبرانی ۱۳ اور ابن حبان ۱۴ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام بیہقی لکھتے ہیں۔ کہ یہ حدیث موصول الاسناد ہے۔

اور اس حدیث کو جن لوگوں نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ وہ ایک سے زیادہ ہیں۔(۳)

کتاب الصدقہ :

اس تحریری دستاویز کے علاوہ دوسرا تحریری سرمایہ بھی خود نبوت ہی کا ساختہ رواختہ صحابہ کے پاس موجود تھا۔ ابوداؤد اور ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ تحریر فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس پر عمل کیا اور حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ کا بھی اسی پر عمل رہا۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے اس نوشتہ کی حدیثیں بھی نقل کی گئی ہیں۔

---

(۱) الروض الباسم ص ۳۵ ج ۱ (۲) دار قطنی ص ۲۰۹

(۳) تنقیح الانظار ص ۳۵۰ ج ۲

اور امام ترمذی (۱) تو یہاں تک لکھ گئے۔

والعمل علی هذا الحدیث عند عامة اهل العلم ۔حضرت عمرؓ کے بعد یہ دستاویز آپ کے خاندان میں ہی رہی۔ امام زہری کہتے ہیں۔ کہ مجھے خود فاروق اعظمؓ کے پوتے حضرت سالم نے یہ تحریر دکھائی ہے۔ میں نے اسے پڑھا ہے۔ اور اسے حرف بحرف زبانی یاد کیا ہے۔ **قال ابن شهاب اقرأنيها سالم بن عبدالله فوعيتها علىٰ وجهها** ۔(۲)

اس کتاب کی بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں گورنری کے زمانے میں حضرت سالم سے نقل لی تھی۔ اور زمانہ خلافت میں اسے اپنی قلمرو میں نافذ کیا تھا۔(۳)

واضح رہے کہ حضرت سالم کو بھی عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا تھا ؎ حافظ جمال الدین زیلعی نے نصب الرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ میں یہ پوری دستاویز ؎ نقل کی ہے۔ بہرحال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا تحریری سرمایہ خود نبوت ہی نے اپنے زمانے میں لوگوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگرچہ محسوس و مرئی اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی بنا پر جو دستاویزیں باہر روانہ نہیں کی نہیں کی گئیں۔ ان میں صرف صدقات جیسی

---

(۱) محمد بن عیسیٰ بن سورہ نام ابو عیسیٰ کنیت' عرب کے قبیلہ سلیم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے سلمی اور ترمذ میں بود و باش کی وجہ سے ترمذی ہیں۔ سنن ترمذی' کتاب العلل اور شمائل نبوی انکی مشہور تصانیف ہیں۔ حدیث کے مشہور اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ امام بخاری ان کے اساتذہ میں سے ہیں حاکم نے عمر بن ملک کے حوالے سے بتایا ہے۔ کہ امام بخاری کی وفات کے بعد خراسان میں امام بخاری کا جانشین زہد و تقویٰ اور علم و حفظ میں ابو عیسیٰ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ روتے روتے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مگر ان کو یہ شرف بھی حاصل ہے۔ کہ خود استاد نے ان سے حدیث کا سماع کیا ہے۔ بعض مواقع پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام بخاری اور مسلم سے اختلاف کیا ہے۔ تاریخ ولادت ۲۰۰ھ اور وفات ۱۳ رجب ۲۷۹ھ بمقام ترمذی ہوئی۔ (۲) دار قطنی: ص ۱۲۰۹

(۳) دار قطنی: ص ۲۰۹ (۴) تاریخ الخلفاء (۵) نصب الرایہ: ص ۳۳۸ ج ۲

چیز پیش پا افتادہ ضرورت کے لیے قید تحریر میں لائی گئی۔ باقی اسلام کے لیے خود اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ لیکن جب مدینہ سے جانے والوں کے لیے دستاویزیں لکھی گئیں۔ تو اس میں صرف صدقات نہیں بلکہ الدیات الفرائض اور السنن تک قلمبند کیے گئے۔ یہ چند نوشتوں کا حال ہے۔ ورنہ ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریری ہدایات' خطوط کے جوابات' سلاطین وقت کے نام دعوت نامے' معاہدات اور صلح نامے۔ اس قسم کا بہت سا تحریری سرمایہ حضور انورؐ نے چھوڑا ہے۔ علماء نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً کتاب الاموال الامام ابوعبید القاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ اعلام السائلین حافظ ابن طولون المتوفی ۹۵۳ھ اور الوثائق السیاسیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صحابۂ کرام اور کتابت حدیث

حضور ہی کے زمانے میں حضور انور کی اجازت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مجموعے صحابہ کرام نے مرتب کیے۔ مثلاً:

صحیفہ صادقہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حضور کی اجازت سے آپ کے ارشادات لکھنے شروع کیے۔ کیوں لکھتے تھے؟ خود فرماتے ہیں۔ کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا۔ حفظ کرنے کے ارادے سے قلمبند کر لیتا تھا۔ یہی لکھی ہوئی دستاویز ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہوگئی تھی۔ اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا۔ فرماتے تھے۔ مجھے زندگی میں دو چیزیں مرغوب ہیں۔ (رہط اور صادقہ) رہط وہ باغ جوان کے والد نے وقف کیا تھا۔ اور یہ اس کے متولی تھے۔ اور صادقہ کے متعلق فرماتے ہیں۔ (۱)

اما الصادقة فصحيفة كتبتها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (۲)

''صادقہ یعنی وہ صحیفہ جو میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھا ہے۔''

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہی صحیفہ ان کی وفات پر ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا۔ (۳) حدیث کی کتابوں میں اس نام سے روایات کا جس قدر ذخیرہ ملتا ہے۔

---

(۱) جامع بیان العلم ص ۷۲ ج ۱ (۲) جامع بیان العلم ص ۷۲ ج ۱ (۳) تہذیب ترجمہ عمرو بن شعیب

وہ اسی صحیفہ کا سرمایہ ہے۔ حافظ زیلعی نے اسے بھی عمرو بن حزم کی کتاب کی طرح متوارث قرار دیا ہے۔ امام ترمذی ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔ اما اکثر اهل الحدیث یحتجون بحدیث عمرو بن شعیب ویثبتونه یعنی محدثین کی اکثریت عمرو بن شعیب کی احادیث کو صحیح اور قابل استدلال سمجھتی ہے (۱)۔ عبداللہ کے پڑپوتے یعنی عمرو بن شعیب کی ثقاہت میں کسی کو کوئی کلام نہیں اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ یہ صحیفہ حضرت عبداللہ ہی کا نوشتہ ہے۔ لیکن چونکہ ان کے والد کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس لیے محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے دادا سے پڑھا ہے کہ نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو سماع متصل ہے۔ اگر نہیں پڑھا تو سماع مرسل ہے۔ حافظ عسقلانی سید الحافظ یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں۔

وجد شعیب کتب عبداللہ فکان یرویها عن جده مرسلا وهی صحاح عن عبداللہ بن عمرو غیر انه لم یسمعها۔

''شعیب نے عبداللہ کی کتابیں پائی ہیں اس لیے ان کتابوں کے ذریعے اپنے دادا سے ان کی روایات مرسل ہیں۔

یہ تو ایک محدثانہ عرف ہے ورنہ آج بھی ہم حدیثیں جن کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔ تو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوچتے کہ خود بیان کرنے والے کا کتاب کے مولف سے اسنادی رشتہ متصل ہے یا نہیں۔

دراصل محدثین کے یہاں بہ نسبت کتابوں کے حافظہ پر زیادہ اعتماد کا اسی طرح رواج تھا۔ جیسے ہمارے عرف میں حافظہ کے مقابلے میں کتابوں پر اعتماد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس دور میں کتابت گویا اہل علم میں ایک بہت بڑی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کا یہ طرز عمل صرف اسنادی رشتہ کو متصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ لیکن آج کی دنیا میں بہ نسبت راوی کے خود مولف کی ذات پر اعتماد ہے۔ اس لیے اس نظریہ کا مقام محدثانہ اصطلاح سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ نسخہ حضرت شعیب کو اپنے دادا سے وراثت میں ملا ہے خواہ شعیب نے دادا سے پڑھا یا نہیں

---

(۱) جامع ترمذی ص ۲۳۳ ج ۱

اور کتب حدیث میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے جس قدر احادیث کا ذخیرہ ہے۔ وہ سب اسی صحیفہ علمی کا سرمایہ ہے۔ ان کی مرویات کی تعداد سات سو ہے۔ مسند امام احمد میں ان کی حدیثیں ۱۳۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔(۱)

---

(۱) موصوف کی حدیث میں اس اسنادی سلسلے کے ساتھ جو وہ عن ابیہ عن جدہ کر کے لاتے ہیں علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ اس ذریعے سے آئی ہوئی موصوف کی روایات میں حجت و استدلال کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت حسب تصریح امام ترمذی اسے حجت سمجھتی ہے۔ مگر کچھ کی رائے میں ان کی یہ روایات قابل حجت نہیں ہیں۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں جدہ کی ضمیر کا مرجع کون ہے۔ اگر ضمیر کا مرجع خود عمرو کی ذات ہے۔ تو اس صورت میں عمرو کے دادا محمد بن عبداللہ ہیں اور حاصل یہ ہے کہ روایت عمرو نے اپنے والد شعیب سے کی ہے اور شعیب نے عمرو کے داد محمد بن عبداللہ سے کی ہے اور معلوم ہے کہ شعیب کے دادا صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں۔ اس لیے اصطلاحی محدثین میں یہ حدیث مرسل ہے۔ اور اگر جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں بلکہ شعیب ہے تو مطلب یہ ہے کہ عمرو نے روایت اپنے والد شعیب سے کی اور شعیب نے اپنے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی سے کی ہے تو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع متصل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع جن کے خیال میں شعیب ہے ان کی رائے میں عمرو کی روایات قابل حجت ہیں کیونکہ شعیب کی ملاقات عبداللہ بن عمرو سے ثابت ہے اور جو لوگ جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ روایات تاریخی طور پر صحیح نہیں ہیں۔ اسی بنا پر حافظ دارقطنی نے تصریح کی ہے کہ جن اسانید میں دادا کے نام کی تصریح آ جائے وہ اصح الاسانید ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ۔ امام احمدؒ امام علی ابن المدینیؒ امام اسحاق بن راہویہؒ امام ابوعبید اور ہمارے عام اصحاب کی رائے میں یہ سلسلہ سند قابل حجت ہے۔ امت میں سے کسی نے اسے رد نہیں کیا ہے۔ امام بخاری پوچھتے ہیں کہ ان ائمہ کے بعد اور کون ہے؟ بلکہ امام اسحاق نے تو اس سلسلہ سند کو ایوب عن نافع عن ابن عمر سے تشبیہ دی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ اس سلسلہ سند کی جلالت قدر کو آشکارا کرتی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے:

لن الاحتجاج بہ ھوا الصحیح المختار الذی علیہ المحققون من اھل الحدیث وھم اھل ھذا لفن و عنھم یوخذ۔

صحیفہ علی مرتضیٰؓ:

یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلے میں تھا جس میں یہ صحیفہ نیام سمیت سما جاتا تھا۔ اس کے متعلق خود حضرت علیؓ کا بیان ہے۔ ماکتبنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاالقرآن وما فی ھذہ الصحیفۃ۔(۱) یعنی ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن اور اس کے صحیفہ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفہ سے منقول ہے کہ مجھے میرے والد نے بھیجا اور کہا کہ یہ کتاب لو اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس لے جاؤ اس میں صدقہ کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام(۲) ہیں۔ نیز اس کتاب میں زکوۃ کے علاوہ خون بہا، قیدیوں کی رہائی، قصاص، حرم مدینہ کے حدود، غیر کی طرف نسبت کا حکم، نقض عہد، غیر اللہ کے نام پر ذبح وغیرہ مسائل واحکام درج تھے۔

صحیفہ صدیقی:

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب حضرت انسؓ کو بحرین کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا تو حکومت کے واجبات کے بارے میں ایک یادداشت ان کو لکھ کر دی۔ اس دستاویز کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذہ فریضۃ الصدقۃ التی فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین والتی امر اللہ بھا(۳) امام بخاری(۴) نے اس نوشتہ کی روایت کو کتاب الزکوۃ کے تین مختلف ابواب میں درج کیا ہے اور امام ابوداؤد نے اس

---

(۱) صحیح بخاری (۲) صحیح بخاری (۳) جامع بیان العلم: ص ۷۱ ج ۱ (۴) کنیت ابوعبداللہ نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بردزبہ ہے چونکہ بردزبہ کے صاحبزادے یمان جعفی کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے اس لیے ان کو نسبت ولاء کی وجہ سے جعفی کہتے ہیں۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے دادا ابراہیم بن مغیرہ کے حالات کا تاریخ سے ہمیں کوئی پتہ نہیں چلا لیکن امام بخاری کے والد محترم امام مالک، امام حماد بن زید کے شاگرد اور عبداللہ بن المبارک کے صحبت یافتہ ہیں۔ اسماعیل اور امام ابوحفص کبیر حنفی کے درمیان بہت مخلصانہ محبت تھی۔ اسماعیل کی وفات کے وقت امام ﴿باقی صفحہ ۱۶۲ پر﴾

صحیفہ کو حدیث کے مشہور امام حماد بن (۱) سلمہ سے روایت کیا ہے۔ جس میں حماد خود تصریح کرتے ہیں کہ میں نے خود ثمامہ سے اس نوشتہ کو حاصل کیا ہے (۲) امام حاکم نے یہ دستاویز نقل کی ہے (۳) حافظ ابو جعفر طحاوی نے بھی یہ دستاویز بحوالہ حماد بن سلمہ بتائی ہے۔ مگر اس میں حماد بن سلمہ کی یہ

﴿بقیہ صفحہ ۱۶۱﴾ ابو حفص کبیر موجود تھے۔ اس وقت ان سے اسماعیل نے کہا تھا کہ میں اپنے مال میں ایک درہم بھی حرام یا شبہ کا نہیں پاتا (مقدمہ ص ۴۸) یہ تعلقات اسماعیل کی وفات کے بعد بھی دونوں خاندانوں میں برابر استوار رہے۔ چنانچہ امام بخاری اور امام ابو حفص کبیر نے امام بخاری کو اس قدر مال تجارت دیا تھا۔ جس کو کچھ تاجروں نے پانچ ہزار کے نفع سے خریدا اور کچھ اس سے زائد نفع دے کر خریدنے کو آمادہ تھے۔ لیکن امام بخاری نے اپنے ارادے کو بدلنا پسند نہ کیا۔ (مقدمہ فتح) حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابو حفص کبیر کو (جو امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد ہیں) امام بخاری کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ اور ان کے حق میں ابو حفص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس کا شہرہ ہو گیا" امام بخاری جمعہ کے دن ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں نے امام اعظم کے دونوں شاگردوں امام وکیع اور امام عبداللہ بن مبارک کی کتابیں نوک زبان کر لی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ آپ کی تصانیف اگرچہ کافی ہیں لیکن ان میں المسند الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ جو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے۔ سب سے زیادہ معرکہ کی کتاب ہے یہ صرف حدیث ہی کی نہیں بلکہ علوم اوائل کا خلاصہ ہے۔ تاریخ وفات یکم شوال ۲۵۶ھ ہے۔

(۱) امام ذہبی نے ان کا تذکرہ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے پرشوکت القاب سے کیا ہے۔ کنیت ابو سلمہ اور نام حماد بن سلمہ بصرے کے رہنے والے ہیں۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیہ میں حافظ بزازی نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ شہاب بن تمیر کہتے ہیں کہ امام حماد کو ابدال میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے۔ کہ اسلام میں سعید بن عروبہ کے ساتھ پہلے مصنف ہیں۔ امام عبدالرحمن مہدی نے ان کی پارسائی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے۔ اگر حماد سے کہا جائے کہ تم کو کل مرنا ہے تو یہ عمل میں اضافہ نہیں کر سکتے یعنی پہلے سے ہی اس قدر ہمہ گیری ہے۔ عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ عابد تو دیکھے لیکن ان سے زیادہ خیر قرأت قرآن اور عمل لوجہ اللہ پر میں نے مواظب کوئی نہیں دیکھا۔ دس ذی الحجہ بعد نماز عید ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابو داؤد ص ۲۲۵ (۳) مستدرک حاکم ص ۳۹۰ ج ۱

تصریح بھی ہے کہ مجھے ثابت البنانی نے یہ دستاویز لینے ثمامہ بن عبداللہ کے پاس بھیجا انہوں نے مجھے یہ دستاویز دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ فاذاعلیه خاتم رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی۔ (۱)

صحیفہ جابرؓ:

حافظ ذہبی (۲) نے تذکرے میں حضرت قتادہؒ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ بصرہ میں سب سے زیادہ حافظ تھے ان کے سامنے حضرت جابرؓ کا صحیفہ پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ قرات علیه صحیفة جابر مرة فحفظها حضرت جابرؓ کا صحیفہ ایک بار پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا (۳) حافظ عسقلانی نے طلحہ بن نافع کے ترجمہ میں سفیان بن عیینہ اور امام شعبہ دونوں کا بیان لکھا ہے کہ حدیث ابی سفیان عن جابر انما هی صحیفة۔ ابوسفیان جو حضرت جابرؓ کی حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ وہ صحیفہ جابرؓ ہی سے نقل کرتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) شرح معانی الآثار۔ ص ۳۶۶

(۲) کنیت ابوعبداللہ نام محمد بن احمد بن عثمان الترکمانی الدمشقی الذہبی ہے۔ علامہ تاج الدین السبکی نے محدث العصر، خاتم الحفاظ، امام العصر لکھا ہے۔ فقہ، حدیث، تاریخ، تجوید، رجال میں بے مثال تھے۔ ان گنت کتابوں کے مصنف ہیں۔ امام اعظمؒ کی سیرت پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔ تذکرۃ الحفاظ میں ایک مقام پر علم الحدیث اور طلب الحدیث پر ایک بڑا مفید نوٹ لکھا ہے۔ ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور تاریخ وفات ۷۴۸ھ ہے۔

(۳) (تذکرۃ الحفاظ: ص ۱۱۶ ج ۱)

(۴) (تہذیب ترجمہ طلحہ بن نافع)

صحیفہ سمرہؓ:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام حسن (۱) بصریؒ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندبؓ سے ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں موجود ہیں امام علی بن المدینی اور امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں انہوں نے سنی ہیں۔ لیکن یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ یہ سب حدیثیں اسی نوشتہ کی ہیں۔ اسی نسخہ کو امام حسن بصری کے علاوہ خود حضرت سمرہؓ کے صاحبزادے نے بھی ان سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں۔ سلیمان روی عن ابیہ نسخۃ کبیرۃ (۲)

صحیفہ صحیحہ:

یہ اصل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی تالیف ہے۔ جو انہوں نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ترتیب دی تھی۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے اس صحیفہ کے راوی ہمام ہیں۔ اس لیے صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دراصل اس کا نام صحیفہ ابی ہریرہؓ لہمام بن منبہ ہونا چاہیے۔

---

(۱) الحسن بن ابی الحسن نام۔ ابو سعید کنیت مدینہ میں نشو و نما پائی۔ شہادت عثمانؓ کے وقت چودہ سال عمر تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ، عمران بن حصینؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور ان کے علاوہ چند در چند صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ مرسل حدیثیں پیش فرماتے یعنی تابعی ہونے کے باوجود ارشاد کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے اپنے اور حضورؐ کے درمیان واسطہ کا ذکر نہ کرتے جیسا کہ عموماً سعید بن المسیبؒ مکحول دمشقیؒ ابراہیم نخعی اور دیگر اکابر تابعین کا معمول تھا۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں۔ ان الناس باسرھم علی قبول المرسل تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں۔ کہ امام حسن بصری کے مرسلات صحیح ہیں (خلاصہ) ان کے متعلق امام اعظم کی کتاب الآثار میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام باقر سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں۔ ص ۲۰۹) تاریخ وفات ۱۱۰ھ۔

(۲) تہذیب: ص ۹۳ ج ۳

آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ میں سے اگر کسی کی حدیث دانی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے تو وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ موصوف نے الصحیفۃ الصادقۃ کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ شاید حضرت ابو ہریرہؓ نے ان ہی کی تقلید میں اپنی تالیف کا نام الصحیفۃ الصحیحہ رکھا ہے۔ بہرحال یہ تالیف عہد صحابہ کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو دمشق اور برلن میں اس کے دو قلمی نسخے ملے ہیں۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد انہوں نے پہلی صدی ہجری کی اس گراں مایہ تالیف کو شائع کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقابلہ کرنے پر نظر آتا ہے کہ بعد کے مولفوں نے مفہوم تو کیا کوئی لفظ تک نہیں بدلا۔ اس صحیفہ کی ہر حدیث نہ صرف صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالے سے ملتی ہے بلکہ مسند احمد میں آج بھی یہ پورے کا پورا رسالہ بلا حذف واضافہ موجود ہے۔ اس سے متعلق تفصیلات کے لیے صحیفہ ہمام بن منبہ کا مقدمہ دیکھئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہم نے زمانہ صحابہ میں حدیث کی تدوین پر ان تالیفات کا تذکرہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کیا ہے کہ حدیث کی تدوین ایک سو سال بعد ہوئی ہے۔ یاد رکھئے یہ بہت بڑا سنگین مغالطہ ہے۔ حدیث کے موضوع پر تالیف و تصنیف کے اس قدر سرمایہ ہونے کے باوجود یہ کہنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صبحی صالح نے علوم الحدیث میں تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ صحابہ کرام کے چند نوشتے ہیں جو بہت سی احادیث پر مشتمل ہیں یا جو مستقل کتاب یا صحیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر صحابہ کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا جائے۔ جس میں انہوں نے کسی حدیث کا تذکرہ کیا ہے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدوین حدیث کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا اور پھر دور صحابہ میں بھی یہ کام ہوتا رہا تحریری بھی تقریری بھی۔ لیکن زیادہ تر توجہ تقریری طور پر کام کرنے کی طرف مبذول تھی کیونکہ عرب والوں کی تاریخ اور ان کی معاشرت میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کا پہلے سے یہی طریقہ رائج تھا۔ وہ اپنے تمام شجرہ ہائے نسب اہم تاریخی واقعات

جنگی کارنامے بڑے بڑے خطبے لمبے لمبے قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے۔ قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے اپنے لیے اسی طریقے کو سراہا اور خود نبوت اور صحابہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

بل ھو ایات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم۔

''بلکہ وہ آیتیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم ملا ہے۔''(۱)

یہی طریقہ ارشاد نبوت کو محفوظ رکھنے کے لیے صحابہ نے اختیار کیا ہے اور خود ذات نبوت نے بھی ان کو ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ وفد عبدالقیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو آپ نے وفد کو زبانی ہدایات سے نوازا تو یہ خصوصی ہدایت بھی فرمائی کہ:

احفظو ھن　''ان کو زبانی یاد کرلو۔''(۲)

حدیث کا بیان کرنے والے صحابہ کرام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جن صحابہ کرام کے ذریعے احادیث کا ذخیرہ امت کو ملا ہے اور تاریخ احکام یا تاریخ سنت کی معلومات کا سرمایہ جن اکابر کی وساطت سے کتابوں میں آیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے صرف چار ہزار مرد و زن ہیں۔

چنانچہ امام حاکم لکھتے ہیں:

---

(۱) یعنی جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پڑھا نہیں ایسے یہ دین جو وہ لے کر آئے ہیں۔ ان کے صحابہ (جن کو اللہ کی جانب سے علم ملا ہے) کے ذریعے بن لکھے سینہ بسینہ جاری ہوگا اللہ کے فضل سے ان کے ہی سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے الفاظ کی حفاظت کرنے والوں کو حفاظ و قراء اور معانی کی نگرانی کرنے والوں کو فقہاء مجتہدین کہتے ہیں صراط مستقیم یہی ہے کہ دین کے پہنچانے میں حفاظ و قراء پر اور دین کے سمجھنے میں فقہاء پر اعتماد رکھے دونوں میں سے کسی ایک میں بھی خودرائی کرنا خسارے کو مول لینا ہے۔ اور غالباً حدیث افتراق میں ما انا علیہ و اصحابی سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔

(۲) الخیرات الحسان: ص ۱۰

فقد روی عنه صلی الله علیه وسلم من الصحابة اربعة الاف رجل و مراة (۱)

''صحابہ میں سے صرف چار ہزار مردوزن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات بیان کی ہیں۔''

اتنی بڑی تعداد میں سے اس قلیل عدد ہی کے ذریعے علوم نبوت ہم تک پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں ہر شخص یہ کام نہ کرتا تھا۔ بلکہ خاص خاص وہ حضرات ہی کرتے تھے۔ جن کو اپنی قوت حافظہ پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اور یہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ روایت کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے:

فاروق اعظمؓ عبداللہ بن مسعودؓ را با جمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن معقلؓ و عمران ب حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامت و ابوالدرداءؓ را بشام و معاویہ بن ابی سفیانؓ را کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشاں تجاوز نکنند۔ (۲)

فاروق اعظمؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت دے کر کوفہ روانہ کیا معقل بن یسارؓ، عبداللہ بن معقلؓ اور عمران بن حصینؓ کو بصرہ اور عبادہ ابن الصامت ابوالدرداء کو شام معاویہ ابن ابی سفیانؓ کو جو کہ شام کے امیر تھے پوری تاکید فرمائی۔ کہ ان کی حدیث سے تجاوز نہ کریں۔

یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ صحابہ میں یہ کام ہر شخص نہیں کرتا تھا اور جو کرتے تھے ان میں بے حد فرق مراتب تھا۔ اس فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ سب سے زیادہ احادیث کی تعداد جن حضرات سے آئی ہے وہ صرف چار ہیں۔ مثلاً

حضرت ابو ہریرہؓ ○ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ○ حضرت انس بن مالکؓ ○ حضرت عائشہ صدیقہؓ ○ ان کے بعد اس سے کم تعداد والے تین ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ○ حضرت جابر بن عبداللہؓ ○ حضرت ابوسعید خدریؓ ○ جن صحابہ کی روایات ہزار سے زیادہ نہیں وہ صرف دس ہیں۔

---

(۱) مدخل: ص ۷　(۲) ازالۃ الخفا: ص ۶

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ○ حضرت عبداللہ بن عمروؓ ○ حضرت علی بن ابی طالبؓ ○ حضرت عمر الخطابؓ ○ حضرت ام سلمہؓ ○ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ○ حضرت براء بن عازبؓ ○ حضرت ابوذر غفاریؓ ○ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ○ حضرت ابوامامہ باہلیؓ ○

وہ صحابہ جن کی روایات سو سے زیادہ ہیں۔ وہ تعداد میں انیس ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ ○ حضرت عثمان غنیؓ ○ حضرت عبادہ بن الصامتؓ ○ حضرت عمران بن حصینؓ ○ حضرت ابوالدرداءؓ ○ حضرت ابوقتادہؓ ○ حضرت بریدہؓ ○ حضرت ابی بن کعبؓ ○ حضرت معاویہؓ ○ حضرت ابوایوب انصاریؓ ○ حضرت مغیرہؓ ○ حضرت ابوبکرہؓ ○ حضرت نعمان بن بشیرؓ ○ حضرت ابومسعود انصاریؓ ○ حضرت جریر بن عبداللہؓ ○ حضرت سہل بن سعدؓ ○ حضرت معاذ بن جبلؓ ○ حضرت اسامہ بن زیدؓ ○ حضرت ثوبانؓ ○

ان کے بعد سینکڑوں سے نیچے احادیث بیان کرنے والے صرف چوراسی ہیں۔

- انیس حدیثیں بیان کرنے والے صرف دو صحابی ہیں۔
- اٹھارہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چھ صحابی ہیں۔
- سترہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔
- سولہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔
- پندرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چار صحابی ہیں۔
- چودہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف گیارہ صحابی ہیں۔
- تیرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف سات صحابی ہیں۔

سب سے زیادہ تعداد ایک ارشاد بیان کرنے والے صحابہ کی ہے۔ اس کے بعد پھر تین بالترتیب ہزاروں تک۔(۱)

اور جن صحابہ کے ذریعے امت کو اپنے پیغمبر سے یہ علم کی میراث ملی ہے۔ علماء نے ان کی زندگیوں پر مفصل اور مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے قدیم کتاب اس موضوع پر اگرچہ سیوطی کے خیال میں امام بخاری کی تاریخ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قدیم کتاب اس موضوع پر

---

(۱) تلقیح فہوم اہل اثر ص ۱۹۳ تا ص ۱۹۵

طبقات ابن سعد ہے صحابہ کے حالات میں اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عرصہ سے مفقود تھی اب یورپ میں چھپ گئی ہے۔ اس کے بعد دوسری کتابیں منصۂ وجود پر آئی ہیں۔ طبع شدہ کتابوں میں سب سے مبسوط حافظ ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس میں کل صحابہ ۱۲۲۷۹ کے تراجم آئے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں تمام صحابہ کو پانچ طبقوں اور امام حاکم نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

طبقات صحابہ یہ ہیں:

- وہ لوگ جنہوں نے مکہ میں مسلمان ہونے میں پہل کی جیسے خلفاء راشدین۔
- وہ لوگ جو مشرکین مکہ کے دارالندوہ میں مشاورت سے پہلے مسلمان ہوئے۔
- مہاجرین حبشہ۔
- اصحاب عقبہ اولیٰ۔
- اصحاب عقبہ ثانیہ۔
- وہ مہاجرین جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ جاتے ہوئے قبا میں ملے۔

اصحاب بدر۔

- وہ صحابہ جنہوں نے بدر اور حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی ہے۔
- اصحاب بیعۃ الرضوان۔
- وہ صحابہ جو حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مہاجر ہوئے۔
- وہ صحابہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے۔
- وہ بچے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ کے دن اور حجۃ الوداع میں زیارت کی۔

صحابہ کرام میں حفاظ وفقہاء

پھر صحابہ کرام میں خدمت دین کا کام علمی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔

کچھ تو وہ تھے جن کا کام صرف محفوظ سرمایہ کے آگے پہنچانا تھا۔ یہ احادیث روایت

کرتے تھے۔ کچھ وہ تھے جن کا کام قرآن وحدیث کے محفوظ سرمائے سے مسائل کا استنباط اور ان میں تفقہ اور تدبر تھا۔ اس سلسلے میں حدیث ابی موسیٰ اشعریؓ پر حافظ ابن القیم کی تصریحات آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں باہم علمی مسائل پر اپنے اپنے فن کے لحاظ سے گفتگو بھی ہوتی اور فقہاء کی جانب سے ان حفاظ پر فقہی اعتراض بھی ہوتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پیش کیا۔

لوگو! اس چیز سے وضو کرو جسے آگ نے بدل دیا یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں تو گرم پانی سے وضو کرتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میرے بھائی! جب تم حضور انورؐ کا ارشاد گرامی سنو تو اس کے لیے مثالیں نہ تراشو۔

مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ ابوحسان الاعرج کہتے ہیں کہ دو شخص حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کو بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ:

انما الطیرۃ فی المراۃ والدابۃ والدار۔

''بے شک شگون عورت' سواری اور گھر میں ہے۔''

حضرت عائشہؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ایسا نہیں ہے۔ حضورؐ تو یوں فرماتے تھے۔ کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا کہنا یہ تھا۔ کہ شگون عورت' گھر اور گھوڑے میں ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مااصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الافی کتاب۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے بات کا آخری حصہ سنا آغاز نہیں سنا جتنا سنا بیان کر دیا۔

مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے کہ حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عائشہؓ کے پاس تھے ابو ہریرہ آئے حضرت عائشہؓ نے کہا اے ابو ہریرہ کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو کہ حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو بلی کے باندھنے' کھانا پینا بند کرنے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ جی ہاں میں نے حضورؐ سے ایسا ہی سنا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ پتہ ہے کہ یہ عورت کون تھی؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ یہ عورت کافرہ تھی۔ خوب یاد رکھو اللہ سبحانہٗ کے نزدیک مومن کا اس سے کہیں زیادہ اکرام ہے کہ وہ اسے صرف ایک بلی کی وجہ سے عذاب دے۔

یاد رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر حضرت عائشہؓ کے ان تعقبات سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کی شان فقاہت پر کوئی حرف آتا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے تعقبات صرف حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان کی جانب سے ایسے تعقبات تو ان پر بھی ہیں جو فقاہت میں معروف اور کثیر الفتاویٰ ہیں۔ مثلاً فاروق اعظمؓ، علی بن ابی طالبؓ۔

ابن سعد نے طبقات میں' ابن القیم نے اعلام میں حضرت ابو ہریرہؓ کو ان صحابہ میں شمار کیا ہے جو بیان فتاویٰ و مسائل میں درمیانے درجہ پر تھے۔ کسی صحابی کے کثیر الحدیث اور ضبط و حفظ میں شہرت پا لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عدیم الفقاہت ہے۔ اگر کثرت حدیث اور اسناد و روایت کی فن کاری کی وجہ سے ارباب طبقات نے امام احمد اور امام بخاری کو فقہاء میں شمار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام احمد اور امام بخاری فقیہ نہ تھے۔ یقیناً تھے لیکن دوسرے ارباب فن کی طرح ان کا یہ فن نہ تھا۔ ایسے ہی حضرت ابو ہریرہؓ یقیناً فقیہ تھے مگر فاروق اعظمؓ، علی بن ابی طالبؓ اور ابن مسعودؓ کی طرح فنکار نہ تھے ان کی فنکاری تحدیث و روایت تھی۔ علامہ عبدالعزیز بخاری نے کشف الاسرار میں' حافظ ابن الہمام نے آخر میں' حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیہ میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح کی ہے۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ فقیہ ہیں۔ اور اسباب اجتہاد سے مالا مال تھا۔ (۱)

---

(۱) تحریر: ص ۳ ج ۲

حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ فقیہ تھے ان کو حافظ ابن حزم نے فقہاء صحابہ میں شمار کیا ہے۔ شیخ تقی الدین السبکی نے ان کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کیے ہیں۔(۱)

یہ امر آخر ہے۔ کہ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں ان کو فنی شہرت نہ ہو جیسا کہ الوابل الصیب میں ابن القیم حافظ ابن حزم کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

ابن عباسؓ کے فتاویٰ تفسیر اور مسائل کا حضرت ابو ہریرہؓ کے فتاویٰ سے کیا مقابلہ اور کیا نسبت؟ بے شک حضرت ابو ہریرہؓ حفظ میں صاحب مقام ہیں بلکہ علی الاطلاق پوری امت میں حفاظ ہیں۔ حدیث کو جیسا سنا ہے آگے پیش کرتے ہیں۔ ان کی ساری توجہات کا مرکز حفظ حدیث اور ان محفوظ حدیثوں کو آگے پہنچانا ہے۔ اور ابن عباسؓ کی توجہ کا مرکز تفقہ اور استنباط مسائل ہے۔ لیجئے خود ان کے الفاظ پڑھ لیجئے۔

فکانت همته مصروفة الى الحفظ و تبليغ ماحفظ كماسمعه وهمة ابن عباس مصروفة الى التفقه والاستنباط۔(۲)

''ابو ہریرہؓ کی مساوی توجہ حدیثوں کے یاد کرنے اور یاد شدہ حدیثوں کے پہنچانے پر لگی تھی۔ اور ابن عباسؓ کی ہمت و توجہ کا مرکز فقہ فتویٰ اور استنباط مسائل تھا۔''

اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ ان صحابہ کی حدیثوں کو جو فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں ترجیح دی جائے۔ برخلاف ان کے جو فقہ و اجتہاد میں نہیں بلکہ صرف عدالت و حفظ میں ممتاز و مشہور ہیں۔ ان کی حدیث کو راجح نہیں قرار دیا جائے گا۔ فقہ و اجتہاد میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں خلفاء راشدینؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا نام لیا ہے۔ اور حفظ و عدالت میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلالؓ کا نام لیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں

---

(۱) الجواہر المضیہ ص ۱۹، ج ۲　(۲) الوابل الصیب ص ۹۰

ان عرف بالفقه والتقدم فى الاجتهاد كالخلفاء الراشدين كان حديثه حجة وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابى هريرة۔

''اگر فقہ اور اجتہاد میں مشہور ہو جیسے خلفاء راشدین تو اس کی حدیث حجت ہے اور اگر کوئی عدالت' ضبط و حفظ حدیث میں مشہور ہو۔ مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو۔ جیسے ابو ہریرہؓ اور انسؓ۔''

اب سابقہ بیانات کی روشنی میں آپ ہی فیصلہ فرمایئے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت فاروقؓ کو کس چیز میں شہرت حاصل ہے۔ یقیناً حضرت ابو ہریرہؓ کو حفظ میں اور حضرت فاروق اعظمؓ کو فقہ و اجتہاد میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ فقیہ نہیں ہیں۔ حاشاثم حاشا فقیہ ہیں۔ مگر حضرت ابن عباسؓ، حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح فقہ میں معروف نہیں۔ اور کسی فن میں شہرت نہ ہونا کوئی عیب نہیں یہ تو فرق مراتب ہے۔

حافظ زرکشی نے حضرت عائشہؓ کے ایسے تعقبات کو ایک رسالہ نامی ''الاجابته فيما استدركة عائشة على الصحابة '' میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی عادت کے مطابق اس کی تلخیص ''عین الاجابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ'' کے نام سے کی ہے۔ یہ مطبع معارف اعظم گڑھ ہندوستان میں طبع ہوا ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صحابہ میں اس لحاظ سے فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی یہی میراث تابعین اور تبع تابعین کو بھی صحابہ سے ملی ہے۔

اور یہاں سے یہ حقیقت بھی الم نشرح ہوگئی کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق جو یہ تصریحات ملتی ہیں کہ:

اقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔''

یا حضرت قرظہؓ کا یہ کہنا کہ: نهانا عمر (منع کیا ہم کو عمرؓ نے) اور یا حضرت ابو ہریرہؓ ابو سلمہ کے سوال پر یہ کہنا کہ:

لو کنت احدث فی زمان عمر مثلما احدث ثکم یضر نبی بمخفقة (۱)

''اگر میں زمانہ عمرؓ میں ایسے حدیث بیان کرتا جیسے تم سے کرتا ہوں تو مجھے وہ درے لگاتے۔''

تو ان کا منشا وہ نہیں جو عموماً آج سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے تحدیث اور اشاعت سنت کے لیے سرکاری طور پر شخصیتیں مقرر کی تھیں۔ ہر کس و ناکس کو یہ کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ امام دارمی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ منشا تھا کہ غزوات اور جنگی سرگرمیوں کے واقعات رائے عامہ کے سامنے نہ بیان کیے جائیں۔ صرف فرائض و سنن سے ان کو روشناس کیا جائے اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں جن کا تعلق عادات و شمائل سے ہے۔ وہ نہ بیان کی جائیں کیونکہ ان سے کوئی غرض شرعی متعلق نہیں۔ یا وہ حدیثیں مقصود ہیں جن کے حفظ و ضبط کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ (۲) ان تاویلات کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا موقف خود ان کے طرز عمل سے متعین ہو سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے تمام ممالک محروسہ میں معلمین مقرر کیے تھے۔ اور ہر جگہ تاکیدی احکام روانہ کیے تھے کہ ان معلمین سے فرائض اور سنن سیکھو جیسا کہ قرآن سیکھتے ہو۔ چنانچہ مسند دارمی میں ہے:

تعلموا الفرائض والسنن لما تعلمون القران ۔

''فرائض اور سنن کو سیکھو جیسے تم قرآن سیکھتے ہو۔''

اور قرآن کے ساتھ صحت الفاظ و اعراب بھی سیکھو۔ ان کے خاص الفاظ حسب روایت ابن الانباری یہ ہیں: **تعلموا اعراب القران کما تعلمون حفظه ۔**

''اعراب قرآن سیکھو جیسے اس کو یاد کرنا سیکھتے ہو۔''

مورخین نے چونکہ زمانہ فاروق اعظمؓ میں تعلیمی نظم کے لیے کوئی خاص عنوان قائم نہیں کیا اس لیے ان معلموں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی مگر جستہ جستہ تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر شہر میں متعدد صحابہ اس کام پر مامور تھے۔ قرۃ العینین میں ہے کہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۲) ازالۃ الخفاء، ص ۱۴۱

در ہر شہرے مقرئے ومحدثے رافرستاد(۱)

''آپ نے ہر شہر میں ایک قاری اور ایک محدث بھیجا۔''

اور روضۃ الاحباب کے حوالے سے لکھا ہے کہ زمانہ فاروق اعظمؓ میں ایک ہزار چھتیس شہر فتح ہوئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں ایک ہزار چھتیس صحابہ کرام کی حدیث کو اشاعت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ چاہیں تو تذکرۃ الحفاظ اسد الغابہ اور الاصابہ جیسی کتابوں سے ایسے صحابہ کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ جن کو حضرت عمرؓ نے معلمین سنن اور محدثین کی حیثیت سے روانہ کیا۔ ایک بار مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے یہ بات واشگاف لفظوں میں فرمائی۔

انی اشهدكم على امراء الامصار انی لم ابعثهم الا ليفقهوا الناس فی دينهم(۲)

''میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے امراء کو شہروں میں دین سکھانے کے لیے روانہ کیا ہے۔''

انی والله مابعث اليكم عمالی ليضربوا ابشاركم ولكن ابعثهم اليكم ليعلموا دينكم وسنة نبيكم(۳)

''میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے امراء کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔''

گویا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ہر ملکی افسر انتظامی سربراہی کے ساتھ محدث اور معلم فقہ ہوتا تھا اور یہ التزام صرف انتظامیہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فوجی افسروں میں بھی اس کا خاص لحاظ ہوتا تھا۔ قاضی ابو یوسف رقمطراز ہیں۔

ان عمر بن الخطاب كان اذا اجتمع اليه جيش من اهل الايمان بعث عليهم رجلاً من اهل الفقه والعلم۔

''حضرت عمر کے پاس مسلمان فوجی آئے۔ تو ان پر اہل فقہ اور علم کو امیر بناتے۔''

یاد رہے کہ صدر اول میں فقہ سے مراد سنت ہوتی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

---

(۱) قرۃ العینین: ص ۱۳۶ (۲) کتاب الخراج: ص ۱۱۸ (۳) کتاب الخراج: ص ۱۱۵

مسلمین در زمان شیخین کے متفق بودند باخذ بہ سنت ظاہر کہ معبر بفقہ است (۱)
''مسلمان شیخین کے زمانے میں سنت کو اپنانے پر متفق تھے جسے فقہ کہتے ہیں۔''

اس تمام تفصیل سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ تاریخ کی اتنی بڑی شہادت ہوتے ہوئے روایت حدیث سے ممانعت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں بلکہ سرکاری طور پر اس کے لیے خاص شخصیتیں مقرر تھیں۔

خلافت راشدہ اور تدوین حدیث

خلفائے راشدین کے سارے دور میں ارشادات پیغمبر کی عمومی حفاظت رائے عامہ نے اسی طرح کی اور اسی کا نام ان کی زبان میں العلم تھا۔ اور یہ علم کی نگرانی سابقہ رواج کے مطابق بطریق الراویۃ تھی۔

یہ بات کہ خلافت راشدہ میں باقاعدہ قانونی طور پر کتابی صورت میں حدیث کی تدوین کیوں نہیں کی۔ اس کے لیے ہم یہاں حافظ ابوبکر بن عقال کے بیان کا ایک اقتباس ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

ابوبکر بن عقال الصقلی بروایت ابن بشکوال رقمطراز ہیں کہ حدیث کا سارا ذخیرہ زمانہ نبوت کے بعد صحابہ کے سینوں میں الگ الگ تھا۔ یعنی کسی کو کچھ معلوم تھا۔ ساری زندگی ایک ہی شخص کو معلوم نہ تھی اور پھر جسے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ بھی معانی کی حد تک۔ کیونکہ الفاظ کی حفاظت کا اس کے لیے کوئی قانونی اہتمام روز اول ہی سے نہیں کیا گیا تھا۔ برخلاف قرآن کے کہ اس کے الفاظ کی قانونی طور پر نگرانی کی گئی تھی۔

ایسی حالت میں اگر صحابہ کرام زمانہ خلافت راشدہ میں قرآن ہی کی طرح احادیث کو بھی یکجا کر لیتے اس میں ایک طرف یہ خوبی ضرور ہوتی۔ کہ ایک قابل اعتماد علمی سرمایہ کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا مگر یہ قباحت بھی یقینی طور پر پیش آتی کہ قرآن اپنے اعجاز کی وجہ سے متعینہ الفاظ میں محفوظ تھا۔ برخلاف سنت کے کہ اس کے معانی و مطالب مقرر تھے۔

(۱) قرۃ العینین: ص ۱۶۴

گر الفاظ کا اعجاز نہ ہونے کی وجہ سے قرآن جیسی حفاظت نہیں کی گئی۔ اس لیے حدیث کا جو ذخیرہ کتاب سے باہر رہتا وہ حدیث ہونے کے باوجود بے اعتبار ہو جاتا۔

ان وجوہ سے خلافت راشدہ نے حدیث کو خود سرکاری طور پر کتابی طرز پر جمع نہیں کیا بلکہ اس کو بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دیا۔

(۱) نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دوسرے انبیاء کی نبوتوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت لے کر آئی ہے۔ دوسری نبوتوں سے اس کو ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ نبوت اپنے ساتھ خلافت لے کر آئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے نبوت کے اس امتیاز کو قرآن کا منطوق قرار دیا ہے۔ قرآن کی مشہور آیت نسخ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما ننسخ من ایۃ او ننسھانات بخیر منھا او مثلھا فقولہ' بخیر منھا فیما تکون النبوۃ مضمومۃ بالخلافۃ۔

''جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو لے آتے ہیں اس سے اچھی یا اس جیسی۔ اس سے اچھی اور بہتر کا مطلب یہ ہے کہ ہم وہ نبوت عطا کرتے ہیں جو خلافت سے وابستہ ہو۔''

حجۃ اللہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

اعظم الانبیاء شاناً من لہ نوع اخر من البعثۃ وذالک ان یکون مراد اللہ تعالیٰ فیہ ان یکون سبباً لخروج الناس من الظلمات الی النور وان یکون قومہ خیر امۃ اخرجت للناس فیکون بعثہ یتناول بعثاً اخر۔

''نبیوں میں بڑی شان کا نبی وہ ہے جو نبی ہونے کے ساتھ ایک اور بعث بھی ساتھ لے کر آئے۔ یہ اس طرح کہ نبی کی نبوت کے ذریعے اللہ سبحانہ کا مقصد ایک تو لوگوں کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان کی روشنیوں میں لانا ہو اور دوسرا یہ کہ اس کی قوم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔ اور یہ آپ کی قوم کی بعثت ہے۔''

(۲) اسلام میں خلافت راشدہ کی حد تک قول خلیفہ کا مقام حجت اور دلیل کا ہے۔ حکیم

الامت شاہ ولی اللہ نے خلفاء کے ارشاد وکردار کی حجیت پر (ازالۃ الخفاء: ص ۴۳۰ ج ۱) پر تفصیلی بحث کی ہے اور اپنے دعویٰ کو قرآن وسنت کے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کہ:

ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم۔

پر لکھا ہے۔

دریں آیت افادہ مے فرماید آنچہ بسعی ایشاں ممکن وشائع ومشہور مے شود دین مرتضی است۔ (۱)

''اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کی کوشش سے اس کو جو قوت ملی اور دین کی جو اشاعت اور شہرت ہوئی وہ دین پسندیدہ ہے۔''

اور آیت:

الذین ان مکناھم فی الارض اقامو الصلوٰۃ۔

پر لکھتے ہیں کہ:

دریں آیت افادہ فرمودہ ہر نمازے و زکوٰتے و امر معروفے و نہی منکرے کہ از ممکناں ظاہر شود محمود ومحل رضا ست۔ (۲)

''یعنی خلافت راشدہ کے قول وفعل کے دین میں حجت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے قرآن میں دین کو ان کی طرف نسبت کر کے اسے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس لیے ان کے تمام اعمال دین میں محمود ومحل رضا ہیں۔''

(۳) اسلام میں جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واجب الاتباع ہے ایسے ہی خلفائے راشدین کی سنت بھی واجب الاتباع ہے یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) ازالۃ الخفاء: ص ۶۱ ج ۱ (۲) ازالۃ الخفاء: ص ۶۱ ج ۱

فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمکسوا بها وعضوا علیها بالنواجذ(۱)

''میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت سے چمٹ جاؤ' اسے تھام لو اور اس کو داڑھوں سے مضبوط پکڑ لو۔''

اسی سنت کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

السنة هی الطریقة المسلوکة لیشتمل ذالک التمسک بما کان علیه و خلفائه الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وهذه هی السنة الکاملة(۲)

''سنت طریقہ مسلوکہ کا نام ہے۔ یہ حضور انور کی سنت اور خلفائے راشدین کے تمام اعتقادات' اعمال اور اقوال کو شامل ہے یہی سنت کاملہ ہے۔''

(۴) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں امت کے اختلاف و افتراق کا پتہ دیا ہے۔ وہاں امت کے لیے اختلاف کے اسی دلدل میں شاہراہ نجات کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے۔ ماانا علیه واصحابی ۔(وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) یہاں آپ نے اپنے ساتھ صحابہ کو ملا کر راہ نجات کی تعیین فرمائی ہے۔

اسی بنا پر فرقہ ناجیہ کی یہ تعریف کی گئی ہے:

الفرقةُ الناجیة هم الاخذون فی العقیدة والعمل جمیعاً بما ظهر من الکتاب والسنة وجری علیه جمهور الصحابة والتابعین(۳)

''فرقہ ناجیہ وہی لوگ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں کتاب و سنت کے ظواہر اور جمہور صحابہ و تابعین کی شاہراہ پر ہوں۔''

---

(۱) ترمذی: ص۹۲ ج ۲۔ ابن ماجہ: ص ۵۔ ابوداؤد: ص ۲۷۹ ج ۲۔ مسند دارمی: ص ۲۶۔ مسند احمد: ص ۱۲۷ ج ۴۔ مستدرک: ص ۹۵ ج ۱) (۲) جامع العلوم والحکم: ص ۱۹۱ ج ۱

(۳) حجۃ اللہ البالغہ: ص ۱۷۰ ج ۱

یعنی فرقہ ناجیہ مفہوم میں کتاب و سنت اور مصداق میں صحابہ و تابعین سے استفادہ کرتا ہے اور اسی مفہوم و مصداق کی ہم آہنگی کو بتانے کے لیے اس فرقہ ناجیہ کا نام السنۃ والجماعۃ رکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ

اسلام کا علمی، اخلاقی اور روحانی نظام نبوت اور خلافت سے مل کر بنتا ہے یعنی قرآن کی ہدایات، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی تشریحات اور خلافت کی آئینی اور قانونی ترتیب کا نام مکمل اسلام ہے۔ اگر صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ میں سے کوئی بھی تدوین سنن کا یہ کام کرتا تو یقیناً یہ تدوین پورے اسلام کی آئینہ دار نہ ہوتی بلکہ خلفاء کے ادوار اربعہ میں سے ایک کے رہ جانے سے بھی سنت کی تدوین ادھوری ہوتی۔ اس لیے ان اکابر میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

(۵) قرآن مجید میں اللہ سبحانہ نے مسلمان کا منتہائے نظر صراط مستقیم قرار دیا ہے اور اسی کی طلب گاری کے لیے ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں درخواست کرتا ہے صراط مستقیم کے تعارف یا تعریف میں جو کہی گئی ہے وہ یہ نہیں کہ وہ صرف انبیاء کا راستہ ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے۔ **صراط الذین انعمت علیھم** (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے) اور ان انعام یافتگان کی قرآن ہی نے خود جو تعیین کی ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ فرمایا:

اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین والشھداء والصالحین۔

''یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔''

یہ آیت گرامی اس بات میں فیصلہ کن ہے کہ صرف انبیاء کی نہیں بلکہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ قرآن کی زبان میں صراط مستقیم ہے۔

آیت استخلاف میں جہاں مخاطبوں سے منکم کے ذریعے خلافت کا وعدہ کیا ہے۔ وہاں ان کی صلاحیت کا پہلے ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے موقعہ پر کلمہ حصر لا کر صدیقیت اور شہادت کو صحابہ کا وصف خصوصی بتایا ہے۔

والذین امنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم۔

"اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی لوگ صدیق اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے حضور۔"

ایک اور موقعہ پر کلمہ خطاب کے ذریعے صحابہ کو کہا ہے:

لتکونوا شھداء علی الناس۔ (تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ)

اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب میں نبوت اور خلافت کے قائم کیے ہوئے نقوش کا نام صراط مستقیم ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے نبوت کے سارے کاموں کو اپنے مخاطبوں کے فرائض بتایا ہے مثلاً

نبوت کا کام دعوت ہے قرآن نے منکم کے خطابی زور سے اسے اپنے مخاطبوں کا فرض قرار دیا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر۔

"چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے۔"

نبوت کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے قرآن نے اسے امت کی خیریت کا ملمح قرار دیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔

"تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے بپا کیے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

نبوت کا مقام شہادت علی الناس ہے قرآن نے اسی کو اپنے مخاطبوں کے نقطہ اعتدال پر ہونے کی علت بتا کر خلافت کا فرض قرار دیا ہے۔

کذالک جعلنا کم امۃ وسطاً لتکونو اشھداء علی الناس۔

"ایسے ہی بنا دیا ہم نے تم کو درمیانی امت تا کہ تم ہو جاؤ گواہ لوگوں پر۔"

نبوت کا کام تبلیغ ہے مگر قرآن میں اسی کو خصوصی طور پر خلافت راشدہ کا فریضہ قرار

دیا ہے۔ فرائض کا یہ اشتراک بول رہا ہے کہ اسلام نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس تمام تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت نبوت کا خلافت کے ساتھ پیوند ہے نبوت اگر انفرادی اسوہ ہے تو خلافت اسی کی اجتماعی تشکیل کا نام ہے اس لیے خلافت راشدہ کے اس دور میں جو اسلامی نقطہ نظر سے معیار حق اور حجت و دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنن کو کتابی صورت میں مدون نہیں کیا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو دور خلافت تدوین سے رہ جاتا اور سنت کی ادھوری تدوین ہوتی۔

خلافت راشدہ کے دور میں خدمت حدیث

دور خلافت راشدہ میں حدیث کی اشاعت میں سب سے زیادہ کوشش حضرت فاروق اعظمؓ نے کی ہے اور صرف حدیث نہیں بلکہ روایت کے اصول کے موجد درحقیقت حضرت عمرؓ ہی ہیں جیسا کہ آپ آئندہ پڑھیں گے۔

حدیث کے سلسلے میں جو کام حضرت فاروق اعظمؓ نے کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ:

- احادیث نبوت کو نقل کر کے وقتاً فوقتاً گورنوں اور ضلعی حکام کے پاس روانہ کرتے۔ ان احادیث کا تعلق سنن و فرائض سے ہوتا۔
- صحابہ میں جو لوگ فن حدیث کے امام تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے روانہ کیا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

فاروق اعظمؓ عبداللہ بن مسعودؓ را با جمع بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن معقلؓ و عمران بن حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامتؓ و ابوالدرداءؓ را بہ شام و بمعاویہ بن ابی سفیان کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشاں تجاوز نہ کند(۱)

"فاروق اعظمؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ کیا اور معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن معقل اور عمران بن حصینؓ کو بصرہ عبادہ بن الصامتؓ، ابوالدرداءؓ کو شام روانہ کیا اور حضرت معاویہؓ کو بڑی تاکید سے لکھا کہ ان کی حدیثوں سے آگے نہ بڑھیں۔"

---

(۱) ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۶

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں بادی النظر ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اگر واقعی اشاعت حدیث کا اتنا اہتمام فرمایا ہے تو پھر حضرت عمرؓ سے دفتر حدیث میں احادیث کیوں کم مروی ہیں؟ یہ خلش بظاہر وزنی ہے لیکن دراصل یہاں ایک مغالطہ اور غلط فہمی ہے۔

محدثین کے یہاں یہ مانا ہوا اصول ہے کہ صحابی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے کو دخل نہ ہو تو اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لے مطلب یہی ہوگا کہ حدیث مرفوع ہے جیسا کہ حافظ محمد ابن ابراہیم الوزیر نے حافظ ابن عبدالبر اور دوسرے محدثین سے نقل کیا ہے اور ہے بھی یہ ایک عقلی قانون۔ اس اصول کی روشنی میں حضرت فاروق اعظمؓ کی تقریروں اور تحریری فرامین' نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے جس قدر اصولی مسائل بیان ہوئے ہیں وہ سب احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے۔

مضمون احادیث در خطب خود ارشاد ے فرمانید تا اصل احادیث بآں موقوف خلیفہ قوت یابد۔ یارانیکہ بغور سخن نرسند ایں رانمی فہمند ونمی دانند کہ فاروق اعظمؓ تمام علم حدیث را اجمالاً تقویت دادہ و اعلان نمودہ۔

''فاروق اعظمؓ اپنی تقریروں میں حدیثوں کا حوالہ دیتے تاکہ حدیث کا ذخیرہ موقوف خلیفہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مستند ہو جائے جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ فاروق اعظمؓ نے تمام علم حدیث کو اس طرح قوی سے قوی تر بنا دیا ہے۔ اور اس کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔''

قرۃ العینین میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

حضرت فاروق اعظمؓ کی حدیثیں صرف اس قدر نہیں جو ان کے نام سے مسانید میں موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر صحابہ سے جس قدر روایات مرفوعہ نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں وہ سب فاروق اعظمؓ ہی کی روایات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی بے شمار روایات کا وہ ذخیرہ ہے۔

جن کو ان بزرگوں نے فاروق اعظمؓ سے سن کر براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔(۱)

خدمت حدیث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک کارنامہ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی تمام تر توجہ ان احادیث کی اشاعت پر صرف کی جن سے عبادات' معاملات یا اخلاق کے مسائل مستنبط ہوتے تھے۔

سنن ہدیٰ اور سنن زوائد میں امتیاز:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی چند در چند اعمال و افعال کا مجموعہ تھی اور آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ عربی ہونے اور قریشی ہونے کی بھی حیثیت رکھتے تھے اس لیے فاروق اعظمؓ نے ان سب حیثیتوں میں بھی ایک نمایاں امتیاز اور خط فاصل قائم کیا تا کہ سنن ہدیٰ اور سنن زوائد میں اختلاط اور التباس نہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں

فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق بیان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیر آں مصروف ساخت لہذا احادیث شمائل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و احادیث سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت مے کرد بدو وجہ۔ یکے آنکہ انہا از علوم تکلیفیہ و تشریعیہ نیست تحمل کہ چوں اہتمام تام بروایت آں بکار برند بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدیٰ مشتبہ گردد۔(۲)

"فاروق اعظمؓ نے وقت نظر سے دو قسم کی حدیثوں میں ایک جوہری فرق قائم کیا اور بتایا کہ وہ حدیثیں کون سی ہیں جن کا تعلق شرائع سے ہے اور وہ کون سی ہیں جو ان سے متعلق نہیں ہیں اسی لیے حضرت عمرؓ وہ احادیث کم بیان کرتے جن کا تعلق سنن زوائد سے ہوتا اور اس میں دو وجہ پیش نظر تھیں ایک یہ کہ سنن زوائد کا تعلق تشریع سے نہیں ممکن ہے کہ ان کی روایت کا اہتمام لوگوں میں سنن زوائد اور سنن ہدیٰ میں اشتباہ پیدا کر دے۔"

---

(۱) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (۲) ازالۃ الخفاء ج ۲ص

شاہ صاحب نے قرۃ العینین میں بالکل درست لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابہ کو خاص اسی مشن پر تمام اطراف مملکت میں روانہ فرمایا اور ان کو روایت کا طریقہ سکھایا اور روایت حدیث کی ان کو زیادہ سے زیادہ تحریض فرمائی اور رائے عامہ کو ان حضرات سے احادیث سیکھنے کی ترغیب دی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری نگرانی خود کی اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کو جانچا اور پرکھا۔ اور اس کے ساتھ ان محدثین کو قرآن و حدیث میں باہم ربط' قرآن میں آئی ہوئی عام بات کو سنت کے ذریعے تخصیص اور مجملات قرآن کے لیے سنت کے ذریعے بیان کے قوانین سکھائے۔

اللہ اکبر! ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ بزرگوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات لوگ خود نہیں سمجھتے اور بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں۔

میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ایسا نہ ہو کہ دامن مقصود ہاتھ سے نکل جائے میں بتا یہ رہا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال' افعال اور احوال کا نام حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کچھ بتانے سے پہلے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ امام اعظمؒ کے بارے میں چند ضروری اور بنیادی باتیں ناظرین کے سامنے رکھوں۔

نام' کنیت اور لقب

نام نعمان' کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ پیدائش کا سال ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء ہے۔ ابن حجر مکی نے امام صاحب کو یہ کہہ کر اسم با مسمیٰ قرار دیا ہے کہ نعمان لغت میں دراصل اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا سارا ڈھانچہ قائم ہے اور جس کے ذریعے جسم کی ساری مشینری حرکت کرتی ہے۔ اسی لیے روح کو بھی نعمان کہتے ہیں چونکہ امام اعظمؒ (۱) کی ذات

---

(۱) ابو حنیفہ کو امام اعظم کہنے والے صرف احناف ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے سب ہی ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں حافظ محمد ابراہیم الوزیر نے ... باقی صفحہ ۱۸۶ پر

گرامی اسلام میں قانون سازی کے فن کے لیے محور اور اس کے مدارک و مشکلات کیلیے مرکز ہے اس لیے آپ کا نام نعمان ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ فابو حنیفة به قوام الفقه (۱)(ابو حنیفہ فقہ کا آسرا ہیں) سرخ اور خوشبودار گھاس کو بھی نعمان کہتے ہیں۔ اور امام صاحب کی کمالاتی مہک اور لہک سے اسلامی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہے۔

طابت خلاله' وبلغ الغاية كماله'(۲)

''عادات میں پاکیزگی اور کمال انتہا کو پہنچ گیا۔''

ابن حجر(۳) الہیثمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ نعمان فعلان کے وزن پر نعمت سے بنا ہے اسم

﴿بقیہ صفحہ ۱۸۵﴾ الروض الباسم میں اور ملک العلماء عزالدین بن عبدالسلام نے قواعد الاحکام میں اسی لقب سے پکارا ہے اور کیوں نہ پکاریں جبکہ بقول حافظ محمد بن ابراہیم آپ کی علمی بزرگی' عدالت تقویٰ اور امانت تواتر سے ثابت ہے اور آپ کا علمی مقام تمام عالم اسلامی میں شرقاً وغرباً ۱۵۰ھ سے آج تک علماء میں مانا ہوا ہے۔

(۱) الخیرات الحسان: ص ۱۰ (۲) الخیرات الحسان

(۳) پورا نام احمد بن محمد بن علی بن حجر ہے۔ ان کو ہیثمی مصر عربی میں ایک شہر کے محلہ ابی الہیثم میں بود و باش کی وجہ سے کہتے ہیں اور قبیلہ بن اسعد سے نسبی تعلق کی وجہ سے ان کو اسعدی بولتے ہیں (النور السافر فی القرون العاشر) رجب ۹۰۹ھ میں ولادت ہوئی بچپنے ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا یتیمی کا سارا وقت عارف باللہ شمس الدین بن ابی الحمائل اور امام شمس الدین الشناوی کی کفالت میں گذرا الشناوی ان کو ابی الہیثم سے مقام قطب الشریف میں لے گئے ابتدائی کتابیں اسی جگہ پڑھیں پھر جامع ازہر میں داخل ہو گئے اچھے اور مہربان اساتذہ کی آغوش میں تفسیر' حدیث' فقہ' کلام' فلسفہ' منطق اور فرائض میں خاص مہارت پیدا کی ۹۳۳ھ کے آخری میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس آ گئے لیکن ۹۵۰ھ میں گھر بار سمیت مکہ معظمہ میں ڈیرا لگا لیا اور تا وفات وہیں درس و افتاء کا کام کیا ان کی تصانیف میں بڑی مفید کتابیں ہیں تاریخ وفات ۹۹۵ھ ہے مناقب امام اعظم پر الخیرات الحسان کے نام سے کتاب لکھی ہے مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔

گرامی میں معنوی رعائیت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی مخلوق خدا کے لیے ایک نعمت ہے اسی لیے آپ کا نام نامی نعمان ہے۔ فرماتے ہیں:

فابو حنیفة نعمة الله علی خلقه (۱)

''ابوحنیفہ مخلوق کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔''

آپ کی کنیت ابوحنیفہ ہے لغت میں حنیفہ حنیف کا مونث ہے حنیف اسے کہتے ہیں جو سب سے ہٹ کر اللہ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حنیف کہتے ہیں۔ امام اعظم نے یہ کنیت اپنے لیے کیوں تجویز فرمائی ہے؟ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ صرف تفاؤل کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے جیسے عموماً ابوالمحاسن' ابوالحسنات' ابوالکلام وغیرہ کنیتیں رکھی جاتی ہیں ورنہ اس نام کی آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں ہے۔

ولا یعلم له' ذکر ولا انثی غیر حماد۔(۲)

''آپ کی کوئی لڑکی نہیں ہے اور نہ حماد کے سوا کوئی لڑکا۔''

اور یہ محض قیاس آرائی ہے کہ عراق زبان میں حنیفہ دوات کو کہتے ہیں اور آپ کا قلم دوات سے چونکہ گہرا لگاؤ رہا ہے اس لیے آپ کو ابوحنیفہ کہتے ہیں۔

دراصل جیسے اشخاص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف ہیں ایسے ہی ادیان میں ان کا دین حنیف اور ملل میں ان کی ملت حنیفہ ہے۔ حنیف دراصل وہ شخص کہلاتا ہے جو سب سے کٹ کر مولیٰ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر غلط دین سے ہٹنے اور کٹ کر اسلام اختیار کرنے والے کو حنیف کہتے ہیں اسلام کو دین حنیف اور ملت حنیفہ کہتے ہیں حتیٰ کہ تحنف مسلمان ہو جانے کے مترادف ہو گیا۔ زمخشری نے اساس البلاغہ میں اس کے سارے مجازات جمع کر دیے چونکہ امام اعظمؒ میں دین حنیف اور ملت حنیفہ کی خدمت کا جذبہ وشوق شروع ہی سے تھا اور اسی جذبہ وشوق کی بنا پر آپ نے تمام فنون کی تکمیل کے بعد فن کاری کے لیے علم الشرائع کو اپنایا جس کے ذریعے پورے دین کی خدمت ہو سکے میری مراد علم الفقہ ہے اس لیے آپ نے ان ہی

---

(۱) '(۲) الخیرات الحسان ص ۱۲

لطیف احساسات کے اظہار کی خاطر بتائے تفاؤل اپنی کنیت ابوحنیفہ تجویز فرمائی۔ اصل میں ابو الملۃ الحنیفہ ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے زمخشری کے حوالہ سے لکھا ہے:

وتدالله الارض بالاعلام المنيفته كما وطلا الحنيفة بعلوم ابى حنفية

الائمة الجلة الحنيفة ازمة الملة الحنيفة الجود والحلم حاتمى

واحنفى والدين والعلم حنيفى وحنفى۔

''اللہ تعالیٰ نے زمین کو بلند پہاڑوں سے جکڑ دیا اور دین حنیف کو علوم ابی حنیفہ کے ذریعے مضبوط بنا دیا۔ ائمہ احناف ہی ملت حنیفہ کی باگیں ہیں جیسے سخاوت حاتمی اور علم حنفی ہے ایسے ہی دین حنیفی اور علم حنفی ہے۔ (۱)

امام اعظمؒ کا نسب نامہ:

مشہور مورخ ابن (۲) خلکان نے امام اعظمؒ کا سلسلہ نسب اس طرح لکھا ہے:

ابوحنیفہ نعمان پسر ثابت زوطی پسر ماہ (۳) لیکن امام صاحب کے پوتے اسماعیل نے امام صاحب کا جو شجرہ نصب خود بتایا ہے وہ اس طرح ہے۔ نعمان پسر ثابت پسر نعمان پسر مرزبان (۴)

---

(۱) الروض الباسم ج ا ص ۱۵۹ (۲) قاضی القضاۃ شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان۔ تاریخ پیدائش ۶۰۸ھ ہے صحیح بخاری حافظ ابن مکرم سے پڑھی ہے المویدطوسی بھی ان کے اساتذہ میں سے ہیں علم الفقہ موصل میں الکمال بھی یوسف سے اور شام میں ابن شداد سے پڑھا بڑے بڑے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا ہے شام میں پورے دس سال منصب قضا پر فائز رہے اور ایک عرصہ مصر میں گذارا۔ ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مرکہ کی کتاب وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان ہے لفظ خلکان کی صلیت اور اس نام سے شہرت کی علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں عبدالقادر العیدروس نے النور السافر میں قطب الدین مکی سے نقل کیا ہے کہ لفظ خلکان دو فعلوں سے مرکب ہے اول تخیہ سے فعل امر اور دوم کون سے کان فعل ماضی اور کلمہ بکسر الام ہے اور وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خلکان کا تکیہ کلام یہ تھا کہ کان والدی کذا لوگوں نے تنگ آ کر کہا کہ خل کان (کان کو چھوڑ) پس تبھی سے خلکان نام پڑ گیا۔ الیافعی نے مرآۃ الجنان میں تاریخ وفات ۶۹۲ھ بتائی ہے۔ (۳)، (۴) اوجز المسالک ج ا ص ۵۲

دونوں درست ہیں فرق ہے تو صرف یہ کہ ابن خلکان نے جس شخص کو زوطی اور امام صاحب کے پوتے نے جسے نعمان قرار دیا ہے ایک ہی شخص کے دو نام ہیں کیونکہ جو شخص مسلمان ہونے سے پہلے زوطی ہے وہی مسلمان ہونے کے بعد نعمان ہے۔ اسی طرح جس شخص کا نام ماہ ہے اسی کا لقب مرزبان ہے۔ کچھ بھی ہو آپ عجمی اور قبیلہ تیم سے نسبت ولاء کی وجہ سے تیمی ہیں جس طرح امام بخاری کو اسی تعلق کی بنا پر جعفی اور امام ابن ماجہ کو ربعی کہا جاتا ہے ایسے ہی امام صاحب کو تیمی کہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

علامہ نوی (۱) نے تہذیب الاسماء اللغات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ لفظ موالی (۲) زیادہ تر دوستی کے عہد و پیمان یعنی موالی الموالات کے معنے میں استعمال ہوتا ہے تاہم موالی چونکہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لیے امام اعظمؒ کے بارے میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے اور وہ موالی کے معنے غلام کے سمجھ بیٹھے لیکن چونکہ خود امام صاحبؒ کی اپنی تصریح موجود ہے کہ یہ نسبت دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے اس لیے اب دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ امام طحاوی مشکل الآثار میں جو فن حدیث میں اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے عقد موالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) ابوزکریا کنیت' محی الدین لقب' یحیٰی بن اشرف نام ہے تاریخ ولادت محرم الحرام ۶۳۱ھ ہے دمشق کے مضافات میں "نویٰ" نامی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ نووی اور نواوی دونوں طرح بولا جاتا ہے ۶۴۰ھ میں دمشق تشریف لیے گئے اور علامہ کمال الدین مغربی کے پاس رہے اور ان کے فیض صحبت سے اس درجہ علمی کمال کے مالک ہو گئے کہ فنون میں محقق اور حافظ حدیث تھے ساری عمر بغیر شادی کے گذار دی ایک لمحہ بھی بیکار نہ تھے شب و روز میں تین ہی کام تھے مطالعہ' تصنیف اور ذکر الٰہی' کھانا چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار نوش فرماتے مدرسہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث تھے آپ کی تصنیف میں شرح صحیح مسلم' الروضہ' شرح المہذب' کتاب الاذکار اور ریاض الصالحین مشہور ہیں تاریخ وفات ۱۴ رجب ۶۷۶ھ ہے۔ (۲) حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ موالی صرف غلام ہی کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ولاء اسلام' ولاء حلف اور ولاء لزوم کو بھی ولاء کہتے ہیں اور ان تعلقات والوں کو موالی کہا جاتا ہے امام بخاری کو ولاء اسلام کی وجہ سے جعفی' امام مالک کو ولاء حلف کی وجہ سے تیمی اور مقسم کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس زیادہ رہنے کی وجہ سے موالی ابن عباس کہتے ہیں۔

عبداللہ بن یزید کہتے ہیں میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا تم کون ہو میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نومسلم۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کرلو پھر تمہاری نسبت بھی ان کی طرف ہوگی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔(۱)

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ **سمع من ابن عون و ابی حنیفة** یہ ابن عون اور ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں(۲) فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں ہے۔(۳) خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا بتا یہ رہا تھا کہ امام اعظمؒ کو تمیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ دوستی کے عہدو پیمان کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الصیمری (۴) نے مناقب میں اور الخطیب نے تاریخ بغداد میں امام صاحبؒ کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان لکھا ہے کہ:

میں اسماعیل پسر حماد پسر نعمان پسر ثابت پسر نعمان پسر مرزبان ابناء فارس سے ہوں اور ہم آزاد ہیں واللہ ہم پر غلامی کا دور کبھی بھی نہیں آیا ہے۔(۵)

---

(۱) مشکل الآثار ص ۵۴ ج ۴ (۲)'(۳) تذکرۃ الحفاظ ص ۳۳۴ ج ۱۔ الصیمری کیمیر بروزن حیدر ہے اور اس کی صیمری نسبت ہے صیمر ایک شہر کا نام ہے پورا نام الحسین بن علی بن محمد بن جعفر ہے ابوعبداللہ کنیت ہے صیمری صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں خطیب بغدادی ان کے تلامذہ میں سے ہیں خطیب نے امام صیمری کی زبانی لکھا ہے کہ میں نے حافظ دارقطنی سے ان کی کتاب السنن کا سماع کیا ہے ان کی تاریخ وفات اتوار کا دن ۲۱ شوال ۴۳۶ھ اور ولادت ۳۵۱ھ ہے خطیب نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ صدوق' وافر العقل' جمیل المعاشرۃ' عارف بحقوق اہل العلم۔ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ بمقام ربع الکرخ منصب قضا پر تا وفات فائز رہے ہیں امام ابوالید الباجی فرماتے ہیں کہ بغداد میں ان کو احناف کی امامت حاصل تھی اور لکھا ہے کان قاضیا عالما خیرا۔ مولانا عبدالحی نے الفوائد البہیہ میں بتایا ہے کہ صیمری نے امام اعظمؒ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب اخبار ابی حنیفہ کے نام سے لکھی ہے۔

(۴) الجواہر المضیہ ص ۲۱۴ ج ۱ ' الفوائد البہیہ: ص ۶۸ (۵) التعلیقات علی المناقب: ۸

اس تاکیدی اور قسم والے بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بنی تیم کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس غلط فہمی کا سرچشمہ ابو خازم(۱) عبدالحمید کا وہ بیان ہے جو حافظ ذہبی نے مناقب میں درج کیا ہے لیکن اس بیان کا محور و مرکز جسے قرار دیا گیا ہے وہ بے نام ہے اس لیے گمنام شخص کی بات پر فیصلے کی بنیاد رکھنا قرین انصاف نہیں ہے جب کہ خود امام صاحبؒ اور ان کے پوتے کا بیان اس موضوع پر موجود ہے اور اس باب میں اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جس موالات کا تاریخ میں تذکرہ ہے وہ ولاء محبت و مودت ہے ولاء عتاق نہیں ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف بہ اسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقد موالات یعنی دوستی و قرابت کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف و مولی کہلاتا۔ بالتصریح تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عقد موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحبؒ کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں:

ولد ابوہ ثابت علی الاسلام (۲)

''ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے۔''

اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہوگا زوطی کا اسلامی نام نعمان ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان بھی ہے کہ ہمارے پردادا ثابت حضرت علیؓ کے پاس گئے حضرت علیؓ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا کی ہے(۳) ابن حجر ہیثمی نے خود اسماعیل کا اس دعاء کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے:

---

(۱) پورا نام عبدالحمید بن قاضی عبدالعزیز ہے موصوف صرف ایک واسطہ سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور حافظ ابوجعفر طحاوی کے استاد ہیں ملا علی قاری نے ان کی تاریخ وفات ۱۹۲ھ لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہترین قاضی اور بلند پایہ فقیہہ تھے امانت و دیانت میں بے مثال تھے ابن الجوزی نے المنتظم میں ان کے آثار جمیلہ کے بڑے گن گائے ہیں۔ المحاضر کتاب ادب القاضی اور کتاب الفرائض ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ (۲) الجواہر المضیہ: ص ۴۵۲ ج ۲ (۳) عمدۃ الرعایہ: ص ۳۴

ہمیں امید ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہمارے بارے میں حضرت علیؓ کی یہ دعا ضرور قبول فرمائی ہے۔(۱(

باالفاظ دیگر امت کو حضرت امام اعظمؒ امیر المومنین علی مرتضیٰ کی دعاؤں کے صدق میں ملے ہیں ملا علی قاری نے بھی مناقب امام میں اسماعیل بن حماد کا یہ بیان نقل کیا ہے۔(۲)

امام اعظمؒ کے متعلق نبوی پیش گوئی:

بہر حال امام اعظمؒ عجمی ہیں۔ ماہ یا مرزبان آپ کے پردادا کا نام فارسی ہے اس لیے آپ کا نسل فارسی سے ہونا یقینی ہے۔

فارس کے بارے میں صحیحین اور جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوال سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اسی صحبت میں سورہ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی۔ **واخرین منھم لما یلحقوا بھم** حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ دوسرے کون ہیں؟ جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں خاموشی اختیار فرمائی پوچھنے والے نے یہی سوال دوبارہ کیا سہ بارہ کیا تب آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے کاندھے پر دست مبارک رکھ دیا اور فرمایا کہ:

لو کان ایمان عندالثریالنا لہ' رجال من ھولاءِ۔

''اگر ایمان کہکشاں میں بھی ہوگا تو ان کے کچھ آدمی ضرور اسے پالیں گے۔''

مسند احمد میں ایک اور سند کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں:

لو کان العلم بالثریالتنا ولہ' ناسٌ من ابناءِ فارس۔

''اگر علم ثریا میں ہو تو فارسی لوگ اسے پالیں گے۔''

---

(۱) الخیرات الحسان

(۲) مناقب امام لملا علی قاری ضلکہ الجواہر المضیہ: ص ۴۵۴ ج ۲

ابونعیم اصفہانی' الشیرازی' الطبرانی اور امام مسلم نے یہی حدیث بالفاظ مختلفہ روایت کی ہے (۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا ایک مصداق شارحین حدیث نے امام اعظمؒ کو قرار دیا ہے حافظ سیوطی فرماتے ہیں فھذا اصل صحیح یعتمد علیہ فی البشارۃ (۲) (بشارت میں یہ قابل اعتماد اصل صحیح ہے) حافظ ابن حجر مکی نے حافظ سیوطی کے بعض شاگردوں (۳) کے حوالے سے لکھا ہے کہ

ہمارے استاد نے یقین کیا کہ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ ہی مراد ہیں کیونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ امام صاحبؒ کے زمانے میں اہل فارس میں سے کوئی بھی امام صاحبؒ کے علمی مقام کو نہیں پہنچ سکا اور آپ تو آپ بلکہ آپ کے تلامذہ کا بھی کوئی مقام نہ پا سکا۔ (۴)

---

(۱) حافظ ابونعیم اصفہانی نے تاریخ اصفہان میں اس حدیث کے سارے طریق جمع کر دیئے ہیں امام بخاری کے الفاظ آپ پڑھ چکے امام مسلم نے رجال کی جگہ رجل من ابناء فارس نقل کیے ہیں امام احمد اور ترمذی نے ایمان اور دین کی جگہ العلم روایت کیا ہے۔ (۲) تبییض الصحیفہ ص ۱

(۳) بعض شاگردوں سے مراد سیرت شامیہ کے مصنف حافظ محمد بن یوسف شامی ہیں۔ علامہ ابن عابدین الشامی نے مواہب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ العلامۃ الشامی تلمیذ الحافظ السیوطی۔ جناب علامہ نواب صدیق حسن خان نے اتحاف میں یہاں پر حافظ سیوطی اور حافظ محمد یوسف شامی پر سخت برہمی کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے اس حدیث کا مصدق خاص امام اعظمؒ کو کیوں قرار دیا ہے اور عون الباری حل اولۃ البخاری میں اس پیش گوئی کو صرف زمرۂ محدثین تک محدود رکھا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے محدثین کے ساتھ فقہاء کو بھی شامل کر لیا ہے اور شاہ صاحبؒ کے مشہور شاگرد بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم نے اس کو اور زیادہ عام کر کے فقہاء محدثین کے ساتھ مشائخ طریقت کو بھی اس کا مصداق بتایا ہے (مظہری ص ۴۵۸ ج ۳) اگرچہ ارشاد کے الفاظ رجال من ہولاء اس سے مانع نہیں ہیں مگر اس بشارت میں داخل ہونے کے لیے صرف وطن کافی نہیں ہے۔ بلکہ نسل فارسی سے ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ابناء فارس کی صاف تصریح ہے اور معلوم ہوا کہ وطن سے نسل تبدیل نہیں ہوتی۔ (۴) الخیرات الحسان ص ۱۴

صرف حافظ جلال الدین السیوطی اور حافظ بن یوسف ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسرے محققین نے بھی حدیث کا مصداق امام اعظمؒ ہی کو قرار دیا ہے۔ علامہ حنفی فرماتے ہیں:

حمله بعض المحققين على ابى حنيفة (١)

''بعض محققین نے اسے امام ابوحنیفہ پر محمول کیا ہے۔''

اور علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ

على الامام الاعظم ابى حنيفة واصحابه (٢)

''اس کا مصداق امام اعظمؒ اور ان کے اصحاب ہیں۔''

حکیم الامت شاہ ولی اللہ (٣) محدث اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

ایک روز اس حدیث پر ہم نے گفتگو کی میں نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ نے علم فقہ کی اشاعت ان کے ہاتھوں کرائی اور اہل اسلام کی اس کے ذریعے اصلاح فرمائی بالخصوص اس آخری دور میں کہ دولت بس یہی مذہب ہے سارے شہروں میں بادشاہ حنفی ہیں قاضی حنفی ہیں اور مدرسین حنفی ہیں۔ (٤)

---

(١)'(٢) السراج المنیر ص ٢١٨ ج ٣ (٣) احمد نام قطب الدین تاریخی نام ولی اللہ عرف ہے تمیں واسطوں سے نسباً فاروقی ہیں۔ جزءلطیف میں فرماتے ہیں کہ ولادت چہار شنبہ کے روز ۴ شوال المکرم ١١١٤ھ میں ہوئی ہے۔ حفظ قرآن کے بعد درسی کتابوں سے پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی حدیث پہلے ہندوستان میں الشیخ محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی ہے ١١٤٣ھ میں حج کو تشریف لے گئے وہاں الشیخ طاہر مدنی سے صحیح بخاری کا سماع کیا موطا' مسند دارمی اور امام محمد کی کتاب الآثار پڑھی شاہ صاحب کی تصانیف علماء کے لیے مشعل ہدایت میں ہیں شاہ صاحب اپنے دور کے مجتہد اور مسائل فرعیہ میں عملاً حنفی تھے اور صرف از خود ہی عملاً حنفی نہ تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ ایسا ہی رہنے کی مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے فیوض الحرمین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت لفظوں میں لکھی ہے ایاک ان تخالف القوم فی الفرع۔ (اپنی قوم کے فروع میں اختلاف سے بچ کر رہو) ﴿باقی صفحہ ١٩٥ پر﴾ (٤) مکتوبات ص ١٦٨

نواب صدیق حسن صاحبؒ نے اتحاف النبلاء المتقین میں بہت کچھ چنین و چناں کے بعد لکھا ہے کہ:

ہم امام دراں داخل است و ہم جملہ محدثین فرس (۱)

لیکن ''ہم جملہ محدثین'' سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ان ہی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں کہ

جہابذہ محدثین مثل بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ و امثال ایشاں۔

کیوں؟ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ:

زیرا کہ ہمہ ایشاں از عجم و سرزمین فارس بودند (۲)

''کیونکہ یہ تمام عجمی تھے اور زمین فارس سے تعلق رکھتے تھے۔

حیرت ہے کہ نواب صاحبؒ نے جملہ محدثین کو ارشاد نبوت کا مصداق بنانے کے شوق میں عجمی اور فارسی بنا دیا حالانکہ تاریخ سے امام بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کسی کا عجمی ہونا ثابت نہیں ہے امام مسلم (۳) کے متعلق خود امام نووی کی تصریح ہے کہ عربی ملبیۃ کیونکہ وہ نسباً قشیری ہیں خود نواب صاحبؒ فرماتے ہیں:

نسبۃ الی قشیر مصغراً قبیلۃ معروفۃ من العرب۔

''عرب کے مشہور قبیلہ قشیر کی طرف اسم نسبت ہے۔''

اور امام ابوداؤد عربی نژاد ہیں اور عرب کے مشہور قبیلے ازد سے تعلق کی وجہ سے ازدی ہیں ترمذی قبیلہ بنی سلیم کی طرف نسبت کی وجہ سے سلمی ہیں۔ محدث حاکم ضبی اور امام دارمی

﴿۳ بقیہ صفحہ ۱۹۴﴾ علامہ نواب صدیق حسن مرحوم نے الحطہ میں ان کے طریق علمی پر ایک جامع تبصرہ کے بعد لکھا ہے کہ طریقہ کلاً حنفی اور صرف شاہ صاحب ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ خاندان او حنفی بود۔ وہ مجدد تھے تاریخ وفات ''لوبود امام اعظم دین'' ۱۱۷۶ھ ہے۔

(۱)'(۲) اتحاف النبلاء المتقین: ص ۲۲۳

(۳) ابوالحسین کنیت' عساکر الدین لقب' مسلم بن الحجاج نام ہے ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے ﴿باقی صفحہ ۱۹۶ پر﴾

بنی ورام کی طرف منسوب ہیں جو قبیلہ تمیم کی مشہور شاخ ہے اور امام المحدثین مالک بن انس خالص عربی ہیں اور امام احمد الشیبانی الذہلی ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں امام احمد (۱) کا پورا نسب ان کے صاحبزادے کی زبانی درج کیا ہے۔

انصاف فرمایئے کہ جملہ محدثین میں بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کون سا محدث فارسی النسل ہے؟ اگر ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہے جبکہ تاریخ کی عملی شہادت موجود ہے تو پھر واقعات کی روشنی میں اس ارشاد نبوت کا اولین مصداق امام اعظم کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

امام اعظم اور اعجاز نبوی:

بہر حال اگر یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہے جبکہ صحیحین میں موجود ہے تو پھر بتانے والوں نے اگر بتایا ہے کہ امام اعظم اس نبوی پیش گوئی کا مصداق اولین ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اعجازی کارنامہ ہیں تو اس میں مبالغہ ہی کیا ہے چنانچہ علامہ ابن حجر ہیثمی نے لکھا ہے

☆ ۳ بقیہ صفحہ ۱۹۵ اور ۵۵ سال کی عمر میں نصر آباد میں ۲۶۱ھ کو وفات پائی علمی طلبگاریوں کے سلسلہ میں حجاز، عراق اور مصر آپ کی جولانگاہ رہے ہیں آپ کی تصانیف میں جلیل القدر تصنیف صحیح مسلم ہے آپ نے اس کتاب کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا ہے جن کو انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا جیسا کہ محدث حاکم نے خود امام مسلم سے نقل کیا ہے حافظ مسلمہ بن قاسم نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام میں کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی (فتح الباری)

(۱) کنیت ابو عبداللہ نام احمد امام بخاری نے آپ کو تاریخ میں الشیبانی الذہلی لکھا ہے حافظ ذہبی نے تاریخ میں آپ کا پورا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ آپ مازن بن شیبان بن ذہلی کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے عربی نژاد ہیں اس لیے آپ ذہلی بھی ہیں اور شیبانی بھی۔ سکونت کے لحاظ سے مروزی اور بغدادی ہیں آپ کے اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔

فیہ معجزة ظاہرة للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبر بما سیقع (۱)

''اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا معجزہ ہے آپ نے ہونے والی بات کا پتہ دیا ہے۔''

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی برتری کے لیے یہ شرف کافی ہے کہ وہ نبوت کا معجزہ ہیں اور اس سے بڑا شرف ہی کیا ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مکاتیب میں سے ہر مکتب فکر نے امام اعظمؒ کے مناقب کو اپنے لیے زاد راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شوافع میں حافظ جلال الدین السیوطی حافظ ابن حجر مکی حافظ ذہبی ابن خلکان الیافعی علامہ نووی امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی موالک میں سے حافظ ابن عبدالبر اور حنابلہ میں سے علامہ یوسف بن عبدالہادی۔ الغرض اس نادرۃ الدہر کی بے ہمتائیوں کا یہ حال تھا کہ محدثین اور فقہاء میں سے کوئی نہیں جس کی زبان ان کے مفاخر اور مآثر کے گیت نہ گا رہی ہو۔

الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء اور مناقب ذہبی سے اگر اس دور کے صرف ایسے علماء کی ایک فہرست تیار کی جائے جنہوں نے امام صاحبؒ کے کمال علم و عمل کو سراہا ہے تو ان کی تعداد سو سے متجاوز ہو گی۔ مسعر بن کدام ایوب السختیانی سلیمان بن مہران شعبہ بن الحجاج سفیان ثوری سفیان بن عیینہ حماد بن زید ابن ابی عروبہ ابن شبرمہ یحییٰ بن سعید القطان۔ ان خوبان زمانہ کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب یک زبان ہیں کہ امام اعظمؒ جیسا جمال ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔

امام اعظمؒ کی محبت سنی ہونے کی علامت ہے:

یگانے اور بیگانے سب ہی متفق ہیں حتیٰ کہ کہنے والوں نے اس ذات گرامی کو معیار سنیت بنا دیا اور برملا کہہ دیا کہ

من احب ابا حنیفۃ فھو سنی ومن ابغضہ فھو مبتدع (۲)

''جو ابو حنیفہ سے پیار کرتا ہوں وہ سنی ہے جو آپ سے بغض رکھتا ہے وہ بدعتی ہے۔''

---

(۱) الخیرات الحسان ص ۶ (۲) الجواہر المضیہ ص ۴۶۰ ج ۲

اور ان ہی کی زبانی مسلمانوں کو یہ پیغام ملا ہے کہ:

ہمارے اور لوگوں کے درمیان ابو حنیفہ ہیں جو ان سے محبت و تعلق رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ اہل السنت ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے ہم یقین سے کہتے ہیں کہ وہ بدعتی ہے۔(۱)

معلوم ہے کہ یہ کہنے والے کون ہیں اور کس وقت کہہ رہے ہیں؟ یہ حافظ عبدالعزیز بن میمون ہیں حضرت نافعؒ، حضرت عکرمہ اور حضرت سالم کے سامنے ان کو زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے اور ان کے تلامذہ میں یحییٰ القطان، عبداللہ بن المبارک، عبدالرزاق اور وکیع بن الجراح جیسے اساطین حدیث ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ یہ امام اعظمؒ کے ایک معاصر کی شہادت ہے اور معاصر کی شہادت ہی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے اسی بناء پر بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث مسائل میں امام اعظمؒ کا لوہا مانتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم وفضلہ میں امام علی بن المدینی اور ملک الحفاظ یحییٰ بن معین کے استاد امام وکیع بن الجراح کے متعلق لکھا ہے۔ کان یفتی برای ابی حنیفة۔ حافظ ابن کثیر اور امام ذہبی نے یحییٰ بن سعید القطان کے بارے میں بتایا ہے۔ کان یحییٰ بن سعید یختار قوله فی الفتویٰ (۲) سمجھدار آدمی کے لیے اس میں یہ بات سوچنے کی ہے کہ یحییٰ القطان کی وفات اگر ۱۹۹ھ میں ہوئی ہے تو امام ابو حنیفہؒ کی تقلید ۱۹۹ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی عوام تو عوام یحییٰ جیسے اخص الخواص ان کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابن کثیر نے تصریح کی ہے کہ امام یحییٰ القطان نے جامع صغیر باقاعدہ قاضی ابو یوسف سے سبقاً پڑھی ہے۔ یحییٰ امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمد کے اساد ہدیث ہیں اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ علم رجال میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ عباس دوری نے سید الحفاظ یحییٰ بن معین کے حوالہ سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

---

(۱) الجواہر المضیہ ص۱۸۲ ج۱ (۲) البدایہ ص۱۵۷ ج۷، تذکرہ الحفاظ ص۱۸۲ ج۱

كتب الجامع الصغير عن محمد بن الحسن.
''میں نے جامع صغیر امام محمد سے لکھی ہے۔''
یحیٰ بن معین کے امام بخاری' مسلم' ابوداؤد' ابوزرعہ اور ابویعلی شاگرد ہیں۔

رخِ انور اور سراپائے امامت:

سن آئے ہو کہ امام اعظمؒ کی ولادت ۸۰ھ مطابق ۱۹۹ء بمقام کوفہ ہوئی حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں اور ابن خلکان نے تاریخ میں اسے راجح قرار دیا ہے۔ لیکن ایک روایت میں حافظ سمعانی اور ان کے ساتھ حافظ ابن حبان نے کتاب الجرح والتعدیل میں اور ابوالقاسم سمنانی نے روضۃ الصفا میں ۶۱ھ کو راجح بتایا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کی رائے میں یہی صحیح ہے ان کا دعویٰ ہے کہ آپ معمرین میں سے ہیں۔

جاوز السبعين فى العمر (۱) ''عمر نوے سے زیادہ ہے۔''

حافظ ذہبی نے مشہور محدث ابونعیم الفضل بن دکین سے نقل کیا ہے کہ امام اعظمؒ خوش رو' خوش پوش' خوش مجلس' کریم النفس' خوشبو پسند اور اپنے رفقاء کے بڑے ہی ہمدرد تھے۔ (۲) امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کا قد میانہ تھا نہ بہت لانبے تھے اور نہ کوتاہ' نہایت شیریں زبان' بڑے دلکش اور قادر الکلام تھے۔ (۳)

امام اعظمؒ کے پوتے اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ امام اعظمؒ کسی قدر دراز قد تھے آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی' اچھا لباس پہنتے' عام زندگی میں اچھی حالت میں رہتے' خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل وحرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہوتا تھا۔ (۴)

امام اعظمؒ تابعی ہیں:

اللہ سبحانہٗ کی مخلوقات میں سب سے برتر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

(۱) الروض الباسم: ص۱۹۲ ج۱
(۲) المناقب: ص۸ ج۳
(۳) صدر الائمہ مکی
(۴) الخیرات الحسان: ص۲۰

آپ کے بعد اولوالعزم(۱) من الرسل ہیں ان کے بعد باقی انبیاء کا مقام ہے۔انبیاء کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین عظام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔

اسلام میں صحابہ کا مقام:

صحابہ اور تابعین کو قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے اپنی دائمی خوشنودی کا پروانہ عنایت فرمایا ہے۔

والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوا هم باحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه"۔

"اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی۔ اللہ سے ان راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔"

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ جن مہاجرین نے ہجرت میں اولیت اور سبقت کا شرف حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکوکاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کی ہے ان سب کو اللہ سبحانہ کو خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے۔قرآن کی یہ آیت صحابہ کی عدالت' ثقاہت' صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مدار اسلام ہے۔ اور ان پر جرح کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے کے مترادف ہے۔

الصحابة كلهم عدول مطلقاً بظواهر الكتاب والسنة واجماع من يعتد به(۲)

تمام صحابہ بلا قید عادل ہیں۔قرآن وسنت اور امت کی اجماعی قوت کا تقاضا یہی ہے۔"

امام ابن الاثیر عز الدین علی بن محمد الجزری ۶۳۰ ھ فرماتے ہیں۔

---

(۱) اولوالعزم من الرسل کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے حافظ سیوطی نے قول صحیح کے مطابق پانچ بتائے ہیں نوح۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اولوالعزم نوح والخليل لمحمد۔ و موسى و عيسى والحبيب محمد۔ (۲) مرقات ص ۱۰ ج ۱

الصحابة بشار کون سائر الرواة فی جمیع ذالک الا فی الجرح والتعدیل فانهم کلهم (۱) عدول (۲)

''صحابہ ان تمام راویوں کے شریک ہیں لیکن ان کی جرح وتعدیل سے بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عادل ہیں۔''

---

(۱) عدول عادل کی جمع ہے۔ عدالت عربی زبان کی مصدر ہے اس کے خاص معنے ہیں اس لیے اس کے اصطلاحی اطلاقات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

- عدل ظلم و جور کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنے معاملات وحقوق میں انصاف برتنے کے ہیں مثلاً سلطان عادل، حکومت عادلہ یہ علم الاجتماع کی اصطلاحی عدالت ہے۔
- عدل فسق وعصیان کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے کہتے ہیں نماز میں امام عادل ہو یعنی متقی ہو فاسق نہ ہو یہ فقہاء کی اصطلاح ہے۔
- عدل کے معنے اس ملکہ کے بھی آتے ہیں جو گناہوں سے دور رکھے یہ علم کلام کی اصطلاح ہے۔
- عدل کے معنے گناہوں سے محفوظ ہونے کے بھی آتے ہیں یہ خالص علم تصوف کی اصطلاح ہے۔
- عدل کے معنے بالارادہ روایت میں جھوٹ سے بچنے کے آتے ہیں یہ اصطلاحی محدثین ہے اور یہی معنے اس وقت مراد ہوتے ہیں۔ جب حدیث کے فن میں راویوں کی عدالت کا دعویٰ کیا جاتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں پوری تلاش وجستجو کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ سے بچنے اور ہر ایسے عمل سے دور رہنے کا جس سے روایت پر کوئی حرف آتا ہو حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر الروض الباسم میں امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ اگر عادل بے گناہ کو کہتے ہیں تو پھر انبیاء کو مستثنیٰ کرنے کے بعد پورے انسانی معاشرے میں کوئی عادل نہیں ہے اور اگر ہر گنہگار عادل ہے تو پھر مجروح ومقدوح کوئی نہیں اس لیے عادل وہ ہے جس کا دامن کبائر کی آلودگی سے پاک ہو اور جس کی زندگی میں نیکیاں غالب ہوں۔ امام نووی نے روضہ میں یہی معنے نقل کیے ہیں۔ الغرض ارباب حدیث کے یہاں عدالت یہ ہے کہ بیان روایت میں جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولے اور اس کے دامن میں نیکیاں زیادہ ہوں۔ امام غزالی فرماتے ہیں عدالت دینی زندگی میں سیرت کی استقامت کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ ﴿باقی صفحہ ۲۰۲ پر﴾

(۲) اسد الغابہ ص ۳ ج ۱

تابعین کی بزرگی:

صحابہ کرام کے بعد تابعین بھی اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ چند ارشادات نبوت ہدیہ ناظرین ہیں۔ حضرت عبداللہ (۱) بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یجیی اقوام تسبق شھادۃ احدھم یمینہ' و یمینہ' شھادتہ'۔

''حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں بعد ازیں جو ان کے بعد آئیں گے پھر جو ان کے بعد آئیں گے اس کے بعد ایسی قوم رونما ہوں گی جن کی شہادت قسم سے آگے اور قسم شہادت سے پیش پیش ہوگی۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

سال رجل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس خیر قال القرن الذی انا فیہ ثم الثانی ثم الثالث۔

﴿۱ بقیہ صفحہ ۲۰۱﴾ عدالت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دامن کبائر سے اور صغائر پر اصرار سے پاک ہو اور ان چیزوں سے محتاط ہو جو وقار کے منافی ہوں۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں عادل وہ ہے جس میں ایسا ملکہ ہو جو اس کو ملازم تقویٰ و مروت بنا دے۔ علامہ جزائری رقمطراز ہیں کہ عدالت کے بھی مراتب ہیں۔

(۱) عبداللہ نام اور ابوعبدالرحمن کنیت ہے والد کا نام مسعود اور ہذیل قبیلہ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے خادم خاص اور بدرین میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں الامام الربانی' الفقیہ اور مقری کے بابرکت القاب سے پکارا ہے روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسلام لانے والوں میں ان کا چھٹا نمبر تھا مکہ میں سب سے پہلے بآواز بلند قرآن خوانی کرنے والے یہی تھے ان کو دونوں ہجرتوں حبشہ اور مدینہ کی سعادت حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا کوفہ میں دینی تعلیم کی اساس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے فقہ کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان فیصلوں پر ہے جن کو تلامذہ ابن مسعودؓ مانتے ہوں اور جانتے ہوں۔ (حجۃ البالغہ) صحیح بخاری ص ۳۶۲ ج ۱)

''ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے اچھے لوگ کون ہیں؟ فرمایا میرے زمانے کے پھر دوسرے کے پھر تیسرے کے۔''(۱)

حضرت امام محی الدین ابوزکریا النووی خیر القرون کی حدیث پر نوٹ لکھتے ہیں

درست یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور صحابہ کا زمانہ ہے دوسرا تابعین کا تیسرا اتباع تابعین کا۔(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ مراد ہے۔(۳)

جناب علامہ مولانا صدیق حسن خاں فرماتے ہیں

یہی صدر اول اور سلف صالح ہیں ان ہی کو ہر موضوع پر بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے ان ہی پر دین کی زندگی پر اعتماد ہے۔ دینی زندگی کے سارے احوال' اعمال' اخلاق اور احکام میں یہی سند ہیں۔(۴)

ان تینوں دوروں میں دور اول یعنی زمانہ صحابہ (جو ۱۱۰ھ تک ہے) کمال علم' کمال ایمان کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے دور سے افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں

قرن اولی کمال علم اور کمال ایمان میں ایسے مقام پر تھا کہ قرن ثانی اور قرن ثالث کی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔(۵)

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں

ان تینوں دوروں میں بہترین دور ان لوگوں کا ہے جن کی نگاہوں نے جمال جہاں آرا کا بحالت ایمان مشاہدہ کیا ہے یہی لوگ حق و باطل میں فرق کو سب سے زیادہ جاننے والے' حق کے سب سے زیادہ ماننے والے' حق کے سب سے زیادہ فریفتہ' باطل کے بیری اور حق کی خاطر سب سے زیادہ جان کھپانے والے ہیں۔ بعد میں

---

(۱) صحیح مسلم ص ۱۳۰ ج ۲　(۲) شرح صحیح مسلم ص ۳۰۹ ج ۲　(۳) فتح الباری ص ۴۴ ج ۱
(۴) الحطہ ص ۲۲　(۵) شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص ۱۳۷

آنے والوں کے مقابلے میں علم و دیانت، سرفروشی و حق آشنائی، حق پذیری اور حق کی خاطر مصائب کے استقبال میں سب سے پیش پیش ہیں۔(۱)

---

(۱) العواصم ص ۹۵۔ یاد رہے کہ جمہور کا تو یہی خیال ہے کہ قرن اول سے زمانہ صحابہ، قرن ثانی سے زمانہ تابعین اور قرن ثالث سے زمانہ اتباع تابعین مراد ہے لیکن ازالۃ الخفاء میں حکیم الامت نے جدید تحقیق فرمائی ہے کہ "قرن اول زمانہ آنحضرت بود از ہجرت تا وفات و قرن ثانی زمانہ شیخین و قرن ثالث زمانہ ذی النورین" ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ "قرن اول زمانہ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است تا زمان وفات وے و قرن ثانی از ابتدائے خلافت صدیق تا وفات فاروق و قرن ثالث قرن حضرت عثمان۔" شاہ صاحب نے جمہور سے الگ اپنے اس دعوے کی توجیہ یہ بتائی ہے کہ قرن لغت میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو عمر میں قریب قریب ہوں اور عرف میں ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو ریاست و خلافت میں قریب قریب ہوں۔ جب خلیفہ دوسرا ہو اور وزیر و سردار بھی دوسرا فوجی افسر سپاہی اور شہری بھی اور ہوں تو قرن بدل جاتا ہے۔ (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۸۷) یہ تو لغت اور عرف کے لحاظ سے قرن کی توجیہ ہے۔ اس کے علاوہ جو محدثانہ تحقیق فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے فرماتے ہیں "جب ہم ان تمام روایات کو جو عبارت میں مختلف اور مقصود میں متحد ہیں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قرون ثلاثہ سے اسی مدت کی تفصیل کی ہے اور اس مدت کو تین قرنوں میں تقسیم کر کے ان کی تعریف صرف اس لیے کی ہے کہ ان قرنوں کے مدبر اور صاحبان حکومت سب حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور اعمال خیر کی اشاعت اور غلبہ اسلام کے بارے میں اللہ سبحانہ کا وعدہ ان قرنوں پر پروان چڑھا (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۶۶) شاہ صاحب کی یہ تحقیق از روئے لغت بالکل نپی تلی ہے اور اس تحقیق کی رو سے جن حدیثوں میں زمانہ صحابہ و تابعین میں فتنوں کی خبر دی گئی ہے ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور چونکہ جمہور علماء نے ان تینوں قرنوں سے وہی تینوں دور لیے ہیں جنہیں ہم نے کتاب میں اختیار کیا ہے اس لیے ان کو ان تمام حدیثوں میں تاویل کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے اور ان تمام حدیثوں سے ایسے مطالب کے نت نئے جوڑے بنانے جن میں صحابہ و تابعین کے زمانے میں فتنوں کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی پیدائش دور نبوت یعنی ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں ہوئی ہے۔ آخری صحابی کی وفات کے وقت یعنی ۱۱۰ھ میں آپ کی عمر تیس سال ہے اور اگر حافظ سمعانی، حافظ ابن حبان، حافظ محمد ابن ابراہیم الوزیری کی پیش فرمودہ تاریخ ولادت ۶۱ھ پر اعتماد کیا جائے تو آپ کی عمر ۴۹ سال ہو چکی ہے۔ اگر ۸۰ھ ہی کو مان لیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عمر کی تیس بہاریں دیکھنے کے باوجود آپ نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی جب کہ ابو الطفیل جنگ احد والے دن پیدا ہوئے آٹھ سال زمانہ نبوت پایا کوفہ میں قیام کیا حضرت علیؓ کے ساتھ تمام مشاہد میں شریک رہے اور حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق ۱۱۰ھ میں وفات ہوئی۔ حافظ ابن حجر بھی امام ذہبی کے تقریب میں ہمنوا ہیں۔

مات سنة عشر ومائة (۱) "۱۱۰ھ میں وفات پائی۔"

اس وقت حضرت امام اعظمؒ کی عمر تیس سال تھی اگر یہ صحیح ہے کہ ابو الطفیل شہادت علیؓ مرتضیٰ کے بعد مکہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا تو حضرت امام اعظمؒ سولہ سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے وہاں ابو الطفیل موجود تھے زیارت نہ ہونا ایک حیرت والی بات ہے اور اگر یہ درست ہے کہ ابو الطفیل نے کوفہ ہی میں باقی زندگی گذاری تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک شخص ایک شہر میں پورے تیس سال گذارے اور اس شہر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی موجود ہوں مگر زیارت نہ ہو۔

محدثین کی زبان میں تابعی:

سب مانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور حافظ ذہبی، حافظ عسقلانی، حافظ قسطلانی، حافظ دار قطنی، ابن الجوزی، خطیب بغدادی، ابن سعد، قاضی ابن خلکان، امام شافعی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ جزری اور حافظ تورپشتی کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ امام اعظمؒ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے اور جیسا صحابی ہونے کے لیے بحالت ایمان ذات نبوت کا دیدار کافی ہے ایسا ہی تابعی ہونے کے لیے صرف صحابی کا دیکھ لینا کافی ہے۔

(۱) تقریب التہذیب ص ۱۸۷

روایت نہ تابعی ہونے کے لیے شرط ہے اور نہ صحابی ہونے کے لیے۔ خود امام بخاری نے صحیح میں صحابی کی یہ تعریف کی ہے کہ:

من صحبت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوراٰہ من المسلمین فھو من اصحابہ (۱)

"جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا دید کا شرف بحالت ایمان حاصل ہو وہ صحابی ہے۔"

اور یہ تعریف ارشادات نبوت سے لی گئی ہے۔ ترمذی میں ہے:

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کسی ایسے مسلمان کو آگ نہ لگے گی جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا۔ (۲)

صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت جابرؓ نے بحوالہ حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کی ہے

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے دیکھو کیا تم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی ہے اگر ہوگا تو اس کی برکت سے ان کو فتح ہوگی۔ پھر دوسرا لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے **ھل فیھم من رای اصحاب النبی**؟ کیا ان میں کوئی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھنے والا ہے۔ پس ان کی فتح ہوگی۔ پھر تیسرا لشکر روانہ کیا جائے گا کہا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے اصحاب نبوت کی زیارت کرنے والوں کو دیکھا ہو۔ (۳)

اس ارشاد نبوت سے صحابی اور تابعی کی تعریف واضح ہو کر سامنے آگئی کہ نبوت کی دید کا جسے بحالت ایمان شرف حاصل ہو وہ صحابی ہے اور اس میں تمام محدثین یک زبان ہیں

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۱۶ (۲) ترمذی ص ۲۲۸ (۳) صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۰

اس موضوع پر محدثین میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ایسے ہی جن آنکھوں نے صحابہ کو مسلمان ہونے کی حالت میں دیکھا ہو وہ تابعی (۱) ہے۔

یہ بات کہ امام اعظمؒ کو شرف دید حاصل ہے ایک بے غبار حقیقت ہے اور اسی بنا پر ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ محدثین کا فیصلہ ہے کہ امام اعظمؒ تابعی ہیں۔ ان اکابر کے نام آپ سن چکے ہیں جنہوں نے صحابہ کی دید کی تصریح کی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی سن لیجئے جنہوں

---

(۱) بعض لوگوں کو کتابوں میں تابعی کی یہ تعریف پڑھ کر من لقی الصحابی الخ غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ دیکھنے والا تابعی نہیں بلکہ ملاقات کرنے والا تابعی ہے لیکن وہ اگر لقاء کے معنی بھی محدثین ہی سے پوچھ لیتے تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ حافظ ابن حجر نے شرح نخبۃ میں لقاء کے معنے جو بتائے ہیں اس میں بیٹھنا، ساتھ چلنا، ایک دوسرے سے بغیر گفتگو ملنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا سب داخل ہے چنانچہ وہ صراحۃً لکھتے ہیں:

ویدخل فیھا رؤیۃ احد ھما الاخر اس لیے من لقی الصحابی کے معنے یہ ہیں کہ تابعی وہ شخص ہے جو صحابی سے ملا ہو یعنی اس کے پاس بیٹھا ہو، اس کے ساتھ چلا ہو، بغیر گفتگو کے ملا ہو، ایک دوسرے کو باہم دیکھا ہو۔ شرح نخبہ میں حافظ عسقلانی نے صحابی اور تابعی کی جو تعریف کی ہے اسے بھی سن لیجئے ھو من لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مومناً بہ ومات علی الاسلام جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان ہی پر اس کی موت ہوئی ہو وہ صحابی ہے۔ اب تابعی کی تعریف بھی پڑھ لیجئے ھو من لقی الصحابی کذالک اور ملاقات کا مطلب آپ سن چکے ہیں۔ اسی تعریف کو علامہ نووی نے تقریب میں اظہر بتایا ہے۔ اسی کو علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں اختیار کیا ہے۔ یہی امام حاکم کا مسلک ہے حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اقرب اور حافظ عراقی نے اسی پر محدثین کی اکثریت کا عمل بتایا ہے۔ امام اعمش کے بارے میں اگرچہ ترمذی کی تصریح یہ ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سنی مگر اس کے باوجود صرف شرف دید کی وجہ سے امام مسلم اور امام ابن حبان نے امام اعمش کو طبقہ تابعین میں شمار کیا ہے امام عراقی فرماتے ہیں کہ حضور انورؐ نے اس ارشاد میں کہ: طوبی من رانی وامن بی وطوبی لمن رای من رانی۔ صحابی اور تابعی کی تعریف کر دی اور تابعی اور صحابی ہونے کا مدار دید کو قرار دے دیا۔ (تدریب: ص ۳۱۶)

نے امام صاحبؒ کے تابعی ہونے کا واشگاف لفظوں میں اقرار کیا ہے۔ امام ابوالبرکات عبداللہ نسفی ○ حافظ بدرالدین عینی ○ حافظ ابن الہمام ○ حافظ ولی الدین العراقی ○ شیخ ابن حجر مکی ○ علامہ قسطلانی ○ شیخ عبدالحق دہلوی ○ امام بزاز کردری ○ ملا علی القاریؒ ○ حافظ عبدالقادر قرشی وغیرہ وغیرہ وہم نے تصریح کردی ہے کہ امام اعظمؒ تابعی ہیں۔ سب کا استقصاء تو مشکل ہے لیکن گلے از گلزار چند تصریحات ہدیہ ناظرین ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کی رائے:

حافظ ابن حجر عسقلانی سے کسی نے دریافت کیا کہ امام اعظمؒ تابعی ہیں یا نہیں؟ حافظ صاحب نے اس کا جو جواب دیا ہے حافظ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان ص ۲۱ پر ملا علی قاری نے شرح مسند امام اعظم ص ۲۸۴ پر اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ ص ۵۰۴ پر نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام اعظمؒ نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت ۸۰ھ کوفہ میں ہے۔ کوفہ میں اس وقت حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق بعد میں ہوئی بصرے میں حضرت انس بن مالکؓ تھے ان کی وفات ۹۰ھ کے بعد ہوئی۔ ابن سعد نے ایک بے غبار سند سے یہ بیان درج کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے ان دو کے علاوہ اور بھی صحابہ بقید حیات تھے بعض اکابر نے صحابی سے امام صاحبؒ کی روایت کے موضوع پر کچھ رسائل بھی لکھے ہیں ان کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں۔ بہر حال اتنی بات معتمد اور طے شدہ ہے کہ آپ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور ابن سعد کی تصریح کے مطابق یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام کی زیارت کا امام ابوحنیفہ کو شرف حاصل ہے اس لحاظ سے امام صاحبؒ کا شمار طبقہ تابعین میں ہے اور یہ شرف امام صاحبؒ کے سوا امام صاحبؒ کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہیں ہے۔ نہ امام اوزاعی کو شام میں نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں نہ امام مالک کو مدینہ میں نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ

میں اور لیث بن سعد کو مصر میں۔(۱)

اسی قسم کا ایک اور سوال حافظ ولی الدین (۲) عراقی کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ امام اعظمؒ تابعی ہیں؟ حافظ عراقی نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ حافظ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں نقل کیا ہے اس میں حافظ عراقی نے صاف اقرار کیا ہے کہ اگر صحابی کے دیکھنے کا نام تابعیت ہے تو امام ابوحنیفہؒ کا شمار بلا ریب تابعین میں ہے اور کوئی نہیں جو اس بنیاد کو مان کر امام اعظمؒ کی تابعیت کا انکار کر سکے۔

---

(۱) یہ جو فرمایا کہ ان کی سند ضعف سے خالی نہیں تو اس سے غلط فہمی نہ ہو جائے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف الاسناد ہے یہ نہیں ہے کہ ثابت نہیں ہے تدریب میں حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ اگر سند ضعیف ہو تو ہم اسے ضعیف الاسناد تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کے ہونے کا انکار نہیں کر سکتے اگر اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ہو تو وہ قابل پذیرائی ہے حافظ ابن القیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ الاصل الرابع الاخذ بالمرسل والحدیث الضعیف اذالم یکن فی الباب شیئ یدفعہ۔ ص اا سارے دفتر حدیث و رجال میں ایسی کوئی شہادت نہیں جس میں کوئی امام کے متعلق یہ بتائے کہ آپ نے صحابہ کو نہیں دیکھا ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اصحابہ الشعوہ بالاسانید الصحاح والحسان اور اصولاً یہی راجح ہے۔

(۲) پورا نام احمد بن عبدالرحیم بن الحسین ہے ولی الدین لقب ابوزرعہ کنیت ہے اپنے والد زین الدین عراقی کے ہاتھو پروان چڑھے ہیں ۷۶۲ھ میں ولادت ہوئی ۳ سال کی عمر میں ان کو ان کے والد دمشق لے گئے۔ جوان ہوئے مصر آ گئے یہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا دوبارہ دمشق گئے اور وہاں کے مشائخ سے فیض یاب ہوئے ان کو یہ شرف ہے کہ ان کی جملہ مرویات اور مصنفات کا ان سے ان کے اکابر اور بزرگوں نے سماع کیا۔ فقہ، اصول، معانی و بیان ادب عربی میں کمال حاصل تھا نوجوانی ہی میں مسند تدریس پر بیٹھ گئے تھے ان کی تصانیف میں کافی کتابیں ہیں ان کا مبسوط ترجمہ ابن فہد نے لحظ الالحاظ از ص ۲۸۴ تا ص ۲۹۰ لکھا ہے ان کی وفات ۱۷ شعبان ۸۲۶ھ کو ہوئی۔

حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ:

علامہ محی الدین نووی نے تقریب میں نوع الحاوی والاربعون میں روایۃ الاکابر عن الاصاغر پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑوں کا چھوٹوں سے استفادہ کی ایک قسم یہ بتائی ہے کہ ایک شخص تابعی ہو کر کسی ایسے شخص سے روایت لے جو تابعی نہیں ہے جیسے عمرو بن شعیب کہ یہ تابعی نہیں ہیں۔ لیکن تابعین نے ان سے روایات لی ہیں۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے باوجود تابعی ہونے کے عمرو بن شعیب سے استفادہ کیا ہے ان کی تعداد حافظ عراقی نے پچاس سے زائد بتائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

وعدهم الحافظ العراقی ابوالفضل نیفاد خمسین (۱)

"حافظ عراقی نے ان کو پچاس سے زیادہ شمار کیا ہے۔"

اس کے بعد حافظ عراقی کے بیان کردہ تابعین کے ناموں کی یہ فہرست دی ہے ابراہیم بن میسرہ ○ ایوب السختیانی ○ بکر بن الاشج ○ ثابت بن عجلان ○ ثابت البنانی ○ جریر بن حازم ○ حبان بن عطیہ ○ حبیب ابن ابی موسیٰ ○ جریر بن عثمان ○ الحکم بن عتبہ ○ حمید الطویل ○ داؤد بن قیس ○ داؤد بن ابی ہند ○ الزبیر بن عدی ○ سعید بن ابی ہلال ○ سلمہ ابن دینار سلمان الشیبانی ○ سلیمان الاعمش ○ عاصم الاحول ○ عبداللہ بن عبدالرحمن ○ الطائفی عبداللہ بن عون ○

---

(۱) پورا نام عبدالرحیم بن الحسین بن عبدالرحمن الکردی الرازیانی ہے۔ حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں اور حافظ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے۔ عزالدین بن جماعہ فرماتے تھے کہ مصر میں ان کے سوا جو بھی حدیث دانی کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف مدعی ہے علامہ سبکی العلائی اور ابن کثیر نے ان کی بے حد تعریف کی ہے ان کی تصانیف میں الفیہ اس کی شرح۔ تخریج احیاء تکملہ شرح الترمذی وغیرہ ہیں۔ ابن فہد لکھتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا حدیث انہوں نے الشیخ علاؤ الدین ابن الترکمانی الحنفی سے حاصل کیا اور ان سے ہی حدیث کی دستار فضیلت لی۔ تحصیل علم کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بہت خوبیوں فضیلتوں اور بزرگیوں کا سرمایہ تھے۔ بدھ کے دن ۸ شعبان ۸۰۶ھ میں بمقام قاہرہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تغمده الله برحمته۔

عبداللہ بن ابی ملیکہ ○ عبدالرحمن بن حرملہ ○ عبدالعزیز بن رفیع ○ عبدالملک بن جریج ○ عبداللہ العمری ○ عطا ابن ابی رباح ○ عطا ابن السائب ○ عطا الخراسانی ○ العلا بن الحارث علی بن الحکم ○ عمرو بن دینار ○ ابو اسحق السبیعی ○ قتادہ ○ محمد بن اسحق ○ محمد بن مجادہ ○ محمد عجلان ابو الزبیر ○ زہری ○ مطر الوراق ○ مکحول ○ موسیٰ ابن ابی عائشہ ○ ابوحنیفہ النعمان بن ثابت ○ ہشام بن عروہ ○ ہشام بن الغاز ○ وہب بن ملبہ ○ یحییٰ ابن ابی کثیر ○ یزید بن ابی حبیب نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے ان تابعین میں امام اعظم کا بھی اسم گرامی موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم حافظ عراقی کے نزدیک تابعی ہیں۔ یاد رہے کہ حافظ عراقی فن حدیث میں بڑے پائے کی شخصیت ہیں۔

علامہ قسطلانی کی رائے:

علامہ قسطلانی نے امام اعظم کو تابعین کے زمرے میں شمار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

ھذا مذھب الجمھور من الصحابه کابن عباس وعلی و معاویه و انس بن مالک و خالد و ابی هریره و عائشه و ام ھانی و من التابعین الحسن البصری و ابن سیرین و الشعبی و ابن المسیب وعطاء و ابو حنیفه ومن الفقهاء ابو یوسف و محمد و الشافعی و مالکؒ و احمد (۱)

یہ تمام صحابہ تابعین اور فقہاء کا مذہب ہے صحابہ جیسے ابن عباسؓ ○ علیؓ ○ معاویہؓ ○ انسؓ ○ خالدؓ ○ ابوہریرہؓ ○ عائشہؓ ○ ام ہانیؓ تابعین میں جیسے حسن بصری ○ ابن سیرین ○ شعبی ○ ابن المسیب ○ عطاء اور ابوحنیفہ اور فقہاء میں جیسے ابو یوسف ○ محمد ○ شافعی ○ مالک اور احمد۔
اس میں امام اعظم کا تابعین کے زمرے میں صاف تذکرہ موجود ہے۔

محدثین میں سے حافظ ابو عمرو بن عبدالبر کی شخصیت سے کون ناواقف ہے موصوف نے حضرت انسؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابی عبداللہ بن الحارث بن جزؓ کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے:

---

(۱) ارشاد الساری: ج ۱ ص ۳۸۲

انا اباحنیفه رأی انس بن مالک و عبدالله ابن الحارث بن جزء۔

''امام ابوحنیفہ کو حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ کی دید کا شرف ہے۔''(۱)

عبداللہ بن حارث کی حدیث پر تفصیلی کلام انشاء اللہ آئندہ آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتادینا ضروری ہے کہ حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی بیش بہا تصنیف الانتصار میں لکھا ہے کہ:

مات عبدالله بن الحارث بن جزء سنة سبع و تسعين (۲)

یاد رہے کہ حافظ ابوبکر الجعابی اپنے وقت میں علل حدیث اور تاریخ رجال کے بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ مشہور محدث دارقطنی ان کے شاگرد ہیں' ابوعلی نیشاپوری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہیں دیکھا۔ ان کو چار لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے درس حدیث میں اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھر' گلی' شاہراہوں پر انسان ہی انسان ہو جاتے تھے' ابوالفضل القطان کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوبکر الجعابی کی زبانی سنا ہے کہ میں جب رقہ پہنچا وہاں میرے پاس حدیث کی کتابوں کا گٹھا تھا۔ ایک روز ملازم غمگین صورت بنائے ہوئے آیا۔ بولا آپ کی ساری کتابیں ضائع ہوگئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں ان میں صرف دو لاکھ حدیثیں تھیں۔ وہ سب مجھے زبانی یاد ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ علل و رجال کے امام تھے۔

یہ امام اعظم کے بارے میں دید کی شہادت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مثبت دعویٰ ہے اس کے مقابلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک منفی چیز ہے۔ اصولی طور پر مثبت کو منفی پر مقدم ہونا چاہیے امام بخاری نے جزء رفع یدین میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ایک بات کے بیان کرنے والے دو شخص ہوں ایک کہے میں نے کرتے دیکھا ہے دوسرا کہے میں نے نہیں دیکھا ہے ان میں مثبت شاہد ہے نافی شاہد نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی چیز نظر نہیں ہے' عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں دو شاہدوں نے گواہی دی ایک نے کہا۔ حمید نے اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمہ ایک ہزار روپیہ ہے دوسرا کہتا ہے کوئی اقرار نہیں کیا جو شخص مثبت کا اظہار کر رہا ہے وہ شاہد ہے اسی کو

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۲ ص ۴۷ (۲) المناقب للموفق: ج ۱ ص ۲۶

اپنایا جائے گا یا مثلاً بلال کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اور فضل بن عباس کہتے ہیں کہ آپ نے نماز نہیں پڑھی' بلال کی بات کو قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ شہادت ہے اور نافی کی بات ناقابل التفات ہے۔(۱)

لیجئے اسی ترازو میں امام اعظم کی تابعیت کے معاملے کو تول کر دیکھ لیجئے۔ ایک طرف حافظ ذہبی اور ابن سعد سیف ابن جابر کی زبانی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام اعظم نے انس بن مالک کو دیکھا ہے اور دوسری طرف یہ کہنے والا کوئی نہیں کہ ''نہیں دیکھا'' اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہوتی بھی تو پھر بھی کہا جا سکتا تھا کہ مثبت شاہد ہے اسی ترازو میں روایت کے مسئلہ کو بھی تول لیجئے۔ ایک طرف کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ امام اعظم نے صحابہ سے روایت کی ہے اس کے مقابلے میں دارقطنی صدیاں گذرنے پر کہتے ہیں کہ امام اعظم نے روایت نہیں کی' فرمایئے امام بخاری کے پیش کردہ ضابطہ کے مطابق شاہد کون ہے؟ وہ جو وجود کا پتہ دے رہا ہے یا وہ جو نہیں' نہیں کر رہا ہے آپ ہی انصاف فرمایئے۔

الغرض امام اعظم کا زمانہ صحابہ میں ہونا اور حضرت انس کا دیکھنا محدثین کے یہاں اتفاقی ہے۔ اس لیے وہ یقیناً تابعی ہیں اور تابعی ہونے کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں۔ والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعواھم باحسان ۔ کیونکہ اس آیت میں مہاجرین وانصار سے جمیع صحابہ مراد ہیں چنانچہ حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے محمد بن کعب قرظی سے صحابہ کی بخشش کا اعلان کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ قرآن میں ہے۔ والسابقون الخ اس آیت نے تمام صحابہ کرام کو بخشش کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ البتہ تابعین کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ احسان کے ساتھ صحابہ کے پیروکار ہوں۔ اس لیے اس آیت نے مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک صحابہ دوسرے وہ جو احسان کے ساتھ صحابہ کے تابعین ہوں اور دونوں کے لیے اس آیت میں چار مہتم بالشان وعدے کیے گئے ہیں۔

---

(۱) جزء رفع الیدین: ص ۸

- اول یہ کہ اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا۔
- دوم یہ کہ صحابی اور تابعین اللہ سے راضی ہو گئے۔
- سوم یہ کہ وہ جنتی ہیں۔
- چہارم یہ کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

امام اعظمؒ تابعی ہونے کی وجہ سے ان تمام وعدوں کے مصداق ہیں اور یہ شرف آپ کے سوا ائمہ اربعہ میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے امام اعظمؒ کو دوسرے اماموں پر مقدم کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے:

لانہ ادرک عصر الصحابة ورای انس بن مالک (۱)

امام اعظمؒ کا زمانہ طلب علم:

امام اعظمؒ کے بچپن کا زمانہ علوم کے لیے نہیں بلکہ فنون کے لیے باغ و بہار کا زمانہ تھا۔ آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو ۸۶ھ مطابق ۷۰۵ء میں ولید بن عبدالملک سریر آرائے حکومت ہوا بنوامیہ کا آفتاب اقبال اس وقت نصف النہار پر تھا۔ عہد ولید خلافت اموی کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ فتوحات ملکی اور رفاہ عامہ کے کاموں کی جو سرپرستی ولید نے اپنے دور حکومت میں کی ہے۔ بنوامیہ میں سے کسی نے کم ہی کی ہوگی۔ ولید کی حکومت کا دائرہ مشرق و مغرب شمال و جنوب میں حجاز و عراق سے افریقہ شام ایشیائے کوچک ترکستان ایران افغانستان اور پاکستان میں شہر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے ولید کو تین کارآمد اور مفید سپہ سالار مل گئے تھے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی جس کے ذریعے ایشیا کے قلب تک اسلامی فتوحات پہنچیں۔ موسیٰ بن نصیر جس کے ذریعے اندلس میں جبرالٹر تک اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور محمد بن قاسم جس کے ذریعے پاکستان میں ملتان تک اسلامی فتوحات کا پھریرا لہرایا۔

غرض ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی فوجیں مشرق، مغرب، شمال، جنوب میں فتح و نصرت کے پرچم اڑا رہی تھیں اس کے بعد مسلمانوں کو ایسا کامیاب دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱ص ۱۰۷

ولید کا زمانہ حکومت ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک ہے اور یہی دور امام اعظمؒ کے جھپٹنے اور لڑکپن کا دور ہے یہ سارا زمانہ امام اعظمؒ نے کوفہ میں گذارا ہے۔

کوفہ کی مرکزی حیثیت:

کوفہ کی علمی حیثیت کیا ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث کے سلسلہ میں آئے گی مگر اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ وادی دجلہ اور فرات کا جنوبی حصہ جسے علمائے جغرافیہ عراق کہتے ہیں ایک خوشگوار سرسبز و شاداب علاقہ اور تین ہزار سالہ مدنیت و تہذیب کا علمی گہوارہ ہے بابلیوں آشوریوں کلدانیوں فارسیوں اور یونانیوں کی جولا نگاہ رہا ہے۔ زمانہ خلافت فاروقی میں اس پر پرچم اسلام لہرایا تو مسلمانوں نے اپنے عہد تمدن میں دو نئے شہر بسائے' کچھ تو اس لیے کہ مدائن دارالخلافہ کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی (۱) اور کچھ اس لیے کہ ممالک محروسہ کا تعلق مدینہ طیبہ سے انتظامی طور پر حمل ونقل کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مشکل رہتا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے شہر بسانے کے لیے ایک کمیٹی فرمائی اس کمیٹی کے حسب ذیل ارکان تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ۔ ان حضرات نے شہر کے لیے دریائے فرات کا کنارہ تجویز کیا۔ رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش ہونے پر شہر بسانے کی اجازت ملی۔ منظوری ہو جانے پر محرم الحرام ۱۷ھ جنوری ۲۳۸ء کو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں مدائن چھوڑ کر کوفہ آئے اور آپ کے ساتھ چالیس ہزار نفوس کوفہ میں آباد ہوئے۔

عددھم اربعون الفاً (۲) ''ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔''

اولین رہائش کے لیے خیمے اور چھپر اختیار کیے گئے۔ لیکن خیموں اور چھپروں سے یہ گھروندے آئے دن آگ کی تباہ کاریوں کا شکار رہتے تھے اس لیے کچھ عرصہ بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے پختہ عمارت کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے پر عراق تمدن کے مطابق حضرت ابو الہیاج الاسدی کو پورے شہر کا سروے کرنے پر مقرر کیا گیا۔ آپ نے بڑی محنت سے شاہراہوں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۷ میں ان الصحابۃ استوخموا المدائن (۲) طبری ج ۴ ص ۱۴۱

کوچوں، گورنمنٹ ہاؤس اور جامع مسجد کے لیے پلاٹ مقرر کیے نقشہ اس طرح ترتیب دیا کہ شہر کے مرکزی مقام پر جامع مسجد ہو، جامع مسجد سے چاروں طرف چوڑی چوڑی سڑکیں ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے سڑکوں کی چوڑائی چالیس ہاتھ یعنی ساٹھ فٹ اور گلیوں کی گیارہ فٹ لکھی ہے(۱) اور جامع مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے کافی فاصلہ پر گورنمنٹ ہاؤس بنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی عظیم الشان ترقی کی کہ مدائن کے خزانے، بابل و بصرہ کا تمدن اور عربی تہذیب یہاں امنڈ کر آ گئی۔ حتیٰ کہ لفظ عراق کا مفہوم ہی کوفہ بن گیا (۲) اور صرف یہی نہیں بلکہ الطبری نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تمدن جدید اور تمول کی داستانیں سن کر تمام عرب میں یہاں آبادکاری کے لیے ایک ولولہ پیدا ہوا۔ حضرت عتبہ نے انس بن حجیہ کو حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس روانہ کیا۔ حضرت فاروقؓ نے ان سے پوچھا کہو کوفہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ سننے کے لائق ہے فرمایا کہ:

انثالت علیھم الدنیا فھم یھیلون الذھب و الفضۃ۔

''ان پر دنیا بہ پڑی اس لیے وہ سنا اور چاندی بہا رہے ہیں۔'' (۳)

یہ تو آپ سن چکے ہیں کہ کوفہ میں آبادکاری کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ چالیس ہزار حضرات تھے۔ ان میں صحابہ کس قدر تھے۔ تصریح تو نہیں ملتی ہے مگر حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں مدائن چھوڑنے کے اسباب بتاتے ہوئے جو یہ فقرہ لکھ دیا ہے کہ:

ان الصحابۃ استوخموا المدائن۔ ''صحابہ کو مدائن کی آب و ہوا موافق نہ آئی۔''

تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری تعداد ہی صحابہ کرام پر مشتمل تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری تعداد نے کوفہ کو وطن بنالیا ہو۔ اگرچہ کوفہ کے تمدن اور تمول کو دیکھ کر زیادہ قریب قیاس یہی ہے کہ صحابہ کا یہ جم غفیر اسی جگہ آباد ہوا ہو۔ لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات واپس ہو گئے ہوں مگر حافظ سخاوی کے بیان سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ حافظ ذہبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

(۱) البدایہ والنہایہ: ج ۷ص ۷۵ (۲) تاریخ الاسلام السیاسی: ج ۱ص ۴۷۰ فجر الاسلام: ص ۱۸۰

(۳) تاریخ طبری: ج ۴ص ۱۴۶

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عمار بن یاسرؓ حضرت علی ابن ابی طالب جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی ایک خلقت یہاں آ کر اتری۔(۱)

اس موضوع پر ان بزرگوں نے یہ اپنے علم کی حد تک بتایا ہے اور اسی لیے خیالات مختلف ہیں۔

چنانچہ امام حاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں ان مشاہیر کے نام لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ سے دوسرے اسلامی شہروں میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے کوفہ سے ابتداء کی ہے اور سب سے زیادہ اسی جگہ آنے والوں کی تعداد بتائی ہے۔ حافظ ابو بشر دولابی نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص اور پچاس وہ بزرگ کہ جو غزوہ بدر میں آپ کے ہمرکاب تھے کوفہ میں فروکش ہوئے۔(۲)

امام ابو الحسن احمد بن عبداللہ نے اپنی تاریخ میں اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آ کر آباد ہوئے۔(۳)

حافظ ذہبیؒ حافظ ابن کثیرؒ حافظ ابو بشر دولابی اور امام ابو الحسن عجلی کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے، صحابہ کی تعداد تو زیادہ ہی ہے مگر تعیین عدد ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق کی ہے۔ خود صحابہ کی تعداد کے بارے میں علما کا ایسا ہی اختلاف ہے۔ حافظ ابو زرعہ نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے۔ حافظ ابن حزم نے ایک لاکھ بتیس ہزار لکھی ہے۔ اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو تعداد بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے۔

لم خرج الی الحج و حضر معہ نحو من مائۃ الف و اربعۃ و عشرین الفاً۔(۴)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق تعداد لکھی ہے

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص۹۲) (۲) کتاب الکنی والاسماء: ص۱۷۴ ج۱

(۳) فتح القدیر: ج ۱ ص۴۲ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ج ۲۱۰ ج ۲

صحابہ کی اس کثرت کے ساتھ احمد امین نے کوفہ کا علمی نسب نامہ جو لکھ دیا ہے۔ وہ ان کی زبانی سن لیجئے

کوفہ میں بے حد وحساب صحابہ کرام کا دور ہوا۔ علم میں ان میں زیادہ مشہور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ حضرت علی کو علمی نشر واشاعت کے لیے سیاسی جھمیلوں کی وجہ سے وہ فراغت نہیں ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعود کو نصیب ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی شخصیت صحابہ میں سب سے بڑی علمی اور اثری شخصیت تھی۔ مسلمان ہونے میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ بھی ہجرت کی اور بعد ازیں مدینہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملازم صحبت تھے۔ آپ کو حضور میں جانے کی اجازت تھی۔ قرآن خوانی اور قرآن دانی سے بے حد شغف تھا۔ اسلامی علیم تفسیر قرآن میں امتیازی مقام کی وجہ سے آپ کا کبار علماء صحابہ میں شمار تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کو کوفہ کے شہریوں کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔ اہل کوفہ نے ان سے علم حاصل کیا اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کی۔

اور صرف علم ہی نہیں بلکہ اخلاق وآداب بھی ان سے ہی لیے۔ ان کے شاگردوں کے بارے میں سعید ابن جبیر کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ہی اس شہر کے چشم وچراغ ہیں آپ لوگوں کو قرآن بھی پڑھاتے' تفسیر بھی سکھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی بیان کرتے اور پیش پا افتادہ حالات میں فتویٰ بھی کتاب وسنت سے یا پھر اپنے اجتہاد سے دیتے۔ آپ کے مدرسہ کے چھ شاگرد مشہور ہیں۔ علقمہ ○ اسود ○ مسروق ○ عبیدہ ○ حارث اور عمرو بن شرجیل یہ حضرات کوفہ میں تعلیم وافتاء میں حضرت عبداللہ کے جانشین ہیں لیکن سب علماء کوفہ کا علمی مرکز صرف حضرت عبداللہ ہی کی شخصیت نہ تھی بلکہ ان میں سے بہتوں نے مدینہ جا کر حضرت فاروق اعظمؓ حضرت علی مرتضیٰ' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت معاذ بن جبل اور دوسرے صحابہ سے علمی استفادہ کیا ہے اس کے نتیجے میں کوفہ کو ایک علمی گھرانہ کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ کوفہ کے علماء میں شریح' شعبی' نخعی اور سعید بن جبیر بہت مشہور ہیں۔ اس بستی میں علمی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ علم کا یہی تاج امام اعظمؒ کے سر رکھا گیا۔ (۱)

---

(۱) فجر الاسلام ص ۱۸۴

فی الواقع صحابہ کی اس کثرت کے باوجود علماء کوفہ نے صرف حضرت عبداللہ ہی پر علمی استفادہ میں قناعت نہیں کی بلکہ ان کے شوق طلب کا عالم یہ تھا کہ وہ اس کی خاطر مدینے کا سفر کرتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ابو عبدالرحمٰن السلمی اور دیگر علماء کوفہ جیسے علقمہ، اسود، حارث، زر بن جیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت ابن مسعود سے قرآن سیکھا۔ نیز یہی حضرات مدینہ جاتے اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم یمن میں حضرت معاذ بن جبل سے لی تھی۔ (۱)

اور پھر چند اوراق کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ حضرت عمرؓ علیؓ اور ابوالدرداء سے علم حاصل کرتے تھے۔

اس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ اوراق میں آ رہا ہے یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ امام اعظمؒ کی یہ بستی علمی بستی ہے۔ خلاصہ کے طور پر یوں سمجھ لیجئے۔ کہ فن قرأت وتجوید کے اگر سات امام ہیں جن کو قراء سبعہ کہتے ہیں تو ان میں سے تین عاصم۔ حمزہ اور کسائی کوفی ہیں۔ علم التفسیر میں خود عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کو اعلم الناس بالتفسیر بتایا ہے (۲) حضرت سعید بن جبیر جن کو حضرت قتادہ تفسیر کا سب سے بڑا عالم مانتے ہیں وہ کوفہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ عربیت اور نحو کی تدوین بھی کوفہ اور بصرہ ان دو شہروں میں ہوئی چنانچہ لغت اور نحو کی کتابوں میں ان دو شہروں کے سوا کسی شہر کے علماء کا اختلاف ذکر نہیں کیا جاتا ہے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے کیسی اچھی بات لکھی ہے

علم نحو نے کوفہ و بصرہ کے ان دو شہروں میں نشو ونما پائی ہے جو پہلی صدی ہجری میں اسلام ثقافت کا سب سے اہم مرکز تھے۔ جہاں علم کلام اور علم فقہ کی اساس رکھی گئی ہے اور جہاں ادب اور فنون کے مدرسے قائم ہوئے (۳)۔

---

(۱) منہاج السنہ ص ۱۵٦ ج ۴ (۲) الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۸۹

(۳) تاریخ اسلام السیاسی ج ۲ ص ۳۵۱

الغرض امام اعظم نے جس بستی میں آنکھ کھولی اور جس میں بچپن اور لڑکپن گذارا یہ وہ صرف تمدن و تمول ہی کا گہوارہ نہیں بلکہ علوم و فنون کی نگری ہے۔

امام اعظم کی علمی طلبگاریوں کا زمانہ:

اگر چہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ امام کی علمی طلب گاریوں کی محرک علامۃ التابعین امام شعبی کی ذات گرامی ہے اور اس سے سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے کہ امام صاحب نے طلب علم کا سلسلہ بچپنے میں نہیں بلکہ بڑے ہو کر شروع کیا ہے لیکن یہ محض اندازہ اور خیال ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ علمی طلب گاریوں کا آغاز تو بچپنے ہی میں ہو گیا تھا مگر امام شعبی کی ذات گرامی نے امام اعظم کو علم الشرائع کی طرف مائل کیا ہے چونکہ امام اعظم کو دوسرے فنون کے ساتھ علم الکلامی سے خاصی دلچسپی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ علم کلام میں اصول دین سے بحث ہوتی ہے اس لیے یہ علم تمام علوم سے برتر ہے(۱)۔ اس علم میں تکمیل کی اور صرف تکمیل ہی نہیں بلکہ اس درجہ امامت اور مہارت پیدا کر لی کہ:

بلغ فیه مبلغاً یشارُ الیه بالا صابع (۲)

''اس مقام پر پہنچ گئے کہ انگلیاں ان ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔''

اور اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو صدر الائمہ نے یحیٰی ابن بکیر کے حوالہ سے امام اعظمؒ کی زبانی لکھا کہ۔

میں ایک روز بازار جاتے ہوئے امام شعبی کے پاس سے گذرا' امام شعبی نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ بازار آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ علمی مشغلہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں علماء کے پاس کم جاتا ہوں فرمایا کہ اس بارے میں غفلت کو راہ نہ دو۔ مطالعہ اور اہل علم کی صحبت کو اپنے لیے ضروری کر لو۔ مجھے تم میں ہونہاری اور بیداری نظر آ رہی ہے۔(۳)

---

(۱) مناقب للموفق۔ ج ۱ص ۶۴ (۲) مناقب کردری: ج ۱ص ۶۴' تاریخ بغداد: ج ۱۳ص ۳۳۲

(۳) مناقب للموفق: ج ۱ص ۶۴

یہ واقعہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ آغاز طلب کا مشورہ نہیں بلکہ نظر فی العلم اور مجالست علماء کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ایک شخص جو علم کی راہ سے واقف نہیں ہے' علماء سے ربط و ضبط نہیں رکھتا ہے صرف دوکاندار ہے۔ اس میں ایک اجنبی شخص کے لیے کون سی کشش ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم میں مجھے علمی بیداری نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام شعبی کو امام اعظم کی کلامی مسائل میں ہونہاری اور بیداری کی داستان معلوم تھی۔ اس بنا پر انہوں نے امام اعظم کو الشرائع کی طرف تکنے کا مشورہ دیا۔ اس کے نتیجے میں خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

امام شعبی کی بات دل میں گھر کر گئی اور بازار چھوڑ کر بس علم ہی کا ہو رہا۔

گویا علم ہی کے ہو رہنے کا معاملہ اب پیش آیا ورنہ طلب علم کا آغاز تو اب سے بہت پہلے ہو چکا ہے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو ایک غلطی کے ازالہ کی خاطر لکھنا پڑا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کے طلب علم کی داستان میں علم کلام کو بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

امام اعظم اور فنون عصریہ:

قرآن حکیم کی تعلیم سے فراغت کے بعد امام اعظم ان فنون عصریہ کی طرف پہلے متوجہ ہوئے جو اس زمانے میں رائج تھے۔ اس کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو صدر الائمہ نے امام صاحب کی زبانی لکھا ہے اس میں خود امام صاحب نے ان علوم وفنون کو نام بنام بتایا ہے جن میں امام صاحب نے کمال پیدا کیا تھا۔

جب میں نے علم سیکھنے کا ارادہ کیا تو میں نے تمام علوم وفنون کو پیش نظر رکھا۔ اور پھر ان میں سے ایک ایک فن کو پڑھا ہے۔(۱)

اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ علم الشرائع کو اپنانے سے پہلے امام صاحب نے اسی بستی میں جسے خود امام صاحب نے معدن العلم والفقہ کا نام دیا ہے۔ علم ادب' علم الشعر والقافیہ اور علم القرأۃ اور علم الکلام میں سے ایک فن کو باقاعدہ پڑھ لیا تھا اور علم الکلام میں اس درجہ مہارت پیدا

---

(۱) مناقب صدر الائمہ: ج ۱ص ۶۱

کر لی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ اس میں میری طرف ہی لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں۔ اسی سلسلے میں صدر الائمہ اور خطیب بغدادی کی بیان کردہ داستان بھی گوش گذار کر لیجئے جو یحییٰ ابن شیبان کے حوالہ سے ہم تک پہنچی ہے۔

مجھے علم کلام میں کافی دسترس تھی ایک عرصہ اسی میں بیت گیا لوگوں سے مناظرے کرتا۔ اسی فن کی حمایت اور مدافعت میرا مشغلہ تھا بصرہ مختلف مدارس فکر کا گڑھ تھا میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں۔ سال بھر یا اس سے زیادہ قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں میری خارجیوں کے فرقوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میں علم کلام کو افضل ترین علم سمجھتا۔ اور کہا کرتا تھا کہ یہی دین کی بنیاد کی نگرانی ہے۔ عرصہ گذرنے پر میں نے خود اپنے تئیں غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ اور تابعین کبار نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ ہم سے زیادہ ان کے علم میں گہرائی تھی۔ حقائق سے واقف تھے مگر اس کے باوجود ان کی زندگیاں مجادلانہ شورشوں سے یکسر خالی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کا مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے ان کے غور وفکر کی جولانگاہ علم الشرائع اور ابواب فقہ تھے یہی ان کا موضوع تھا یہی ان کی مجلسی زندگی کی رونق تھی اسی کی لوگوں کو تعلیم دیتے اور اسی کے سیکھنے کی ترغیب دیتے صدر اول ایسے ہی گذرا ہے تابعین بھی ان کے نقش قدم پر تھے اس موقف پر پہنچ کر میں نے علم کلام کو خیر باد کہہ دیا۔ صرف فنی معرفت باقی تھی۔ اور زندگی میں بطور فن سلف کے علوم کو اپنا لیا۔ وہی کام شروع کیا جو وہ کرتے تھے اور اس کے فن کاروں سے رابطہ پیدا کر لیا اور ان کی ہی مجلسوں کو اپنا لیا اور اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا کہ متکلمین کا گروہ اسلاف کے نقش قدم سے ہٹا ہوا اور صالحین کے مقام سے دور ہے ان کے دلوں میں قساوت ہی قساوت ہے کتاب وسنت کی مخالفت سے بے پرواہ بے روح اور تقویٰ سے دور طبقہ ہے۔(۱)

(۱) مناقب صدر الائمہ۔ ج ۱ ص ۶۱

اس سے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلبگاریوں کا سلسلہ بچپنے میں شروع ہوا ہے۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ امام حماد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا ہے اور یہ بھی تاریخ بغداد میں ہے کہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں امام حماد کی خدمت میں پورے اٹھارہ سال رہا ہوں اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ امام اعظم ایک تمیذ علم الشرائع کی حیثیت سے تمام علوم میں تکمیل کے بعد امام حماد کی خدمت میں ۱۰۲ھ میں تشریف لے گئے جب کہ امام اعظمؒ کی عمر ۲۲ سال تھی اور یہ بات خود امام اعظم کے بیانوں کی روشنی میں بے غبار ہے کہ امام حماد کی خدمت میں تشریف آوری علم الشرائع کی خاطر تمام علوم وفنون کے پڑھنے کے بعد ہوئی ہے۔

امام اعظمؒ کے زمانے میں علم چار حصوں میں تقسیم تھا

(الف) ادبی فنون کے مدرسے۔

(ب) علوم عقلیہ کے حلقے۔

(ج) مذاکرہ حدیث کی جماعتیں۔

(د) استنباط مسائل کے مراکز۔

اگر ترتیب یوں قائم کی جائے کہ امام اعظم نے

اولاً:- قرأت عاصم کے مطابق قرآن حفظ کیا۔

ثانیاً:- آپ نے نحو ادب اور شعر پر وقت صرف کیا۔

ثالثاً:- آپ نے علم کلام اور علوم عقلیہ میں مہارت پیدا کی۔

رابعاً:- آپ نے مذاکرہ حدیث کے حلقوں میں شرکت کی۔

خامساً:- آپ نے استنباط و استخراج مسائل اور فقہ و اجتہاد کے لیے حماد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ امام موصوف نے تعلیم کا آغاز بچپن میں کیا ہے اور ابھی بچپن سے گذر کر لڑکپن ہی تھا کہ آپ نے نحو، قرأت، ادب وشعر اور علوم عصریہ کی تکمیل فرمالی تھی۔ اس کی وضاحت امام صاحبؒ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو امام مرغینانی نے نعیم بن عمرو کی زبانی نقل کیا ہے کہتے ہیں

میں نے امام ابوحنیفہ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ میں زمانہ حجاج میں لڑکپن کی عمر میں بازار جاتا تھا۔ اور لوگوں سے علم کلام کے ذریعے عقائد پر باتیں کرتا تھا ایک روز مجھ سے ایک شخص نے دینی فرائض کے بارے میں ایک مسئلہ پوچھ لیا مجھے کوئی جواب نہ آیا اس شخص نے مجھ سے کہا کہ ایسے مسائل میں لب کشائی کرتے ہو جو بال سے بھی زیادہ باریک ہیں اور نظر بظاہر ہو بھی ہوش مند۔ مگر تمہیں ایک دینی فریضہ کا پتہ نہیں ہے۔ میں یہ سن کر شرمندہ ہو گیا۔ (۱)

حجاج کی وفات جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ۹۴ھ میں امام اعظمؒ کی عمر صرف چودہ سال کی ہوتی ہے اور اسی عمر کے شخص کو عربی زبان میں غلام کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سال کی عمر میں امام اعظمؒ علم کلام اور علوم عقلیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

امام اعظمؒ اور علوم عقلیہ:

قرآن حکیم اور فنون ادب کے بعد امام اعظمؒ نے اپنی پوری توجہ علوم عقلیہ پر مرکوز کر دی تھی اور علوم عقلیہ میں مہارت کا یہ مشغلہ بیس سال کی عمر تک قائم رہا۔ امام زرنجری نے امام ابوعبداللہ بن ابی حفص کی زبانی جو واقعہ لکھا ہے کہ

امام اعظمؒ کوفہ میں پیدا ہوئے اور علم الکلام کی تلاش کرتے رہے اور لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے تا آنکہ اس میں ماہر ہو گئے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلبگاریوں میں مرکزی مقام علوم عقلیہ کو حاصل تھا اور یہ بھی لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ایک عرصہ تک اس فن کے زور سے مختلف مدارس کا مقابلہ کیا رائے عامہ کے دماغی سکون کے لیے دلائل کا سامان فراہم کیا۔

آپ کی کلامی اور عقلی علوم کی جولانگاہ صرف کوفہ ہی نہ تھا بلکہ آپ کی اس فن میں اس درجہ شہرت ہو چکی تھی کہ جہمیت اور ارجاء کے استیصال کی خاطر کوفہ سے باہر بھی جانا پڑا۔

---

(۱) مناقب صدر الائمہ۔ ج ۱ ص ۶۴

شیعہ اور خوارج کے ساتھ امام اعظمؒ نے علوم عقلیہ میں اپنی خداداد علمی صلاحیتوں سے جن جن فرقوں کو ان کے غلط عقائد پر خبردار کیا یہ ہیں۔ جہمیہ اور مرجیہ۔ ان فرقوں کے ظہور سے ایسے مسائل منصۂ شہود پر آئے جن کا براہ راست اسلامی عقائد سے تعلق تھا ان مسائل میں جو مسئلے خاص طور پر توجہ علمی کے مستحق رہے ہیں یہ ہیں۔ ایمان، تقدیر، صفات الٰہی ان میں سب سے اہم ایمان ہے اور یہ بے حد افسوس اور صدمہ والی بات ہے کہ جو چیز اسلام میں سب سے اہم ہے امت میں سب سے پہلے اختلاف اسی میں رونما ہوا۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں:

یہ مسائل یعنی اسلام، ایمان، کفر و نفاق وہ بنیادی مسائل ہیں جن پر شقاوت و سعادت اور جنتی و ناری ہونے کا دارومدار ہے مگر امت ان ہی میں سب سے زیادہ اختلاف کا نشانہ بنی ہے۔(۱)

اس اختلاف کی نزاکت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر امام اعظمؒ ہی کے زمانے میں ایک سے زیادہ مدارفکر پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ ابن تیمیہ شرح العقیدہ الاصفہانیہ میں فرماتے ہیں کہ جہم بن صفوان کی رائے میں ایمان صرف معرفت کا نام ہے۔ حافظ ابن حزم نے الفصل فی الملل والا ہواء والنحل میں لکھا ہے کہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے بھی انکار کرے، بتوں کی پوجا بھی کرے، قلادۂ یہودیت ڈال لے مگر اسے معرفت قلبی حاصل ہو تو مومن کامل ہے۔

خوارج کا خیال ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبانی اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا رکن ہے۔

ان مدارس کے سامنے امام اعظمؒ نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی اولاً اس لیے کہ ایمان اسلامی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے اگر یہی غلط ہو تو اس پر اٹھی ہوئی ساری عمارت غلط ہو کر رہ جائے گی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ یہی اسلامی شہریت کے لیے فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کا فیصلہ ہونے پر اسلام کا مالیاتی نظام، اقتصادی اور اجتماعی نظام قائم ہوسکتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر امام اعظمؒ کے لیے ناگزیر اور بے حد ناگزیر تھا کہ یہ واضح کریں کہ ایمان کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟

---

(۱) جامع العلوم والحکم: ص ۲۷

مسئلہ ایمان اور امام اعظمؒ:

افراط وتفریط کی ان دونوں صورتوں میں کہ ایک فرقہ صرف قلبی معرفت کو ایمان کہتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلے میں عمل کو بھی ایمان بتا رہا ہے۔ امام اعظمؒ نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف اگر قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق ہے تو دوسری طرف عقل کو بھی اپیل کرتی ہے اور خود انسانی وجدان بھی اسے باور کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا ہے۔ امام اعظمؒ نے بتایا ہے کہ ایمان نام ہے ان تمام باتوں کو جو نبوت محمدیہؐ لے کر آئی ہے باور کر لینے اور ماننے اور اس کے اقرار کرنے کا۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دراصل یہاں تین چیزیں ہیں۔ دل کی تصدیق' زبان کا اقرار اور اعمال۔ تصدیق ایمان کا رکن ہے۔ اقرار شرط اور اعمال کی حیثیت مکمل اور متمم کی ہے۔ اگرچہ قرآن وسنت میں ان گنت مقام پر ایمان کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ قرآن کا اور نبوت کا طریق تعلیم اور اسلوب بیان دونوں فطری ہوتے ہیں اس لیے وہاں ہر بات فنی اصطلاحات سے بالا ہو کر سادہ طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی ایمان کو دیکھ لیجیے جس میں دل کی تصدیق' زبان کا اقرار اور اعمال سب ہی داخل ہیں لیکن ان میں ہر ایک کا مقام الگ ہے۔ دل کی تصدیق اور اعمال میں باہمی ربط۔ اقرار کی حیثیت اور پھر اعمال میں باہم مراتب کا فرق سمجھنا کس قدر مشکل ہے مگر ذات نبوت نے ان سب کو نہایت سادہ طریق پر سمجھا دیا ہے ارشاد ہے کہ بنی الاسلام علی خمس الخ۔ اسلام کا محل پانچ ستونوں پر قائم ہے محل میں چھت ہوتی ہے ستون ہوتے ہیں' در ودیوار ہوتے ہیں اور ان سب کے مجموعے کا نام محل ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اتنا بڑا مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ لیکن بنیاد جس پر محل کی یہ عمارت قائم ہے آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ وہ زمین نیچے ہوتی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے۔ جیسے مکان کے اجزاء میں ظاہر ہے کہ مکان کی بقاء کے لیے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق اور روشندان کی نہیں۔ اسی طرح یہاں ارکان خمسہ' اقرار شہادتین' نماز' روزہ' زکوۃ اور حج اسلام کے ستون ہیں اور یہ پانچوں ستون تصدیق قلبی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے ایسے ہی تصدیق بھی دل میں پوشیدہ ہوتی ہے ایک موٹی سی مثال

سے صاحب نبوت نے جادۂ اہل حق کیسے واضح فرمادیا اور تصدیق وعمل کے باہمی ربط اور پھر اعمال کے باہم فرق مراتب کو کس عمدگی سے سمجھا دیا ہے اسی بات کو امام اعظمؒ نے حومہ رسمیہ کے شیدائیوں کے سامنے رکن، شرط اور عمل کا نام لے کر پیش کیا ہے۔ چونکہ تصدیق کا معاملہ دل سے متعلق ہے اور دل کے حالات کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے ارکان خمسہ میں سے زبان کے اقرار کو قرآن وسنت میں ضروری بتایا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں

> اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے توحید کا زبانی اقرار ہی مسلمان ہونے کا معیار قرار دیا گیا اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز وخاتمہ کا مدار بنا دیا گیا۔ (۱)

> جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں تصدیق موجود ہے یا نہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص اقرار نہیں کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اقرار کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ (۲)

اسی لیے امام اعظمؒ ایمان میں دل کی تصدیق کے ساتھ زبان کے اقرار کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اگرچہ بعد میں آنے والے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی حیثیت کیا ہے ایک جماعت رکن بتاتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ شرط ہو یا رکن، صرف تصدیق کا نام ایمان نہیں ہے اس کی پوری وضاحت امام اعظمؒ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے ابومقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

> امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ ایمان تصدیق ومعرفت کے ساتھ اسلام کے زبانی اقرار کا نام ہے۔ لوگ تصدیق میں تین قسم کے ہیں کچھ زبان ودل دونوں سے مانتے ہیں، کچھ زبان سے مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے، کچھ دل سے مانتے ہیں مگر زبان سے نہیں مانتے۔ پہلا طبقہ تو اللہ اور لوگوں کے نزدیک مومن ہے۔ دوسرا طبقہ عنداللہ تو مومن نہیں مگر لوگوں میں مومن ہے کیونکہ لوگوں کو دل کا حال معلوم نہیں اقرار کی بناء پر ان کے ذمہ ان کو مومن ہی کہنا ہے۔ تیسرا طبقہ اللہ کے یہاں مومن ہے مگر عندالناس کافر ہے۔ (۳)

---

(۱) کتاب الایمان ص ۱۷۲ (۲) کتاب الایمان ص ۸۸ (۳) الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء ص ۱۶۹

یہاں تصدیق کے ساتھ اقرار ہی پر زور دیا ہے اور اسلامی زندگی میں اس کی اہمیت بتائی ہے اقرار کو ایمان میں کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو صدر الائمہ مکی نے لکھا ہے

جہم بن صفوان آپ کے پاس آیا اور ایمان کے موضوع پر گفتگو کی بولا کہ میں آپ سے ایمان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں امام صاحبؒ نے فرمایا کہ تا حال تمہیں ایمان کا پتہ نہیں ہے بولا کہ پتہ تو ہے مگر کچھ شک ہے فرمایا کہ ایمان میں شک کا نام کفر ہے۔ بولا ذرا میری بات تو سن لیجئے فرمایا کہو بولا یہ بتایئے کہ ایک شخص جسے اللہ کی ذات کی معرفت حاصل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے۔ کیا وہ مومن ہے یا کافر؟ فرمایا کہ جب تک زبان سے اقرار نہ کرے کافر ہے۔ بولا کافر کیونکر ہو سکتا ہے اسے معرفت حاصل ہے امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر تم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہو اور اسے حجت بھی سمجھتے ہو تو دلائل قرآن سے دوں ورنہ غیروں کے انداز پر گفتگو کروں۔ جہم بن صفوان نے کہا کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے۔ **واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا الی فاثابهم الله بما قالوا** اس آیت میں اللہ سبحانہ نے **عرفوا** کے ساتھ **یقولون** (کہتے ہیں)اور **قالوا** (انہوں نے کہا) ذکر بتا دیا کہ ایمان قلب و زبان دونوں سے مطلوب ہے ایک ارشاد ہے **قولوا امنا بالله** ۔ ایک اور ارشاد ہے **والزمهم کلمة التقوی** ۔ یہاں بھی کلمۃ التقویٰ سے اقرار شہادتین مراد ہے۔ ایک اور مقام پر ہے **هدوا الی الطیب من القول** ۔ یہاں الطیب من القول سے توحید و رسالت کا اقرار ہی مقصود ہے۔ نیز فرمایا **الیه یصعد الکلم الطیب** ۔ اور **یثبت الله الذین امنوا بالقول الثابت** ۔ ان آیات میں بھی **الکلم الطیب** اور **القول الثابت** سے مراد زبان ہی کا اقرار ہے۔ یہ تو قرآن ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلے میں فرمایا ہے **قولو الا الہ الا اللہ تفلحوا** ۔ اس میں **لا الہ الا اللہ** کہنے پر فلاں کو موقوف قرار دیا ہے۔ قرآن و حدیث کے بعد خود حدیث بھی یہی کہتی ہے کہ اگر ایمان صرف دل کی معرفت کا نام ہوتا اور اقرار کی ضرورت نہ ہوتی تو پھر ہر منکر قلبی معرفت کے بعد مومن ہوتا اور ابلیس کا مومنوں میں شمار ہوتا کیونکہ اسے یہ معرفت تو اللہ ہی اس کا خالق، مالک، محیی اور ممیت ہے حاصل ہے اور تمام کافر بھی مومن ہونے چاہئیں کیونکہ قرآن میں ان کی معرفت کا اقرار ہے اس کے بعد متعدد قرآنی آیات پیش فرمائی ہیں۔ (۱)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ اقرار کو ایمان میں رکنیت کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق کا نام ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ماننا دل کی اور اقرار زبان کی تصدیق ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اقرار اور التزام طاعت بھی اس کا اہم جز ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ ابو مقاتل نے امام اعظمؒ سے جو ایمان کی تعریف نقل کی ہے اس میں اقرار کا متعلق اسلام کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

الایمان هو المعرفة و التصديق و الاقرار بالاسلام ۔ (۲)

''ایمان معرفت، تصدیق اور اطاعت کے اقرار کا نام ہے۔''

الفقہ الاکبر میں اسلام کی حقیقت خود امام اعظمؒ نے جو بتائی ہے یہ ہے

الاسلام هو التسليم و الانقياد لاوامر الله ۔ (۳)

''اسلام ماننے اور احکام الٰہی کی سراپا پیروی کا نام ہے۔''

اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ انقیاد اور التزام طاعت بھی اس کا اہم رکن ہے جیسے تصدیق رکھ کر التزام طاعت کا عہد نہ کرنا اسلام نہیں ہے ایسے ہی صرف فرمانبرداری کا التزام رکھ کر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہ ہونا ایمان نہیں ہے۔

---

(۱) المناقب: لصدر الائمہ: ۱۴۵ تا ص ۱۴۸　(۲) الانتقاء، ص ۱۶۸　(۳) الفقہ الاکبر، ص ۳۵

ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و دل تصدیق سے مزین ہوں اور اسلامی دستور حیات کو اپنانے کا عزم صمیم ہو اقرار کا لفظ ایمان میں بے معنی اور بے جان نہیں ہے۔

امام اعظمؒ کے ایمان میں اس قانونی موقف نے کہ ایمان نام ہے اقرار و تصدیق دونوں کا۔ دونوں فرقوں کی تردید کر دی جہمیہ کی بھی اور مرجیہ کی بھی۔

ایمان کی اسی حقیقت کو امام احمد بن حنبل نے اس طرح پیش فرمایا ہے:

اہل السنۃ والجماعۃ مومن کی تعریف یہ ہے کہ اس کی شہادت دے کہ اللہ سبحانہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور شہادت دے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے اور رسول ہیں۔ نیز دوسرے پیغمبر جو کچھ لائے ہیں ان باتوں کا زبان سے اقرار کرے اور جو کچھ اس کی زبان کہے دل اس کا ساتھ دے ایسے آدمی کے ایمان میں کوئی شک نہیں۔(۱)

امام اعظمؒ کی علم کلام میں تصانیف:

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں امام اعظمؒ نے علم الکلام کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ان فرقوں کے مقابلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو واضح فرمایا ہے۔ یہ بات کہ اس موضوع پر امام اعظمؒ کی کوئی کتاب نہیں ہے معتزلہ کی اڑائی ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں

هذا كلام المعتزلة ودعواهم انه' ليس له' فى علم الكلام له' تصنيف (۲)

''یہ معتزلہ کی بات ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ امام اعظمؒ کی علم کلام میں کوئی تصنیف نہیں ہے۔''

اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم کی افواہوں سے معتزلہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ امام اعظمؒ کو اپنے مزعومات کی اشاعت کے لیے استعمال کر سکیں۔

علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں علم الکلام کے موضوع پر امام اعظمؒ کی جن تصانیف

---

(۱) مناقب احمد لابن الجوزی (۲) الجواہر المضیہ ج ۲ ص ۴۶۱

کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہیں۔ الفقہ الاکبر' الرسالہ' الفقہ الابسط' کتاب العالم والمتعلم اور الوصیہ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف بھی اس زمانے کے رواج کے مطابق املائی طرز پر ہوئی ہے۔

املاًها على اصحابه من الفقه الاكبر والرسالة و الفقه الابسط و كتاب العالم و المتعلم و الوصية(۱)

علامہ طاش کبری زادہ نے پوری قوت سے یہ بات بتائی ہے کہ

امام اعظمؒ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ الفقہ الاکبر اور العالم جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کتابیں امام اعظمؒ کی نہیں معتزلہ کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں۔ (۲)

علامہ بزازی نے تصریح کی ہے کہ

یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ علم کلام میں امام ابو حنیفہؒ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ الفقہ الاکبر اور العالم والمتعلم میں نے خود علامہ شمس الدین کی ارقام فرمودہ دیکھی ہیں ان پر لکھا ہوا تھا کہ یہ امام اعظمؒ کی تصانیف ہیں۔ (۳)

صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے اپنی مشہور کتاب اصول دین میں جو حال ہی میں مصر میں ڈاکٹر ہانس پیٹر لنس کی تحقیق سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آئی ہے اس میں امام اعظمؒ کے بارے میں تصریح کی ہے کہ

قد صنف فيها كتباً وقع بعضها الينا(۴)

"آپ نے علم کلام میں کچھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں ملی ہیں۔"

یہ ابوالیسر فروع واصول میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور لکھا ہے **كان امام الائمة على الاطلاق**۔ صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں چنانچہ ان کی سند یہ ہے:

عن اسمعيل بن عبدالصادق عن جده ابى اليسر عبدالكريم عن ابى المنصور الماتريدى عن ابى بكر الجوزجانى عن ابى سليمان عن محمد(۵)

---

(۱) اشارات المرام ص ۲۱ (۲) مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۲۹

(۳) مناقب کردری ج ا ص ۱۰۹ (۴) اصول بزدوی ص ۴ (۵) الفوائد البہیہ ص ۷۳

علامہ بیاضی نے امام اعظمؒ کی ان کتابوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت کو شرح و بسط سے لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:

الفقہ الاکبر' الرسالۃ' الفقہ الابسط' العالم والمتعلم اور الوصیۃ کی امام اعظمؒ سے روایت میں مرکزی حیثیت حماد بن ابی حنیفہ' قاضی ابو یوسف' ابو مطیع الحکم بن عبداللہ اور ابو مقاتل حفص بن مسلم کی ہے۔ ان ائمہ سے ان کتابوں کو اسماعیل بن حماد' محمد بن مقاتل' محمد بن سماعہ' نصیر بن یحییٰ اور شداد بن حکیم نے روایت کیا ہے۔ (۱)

آخر میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کو نصیر بن یحییٰ اور محمد بن مقاتل سے امام ابو منصور ماتریدی نے روایت کیا ہے۔ علامہ زاہد کوثری رقمطراز ہیں

علم کلام میں امام اعظمؒ کا یہ علمی سرمایہ امت کو وراثت میں ملا ہے۔ الفقہ الاکبر ۰ اس کی سند یہ ہے۔ علی بن احمد الفارسی عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مقاتل عن عصام بن یوسف عن حماد بن ابی حنیفہ عن ابی حنیفہ۔ الفقہ الابسط۔ اس کی سند یہ ہے ابو زکریا یحییٰ بن مطرف عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مطیع البلخی عن ابی حنیفہ۔ العالم و المتعلم۔ اس کی سند یہ ہے۔ الحافظ احمد بن علی حاتم بن عقیل عن الفتح بن ابی علوان ومحمد بن یزید عن الحسن بن صالح عن ابی مقاتل عن ابی حنیفہ۔ الرسالۃ۔ نصیر بن یحییٰ عن محمد بن سماعہ بن ابی یوسف عن ابی حنیفہ کی سند سے مروی ہے اور اسی سلسلہ سند سے الوصیہ۔ بھی مروی ہے۔ (۲)

تاریخ وراویت کی یہ شہادتیں بتا رہی ہیں کہ علم کلام میں امام اعظمؒ نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے وہ امام اعظمؒ ہی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ ہماری کتاب ''امام اعظمؒ اور علم الکلام'' میں آئیں گی۔

علم کلام اور اس کا حکم:

علم کلام کے موضوع پر امام اعظمؒ کے بیانات پڑھ کر شاید آپ یہ خلش محسوس کریں

---

(۱) اشارات المرام: ص ۲۲ (۲) مقدمہ اشارات: ص ۵

کہ امام صاحبؒ علم الکلام کی تعلیم و تعلم کی اشاعت کو امت میں پسند نہ کرتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے اپنی کتاب اصول دین میں اس کی وضاحت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ

علم کلام دراصل ان مسائل کا نام ہے جن کی حیثیت اسلام میں اصول دین کی ہے اور جن کا سیکھنا فرض عین ہے امام ابوحنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہل بدعت کسے مناظرہ کیا ہے آغاز میں آپ اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور اس علم میں آپ نے کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے کچھ تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور کچھ کو اہل بدعت نے خورد برد کر دیا۔ جو کتابیں امام اعظمؒ کی ہم کو ملی ہیں ان میں العالم والمتعلم اور الفقہ الاکبر ہے۔ العالم والمتعلم میں امام اعظمؒ نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ علم کلام پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ اسی کتاب میں ہے کہ متعلم کہتا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم کلام نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ صحابہ کرام نے یہ علم نہیں پڑھا ہے۔ عالم کہتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں ٹھیک ہے ہمیں بھی علم کلام نہ پڑھنا چاہیے جیسے صحابہ نے نہیں پڑھا لیکن تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہمارے اور صحابہ کے معاشرے میں کیا فرق ہے؟ جن حالات سے ہمیں دین کی زندگی میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان سے صحابہ دوچار نہیں تھے ہمارا ایسے معاشرے سے سابقہ پڑا ہے جن کی زبانیں مسلک حق کے خلاف جھوٹ اور بے لگام ہیں۔ جن کے یہاں ہمارا خون روا ہے کیا اس ذہن کے گردوپیش میں ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ راست روا اور غلط کار میں ایک حد فاصل اور خط تمیز قائم کریں۔ یوں سمجھو کہ صحابہ ایسے خوش آئند ماحول میں تھے جہاں جنگ کا نام ونشان نہ تھا امن وسکون کی زندگی تھی۔ یقیناً ایسے ماحول میں سامان جنگ اور جنگی تیاری کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جنگجو طبقہ نے حملہ کر کے ایمان واعتقاد کی زندگی کا امن وسکون تہ وبالا کر دیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے سامان جنگ کی ضرورت ہے اور فوجی ٹریننگ کی

بھی۔ ہمارا اکثر فقہاء نے لوگوں کو علم کلام سیکھنے سے روک دیا ہے لیکن جو امام ابو حنیفہ کے پیروکار ہیں وہ اس کی تعلیم و تعلم کے جواز کے قائل ہیں البتہ انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں اس میں مناظرے سے روک دیا تھا۔(۱)

گویا امام اعظمؒ کی نظر میں علم کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحبؒ کے اس بیان کی وضاحت فرمائی ہے۔ جو بات روز اول علم الکلام کے بارے میں امام اعظمؒ نے فرمائی ہے کہ اس کی حیثیت ایک دفاعی سرمایہ کی ہے وہ ہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے۔ چنانچہ امام الحرمین ابو محمد جوینی نصیحۃ المسیمین میں فرماتے ہیں:

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں جو انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں جو کہ بے سودمند مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی بحثیں کے روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تالیف میں اقرار کیا ہے کہ

انما المقصود منهٗ حفظ عقيدة اهل السنة وحراستها عن تشويش اهل البدعة (۲)

"علم کلام سے مقصود صرف بدعتیوں سے اہل السنہ کے عقیدہ کی حفاظت اور نگرانی ہے۔"

ان اقراروں سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جو بات اولاً امام صاحبؒ کی زبان پر آئی بالآخر وہی وقت کا آوازہ بن گیا۔ امام اعظمؒ نے یہی تو بتایا ہے کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لیے عقائد کی فراہمی کا کسی خاص عقلی نہج پر سلیبس تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اس

(۱) اصول بزدوی صدر الاسلام ۳ (۲) المنقذ من الضلال ص ۲۶

کی غایت یہ اور صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے خودفریبی سے شک وارتیاب کی گود میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر جمتے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اس حملے کے لیے یونانی فلسفے کے میگزین سے ہتھیار مانگ کرلائے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح وہ اسلام کی عمارت کو گرادیں گے اصول جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوت دوسروں کے مقابلے پر صرف کریں لیکن یہ تو انتہائی فراست اور زیرکی کہیئے یا وقت کی سیاسی مہارت کہ گھر سے مقابلہ کے ارادے سے نکلے ہیں اور خالی ہاتھ ہیں۔ ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور سرمائے کو آنچ نہ آئے اور میدان بھی ہاتھ آجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی دلائل اپنی جگہ رہے سنت کی پکار اپنے مقام پر ان ہی کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کران سے مقابلہ کیا اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے

لکنهم اعتمد والی ذالک علی ماتسلموها من خصومهم۔

''لیکن متکلمین نے اس معاملے میں اپنے مدمقابل کے مسلمات کا ہی سہارا لیا ہے۔''

اور:

وکان اکثر خوضهم فی استخراج مناقضات الخصوم ومواخذتهم للوازم مسلماتهم۔

''ان کی فکری توجہ صرف یہ تھی کہ مدمقابل کا توڑ کیا جائے اور ان کے مسلمات کے لوازم ہی سے ان کی گرفت کی جائے۔''

اس سے مقصود یہی بتانا ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو چپ کرانا ہے۔

الغرض امام اعظمؒ کے بارے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ امام موصوف علم کلام کو کسی درجے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ امام اعظمؒ کے موقف کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ علم کی دنیا نے علم الکلام میں امام اعظمؒ کو متکلم اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ امام عبدالقاہر بغدادی شافعی نے بتایا ہے کہ علم کلام کے موضوع پر اولیت کا شرف امام اعظمؒ کو حاصل ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں

اول متکلمیهم من الفقهاءِ وارباب المذاهب ابو حنیفة والشافعی فان ابا حنیفة له' کتاب فی الرد علی القدریة سماهُ الفقهُ الاکبر وله' رسالة املاها فی نصرة قول اهل السنة ان الاستطاعة مع الفعل (۱)

''فقہاء میں سب سے پہلے متکلم ابوحنیفہ اور شافعی ہیں ابوحنیفہ نے قدریہ کے رد میں فقہ اکبر نامی کتاب تصنیف کی ہے موضوع استطاعت پر اہل السنۃ کے موقف کی نصرت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔''

علامہ ابوالمظفر اسفرائنی نے امام اعظم کی کلامی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے (۲) ابن الندیم نے بھی ان کتابوں کا پتہ دیا ہے اور آخر میں آپ کی وسعت علمی کے بارہ میں لکھا ہے:

العلم بحراً وبراً شرقاً وغرباً بعداً وقرباً (۳)

''دور نزدیک' مشرق' مغرب اور خشکی وتری میں آپ ہی کا علم ہے۔''

تاریخ الاسلام السیاسی کے مؤلف حسن ابراہیم حسن نے بھی ابن الندیم کی ہمنوائی کی ہے۔ الغرض میں بتا یہ رہا تھا کہ امام اعظمؒ کی طلب علم کی داستان میں علوم عقلیہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس میں ناموری اور شہرت کے پیش نظر امام شعبی نے امام اعظمؒ کو ۹۴ھ میں علم الشرائع کے لیے مطالعہ علمی اور مجالست علماء کا مشورہ دیا۔ علم الشرائع کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظمؒ اپنے استاد حماد کے پاس ۱۰۲ھ میں یعنی چوبیس سال کی عمر میں گئے اور پورے اٹھارہ سال کے بعد علم الشرائع کی تعلیم وتمرین سے فراغت کے بعد مجتہد کی حیثیت سے ۱۲۰ھ میں لوگوں میں رونما ہوئے۔ ۹۵ھ سے ۱۰۲ھ تک کا پورا وقت امام اعظمؒ نے علم حدیث پر صرف کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے آپ کو ذرا انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہو گی۔ سردست تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پندرہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ اور فنون عصریہ میں اتنی مہارت ہو جانا کہ اسی کو فن کی حیثیت سے اپنا لینا اور اسی پر مختلف مدارس فکر سے مقابلہ کرنا

(۱) اصول الدین عبدالقاہر بغدادی: ص ۳۰۸ (۲) التبصیر: ص ۱۱۳

(۳) الفہرست لابن الندیم: ص ۲۵۵

امام صاحبؒ کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ جہم سے مقابلہ کی داستان آپ سن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کلامی مسائل میں امام صاحبؒ کے دوسرے فرقوں سے بھی مناظرے ہوئے ہیں مگر ہم ان کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل بہت طویل الذیل ہیں اندیشہ ہے کہ اپنے موضوع سے دور نہ ہو جائیں۔

امام اعظمؒ طالب علم کی حیثیت سے:

۹۶ھ میں امام اعظمؒ نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر اور خوارزمی نے تصریح کی ہے اور اسی حج میں تفقہ فی الدین کے موضوع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے یہ گویا علم حدیث کی ابجد ہوئی ہے۔

من تفقه في دين الله كفاه الله همه ورزقه من حيث لايحتسب۔

''جس نے اللہ کے دین میں فقاہت پیدا کر لیا اللہ اس کے رنج وغم میں کافی ہے اور اس کو ایسے مقام سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔''(۱)

امام شعبی کے کہنے سے دل پہلے ہی مائل ہو چکا تھا۔ اس ارشاد نبوت سے زخمی ہو گئے اور ۹۶ھ سے ہی علم الشرائع کی طرف رخ کر لیا۔ اور زندگی کے اس موڑ پر آپ نے تمام علوم کا باہم موازنہ کیا مگر الشرائع کے لیے چونکہ علم الحدیث ناگزیر تھا اس لیے آغاز یہیں سے کیا اور ۹۸ھ سے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور ۹۸ھ سے شروع ہو کر ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگرچہ کام کا آغاز تو علم حدیث میں ۸۹ھ میں ہو چکا تھا مگر پوری باقاعدگی کے ساتھ پورا کا پورا وقت ۱۰۰ھ سے لگایا ہے۔ ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا اور سب سے پہلے اپنے شہر کے مشہور محدث علامۃ التابعین سے استفادہ کیا۔ امام شعبی کی حدیث میں جلالت شان کا اندازہ کرنا ہو تو امام زہری کا حسب ذیل بیان پڑھیے۔

علماء چار ہیں۔ سعید مدینے میں' شعبی کوفہ میں' حسن بصرہ میں' اور مکحول شام میں۔(۲)

---

(۱) جامع بیان العلم (۲) تذکرۃ الحفاظ

فن حدیث میں یہ امام اعظمؒ کے اکابر شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظمؒ کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کر دی ہے وھو اکبر شیخ لابی حنیفۃ (۱)

اور معلوم ہے کہ امام شعبی متکلم نہ تھے۔ ان سے امام اعظمؒ کا تلمذ صرف ان کے فن ہی میں ہو سکتا ہے اور ان کا فن علم حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام عبداللہ بن عون البصری ۱۵۱ھ جو امام شعبی کے بھی شاگرد ہیں اور جن کے بارے میں امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں۔ ما کان بالعراق اعلم بالسنۃ (عراق میں ان سے زیادہ حدیث کا عالم کوئی نہ تھا۔) ان کا امام شعبی کے بارے میں بیان ہے:

اذا وقعت الفتوی انقبض الشعبی۔

''جب کوئی فتویٰ آ جاتا تو امام شعبی کو گھٹن ہوتی تھی۔'' (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ فقہ بھی امام شعبی کا فن نہ تھا بلکہ ان کا فن خود ان کے اعتراف کے مطابق حدیث اور صرف حدیث تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

انا لسنابا لفقھاءِ ولکنا سمعنا الحدیث فروینا الفقھاء۔

''ہم فقہاء نہیں ہیں ہم تو احادیث سن کر فقہاء کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔'' (۳)

امام شعبی کا اپنا فن حدیث تھا اور اس میں اس قدر جامعیت تھی کہ مشہور محدث عاصم الاحول جو امام الحفاظ شعبہ بن الحجاج، امام المحدثین یزید بن ہارون، امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارک کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

ما رایت احدًا اعلم بحدیث اھل الکوفۃ والبصرۃ والحجاز من الشعبی۔

''میں نے کوفیوں، بصریوں اور حجازیوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا۔'' (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۷۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۷۹ (۳، ۴) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۷۹۔۱

اس تمام تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ناظرین اوراق کے سامنے امام اعظمؒ کی داستان طلب علم حدیث واضح اور صاف ہو کر آ جائے۔

آپ چاہیں تو ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اس داستان کو اس طرح سمیٹ سکتے ہیں

حفظ قرآن بقرأت عاصم	۸۶ھ تا ۸۸ھ	۲ سال	عمر ۸ سال
نحو وادب	۸۸ھ تا ۹۰ھ	۲ سال	عمر ۱۰ سال
علم الکلام	۹۰ھ تا ۹۴ھ	۵ سال	عمر ۱۴ سال
مناظرہ	۹۵ھ تا ۹۸ھ	۴ سال	عمر ۱۸ سال
علم الحدیث	۹۹ھ تا ۱۰۳ھ	۵ سال	عمر ۲۳ سال
فقہ وعلم الشرائع	۱۰۴ھ تا ۱۲۰ھ	۱۷ سال	عمر ۴۰ سال

گویا چالیس سال کی عمر میں امام اعظمؒ اپنے استاد کی جگہ پر بحیثیت ایک متقن، مجتہد فقیہ، محدث اور مفسر کے تشریف فرما ہوئے۔

بیس سال کی عمر میں علم حدیث پڑھنے کی وجہ:

اس عمر میں حدیث کا طالب علم بننے میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے جس کی نشاندہی محدث خطیب بغدادی نے کی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوفہ میں بجبر رواج ہی یہ چل پڑا تھا کہ طلب حدیث کی طرف بیس سال کی عمر میں قدم بڑھایا جائے۔ چنانچہ الخطیب رقمطراز ہیں

ان اهل الكوفة لم يكن الواحد يسمع الحديث الا بعد استكماله عشرين سنة۔

"کوفہ والوں میں سے کوئی شخص بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا طالب علم نہ بنتا تھا۔"(۱)

امام الحسن بن عبدالرحمن رامہرمزی کہتے ہیں کہ میرے سے ایک سے زیادہ مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ محدث موسیٰ بن اسحاق سے جب دریافت کیا گیا کہ تم نے ابونعیم سے حدیث کیوں نہیں لی؟ تو انہوں نے جواب دیا

---

(۱) الکفایہ فی علم الروایہ ص ۵۵

اہل کوفہ اپنے بچوں کو بچپنے میں علم حدیث کا طالب علم نہ بناتے تھے بلکہ بیس سال کی عمر میں اس کے لیے روانہ کرتے تھے۔(۱)

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ بصرہ میں حدیث پڑھنے کے لیے دس سال کوفہ میں بیس سال اور شام میں تیس سال کا طریقہ رائج تھا۔

اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظمؒ کے اس عمر میں طلب حدیث کے عزم میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے۔ الغرض بیس سال کی عمر میں ۹۹ھ میں امام اعظمؒ نے سب سے پہلے اپنے شہر کے جلیل القدر محدث امام شعبیؒ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا جیسا کہ ملا علی قاری نے حافظ ابو سعد السمعانی کے حوالے سے خود امام صاحب کی زبانی لکھا ہے کہ

میں دینی علوم میں لوگوں سے گفتگو کرتا تھا ایک بار مجھ سے ایک فریضہ کے بارے میں پوچھا گیا مجھے جواب نہ آیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ دین و عقائد میں موشگافیاں کرتے ہو اور فرائض کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہو گیا بعد ازیں میں امام شعبی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔(۲)

امام شعبی کی خدمت میں جیسا کہ بتا چکا ہوں صرف حدیث کے لیے آئے تھے اور آنے کی وجہ الکردری نے خود امام صاحبؒ ہی کی زبانی یہ بتائی ہے۔

کان الشعبی من اعلم الناس (۳)

علم حدیث میں زمانہ طالب علمی میں امام اعظمؒ کی سبقت:

بہر حال ۱۰۰ھ میں امام اعظمؒ نے بیس سال کی عمر میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور جس محنت و کوشش سے انہوں نے اس علم کو حاصل کیا ہے ان کے ہم عصروں میں سے بہت ہی کم نے اس محنت سے حاصل کیا ہوگا۔

حافظ سمعانی لکھتے ہیں

---

(۱) توضیح الافکار ج ۲ ص ۲۹۴ (۲) الجواہر المضیہ ص ۴۶۳ (۳) مناقب کردری ج ۲ ص ۲

اشتغل بطلب العلم و بالغ فیه حتی حصل له' مالم یحصل لغیره۔

''وہ طلب علم میں مشغول ہوئے تو اس درجہ ہوئے کہ جس قدر ان کو حاصل ہوا دوسروں کو نہ ہو سکا۔''(۱)

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحبؒ کے رفیق ہیں نقل کرتے ہیں:

میں امام اعظمؒ کا رفیق مدرسہ تھا وہ علم حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی حال زہد و تقویٰ میں ہوا اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے۔(۲)

کوفہ ہی میں رہتے ہوئے امام اعظمؒ کا علم حدیث میں مسعر بن کدام اور ان کے ساتھیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سب سے پہلے امام اعظمؒ نے کوفہ میں جس قدر علم حدیث تھا اس کی تحصیل کی کیونکہ مسعر بن کدام کی علمی رفاقت امام اعظمؒ کو کوفہ ہی میں حاصل ہوئی ہے۔ علم کی خاطر مسعر بن کدام کا کوفہ سے باہر جانا ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ

امام مسعر بن کدام نے حدیث کی خاطر کبھی کوفہ سے باہر کا سفر نہیں کیا۔(۳)

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسعر بن کدام کا مفصل اور مبسوط چہرہ قلمبند کیا ہے۔

علم حدیث میں ان کا پایہ معلوم کرنا ہو تو حافظ ابو محمد رامہرمزی کا یہ بیان پڑھئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری میں جب کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے تھے:

ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو اس علم حدیث کی ترازو ہیں۔(۴)

امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت زیادہ تقدس کی وجہ سے ان کا نام ہی مصحف رکھا ہوا تھا۔

---

(۱) کتاب الانساب: ص ۱۵٦　(۲) مناقب ذہبی: ص ۲۷

(۳،۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۹

غور فرمایئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ ان کا علم جس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دے کہ وہ علم حدیث کی ترازو ہے علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا کیا حال ہوگا؟ اور پھر خود یہ میزان علم حدیث جس شخص کے بارے میں یہ انکشاف کرے کہ وہ علم حدیث میں مجھ سے بھی آگے ہے تو پھر اس کا علم حدیث میں کیا مقام ہوگا۔ اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوفہ میں جس قدر علم حدیث پھیلا ہوا تھا اسے امام اعظمؒ نے سمیٹ لیا تھا۔ اسی بنا پر امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ۔

بخدا امام اعظمؒ اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کے اس دنیا میں سب سے بڑے عالم تھے۔(۱)

اور جس کی طلیت کا نہیں بلکہ اطلیت کا یحییٰ دعویٰ کریں علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ یاد رہے کہ خطیب نے بحوالہ یحییٰ بن معین تصریح کی ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان فتویٰ میں امام اعظم کے قول کو اپناتے تھے اور اہل کوفہ میں سے امام صاحب ہی کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ کبھی فرماتے کہ ابوحنیفہ نے بے شمار باتیں بہترین فرمائی ہیں اور کبھی کہتے کہ بخدا ہم نے ابوحنیفہ سے زیادہ بہتر رائے والا کوئی نہیں سنا ہے ہم ان کے اکثر و بیشتر باتوں کو اپناتے ہیں۔(۲)

امام اعظمؒ کے حدیث میں اساتذہ:

امام اعظمؒ کے اساتذۂ حدیث میں صحابہ، تابعین اور اتباع تینوں ہیں ان سے باہر کوئی نہیں ہے۔ یعنی سب اساتذہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی خیریت کی زبان نبوت سے شہادت دی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ اساتذہ کا شمارہ صرف ۷۴ بتایا ہے جن کی تفصیل حافظ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں پوری درج کردی۔ لیکن حافظ ذہبی نے عدد کثیر من التابعین کہہ کر مشہور محدث ملا علی القاری کے دہان قلم سے نکلی ہوئی اس بات کو سچا کردیا جو انہوں نے شرح مسند امام میں لکھی ہے کہ۔

---

(۱) ما تمس الیہ الحاجہ: ص ۱۰ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۴۴

امام اعظمؒ کے اساتذہ صحابہؓ تابعین اور اتباع تابعین میں سے بہت ہیں جن کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے۔(۱)

اور اس کی حافظ ابن حجر مکی نے بھی یہ لکھ کر تصدیق کی ہے کہ۔

ابو حفص کبیر نے ان میں سے چار ہزار اساتذہ حدیث ذکر کیے ہیں۔

حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں ان مشائخ کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور ان سے صدر الائمہ نے مناقب میں نقل کیا ہے۔

امام اعظمؒ کے اساتذۂ حدیث کی عظمت:

امام اعظمؒ کو اساتذہ کے معاملے میں سب ائمہ حدیث سے ممتاز کرنے والی چیز صحابہ کرام کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا ہے۔ یہ اساتذہ ہی کی عظمت ہے جس کا اظہار خود امام اعظمؒ نے سربراہ حکومت عباسیہ ابو جعفر منصور دوانیقی کے سامنے بر سر دربار کیا ہے۔

ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیر المومنین ابو جعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیر المومنین ھذا عالم الدنیا الیوم۔ (یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں) ابو جعفر منصور نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے ابو جعفر نے کہا کہ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔(۲)

تلامذہ کی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ کی عظمت سے ہوتا ہے۔ اسی بناء پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ میں امام بخاری کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے اولین طبقہ تابعین کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

الطبقة الاولی ممن حدثہ عن التابعین۔

---

(۱) شرح مسند امام ص ۲۰۰ (۲) تاریخ بغداد از جامع المسانید

اور پھر ان تابعین کے یہ نام بتائے ہیں۔ مکی بن ابراہیمؒ ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابونعیم الفضل بن دکین اور خلاد بن یحییٰ۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن اساتذہ پر امام بخاری کے لیے طبقہ اولیٰ ہونے پر حافظ ابن حجر عسقلانی کو فخر ہے وہ خلاد بن یحییٰ کو چھوڑ کر سب کے سب امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں۔(۱)

صدر الائمہ مکی شمس الائمہ زرنجری سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحفص صغیر کے زمانے میں ایک بار احناف وشوافع میں بحث چھڑ گئی کہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ میں افضل کون ہے؟ امام ابوحفص صغیر نے فرمایا کہ دونوں کے اساتذہ شمار کرلو۔ چنانچہ امام شافعی کے اساتذہ گنے گئے تو اسی ہوئے۔ پھر امام اعظم کے مشائخ کا حساب لگایا گیا تو چار ہزار نکلے۔ امام ابوحفص نے فرمایا کہ **هذا ادنى من فضائل ابى حنيفة** (یہ امام اعظمؒ کی برتری کی ادنیٰ شہادت ہے)(۲)

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں عبداللہ بن المبارک کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ عباس بن مصعب نے تاریخ مرو میں امام عبداللہ بن المبارک کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے چار ہزار اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا ہے اور پھر ایک ہزار سے روایت کی۔ عباس کہتے ہیں کہ ان میں سے آٹھ سو کی روایات مجھے بھی ملی ہیں۔ حافظ کبیر ابوداؤد طیالسی ۲۰۴ھ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ہزار اساتذہ سے احادیث لکھی ہیں۔(۳) امام بخاری فرماتے ہیں:

میں نے ایک ہزار اسی حضرات سے حدیث لکھی ان میں ہر ایک محدث تھا۔(۴)

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان کا بیان ہے کہ میں نے پورے تیس سال رحلت میں بسر کیے اور ایک ہزار سے زائد اساتذہ سے حدیثیں سنی ہیں جو سب کے سب ثقاہت کی ترازو میں پورے تھے مگر سوچنے کی بات ہے کہ امام بخاری امام ابوداؤد اور امام یعقوب کے اساتذہ کی یہ تعداد کوئی قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محدثین اطراف وآفاق عالم اسلامی میں پھیل چکے تھے اور جابجا اسناد وروایت کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ اتباع تابعین میں سے ایک ایک شخص کے ہزار ہا شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے ہزار ہا شاگرد تھے۔ تمام بلاد اسلامیہ

---

(۱) مناقب ذہبی: ص ۱۱-۱۲ (۲،۳) مناقب موفق: ص ۳۸ (۴) مقدمہ فتح الباری: ص ۵۲۴

میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں اور بڑے زور شور سے درس حدیث ہو رہا تھا۔ اس زمانے کی شہری زندگی میں علم حدیث اس قدر رائج تھا کہ ایک ایک محدث کے حلقہ درس میں ہزار ہا طلبہ کی شرکت ایک معمولی بات تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسند عراق امام علی بن عاصم واسطی امام اعظمؒ کے مشہور شاگرد کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے حلقہ درس میں تیس ہزار سے زیادہ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔(۱) اور ان ہی کے صاحبزادے امام ابوالحسین عاصم بن علی ۲۲۰ھ میں جو امام بخاری کے بھی استاد ہیں اور جن سے انہوں نے اپنی صحیح میں روایات بھی لی ہیں ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے　بغداد آئے ان کے املائی درس میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ابوالحسین بن المبارک کا بیان ہے کہ ان کی مجلس درس میں طلبہ کا اندازہ ایک لاکھ انسانوں سے اوپر لگایا جاتا تھا۔(۲) عمر بن حفص کہتے ہیں کہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنے کارندوں کو رحبۃ النخل میں صرف اس مقصد کی خاطر روانہ کیا تھا کہ اندازہ لگائیں کہ امام عاصم کے درس حدیث میں کتنی تعداد ہے؟ امام عاصم چھت پر بیٹھ کر لوگوں کو سناتے تھے۔ میں نے ایک روز سنا ہے کہ فرما رہے تھے حدثنا اللیث بن سعد۔ ہجوم اتنا تھا کہ آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی آپ نے اسی روز ایک کلمہ چودہ بار کہا اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ لگایا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار تھے۔(۳) امام اعظمؒ ہی کے ایک اور شاگرد خاص ہیں یزید بن ہارون۔ جو فن حدیث میں مشہور امام ہیں ان کے متعلق یحییٰ بن طالب کا بیان ہے کہ ان کی مجلس میں ستر ہزار کی حاضری ہوتی تھی۔(۴) بلکہ امام محمد کے بارے میں حضرت امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد جب کوفہ میں موطا کا درس دیتے تو ان کی فرودگاہ پر لوگوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ تنگ ہو جاتی اسی زمانے میں امام شافعی تحصیل علم کی خاطر کوفہ کو تشریف لائے تھے کیونکہ یہ بتانے سے پہلے امام شافعی نے امام محمد کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کی خدمت میں تین سال رہا ہوں اور اس عرصہ میں میں نے ان

(۲،۱) تذکرہ الحفاظ ج اص ۳۵۹　(۳) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۳۵۹

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج اص ۲۹۲

سے سات سو حدیثیں سنی ہیں۔(۱) اور یہ ساری داستان امام مالک کی وفات کے بعد کی ہے اس کی پوری تفصیل اسد بن فرات نے اس طرح بتائی ہے کہ۔

ہم ایک روز امام محمد کے حلقہ درس میں موجود تھے دفعۃً ایک شخص گردنیں پھلانگتا ہوا امام محمد کے پاس آیا اور ہم نے امام محمد کی زبان سے یہ الفاظ سنے: انا لله وانا اليه راجعون مصيبة ما اعظمها مات مالك بن انس امير المومنين فى الحديث ۔ ان للہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث امام مالک کی وفات ہوگئی ہے۔ امام محمد جب اس کے بعد امام مالک سے حدیثیں بیان کرتے تو لوگ امام مالک کی حدیثوں کے شوق میں اس کثرت سے آپ کی خدمت میں آتے کہ آپ کے یہاں آنے کے راستے بند ہو جاتے اور جب امام مالک کے سوا کسی اور کی حدیثیں بیان کرتے تو خواص ہی خواص آتے۔(۲)

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دور میں جب گھر گھر حدیث کا چرچا تھا محدثین کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد حیرت انگیز نہیں ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت امام اعظمؒ کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد کیسے پیدا ہوگئی جبکہ علم حدیث کی ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے ۱۰۱ھ میں سرکاری حکم جاری کیا گیا کہ احادیث جمع کی جائیں جیسا کہ آپ انشاء اللہ آئندہ اوراق میں اس کی تفصیل پڑھیں گے۔ اس سرکاری حکم کے بارے میں حافظ ابو نعیم نے بتایا ہے کہ یہ آفاق یعنی اطراف مملکت میں روانہ کیا گیا۔ اس آفاق سے مراد مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں یہی وہ مقامات تھے جہاں سے علم نبوی کے چشمے اُبل اُبل کر سارے عالم میں رواں ہوئے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

یہ پانچ شہر مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام ہی ہیں جن سے علوم نبوت یعنی ایمانی، قرآنی اور شرعی علوم نکلے ہیں۔(۳)

ورنہ علم حدیث کی تدوین فن روایت و اسناد کے لحاظ سے دور تابعین کے آخر میں وجود پذیر ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

---

(۱) الانتقاء، ص ۵۳　(۲) نیل الامانی　(۳) منہاج السنہ، ج ۴ ص ۱۴۲

زمانہ تابعین کے آخر میں تدوین آثار کا کام رونما ہوا ہے۔(۱)

الغرض اس دور میں جبکہ روایت و اسناد کی فنی طور پر بھی ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے اساتذہ کی یہ تعداد کثیر اس بات کی شہادت ہے کہ امام اعظمؒ نے علم حدیث کرنے میں بہت بڑی محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ الغرض امام اعظمؒ نے علم حدیث میں اس درجہ کمال پیدا کر لیا تھا اور ایسی محنت کی کہ امام علی بن عاصم جیسا نامور محدث امام اعظم کے بارے میں یہ اقرار چھوڑ گیا۔

اگر ابو حنیفہ کے علم کو دوسروں کے علم کے مقابلے میں تولا جائے تو ابو حنیفہ کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔(۲)

امام اعظمؒ کے اساتذہ میں پہلا طبقہ:

امام اعظمؒ کے ان اساتذہ میں سب سے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے محدثین کے ایک طبقہ نے مثلاً حافظ ولی الدین عراقی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سخاوی نے خالص اسنادی اور روایتی نقطہ نظر سے امام اعظم کے صحابہ کے تلمذ پر لم نصح روایتہ، روایت صحیح نہیں ہے لکھ دیا ہے۔ اس سے بہتوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ امام اعظم کو صحابہ سے شرف تلمذ ثابت نہیں بلکہ اس کا عدم ثابت ہے اور صحابہ کے نام سے امام کی روایات موضوع ہیں حالانکہ اصول محدثین کی رو سے ایسا سمجھنا خطرناک غلطی ہے بلکہ فن روایت کے مسلمہ اصول و قواعد سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ

محدثین بسا اوقات لایصح اور لایثبت کا لفظ بولتے ہیں نادان اس کا مطلب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے یہاں موضوع یا ضعیف ہے۔ ایسا سوچنا ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔(۳)

مشہور محدث ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ "صحیح نہیں ہے" کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بات گھڑی ہوئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسن یا ضعیف ہے۔ علامہ

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴ (۲) مناقب امام اعظم الذہبی ص ۴ (۳) الرفع والتکمیل ص ۸۶

نور الدین" جواہر العقدین فی فضل الشرفین" میں فرماتے ہیں کہ امام احمد کے حدیث عاشوراء پر لا یصح کے ریمارکس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باطل ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح تو نہ ہو لیکن قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کا درمیانی درجہ حسن ہی ہے۔ امام زرکشی نکت علی ابن الصلاح میں فرماتے ہیں کہ محدثین کی دونوں تعبیروں موضوع اور لا یصح میں بہت بڑا فرق ہے موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور بات کا گھڑی ہوئی ہونا ثابت ہوگیا ہے اور لا یصح میں صرف صحیح نہ ہونے کی خبر ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا عدم بھی ثابت ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی "القول المسدد فی الذب عن مسند احمد" میں لکھتے ہیں کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ علامہ محمد بن عبد الباقی شرح مواہب اللدنیہ میں حدیث

یطلع اللہ لیلة النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقہ الا المشرک او المشاحن۔

پر ابن دحیہ کا کلام **لم یصح فی لیلة نصف شعبان شئی** نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ

شاید ابن دحیہ کی مراد اصطلاحی صحت ہے کیونکہ یہ حدیث حسن ہے اگر چہ درجہ صحت کو نہیں پہنچی۔ (۱)

مولانا عبدالحی فرماتے ہیں

کسی حدیث پر محدثین کا عدم ثبوت اور عدم صحت کا حکم لگانا عرف محدثین کے مطابق حدیث کے ضعیف اور موضوع ہونے کو لازم نہیں بلکہ ممکن ہے کہ حدیث حسن لذاتہ یا لغیرہ ہو؟۔

اسی بنا پر امام ترمذی اپنی جامع میں ایک حدیث لاتے ہیں اور خود اس کی تضعیف بھی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ **والعمل علیٰ ھذا عند اھل العلم**۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اسنادی اور روایتی طور پر صحیح نہ ہونے سے اصل بات کا نہ ہونا

---

(۱) شرح المواہب اللدنیہ۔ ج ۷ ص ۴۱۳

ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل یہاں حدیث ضعیف بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جس میں شرائط صحت میں سے کوئی شرط نہ ہو۔ اور دوسری وہ جس میں شرائط قبول میں سے کوئی شرط نہ ہو۔ اس لیے امام اعظمؒ کے صحابہ سے تلمذ کے موقعہ پر محدثین کے یہاں لایصح دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کہ ان اکابر کے نزدیک یہ داستان گویا بناوٹی ہے بہت بڑی جرأت اور بے باکی ہے۔ مشہور حدیث افتراق امت کے متعلق مجدالدین فیروز آبادی نے سفر السعادۃ کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ لم یثبت فیه شی۔ (اس موضوع پر کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے) حالانکہ چند در چند طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ صحت کے قریب قریب ہے جیسا کہ امام حاکم لکھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ طرق سے اس حدیث کا آنا اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ:

> صاحب قاموس علامہ مجدالدین نے سفر السعادۃ میں ایک سے زیادہ احادیث کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہیں اس سے ہمارے زمانے کے ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا ہے اور انہوں نے احادیث ثابتہ پر موضوع، ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔ (۱)

صحابہ سے روایت کا شرف:

ذرا اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ امام اعظمؒ کی صحابہ سے روایت کی حیثیت واقعات کی دنیا اور قانون کی نظر میں کیا ہے؟ یہی نا کہ امام اعظمؒ کے لیے ایک جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ فضل و بزرگی ہے جس میں ائمہ میں سے امام اعظمؒ کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی بات ہے تو اس میں روایتی و اسنادی کمزوریوں سے صرف نظر تو خود محدثین کی طے کردہ پالیسی ہے۔ حلال و حرام میں اسنادی کمزوریوں کو تلاش کرنا محدثین نے ناگزیر بتایا ہے لیکن جہاں تک فضائل اور سیر کا میدان ہے اس میں وہ ضعیف روایات کو بھی شرف قبول عطا کر دیتے ہیں۔ مشہور محدث علی الحلبی ''انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون''

---

(۱) تحفۃ الکملۃ علی حواشی تحفۃ الطلبہ: ص ۵

میں رقمطراز ہیں کہ سیرت میں صحیح، ضعیف، موضوع، مرسل، منقطع اور معضل سب اسی قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ جب ہم حلال وحرام کو موضوع بحث بناتے ہیں تو ہم متشدد ہوتے ہیں اور فضائل میں ہم تساہل ہوتے ہیں۔ خطیب بغدادی نے اس موضوع پر الکفایہ میں ایک مستقل عنوان قائم کر کے ائمہ کی تصریحات جمع کر دی ہیں۔

علامہ ابن سیدالناس نے ''عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر'' میں مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

کلبی سے زیادہ تر روایات انساب ایام عرب اور لوگوں کے احوال سے متعلق ہیں اس موضوع پر علماء چشم پوشی سے کام لیتے ہیں ان لوگوں سے بھی روایات لے لیتے ہیں جن کی احکام میں احادیث معتبر نہیں ہوتی ہیں۔ اس میں رخصت ہے اور یہ رخصت امام احمد سے منقول ہے۔(۱)

ملا علی قاری نے مشہور رسالہ ''الحظ الاوفر فی الحج الاکبر'' میں اس حدیث پر کہ:

افضل الایام یوم عرفة اذا وافق یوم الجمعة فهو افضل من سبعین حجةً۔

یہ نوٹ لکھا ہے:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث ضعیف فضائل میں تمام علماء کے نزدیک قابل اعتبار ہے۔(۲)

حافظ سیوطی نے بھی یہ بات طلوع الثریا، التعظیم والمنہ اور القامۃ السندسیہ میں لکھی ہے۔ حافظ عراقی نے شرح الالفیہ میں، امام نووی نے تقریب میں اور سیوطی نے اس کی شرح تدریب میں اس بات کو بار بار صاف کیا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر امام اعظمؒ کی اس جزوی فضیلت کے موضوع پر یہ ردوکد کچھ بے معنی سی بات ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے سب سے پہلے دارقطنی نے صدیاں گذرنے پر یہ بات لوگوں کو بتائی ہے کہ:

امام ابوحنیفہ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی البتہ انہوں نے حضرت انسؓ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر ان سے کوئی بات نہیں سنی۔

---

(۱) عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر: ج ا ص ۱۵ (۲) الحظ الاوفر: ص ۳۱۹

دار قطنی کے بعد خطیب بغدادی نے بھی تاریخ بغداد میں یہی بات دہرا دی ہے چنانچہ سعید بن ابی سعید نیشاپوری کے ترجمہ میں امام اعظمؒ کی ایک حدیث کو بواسطہ امام ابو یوسف بالاسناد نقل کرنے کے بعد کہ جس میں حضرت انسؓ سے امام اعظمؒ کے سماع کی تصریح موجود ہے لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ کا حضرت انسؓ سے سماع صحیح نہیں ہے۔(۱)

اور امام ابوحنیفہ نے انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے۔(۲)

اس کے بعد شوافع میں زید الدین عراقی اور ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہی ہم زبان ہو گئے ورنہ اس سے پہلے اس موضوع پر متقدمین میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا اسی بنا پر ملا علی قاری شرح مسند امام میں فرماتے ہیں

والمعتمد ثبوتها۔

''پائیدار بات یہی ہے کہ امام اعظمؒ کا صحابہ سے تلمذ ثابت ہے۔''

امام اعظمؒ کا حضرت انس بن مالکؓ سے تلمذ:

صحابہ میں جن اکابر کے سامنے امام اعظم نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ ان میں حضرت انس بن مالکؓ کا مقام سب سے اونچا ہے ان کی کنیت ابوحمزہ ہے انصار مدینہ میں بنی نجار سے تعلق کی وجہ سے نجاری ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ملیکہ بنت ملحان اور کنیت ام حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے میری عمر دس سال تھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرمائے دار بقا ہوئے تو میں بیس سال کا تھا ان کو ان کی والدہ ہی خدمت اقدس میں لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! خدمت کے لیے خادم لائی ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف قبول عطا فرمایا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار دعا کی درخواست کی آپ نے دعا فرمائی 'اللهم اكثر ماله' و ولده'۔ فرماتے ہیں کہ مال کی اتنی فراوانی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۱۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۴

ہوئی کہ میرے نخلستان اور تاکستان میں سال بھر میں دو بار پھل آتا۔ اولاد کا حال یہ ہے کہ میری اولاد اور اولاد کی اولاد کو اگر اس وقت شمار کیا جائے تو ایک سو کے قریب ہیں۔ حضرت ثابت فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے ہاتھوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھویا ہے؟ فرمایا کہ ہاں: حضرت ثابت نے فرمایا ذرا ہاتھ دیجئے میں اس کو بوسہ دوں۔ مسند امام احمد میں ہے نضر بن انس کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے روز قیامت کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی حضور انورؐ نے وعدہ فرمایا حضرت انسؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ سے قیامت کے روز کہاں ملوں؟ فرمایا اول صراط پر دیکھنا وہاں نہ ملوں تو میزان عمل پر دیکھنا وہاں بھی نہ ملوں تو حوض کوثر پر ملنا۔(۱)

حافظ ابن کثیر نے ابوبکر بن عیاش کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے عبدالملک بن مروان کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی گورنر حجاز کے متعلق ایک شکایتی خط بھیج اور لکھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اگر کہیں اپنے نبی کا خادم مل جائے تو وہ اس کا حد درجہ اکرام کریں۔ میں نے پورے دس سال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارے ہیں اور آپ کی خدمت کی ہے۔ لکھا ہے کہ عبدالملک نے حجاج کو خط لکھا۔ خط میں یہ درج تھا۔

جب میرا خط تم کو ملے تو ابوحمزہ کے پاس جاؤ ان کو راضی کرو ان کے ہاتھ اور پاؤں چومو ورنہ تم کو میری جانب سے ایسی سزا ملے گی جس کے تم مستحق ہو۔(۲)

خط پہنچتے ہی حجاج نے حضرت انسؓ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن حجاج ہی کے ایک دوست نے صلح کرا دی۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرصہ دراز تک رہے آپ بے شمار احادیث کے امین تھے عمر طویل پائی ہے۔ آپ بصرہ میں دنیا سے روانہ ہونے والے صحابہ میں آخری صحابی تھے۔ امام بخاری نے ان سے اسی حدیثیں لی ہیں۔(۳)

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ج ۹ ص ۹۷　(۲) البدایہ والنہایہ۔ ج ۹ ص ۹۷

(۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۴۲

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ۹۳ھ میں بصرے میں آپ کا انتقال ہوا۔ ہذا ہوالمشہور وعلیہ الجمہور۔ اس وقت امام اعظمؒ کی عمر تیرہ سال تھی۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں صدرالائمہ مکی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بحوالہ امام اعظمؒ درج کی ہے۔

ابو حنیفة عن انس بن مالک قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول طلب العلم فریضة علی کل مسلم۔(۱)

جیسا کہ امام اعظمؒ کی داستان علم میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظمؒ کا زمانہ طلب علم چھپنا اور بچپن ہے اور آپ کی علمی کاریوں کا آغاز علم کلام سے ہوا ہے بصرہ اس زمانے میں علم کلام کی منڈی تھی۔ علم کلام کی تحصیل کے لیے امام اعظمؒ کا کوفہ سے بصرہ جانا اور بصرہ میں قیام کرنا مشہور ہے امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں بصرہ میں بیس سے زیادہ بار گیا ہوں۔ اسی زمانے میں آپ کو حضرت انسؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ابونعیم نے بالتصریح لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے حضرت انسؓ کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں سنی ہیں۔

---

(۱) یہ حدیث حافظ خسرو نے بحوالہ قاضی ابو یوسف عن ابی حنیفہ تین متصل سندوں سے اور قاضی ابوبکر محمد بن الباقی نے اپنے مسند میں دو متصل سندوں سے بیان کی ہے حافظ جلال الدین السیوطی حافظ ابو معشر سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ میری رائے میں یہ حدیث صحیح کے ہم پلہ ہے کیونکہ میرے علم میں یہ حدیث پچاس طرق سے مروی ہے (تبییض الصحیفہ ص ۶) حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے کچھ طرق کی بعض ائمہ نے تصحیح فرمائی ہے حافظ ابوالحجاج المزی کا اعتراف کیا ہے کہ کثرت طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجے میں ہے اس موضوع پر ان اکابر سے احادیث آئی ہے۔ ابیؓ، جابرؓ، حذیفہؓ، الحسین بن علیؓ، سلمانؓ، سمرۃؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، علیؓ، معاویہؓ، بدیلؓ، ابوسعیدؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، ام ہانیؓ وغیرہ وغیرہ۔

امام اعظمؒ کا حضرت عبداللہ بن الحارثؓ سے تلمذ:

یہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ان کی بود و باش مصر میں تھی، ارشادات پیغمبر کے امین تھے۔ اہل مصر نے ان سے ارشادات کو سن کر آگے نقل کیا ہے۔(۱)

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم وفضلہ میں بسند متصل خود امام اعظمؒ کی زبانی نقل کیا ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے میں نے والد محترم سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ والد صاحب نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ان کا نام نامی عبداللہ بن الحارث ہے میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنا رہے ہیں میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی آگے لے چلئے تاکہ میں بھی ان کی زبان مبارک سے ارشاد گرامی سنوں۔ والد محترم لوگوں کو چیرتے پھاڑتے آگے آگے ہو گئے تا آنکہ میں حضرت عبداللہؓ کے پاس پہنچ گیا میں نے سنا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے دین میں فقاہت بہم پہنچائی اللہ اس کو اس کے غم میں کافی ہوگا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچائے گا جہاں کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔(۲)

سبط الجوزی نے الانتصار والترجیح میں حافظ ابونعیم اصفہانی کے حوالے سے جن صحابہ کرام کے بارے میں امام اعظم کی دید و شنید کو مانا ہے ان میں حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزء بھی ہیں نیز اس روایت کو الحافظ الاستاذ ابو محمد حارثی، الحافظ ابو عبداللہ الحسین بن محمد اور حافظ ابوبکر محمد بن الباقی

(۱) الاصابہ ج ۲ ص ۵ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۴۵

نے اپنے مسانید میں باسانید متصلہ درج کیا ہے۔ تاج الاسلام حافظ عبدالکریم صعانی فرماتے ہیں کہ حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں بسند متصل اس کی تخریج کی ہے۔ (۱)

حافظ ابن عبدالبر جو خطیب بغدادی کے معاصر بھی ہیں جامع بیان العلم میں حضرت عبداللہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد جس میں امام اعظمؒ نے اپنے سماع کی تصریح کی ہے سماع کے ثبوت میں لکھا ہے کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ امام اعظمؒ نے حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کو دیکھا ہے۔ اگرچہ حضرت عبداللہؓ کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہی ہے جو حافظ ذہبی نے اپنی تاریخ کبیر کے مقدمہ میں بتائی ہے کہ متقدمین نے ضبط تاریخہائے وفات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا اس سلسلے میں انہوں نے صرف حافظہ پر ہی بھروسہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی اور یہی صورت حال زمانہ شافعی تک تابعین کے بارے میں رہی۔ (۲) لیکن حضرت عبداللہ کی اسی حدیث کو حافظ ابوبکر الجعابی نے نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کی تاریخ وفات ۹۷ھ ہے۔ واضح رہے کہ حافظ ابوبکر الجعابی علل حدیث

---

(۱) یہ حدیث اگرچہ متعدد سندوں سے آئی ہے لیکن ہم نے جو روایت نقل کی ہے اس کی تخریج حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بطریق یوسف ابن احمد المکی از ابی جعفر العقیلی وابی علی الرازی ومحمد بن سماعہ از قاضی ابی یوسف امام اعظم سے کی ہے حافظ ابوالحسن علی بن محمد الکنانی نے اس کو ابوالعباس احمد بن الصلت بن المغلس والی روایت کا متابع قرار دیا ہے بلاشبہ احمد بن الصلت پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ کلام کیا ہے مگر حافظ ابوزرعہ حافظ ابوحاتم جیسے ائمہ فن رجال نے ان کی صداقت اور ثقاہت کو سراہا ہے دراصل بعد میں آنے والوں کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ احمد نے ایک ضخیم کتاب امام اعظم کے مناقب پر کیوں لکھی یہ کتاب بعض ارباب ظواہر کے لئے ان کے خلاف برہمی کا باعث ہوگئی حتی کہ دارقطنی کو تو ان پر اس قدر غصہ آیا کہ ان کی اس کتاب ہی کو موضوع قرار دے دیا لیکن حافظ کو جو امام اعظم سے سوء عقیدت ہے اس کی موجودگی میں ان سے کچھ اور توقع ہی بیکار ہے۔　　(۲) الاعلان لاتوبیخ: ص ۱۶۹

اور تاریخ رجال میں بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی' حافظ ابو عبداللہ الحاکم اور حافظ دارقطنی نے فن حدیث میں ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے چار لاکھ حدیثوں کو نوک زبان کیے ہوئے تھے حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

كان بارعاً فی معرفة العلل وثقات الرجال ولواريخهم (۱)

''حدیثوں کی علل شناسی رجال اور ان کی تاریخ میں بڑے ہی ماہر تھے۔''

تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔ الحافظ البارع فرید زمانہ اگرچہ حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں صرف ان دو صحابہ ہی کا تذکرہ کیا ہے مگر امام ابو معشر عبدالکریم نے ان دو کے ساتھ چار کے اور نام بھی بتائے ہیں۔ صدر الائمہ کی بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے جن کے آگے فن حدیث میں خطیب بغدادی نے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا ہے لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے صحابہ میں سے حسب ذیل حضرات کو دیکھا اور ان سے حدیثیں سنی ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن الحارثؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ۔ ملک الحفاظ یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل میں مسلم الثبوت امام اور علم حدیث کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں:

ان ابا حنيفة صاحب الرای سمع عائشة بنت عجرد تقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم اكثر جند الله فی الارض الجراد لا اكله' ولا احرمه' (۲)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے امام اعظمؒ کا تلمذ:

ان کی کنیت کچھ کی رائے میں ابو معاویہ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابو ابراہیم ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۸۷ھ میں کوفہ تشریف لائے اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کوفہ کو رہنے والے صحابہ میں یہ آخری صحابی ہیں اور امام بخاری کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات ۸۹ھ بتائی ہے۲۔ اگر ان کی تاریخ فی الواقع ۸۹ھ ہے تو اس وقت امام اعظمؒ کی عمر نو سال ہے۔

---

(۱) لسان المیزان ترجمہ عائشہ (۲) البدایہ والنہایہ: ج ۹ ص ۷۵

اس عمر میں نہ دیکھنا مستبعد ہے اور نہ سننا۔ اور جب کہ امام اعظمؒ کے خاندان میں اس کا مزید اہتمام بھی تھا کہ بچوں کو صحابہ کی خدمت میں لے جاتے تھے چنانچہ آپ کے والد ماجد ثابت بھی بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا بھی فرمائی تھی۔ ایسی صورت میں اگر امام اعظمؒ نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی نو سال کی عمر میں زیارت کی اور حدیثیں سنی ہیں تو اس میں انکار کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں جہاں تک روایت سننے کا معاملہ ہے وہ محدثین کے یہاں اتفاقی ہے۔

تحمل روایت کی عمر اور محدثین:

تحمل روایت کے لیے نو سال تو بڑی عمر ہے امام بخاری نے کتاب العلم میں متیٰ یصح سماع الصغیر کا عنوان قائم کر کے محمود بن الربیع کی زبانی ایک واقعہ نقل کیا ہے اس واقعہ میں خود ان صحابی کا بیان ہے کہ میری عمر پانچ سال تھی اور الخطیب نے بھی لکھا ہے کہ محمود کی عمر حضور انورؐ کی وفات کے وقت پانچ سال تھی (۱)۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس عمر میں روایت لینے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے اور حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں محمود کی اس روایت کی وجہ سے پانچ سال پر محدثین کا عمل بتایا ہے۔

وهو الذی استقر علیه اهل الحدیث (۲) ''اسی پر محدثین کا عمل ہے۔''

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی عمر حضرت عبداللہ بن اوفیٰ کے دنیا سے رحلت فرمائے دار بقا ہونے کے وقت نو سال تھی اور یہ محدثین کی قائم کردہ اس تحدید سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے تحمل روایت کے لیے ضروری قرار دی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن الصلاح نے قاضی عیاض کے حوالے سے بتایا ہے۔

محدثین نے اس میں ضابطہ یہی بتایا ہے کہ تحمل روایت کی کم از کم عمر محمود کی ہے۔ اس لیے اس کی پذیرائی ہر شک وشبہ سے قطعی طور پر بالا ہے۔

فاذن لا ینکر سماع الامام من عبداللہ بن ابی اوفی (۳)

---

(۱) الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۸۹ (۲) مقدمہ ابن الصلاح (۳) شرح مسند امام اعظم ص ۲۸۹

اس لیے امام اعظمؒ کا سماع حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے ناقابل انکار ہے۔

حافظ ابو معشر عبدالکریم نے اپنے رسالہ میں ان کے حوالے سے امام اعظمؒ کی یہ روایت نقل کی ہے۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے مسجد بنائی خواہ وہ چیل کے آشیانے جتنی ہو اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

ان مذکورہ صحابہ کے علاوہ حضرت سہل بن سعد الساعدی ۹۱ھ اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ ۱۰۰ھ مکہ میں بقید حیات تھے۔ محدثین نے ان سے بھی امام اعظمؒ کی دید وشنید بتائی ہے۔ اگر امام اعظمؒ نے ان سے بھی کچھ حدیثیں سنی ہیں اور ان کے سامنے بھی چھپنے میں زانوئے ادب تہ کیا ہو تو اس میں انکار کی کیا بات ہے؟

اتصال روایت کی شرط:

اتصال روایت کی حد تک امام بخاری تو اگرچہ ایک بار ملاقات کو ضروری بتاتے ہیں لیکن امام مسلم کے خیال میں اتصال کے لیے ملاقات ضروری نہیں وہ تو صرف ہم عصر ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ہم عصری ثابت ہو جانے کے بعد روایت کو بلفظ عن پیش کرنا درست ہے بلکہ امام مسلم تو معاصرت کے ساتھ ملاقات کی شرط کو من گھڑت اور من مانی بات قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان اشتراط اللقاء قول مخترع لم يسبق قائله' اليه۔

ملاقات کی شرط ایک من گھڑت بات ہے اس سے پہلے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔"

اور پھر امام مسلم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دعوے کے پیچھے اجماع کی طاقت ہے۔ یاد رہے کہ امام مسلم کا یہ اختلاف صرف حدیث معنعن میں ہے۔ بہرحال ایسی حالت میں امام اعظمؒ کی احادیث معنعنہ کو جو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں دراصل وہ فن کا منہ چڑاتے ہیں کیونکہ اگر یہ روایات پایہ ثبوت کو نہ پہنچتیں تو امام یحییٰ بن معین، حافظ ابونعیم شافعی، حافظ ابن

عبدالبر مالکی جو حدیث و روایت کے ارا کین خیال کیے جاتے ہیں ہرگز اس بات کی تصریح نہ کرتے کہ امام اعظمؒ نے صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔

الغرض میں اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنے شہر کوفہ کے اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔

آیئے پہلے سرراہے کچھ کوفہ میں علم حدیث کا حال سن لیجئے

کوفہ میں علم حدیث:

فتوح البلدان میں امام احمد بن یحییٰ بغدادی نے بحوالہ نافع بن جبیر بن مطعم حضرت عمرؓ کا کوفہ کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے بالکوفة وجوه الناس (کوفہ میں بڑے لوگ ہیں)

ظاہر ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ یہاں جس وجاہت کا تذکرہ فرمارہے ہیں وہ دینی اور علمی وجاہت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی تائید خود حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خط سے ہوتی ہے۔ جو انہوں نے کوفہ والوں کے نام لکھا ہے اور جسے حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے۔

میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسر کو بحیثیت امیر اور عبداللہ بن مسعود کو بحیثیت معلم اور وزیر روانہ کیا ہے۔ یہ دونوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں منتخب اور برگزیدہ ہستیاں ہیں صرف صحابی نہیں بلکہ شرکائے بدر میں سے ہیں تم ان کی اقتداء کرو دیکھو عبداللہ کے معاملے میں میں نے تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے۔(۱)

اس خالص علمی وجاہت کی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک بار کھڑا دیکھ کر فرمایا تھا:

کنیف ملئ علماً۔

(علم سے بھرا ہوا برتن ہے)(۲)

اور اسی علمی وجاہت اور جلالت قدر کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات

(۲،۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۳

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل سے جب ان کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت کیا کہ آپ کی رائے میں طالب علم کو کیا کرنا چاہیے آیا ایک ہی استاد کی خدمت میں برابر حاضر رہ کر اسی سے حدیثیں لکھتا رہے یا ان مقامات کا رخ کرے جہاں علم کا چرچا ہے اور وہاں جا کر علماء سے استفادہ کرے۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیے اور دوسرے مقامات کے علماء سے حدیثیں لکھنی چاہئیں اور ان علماء میں سب سے پہلے امام احمد نے کوفیین ہی کا ذکر کیا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

یرحل ویکتب من الکوفیین والبصریین واھل المدینہ و مکۃ(۱)

''سفر کرے اور کوفیوں، بصریوں اور مدینہ اور مکہ والوں سے احادیث سے لکھے۔''

امام بخاری نے طلب حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا دو دفعہ جزیرہ گئے چار بار بصرہ جانا ہوا چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے مگر اس کے باوجود مکہ و بغداد کو اتنی اہمیت تھی کہ فرماتے ہیں

﴿بقیہ صفحہ ۲۶۱﴾ امام یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ محدثین پانچ ہیں مالک ابن جریج، ثوری اور عفان (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۴۵) امام احمد فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں عبدالرحمن بن مہدی سے زیادہ رسوخ کے مالک ہیں (کتاب الجرح والتعدیل: ج ۳ ص ۳۰) ابن ابی حاتم نے ان کے اساتذہ میں حماد بن زید۔ حماد بن سلمہ اور امام شعبہ کو شمار کیا ہے اور حافظ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں حماد بن زید کے بارے میں انکشاف کیا ہے۔ **روی حماد زید عن ابی حنیفۃ احادیث کثیرۃ۔** (ص ۱۳۰) حافظ ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مامون الرشید کی جانب سے ان کو سرکاری وظیفہ ملتا تھا۔ خلق قرآن کے مسائل میں یہ بھی امام احمد کے ہمنوا تھے۔ سرکار مامون نے ان کو اپنانے کی کوشش کی اسی سلسلے میں ان کا سرکاری وظیفہ بند کرنے کی دھمکی دی گئی تو فرمایا **وفی السماء رزقکم** الخ۔ خطیب نے وظیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **کان المامون یجری علی عفان خمسمائۃ درھم کل شھر۔** امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۲۲۰ھ میں ہوئی بخاری ابوداؤد کی بھی یہی رائے ہے۔

(۱) تدریب الراوی ص ۳۷۷

میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کی ہمرکابی میں کوفہ اور بغداد کتنی بار مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔(۱)

آج بھی اگر آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ صرف بخاری شریف کو اٹھا لیجئے اور اس میں جس قدر صحابہ سے احادیث منقول ہو کر آئی ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالیے حافظ ابن حجر عسقلانی نے بترتیب حروف تہجی مقدمہ فتح الباری میں تمام صحابہ کو نام بنام لکھ دیا ہے۔ ان صحابہ میں سے جو خاص کوفہ میں آ کر جاگزین ہوئے ذرا ان کے نام پڑھ لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ امام بخاری کے ان گنت بار کوفہ جانے کا کیا باعث تھا اور پتہ لگ جائے کہ کوفہ کا حدیث میں کیا مقام ہے۔

۱- حضرت اشعث بن قیس الکندیؓ ○ ۲- حضرت عدی بن حاتمؓ ○ ۳- حضرت اہبان بن اوس الاسلمیؓ ○ ۴- حضرت عقبہ بن عمروؓ ○ ۵- حضرت بریدہ بن الحصیبؓ ○ ۶- حضرت علی بن ابی طالبؓ ○ ۷- حضرت جابر بن سمرہؓ ○ ۸- حضرت عمران بن الحصینؓ ○ ۹- حضرت جریر بن عبداللہؓ ○ ۱۰- حضرت عمرو بن حریثؓ ○ ۱۱- حضرت جندب بن عبداللہؓ ○ ۱۲- حضرت مرداس بن مالکؓ ○ ۱۳- حضرت حارثہ بن وہبؓ ○ ۱۴- حضرت مسیب بن حزنؓ ○ ۱۵- حضرت حذیفہ بن الیمانؓ ○ ۱۶- حضرت معن بن یزیدؓ ○ ۱۷- حضرت خباب بن الارتؓ ○ ۱۸- حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ○ ۱۹- حضرت زید بن ارقمؓ ○ ۲۰- حضرت نعمان بن بشیرؓ ○ ۲۱- حضرت سلیمان بن صردؓ ○ ۲۲- حضرت نعمان بن مقرنؓ ○ ۲۳- حضرت سمرہ بن جنادہؓ ○ ۲۴- حضرت اضیع بن الحارثؓ ○ ۲۵- حضرت سنین ابو جمیلہؓ ○ ۲۶- حضرت وہب بن عبداللہؓ ○ ۲۷- حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ ○ ۲۸- حضرت عبداللہ بن یزیدؓ ○ ۲۹- حضرت عبدالرحمن بن ابزیؓ ○

یہ ان کوفی صحابہ کے اسمائے گرامی ہیں جن کے حوالے سے امام بخاری نے صحیح میں ارشادات نبوی لیے ہیں اسی پر تمام صحاح ستہ کو قیاس کر لیجئے۔

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۱۹۲

ذرا ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور بخاری شریف ہی کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے راویوں میں سب سے زیادہ تعداد جس شہر کے راویوں کی ہے وہ کوفہ ہی ہے۔ راقم الحروف نے اس ارادے سے بخاری شریف کے راویوں کا جائزہ لیا تو صرف شہر کوفہ کے راویوں کی تعداد صحیح بخاری میں تین سو سے زائد ملی ہے۔ اگر کتاب کی ضخامت کے زائد ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کے نام ہدیہ ناظرین کرتے۔

علمائے محدثین نے حفاظ حدیث کے حالات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو اپنے وقت میں حفاظ حدیث تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب تذکرۃ الحفاظ ہے۔ یہ حافظ شمس الدین الذہبی ۷۴۸ھ کی تصنیف ہے حافظ موصوف نے اس کتاب میں کسی ایسے شخص کا تذکرہ نہیں لکھا ہے جس کا شمار حفاظ حدیث میں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ ابن قتیبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

ابن قتیبہ علم کا خزانہ ہیں لیکن حدیث میں ان کا کام تھوڑا ہے اس لیے میں نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔(۱)

اور خارجہ بن زید اگرچہ فقہائے سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے بارے میں صاف تصریح کر دی ہے کہ

چونکہ وہ قلیل الحدیث تھے اس لیے میں نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار نہیں کیا۔(۲)

ایسے ہی اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے جو حافظ حدیث تو ہیں مگر محدثین کے یہاں پایہ اعتبار سے ساقط ہیں چنانچہ امام ذہبی نے واقدی اور ہشام کلبی کو اسی لیے حفاظ حدیث میں شمار نہیں کیا۔(۲)

اس کتاب میں سے صرف ۲۵۶ھ تک کے ان محدثین کا تذکرہ پڑھ لیجئے جن کو امام ذہبی نے کوفی کہا ہے۔ ہم یہاں صرف ان محدثین کا ذکر کریں گے جن کے لیے امام ذہبی نے کتاب میں مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

(۱،۲) تذکرۃ الحفاظ

۱- علقمہ بن قیس الامام ۶۲ھ ○ ۲- مسروق الہمدانی ۶۳ھ ○ ۳- الاسود بن یزید
النخعی ۷۲ھ ○ ۴- عبیدہ بن السلمانی ۷۵ھ ○ ۵- سوید بن غفلہ الکوفی ۸۱ھ ○ ۶- زر بن
حبیش ابو مریم الاسدی ۸۲ھ ○ ۷- ربیع بن خثیم ابو یزید الثوری ۶۳ھ ○ ۸- عبدالرحمن بن ابی
لیلی ۸۳ھ ○ ۹- ابو عبدالرحمن السلمی ۷۳ھ ○ ۱۰- ابو امیہ شریح بن الحارث ۷۸ھ ○ ۱۱-
ابو مقام شریح المذحجی ۷۸ھ ○ ۱۲- ابو وائل شقیق بن سلمہ ۸۲ھ ○ ۱۳- قیس بن ابی حازم
۹۷ھ ○ ۱۴- عمرو بن میمون ابو عبداللہ ۷۵ھ ○ ۱۵- زید بن وہب ابو سلیمان ۸۳ھ ○ ۱۶-
معرور بن سوید ابو امیہ الاسدی ۱۲۰ھ ○ ۱۷- ابو عمرو سعد بن ایاس الشیبانی ۹۸ھ ○ ۱۸- ربعی
بن حراش ۱۰۱ھ ○ ۱۹- ابراہیم بن یزید التیمی ۹۲ھ ○ ۲۰- ابراہیم بن یزید ابو عمران ۹۵ھ ○
۲۱- سعید بن جبیر ۹۵ھ ○ ۲۲- عامر بن شراحیل الہمدانی ۱۰۴ھ ○ ۲۳- عمرو بن عبداللہ ابو
اسحاق ۱۲۷ھ ○ ۲۴- حبیب بن ابی ثابت ۱۱۹ھ ○ ۲۵- الحکم بن عتیبہ ابو عمرو الکندی ۱۱۵ھ ○
۲۶- عمرو بن مرہ ابو عبداللہ ۱۱۶ھ ○ ۲۷- القاسم بن محمد و ابو عروہ ۱۱۶ھ ○ ۲۸- عبدالملک بن
عمیر ۱۳۶ھ ○ ۲۹- منصور بن المعتمر ۱۳۲ھ ○ ۳۰- مغیرہ بن مقسم ۱۲۶ھ ○ ۳۱- حصین بن
عبدالرحمن ۱۳۶ھ ○ ۳۲- سلیمان بن فیروز ۱۳۸ھ ○ ۳۳- اسمٰعیل بن ابی خالد ۱۴۵ھ ○
۳۴- سلیمان بن مہران الاعمش ۱۴۸ھ ○ ۳۵- عبدالملک بن سلیمان ۱۴۵ھ ○ ۳۶- نعمان
بن ثابت ۱۵۰ھ ○ ۳۷- محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلی ۱۴۸ھ ○ ۳۸- حجاج بن ارطاۃ ۱۴۹ھ
○ ۳۹- مسعر بن کدام الہمدانی ۱۵۷ھ ○ ۴۰- عبدالرحمن بن عبداللہ المسعودی ۱۶۰ھ ○ ۴۱-
سفیان بن الثوری ۱۶۱ھ ○ ۴۲- اسرائیل بن یونس السبیعی ۱۶۲ھ ○ ۴۳- زائدہ بن قدامہ
۱۶۱ھ ○ ۴۴- الحسن بن صالح ۱۶۷ھ ○ ۴۵- شیبان بن عبدالرحمن ۱۶۴ھ ○ ۴۶- قیس بن
الربیع ابو محمد ۱۶۷ھ ○ ۴۷- ورقاء بن عمر ۱۶۰ھ ○ ۴۸- شریک بن عبداللہ القاضی ۱۷۷ھ ○
۴۹- زہیر بن معاویہ ابو خیثمہ ۱۷۷ھ ○ ۵۰- القاسم بن معن ۱۷۵ھ ○ ۵۱- ابو الاحوص
سلام بن سلیم ۱۷۹ھ ○ ۵۲- بشر بن القاسم ۱۷۸ھ ○ ۵۳- سفیان بن عیینہ ابو محمد ۱۹۸ھ ○
۵۴- ابو بکر بن عیاش ۱۹۳ھ ○ ۵۵- یحیی بن زکریا بن ابی زائدہ ۱۸۲ھ ○ ۵۶- عبدالسلام بن
حرب ۱۸۷ھ ○ ۵۷- جریر بن عبدالحمید ۱۸۸ھ ○ ۵۸- سلیمان بن حیان الاحمر ۱۹۸ھ ○

۵۹- ابراہیم بن محمد الفزاری ۱۸۵ھ ○ ۶۰- عیسیٰ بن یونس السبیعی ۱۸۵ھ ○ ۶۱- عبداللہ بن ادریس ۱۹۲ھ ○ ۶۲- یحییٰ بن یمان ابوزکریا ۱۸۹ھ ○ ۶۳- حمید بن عبدالرحمن ابوعوف ۱۹۰ھ ○ ۶۴- علی بن مسہر ابوالحسن ۱۸۶ھ ○ ۶۵- عبدالرحیم بن سلیمان ۱۹۵ھ ○ ۶۶- یعقوب بن ابراہیم الانصاری ۲۰۸ھ ○ ۶۷- ابومعاویہ محمد بن خازم ۱۹۵ھ ○ ۶۸- مروان بن معاویہ ۱۹۳ھ ○ ۶۹- حفص بن غیاث النخعی ۱۹۴ھ ○ ۷۰- وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ ○ ۷۱- عبیدہ بن حمید ۱۹۰ھ ○ ۷۲- عبیداللہ الاشجعی ۱۸۲ھ ○ ۷۳- عبدہ بن سلیمان ۱۸۸ھ ○ ۷۴- عبدالرحمن بن محمد ۱۹۵ھ ○ ۷۵- محمد بن فضیل ۱۹۵ھ ○ ۷۶- حماد بن اسامہ ۲۰۳ھ ○ ۷۷- محمد بن بشر ۲۰۳ھ ○ ۷۸- یحییٰ بن سعید القرشی ۱۹۴ھ ○ ۷۹- یونس بن بکیر ۱۹۹ھ ○ ۸۰- عبداللہ بن نمیر ۱۹۹ھ ○ ۸۱- شجاع ابوالولید ابوبدر ۲۰۴ھ ○ ۸۲- محمد بن عبید الایادی ۲۰۴ھ ○ ۸۳- عبداللہ بن داؤد ۲۰۹ھ ○ ۸۴- الحسین بن علی ابوعلی ۲۰۳ھ ○ ۸۵- زید بن الحباب ۲۰۳ھ ○ ۸۶- عبیداللہ بن موسیٰ ۲۱۳ھ ○ ۸۷- اسحاق بن سلیمان ۲۰۰ھ ○ ۸۸- محمد بن عبداللہ ۲۰۳ھ ○ ۸۹- یحییٰ بن آدم ۲۰۳ھ ○ ۹۰- داؤد بن یحییٰ ۲۰۳ھ ○ ۹۱- عبداللہ بن یزید ۲۱۳ھ ○ ۹۲- ابونعیم الفضل بن دکین ۲۱۸ھ ○ ۹۳- قبیصہ بن عقبہ ابوعامر ۲۱۵ھ ○ ۹۴- موسیٰ بن داؤد ۲۱۷ھ ○ ۹۵- خلف بن تمیم ۲۰۶ھ ○ ۹۶- یحییٰ بن ابی بکیر ۲۰۳ھ ○ ۹۷- عبیداللہ ۲۰۳ھ ○ ۹۸- زکریا بن عدی ۲۱۳ھ ○ ۹۹- احمد بن عبداللہ ۲۱۷ھ ○ ۱۰۰- مالک بن اسمٰعیل ۲۱۷ھ ○ ۱۰۱- خالد بن مخلد ۲۱۳ھ ○ ۱۰۲- یحییٰ بن عبدالحمید ۲۲۸ھ ○ ۱۰۳- عبداللہ بن محمد ابوبکر ۲۳۴ھ ○ ۱۰۴- محمد بن عبداللہ بن نمیر ۲۳۴ھ ○ ۱۰۵- عثمان بن ابی شیبہ ۲۳۹ھ ○ ۱۰۶- علی بن محمد بن اسحاق ۲۲۳ھ ○ ۱۰۷- احمد بن حمید ابوالحسن ۲۲۰ھ ○ ۱۰۸- الحسن بن الربیع ۲۲۱ھ ○ ۱۰۹- محمد بن العلاء ۲۴۸ھ ○ ۱۱۰- ہناد بن السری ۲۴۳ھ ○

ان حفاظ کے علاوہ دوسرے بھی کوفہ کے لاتعداد محدثین ہیں لیکن ہم نے صرف تذکرۃ الحفاظ سے ان حفاظ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ جو ۲۴۸ھ تک ہوئے ہیں۔

بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس بستی میں سب سے پہلے امام اعظمؒ نے طلب حدیث کے میدان میں قدم رکھا وہ بستی حدیث کی نعمت سے مالا مال تھی اور اس وقت اس میں دنیا کے

علم حدیث کے وہ آفتاب و ماہتاب تھے جو اپنی تابانیوں سے دنیا کو محو حیرت کر رہے تھے اور جو امام اعظمؒ کے علم حدیث میں اساتذہ ہیں۔ یہاں سب کا استقصاء تو از بس دشوار ہے مگر گلے از گلزار چند گرامی قدر ہستیاں پیش کرتا ہوں۔

علامۃ التابعین امام شعبیؒ سے تلمذ:

خطیب بغدادی نے امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم تین پر ختم ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور زید بن ثابتؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سارے علوم چھ حضرات کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ علقمہ، اسود، عبیدہ، الحارث، مسروق، عمرو۔ اور ان اکابر کی علمی میراث صرف دو کو ملی ہے ابراہیم نخعی اور امام شعبی۔

(تلقیح فهوم اهل الاثر: ص ۲۳۶)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بعد لوگوں میں محدث کی حیثیت سے صرف دو ہیں امام شعبی اور سفیان ثوری۔(۱)

حافظ ذہبی نے خود امام شعبی کی زبانی یہ انکشاف فرمایا ہے کہ

ادرکت خمسمائة من الصحابة (۲)

"میں نے پانچ سو صحابہ سے ملاقات کی ہے۔"

ان کی علمیت کا اندازہ کرنا ہو تو عبدالملک بن عمیر کا وہ بیان پڑھئے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے۔

ایک بار امام شعبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرما رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس سے گذرے سن کر فرمایا کہ میں خود ان غزوات میں شریک ہوا ہوں لیکن شعبی کو غزوات زیادہ محفوظ ہیں اور مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔(۳)

امام شعبی کا دور حدیث کی زبانی یاداشت کا زمانہ ہے اس عہد میں حدیثوں کو سن کر

---

(۱) تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۲۳۶ (۲،۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۶

زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی رواج تھا جیسا کہ اس گئے گذرے آج کے زمانے میں مسلمانوں میں قرآن کو یاد کرنے کا معمول ہے اس دور کے لوگوں کا فیشن ہی یہ تھا کہ سب کچھ زبانی یاد ہو کتابت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ امام شعبی بھی کتابت حدیث کے قائل نہ تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

ما کتبت سوادا فی بیضاء الیٰ یومی ھذا۔(۱)

''میں نے کبھی بھی روشنائی اور کاغذ سے کام نہیں لیا۔''

قوت حافظہ اس قدر غضب کی تھی کہ جو کچھ بھی سنتے فوراً یاد ہو جاتا۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ روایات شعری مجھے کم یاد ہیں مگر کم یاد ہونے کے باوجود حال یہ ہے۔

ان شئت لا نشدتکم شھرًا ولا اعید(۲)

''اگر میں چاہوں تو ایک ماہ تک اشعار پڑھتا رہوں اور تکرار نہ ہو۔''

ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرماتے ہیں:

اے شباب میں تم سے دوبارہ حدیث بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست نہیں کی۔

لا احببت ان یعیدہ علی۔ (مجھے تکرار پسند نہیں ہے)۔(۳)

علم حدیث میں اس قدر اونچا مقام رکھتے تھے۔ عاصم احول فرماتے ہیں کہ میں نے بصرہ کوفہ اور حجاز والوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا ہے۔(۴)

خطیب نے لکھا ہے کہ حدیث کے مشہور امام زہری کا کہنا ہے۔

علماء چار ہیں مدینے میں سعید بن المسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں حسن بصری اور شام میں مکحول۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۶ تا ۷۹ (۲، ۳، ۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۶

(۵) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۲۲

امام اعظمؒ نے شبعی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ امام اعظمؒ ۱۰۰ھ میں بعمر بیس سال امام شعبی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرے میں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظمؒ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور صرف نام ہی نہیں لیا بلکہ یہ بتایا ہے کہ

هو اكبر شيخ لابي حنيفة (١)

اور تو اور دور جدید کے بہت بڑے محقق ڈاکٹر فلپ حتی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب تاریخ العرب میں اس کا اقرار کیا ہے کہ

كان من ابرز الذين تخرجوا على الشعبي الامام ابو حنيفة المشهور (٢)

''امام شعبی کے بلند پایہ تلامذہ میں سے مشہور امام ابوحنیفہ ہیں۔''

عبداللہ بن داؤد الخریبی کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا ہے کہ کبراء تابعین میں سے آپ نے کس کس سے استفادہ کیا ہے؟ فرمایا:

قاسم بن محمد، طاؤس، عکرمہ، عبداللہ بن دینار، حسن بصری، عمرو بن دینار، ابوالزبیر، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، ابراہیم، شعبی اور امام نافع اور ان جیسوں سے ملا ہوں۔ (۳)

مسند امام میں خود ان کے حوالہ سے احادیث آئی ہیں۔ چنانچہ خوارزمی نے جامع المسانید کے نام سے جو مجموعہ ترتیب دیا ہے اس میں بحوالہ امام شعبی ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں اور علامہ حصکفی نے اس مسند میں امام شعبی کے حوالہ سے روایات درج کی ہیں جس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

ابو حنيفة عن الشعبي عن المغيرة من شعبة قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح على الخفين۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم موزوں پر مسح فرماتے ہیں۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۷۵　(۲) تاریخ العرب طول. ج ۱ ص ۳۱۱

(۳) شرح مسند: ص ۵۶

اس روایت کی تخریج بحوالہ امام اعظمؒ الحافظ الحارثی کے علاوہ حافظ ابومحمد بخاری' حافظ طلحہ بن محمد' حافظ حسین بن محمد' حافظ ابوبکر بن عبدالباقی اور خود امام محمد نے کتاب الآ ثار میں کی ہے۔ ویسے تو جیسا کہ حافظ بزار فرماتے ہیں اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرات کی تعداد ساٹھ ہے مگر اسی روایت کو جو امام بخاری نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

انه' خرج لحاجته فاتبعه' المغيرة باداوة فيها ماء فصب عليه حين فرغ من حاجبه فتوضا ومسح على الخفين(۱)

''آپ ضرورت سے گئے مغیرہ پانی کا برتن پیچھے سے لے کر آئے' پانی آپ نے ضرورت سے فراغت کے بعد استعمال کیا۔ وضو فرمایا اور خفین پر مسح فرمایا۔''

اسی روایت کو امام مسلم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کئی طریقوں سے بیان کیا ہے ان میں سے ایک طریق جس میں حضرت امام شعبی نے بھی حدیث بحوالہ عروۃ بن مغیرہ اپنے شاگرد عمر بن زائدہ سے بیان کی اس طرح ہے۔

عن ابيه انه' وضا النبي صلى الله عليه وسلم فتوضاء ومسح على الخفين فقال له' انى اوعنهما طاهرتين(۲)

''حضرت مغیرہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرایا۔ آپؐ نے وضو فرمایا خفین پر مسح کیا اور فرمایا کہ میں نے موزے بحالت طہارت پہنے تھے۔''

واضح رہے کہ حافظ ذہبی نے امام شعبی کو حفاظ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے اس طبقے میں کم وبیش تیس حفاظ حدیث ہیں۔ امام ذہبی کی تصریح کے مطابق امام اعظمؒ حضرت شعبی کے شاگرد ہیں اور یہ بھی ذہبی نے ہی لکھا ہے کہ وکیع بن الجراح' امام یزید بن ہارون' امام ابو عاصم النبیل' امام عبدالرزاق' امام عبید اللہ بن موسیٰ' امام ابونعیم فضل بن دکین اور امام ابو عبدالرحمٰن المقری جیسے ائمہ حدیث نے امام ابوحنیفہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ شجرہ علم حدیث کے تمام برگ وباران ہی اکابر سے نکلے ہوئے ہیں۔ امام عبدالرزاق' امام عبید اللہ

---

(۱) الجامع الصحیح: ج ۱ ص ۱۲۸　　(۲) صحیح مسلم: ج ۱ ص ۶۲۳

بن موسیٰ' امام ابو نعیم اور امام ابو عبدالرحمن المقری کے تلامذہ میں آپ کو امام احمد اور امام بخاری ملیں گے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے جہاں امام مقری کے ترجمہ میں یہ بتایا ہے کہ

سمع من ابن عون و ابی حنیفة(۱)

وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ روی عنہ' البخاری و احمد۔ امام مقری بخاری اور امام کے استاد ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ جیسے مسلم اور ابوداؤد امام احمد کے شاگرد ہیں ایسے ہی ترمذی اور ابن خزیمہ حضرت امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام شعبی کی ذات گرامی بواسطہ امام اعظمؒ علم حدیث میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حماد بن سلیمان سے تلمذ:

والد کا نام مسلم اور کنیت ابو سلیمان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حماد حدیث میں حضرت انس بن مالکؓ، زید بن وہب' سعید بن المسیب' سعید بن جبیرؒ عکرمہ مولی ابن عباسؓ' ابو وائل' ابراہیم نخعی' عبداللہ بن بریدہ اور عبدالرحمن بن سعد کے شاگرد ہیں۔ اور مشہور محدث عاصم الاحول' امام شعبہ' امام سفیان ثوری' امام حماد بن سلمہ' امام مسعر بن کدام' امام ابو حنیفہ اور سلیمان بن مہران کے استاد ہیں۔ امام مسلم' ابو داؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے اپنی کتابوں میں ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حافظ عسقلانی اور حافظ ذہبی دونوں اس پر متفق ہیں۔ کہ حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

ابو الشیخ نے تاریخ اصفہان میں لکھا ہے کہ ایک روز ان کو ان کے استاد ابراہیم نخعی نے ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے روانہ کیا۔ زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی ادھر ان کے والد کہیں سے گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ صورت حال دیکھ کر حماد کو ڈانٹا اور زنبیل لے کے پھینک دی۔ جب ابراہیم نخعی کی وفات ہوگئی تو حدیث کے طالب علم ان کے گھر آئے دستک دی ان کے والد چراغ لے کر باہر آئے دیکھ کر کہا کہ ہمیں آپ کی نہیں بلکہ آپ کے صاحبزادے کی ضرورت ہے یہ شرمندہ ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا کہ جاؤ باہر جاؤ۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کے صدق میں ملا ہے۔ (۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۳۳ (۲) تقدمہ نصب الرایہ

علامہ خوارزمی نے امام بخاری کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ

لقد سالنی هذا یعنی حماد مثل ما سالنی جمیع لناس (۱)

حافظ عبداللہ بن وہب دینوری کہتے ہیں کہ

ایک بار حافظ ابوزرعہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ایک خراسانی ان کے سامنے موضوع حدیثیں بیان کر رہا ہے اور یہ ان روایات کو غلط بتا رہے ہیں۔ وہ شخص ان کی باتوں پر ہنس رہا ہے کہ واہ کیا خوب؟ جو روایت تم کو یاد نہیں اس کو غلط بتا رہے ہو اس پر میں نے اس شخص سے پوچھا **اسد ابو حنیفة عن حماد** ؟ بتاؤ امام ابوحنیفہ کی بواسطہ حماد کیا روایات ہیں؟ بیچارہ چپ ہو گیا پھر میں نے حافظ ابوزرعہ سے دریافت کیا **ماتحفظ لا بی حنیفة** ؟ آپ کو حماد کی سند سے امام ابوحنیفہ کی کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ آپ پر حافظ ابوزرعہ نے حدیثوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (۲)

یاد رہے کہ امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام اعظمؒ چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی تھیں۔ چنانچہ امام حافظ زکریا نیشاپوری بسند متصل امام موصوف سے ناقل ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی کل روایات چار ہزار تھیں ان میں دو ہزار حماد کی اور دو ہزار تمام اساتذہ کی ہیں۔ (۳)

نقد و رجال کے امام حضرت شعبہ امام حماد کی صداقت کا لوہا مانتے ہیں اور سید الحفاظ یحییٰ بن معین ان کی ثقاہت کو سراہتے ہیں۔ امام ابوعبداللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں جہاں ان ائمہ حدیث کا تذکرہ کیا ہے جن کی علم حدیث میں امامت مسلم ہے اور جن کی ثقاہت پر فن حدیث پر اعتماد ہے۔ ائمہ حدیث کا اس فہرست میں حماد بن ابی سلیمان کا بھی ان میں تذکرہ کیا ہے۔ (۴)

---

(۱) جامع المسانید ج ۲ ص ۵۲۵ — (۲) تذکرۃ الحفاظ ص ۲۵۸

(۳) مناقب الموفق ج ۱ ص ۹۶ — (۴) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۱۷

حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ارباب فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حماد کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا تذکرہ باوجود عدالت، صداقت اور ثقاہت کے اس معذرت کے ساتھ کیا ہے۔

لولا ذکر ابن عدی فی الکامل لما اوردتہٗ (۱)

''اگر ابن عدی ذکر نہ کرتا تو میں میزان میں ان کا ترجمہ نہ لکھتا۔''

دراصل بتانا یہ چاہتے ہیں کہ امام حماد اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس قدر اونچے مقام پر ہیں کہ ان کا ذکر میزان میں نہ آنا چاہیے۔ کیونکہ یہ امام ذہبی کی اس پالیسی کے خلاف ہے جس کا تذکرہ خود امام ذہبی نے کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔

میزان الاعتدال میں ائمہ متبوعین کا ذکر:

میرا اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو امام موصوف نے میزان کے مقدمہ میں کیا ہے کہ

لا اذکر فی کتابی من الائمۃ المتبوعین فی الفروع احدا لجلالتھم فی الاسلام وعظمتھم فی النفوس مثل ابی حنیفۃ والشافعی۔(۲)

''میں اپنی کتاب میں ان اماموں کا ذکر نہ کروں گا جن کی فروع میں تقلید کی جاتی ہے کیونکہ اسلام میں ان کی جلالۃ اور لوگوں میں ان کی عظمت موجود ہے جیسے ابو حنیفہ اور شافعی۔''

ظاہر ہے کہ امام حماد صرف امام نہیں بلکہ امام الائمہ ہیں پھر ان کا میزان میں تذکرہ اس وعدے کی خلاف ورزی ہے۔ امام ذہبی نے اسی سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے میزان میں ان کا تذکرہ ان کی ثقاہت، صداقت اور عدالت کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے نہیں کی بلکہ صرف اس لیے کیا ہے کہ امام عدی نے الکامل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱) میزان الاعتدال۔ ج ۱ ص ۲۷۹ (۲) میزان الاعتدال: ج ۱ ص ۲۷۹

تاریخ کا المناک حادثہ:

شاید آپ خلش محسوس کریں کہ خیر امام حماد کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ان جیسوں کا میزان میں ذکر نہ ہوگا خود ان کا بھی میزان میں ذکر ہے اور ذکر بھی کوئی طویل نہیں بلکہ صرف ایک سطری۔

یہ تاریخ صحافت کا بڑا ہی المناک اور دردناک حادثہ ہے دراصل میزان الاعتدال اولاً جب ہندوستان میں چھپی تو امام صاحب کا تذکرہ تقطیع نون کتاب کے اندر نہیں بلکہ کتاب کے حاشیہ پر پریس والوں نے چھاپ دیا اور خود پریس والوں نے ایسا کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ میزان کے کئی نسخوں میں سے ایک کے حاشیہ پر چونکہ ایسا ہی درج تھا اس لیے اس کو اصل کتاب میں جگہ نہیں دی گئی اس کے بعد مصر کے پریس سے جو میزان چھپ کر آئی تو یار لوگوں نے کتاب کے اندر داخل کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میزان میں امام اعظمؒ کا کوئی ذکر نہ تھا غالباً کسی نے مطالعہ میں اپنی یادداشت حاشیہ میں درج کر دی تھی اور بعد کو مطابع والوں نے اسے اصل کتاب ہی میں داخل کر دیا۔

مولانا عبدالحی صاحب غیث الغمام میں فرماتے ہیں کہ میزان کے جن نسخوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان میں اس عبارت کا نام نہیں ہے اور نہ ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حافظ عراقی شرح الفیہ میں فرماتے ہیں کہ ابن عدی نے کامل میں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا ہے جن پر کسی نہ کسی درجے کلام ہے چاہے وہ ثقہ ہی ہوں لیکن امام ذہبی نے میزان اس التزام کے ساتھ لکھی ہے کہ اس میں کسی صحابی اور ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کا ذکر نہ ہوگا۔ حافظ سخاوی نے شرح الفیہ میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ امام ذہبی نے ائمہ متبوعین کے ذکر نہ کرنے کا التزام کیا ہے اور حافظ سیوطی نے بھی تدریب الراوی میں میزان کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ ان اکابر کی یہ تصریحات کھلے بندوں کہہ رہی ہے کہ میزان میں امام اعظمؒ کا ترجمہ نہیں ہے۔ مشہور محدث علامہ محمد بن اسمٰعیل الیمانی توضیح الافکار میں رقمطراز ہیں کہ امام ذہبی نے میزان میں امام اعظمؒ کا ترجمہ نہیں لکھا ہے لیکن امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لسان المیزان میں امام

اعظمؒ کا کوئی ترجمہ نہیں لکھا حالانکہ لسان المیزان اااعتدال کا چربہ ہے۔ یہ اس بات کی صریح شہادت ہے کہ میزان میں امام اعظمؒ کا ترجمہ نہ تھا۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ بتا یہ رہا تھا کہ امام حماد کی ذات گرامی اپنی ثقاہت کی وجہ سے بہت اونچے مقام پر ہے۔ قلم کو روک نا چاہتا ہوں مگر کیا کروں رکتا نہیں ہے۔ بزرگان دین کی عدالت وثقاہت تو اپنی جگہ ہے افسوس تو اس پر آتا ہے کہ لوگ اکابر کے منہ سے نکلی ہوئی بات کا منشا خود نہیں سمجھتے اور بات کا خواہ مخواہ بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک بار امام حماد حج کر کے کوفہ واپس آئے لوگ ملاقات کی خاطر حاضر ہوئے آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے کوفہ والو! تم اللہ سبحانہ کا شکر ادا کرو میں عطاء بن ابی رباح' طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں لیکن تمہارے بچے اور بچوں کے بچے بھی علم میں ان سے آگے ہیں اس میں کون سی توہین کی بات ہے یہ تو کوفہ میں علم کی بہتات پر تحدیث نعمت ہے۔

امام حماد پر ارجاء کی تہمت:

ظلم بالائے ظلم یہ کہ ان کے متعلق رجال کی کتابوں میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

تکلم فیہ للارجاء۔

حالانکہ امام حماد کا دامن اس تہمت سے بالکل پاک ہے صرف امام حماد نہیں بلکہ ان ہی طرح بخاری اور مسلم کے کتنے ہی راویان حدیث ہیں جن کی ثقاہت اور عدالت مسلمہ ہے مگر ان پر صرف فکری اختلاف کی وجہ سے ارجاء کی تہمت جڑ دی ہے۔ خدا بھلا کرے الشہرستانی کا کہ انہوں نے رجال المرجئہ کے عنوان سے مختلف اکابر مثلاً الحسن بن محمد' سعید بن جبیر' طلق بن حبیب' محارب بن دثار' حماد بن ابی سلیمان' امام اعظمؒ' قاضی ابو یوسف' امام محمد وغیرہ وغیرہ کا نام لکھ کر یہ بات لکھ دی ہے کہ

ھؤلاء کلھم ائمۃ الحدیث(۱)

حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں جہاں بخاری ومسلم کے ان راویوں کی فہرست

(۱) الملل والنحل: ج ۱ ص ۲۳۴

دی ہے جن کو کہنے والے مرجیہ کہہ گئے ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی طرف جس ارجاء کی نسبت کی گئی ہے اس سے مقصود مرجیہ کا وہ ارجاء نہیں ہے جو اہل السنۃ کی اپوزیشن ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے۔

تاخیر القول فی الحکم علیٰ مرتکب الکبائر (۱)

اگر ارجاء یہی ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہے لیکن اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ بخش دے خواہ سزا دے۔ تو سب اہل السنۃ ہی ارجاء کے شکار ہیں سب یہی کہتے ہیں۔

مرجی امرہ' و مفوض مصیرہ' الی ربہ ان شاء عذبہ' وان شاء عفاعنہ' (۲)

امام اعظمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سب کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجوزی نے مناقب میں امام احمدؒ کی یہی رائے لکھی ہے کہ

اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا چاہے اس نے کبائر ہی کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو (۳)

خود امام بخاری نے صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے کہ

المعاصی من امر الجاھلیۃ لایکفر صاحبھا بارتکابھا الا بالشرک (۴)

یہی بتایا ہے کہ شرک کے سوا گناہ خواہ کیسا ہی سنگین ہو مگر گنہگار کافر نہیں ہوتا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ حافظ بدرالدین عینی نے امام بخاری کے دعویٰ اور دلائل کی توضیح کے بعد لکھا ہے۔

ھذا ھو مذھب اھل السنۃ والجماعۃ (۵)

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرجیہ جو کہتے ہیں کہ گناہ سے کچھ نہیں ہوتا اور خوارج جو کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کی رائے میں مرتکب کبیرہ کی ہرگز بخشش نہ

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۲۱۹ (۲) تدریب الراوی: ص ۱۱۲

(۳) مناقب ابن الجوزی: ج ۱ ص ۸۰ (۴) صحیح بخاری: ج ۱ ص ۷ (۵) عمدۃ القاری: ج ۱ ص ۸۰

ہوگی ان میں سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہل السنۃ نے اختیار کی ہے اور جس کی قانونی تعبیر یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کا جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار ہوسکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔

اگر اسی کا نام ارجاء ہے جو آپ حافظ سیوطی کی زبانی سن آئے ہیں تو پھر مرجئہ ہونے کی پھبتی کیوں ہے؟ اور زبان وقلم کے یہ سارے ہنگامے کیوں ہیں؟ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ غصہ صرف اس پہ ہے کہ ایمان کے بارے میں قانونی تعبیر فقہاء محدثین نے الگ کیوں اختیار کی ہے۔ اور فقہاء نے اس موضوع پر وہی زبان کیوں اختیار کی جو بعد میں محدثین کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے فقہا کو مرجئہ کہا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کہا ہے جن سے مرجئہ کی موافقت کی بو آتی ہے۔ (۱)

یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے استاد فقہ ہونے کے ساتھ استاد حدیث بھی ہیں۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار میں امام حماد کے حوالہ سے امام ابوحنیفہؒ کی روایات موجود ہیں۔

عن ابی یوسف عن ابی حنیفۃ عن حمادٍ عن ابراھیم انہ قال لم یجتمع اصحاب محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم علی شئی کما اجتمعوا علی التنویر بالفجر والتکبیر بالمغرب ولم یثابروا علیٰ شئی من التطوع کماثابروا علیٰ اربع قبل الظھر ورکعتی الفجر (۲)

"ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کسی کام پر اتنا ایکا نہیں ہوا جتنا صبح کی نماز کو چاندنا کر کے پڑھنے اور مغرب کی نماز کو سویرے پڑھنے پر ہوا ہے اور کسی بھی نفل پر اتنی ہیشگی نہیں کی جتنی ظہر سے پہلے چار سنتوں اور صبح کی نماز سے پہلے دو سنتوں پر کی ہے۔"

(۱) کتاب الایمان: ص ۱۶۱ (۲) کتاب الآثار ص ۵۶

امام محمدؒ نے مؤطا میں امام مالکؒ کے ساتھ کچھ امام اعظمؒ کی روایات بھی درج کی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

محمد اخبر نا ابو حنیفة عن حمادٍ عن ابراهیم ان ابن مسعودٍ سئل عن الوضوءِ من مس الذکرِ فقال ان کان فاقطعه'(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا گیا کہ پیشاب گاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو کا حکم کیا ہے؟ فرمایا اگر ناپاک ہے تو کاٹ دو۔"

امام محمد نے کتاب الاثار میں بھی بحوالہ امام اعظم از حماد بے شمار روایات درج کی ہیں۔

محمد عن ابی حنیفة عن حمادٍ عن ابراهیم قال ثلاثة یوجر فیهن المیت بعد موته ولد یدعوله' بعد موته فهو یوجر فی دعائه ورجل علم علماً یعمل به و یعلمه' الناس فهو یوجر علیٰ ما عمل و علم ورجل ترک صدقة.

---

(۱) مؤطا امام محمد: ص ۵۴ نوٹ:۔ آج مؤطا امام مالک کے دو ہی نسخے متداول ہیں ایک امام یحییٰ بن یحییٰ لیثی کا۔ اور دوسرا امام محمد کا جن کے متعلق امام ذہبی نے لکھا ہے کان من بحور العلم و الفقه قویاً فی مالک۔ (میزان الاعتدال) علم اور فقہ کے سمندر تھے اور امام مالک سے آمدہ بیانات میں بے حد قابل اعتماد ہیں۔ امام مالک کے ساتھ تلامذہ میں امام محمد کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے امام مالک کی ساری حدیثوں کو امام مالک کی زبان سے سنا ہے ورنہ عام طور پر امام مالک کے شاگرد پڑھتے اور وہ سنتے یہی وجہ ہے کہ امام محمد کو امام مالک سے مؤطا سننے میں پورے تین سال لگے نیز جتنے لوگوں نے امام مالک سے مؤطا کی روایت کی ہے ان میں کوئی بھی جلالت شان میں امام محمد کا ہمسر نہیں ہے بلاشبہ امام شافعی مؤطا کے رواۃ میں داخل ہیں لیکن قطع نظر اس بات کے کہ ان سے مؤطا کا کوئی نسخہ مروی نہیں ہے ان کو امام محمد سے وہی نسبت ہے جو امام مالک سے ہے کیونکہ امام شافعی نے دونوں اماموں سے یکساں استفادہ کیا ہے اور گو انہوں نے امام محمد سے حدیث کا علم بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے۔ اور الشافعی فاضح بمحمد بن الحسن فی الحدیث: ص ۹۵) ﴿باقی صفحہ ۲۷۹ پر﴾

تین چیزوں سے مرنے کے بعد مرنے والا فائدہ اٹھاتا ہے۔ بیٹا جو مرنے کے بعد اس کے لیے دعا مانگے' عالم جس نے علم حاصل کیا عمل کیا اور لوگوں کو تعلیم دی لوگوں کے علم و عمل کا میت کو بھی فائدہ ہوتا ہے تیسرے وہ زمین جسے خیراتی کاموں کے لیے صدقہ' بنا کر چھوڑ دیا گیا۔

ایسے ہی حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں بحوالہ حماد امام اعظم کی بہت سی روایات درج کی ہیں۔

ابو حنيفة عن حمادٍ عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله بن مسعودٍ قال لم يقنت رسول الله صلى الله عليه وسلم في الفجر الا شهرًا حارب حيا من المشركين فقنت يدعو (۱)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں صرف ایک ماہ قنوت کی جبکہ مشرکین کے ایک قبیلے سے جنگ تھی۔''

امام اعظمؒ ہی کا جو مسند بروایت موجود ہے اس میں حضرت حماد کے حوالہ سے روایات موجود ہیں۔

ابو حنيفة عن حمادٍ عن ابراهيم عن علقمة والاسود عن ابن مسعود ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان لا يرفع يديه الا عند افتتاح الصلوٰة ولا يعود لشيئ من ذالك (۲)

﴿بقیہ صفحہ ۲۷۸ کا﴾ لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ فقہ میں وہ خاص طور پر امام محمد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں امام شافعی سے ناقل ہیں۔ امن الناس علی فی الفقه محمد بن الحسن اور حافظ سمعانی نے بویطی کی زبانی امام شافعی کے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اعانني الله برجلين بابن عيينة في الحديث وبمحمد في الفقه۔ (بلوغ الامانی: ص ۲۳) (ص ۲ کتاب الآثار امام محمد: ص ۱۸)

(۱) مسند خوارزمی: ج۱ ص ۳۱۱　(۲) شرح مسند ملا علی قاری: ص ۸۹　نوٹ:۔ یہ حدیث ﴿باقی صفحہ ۲۸۰ پر﴾

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

﴿بقیہ صفحہ ۲۷۹﴾ مختلف الفاظ میں دوسرے محدثین ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کی ہے ابو داؤد کی روایت میں اس حدیث کو بیان کرنے والے چھ راوی ہیں۔ عثمان' وکیع' سفیان ثوری' عبدالرحمن اور علقمہ اور اسی سند کے ساتھ یہ حدیث ترمذی میں موجود ہے مگر اس میں ہناد کی جگہ محمود بن غیلان ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو ان رواۃ کے حوالہ سے بیان کیا ہے وکیع' سفیان' عاصم' عبدالرحمن اور علقمہ۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں۔ لم یثبت حدیث ابن مسعود۔ دراصل یہ ایک سنگین مغالطہ ہے حدیثیں دو ہیں اور دونوں ابن مسعود کی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ عبداللہ کہتے ہیں کہ کیا میں تم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز نہ پڑھاؤں۔ عبداللہ نے نماز پڑھائی اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ دونوں میں فرق ہے پہلی حدیث میں حضورؐ کے بارے میں ہے کہ آپ نے نہیں کیا اور دوسری میں آپ کے عمل کا نہیں بلکہ خود عبداللہ کے عمل کا ذکر ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں پہلی مرفوع ہے اور دوسری موقوف ہے کچھ راویوں نے دونوں کو خلط ملط کر دیا تھا عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ روایتی حیثیت سے پہلی بات ثابت نہیں ہے اور ثابت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس اسناد سے پہلی روایت عبداللہ بن المبارک کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ثابت نہ ہونے سے مطلقاً نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف اس اسناد کی صحت کی نفی ہے۔ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے نزدیک کسی حدیث کا ثابت نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اور بھی کسی کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ مشہور محدث یحییٰ القطان اسے صحیح کہتے ہیں حافظ ابن حزم کی رائے میں صحیح ہے اور امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ حدیثیں دونوں طرح آئی ہیں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کی۔ امام اعظمؒ نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی سنت کو اولیٰ اور افضل قرار دیا ہے کیونکہ صحابہ کی زیادہ تعداد اسی پر عمل پیرا تھی اور محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ اذا تنازع الخبران عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نظر الیٰ ما عمل علیہ اصحابہ' (ابوداؤد)

بطور گلے از گلزار چند روایات ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے استاد حدیث ہیں اور استاد بھی ایسے شفیق کہ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے والد بزرگوار نے امام حماد سے ایک مسئلہ دریافت کیا حماد نے جواب دیا۔ امام صاحب نے جواب پر ایک سوال کر دیا بات لمبی ہو گئی۔ حضرت حماد خاموش ہو گئے امام صاحب جب مجلس سے رخصت ہو گئے تو امام حماد نے فرمایا۔

هذا مع فقهه يحيي الليل (١)

''یہ صرف فقیہہ نہیں بلکہ شب زندہ دار بھی ہیں۔''

امام حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک بار میرے والد محترم سفر میں تشریف لے گئے واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں زیادہ کون یاد آیا؟ میرا خیال تھا کہ وہ یہی فرمائیں گے کہ تو! لیکن انہوں نے امام ابوحنیفہ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابوحنیفہ سے ایک لمحہ کے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔ (٢)

ابو اسحاق السبیعی سے تلمذ:

ان کا نام عمرو بن عبداللہ اور کنیت ابو اسحاق ہے حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا استاد لکھا ہے یہ خود علم حدیث میں صحابہ کرام یعنی زید بن ارقم، عبداللہ بن عمرو، عدی بن حاتم طائی اور براء بن عازب کے شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ

حدث عن ثلاثمائة شيخ (٣)

''ان کے تین سو استاد ہیں۔''

ان میں اڑتیس صحابہ کرام ہیں۔ امام ابوداؤد طیالیسی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیں چار شخصوں سے ملی ہے زہری، قتادہ، ابو اسحاق السبیعی اور امام اعمش۔ پھر سب کے بارے میں ایک ایک فن کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے ابو اسحاق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ

اعلمهم بحديث علي وابن مسعود (٤)

---

(١) الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ: ٢٧ (٢) تاریخ بغداد ترجمہ حماد (٣، ٤) تذکرۃ الحفاظ ج ١ ص ١٠٩

انہوں نے قرآن حکیم امام ابو عبدالرحمٰن السلمی سے پڑھا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام اعمش فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ ان کو دیکھتے تو پکار اٹھتے۔

هذا عمرو القاری (۱)

امام ابو عبدالرحمٰن السلمی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی اور ان کے علاوہ کوفہ کے دوسرے علماء جیسے علقمہ، اسود، حارث اور زر بن جیش نے قرآن عزیز عبداللہ بن مسعودؓ سے حاصل کیا ہے۔ (۲)

صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ مدینے جا کر حضرت عمرؓ، حضرت عائشہ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔

۱: اسحاق السبیعی کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ امام ابو اسحاق السبیعی مجھ سے سال یا دو سال بڑے ہیں ان سے امام اعظم نے بہت احادیث روایت کی ہیں۔ چنانچہ کتاب الآثار میں قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

ابو یوسف عن ابی حنیفة عن ابی اسحاق السبیعی عن شریح انه قال اذا مضت اربعة اشهر بانت بالایلاء۔

شریح کہتے ہیں کہ چار ماہ گذرنے پر عورت ایلاء سے بائنہ ہو جائے گی۔ (۳)

حافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں فرماتے ہیں:

ابو حنیفة عن ابی اسحاق السبیعی عن الاسود عن عائشة قالت لم یکن بین اذان بلال و ابن ام مکتوم الا قدرماینزل هذا ویصعد هذا۔

بلال اور ابن ام مکتوم کی اذانوں میں صرف دونوں مؤذنوں کے اترنے اور چڑھنے کا فرق ہوتا تھا۔ (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب۔ ج۹ص۶۶ (۲) منہاج السنۃ: ج۴ص۱۴۲

(۳) کتاب الآثار: ص۸۰ (۴) جامع المسانید: ص۳۰۴

حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنے مسند میں بھی بحوالہ ابواسحاق السبیعی بہت روایات لکھی ہیں۔

ابو حنیفة عن ابی اسحاق السبیعی عن البراء ان النبی صلی الله علیه وسلم کان یعلمنا التشهد کما یعلم السورة من القرآن۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد ایسے ہی سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورت۔(۱)

امام ابواسحاق السبیعی کو حافظ ذہبی نے حفاظ کے چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے۔ امام شعبی، امام اعمش اور امام سفیان ثوری جیسے اجلہ ائمہ حدیث کے شاگرد ہیں۔

الامام الحافظ شیبان سے امام اعظمؒ کا تلمذ:

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔ الامام الحافظ الحجۃ، اصل میں بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر کوفہ میں اقامت فرمائی تھی حکم بن عتیبہ، زیاد بن علاقہ، منصور بن المعتمر، عبدالملک بن عمیر، سماک بن حرب، سلیمان بن مہران اور حسن بصری سے حدیث کی تعلیم پائی ہے۔ سید الحفاظ یحییٰ بن معین سے ان کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا کہ ہر پہلو سے ثقہ ہیں تمام ائمہ نقد و جرح ان کی ثقاہت و صداقت پر متفق ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جن ائمہ فن سے ان کی ثقاہت و صداقت نقل کی ہے ان میں ابوالقاسم البغوی، یعقوب بن شیبہ، ابوحاتم، العجلی، النسائی اور یحییٰ بن حمید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زائدہ بن قدامہ، ابوداؤد طیالسی الحسن بن موسیٰ، عبدالرحمن مہدی علم حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔

حافظ ابن حجرت عسقلانی نے تہذیب میں ان کے شاگردوں کی فہرست میں امام اعظمؒ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور حافظ ذہبی نے امام صاحب کی شاگردی کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

حدث الامام ابو حنیفة عنه(۲)

---

(۱) شرح مسند امام: ص ۱۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ شیبانی

حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی کو ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے پر بڑا ہی ناز تھا منجملہ اور شاگردوں کے مشہور امام المسند علی بن الجعد (۱) جوہری بھی ان کے شاگرد ہیں اور امام بخاری، امام مسلمؒ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان سے کافی روایات لی ہیں اور امام اعظمؒ کے مسانید میں بھی ان کے حوالہ سے احادیث آئی ہیں۔

ابو حنیفة عن شیبان عن یحییٰ عن المهاجر عن ابی هریرة قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صوم الصمت والوصال۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چپ رہنے اور ہمیشہ کے روزے سے منع فرمایا ہے (۲)
یہی روایت بحوالہ عکرمہ الحافظ الحارثی بخاری نے بھی اپنے مسند میں بیان کی ہے۔

---

(۱) علی بن الجعد حدیث کے مشہور امام ہیں امام بخاری اور ابوداؤد کے استاد ہیں اور حدیث میں جیسے ابن ابی ذئب اور شعبہ کے شاگرد ہیں ایسے ہی قاضی ابو یوسف سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے اور قاضی صاحب کے اصحاب میں سے ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالحسن بن الجعد الجوہری ہے ان کی حدیث دانی کا اندازہ کرنا ہو تو مشہور محدثین جزرہ احمد اسحاق بن راہویہ اور یحییٰ بن معین کا یہ اتفاقی فیصلہ پڑھئے۔ امام جزرہ کہتے ہیں کہ ہم چاروں ایک روز ان کے در دولت پر حاضر ہوئے آپ اپنی کتابیں لے آئے اور واپس اندر چلے گئے ہمیں خیال ہوا کہ کھانا لینے گئے ہیں ہمیں ان کی کتابوں میں کوئی غلطی نہیں ملی کھانے سے فراغت کے بعد کتابوں میں درج شدہ ساری احادیث ہمیں زبانی سنادیں۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ امام اعظم جب حدیث پیش کرتے ہیں تو وہ موتی کی طرح آباد ہوتی ہے (ج ۲ ص ۳۰۸) اگرچہ بخاری ابوداؤد اور مسلم سب ہی کو ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حدیث ان سے اس لیے نہیں لی ہے کہ یہ بزرگ ان لوگوں میں سے تھے جو خلق قرآن کے مسئلہ میں متشددین میں سے نہ تھے امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ **من قال القرآن مخلوق لم اعنفهٗ** اسی بنا پر ان پر بدعتی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔ (۲) کتاب الآثار

الحکم بن عتیبہ سے امام اعظمؒ کا تلمذ:

حافظ ذہبی نے ان کو شیخ الکوفہ لکھا ہے۔ قاضی شریح، ابو وائل، ابراہیم نخعی، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور سعید بن جبیر سے علم حدیث پڑھا ہے۔ خلاصہ میں ان کو احد الاعلام بتایا ہے۔ اجامام اوزاعی، امام مسعر بن کدام، حمزۃ الزیات، امام شعبہ اور ابوعوانہ نے خلاصہ میں امام اعظمؒ کو ان کا شاگرد قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں سفیان بن عیینہ کا تاثر یہ تھا کہ حکم اور حماد جیسا کوئی نہیں ہے۔ ائمہ ارباب حدیث نے اپنی کتابوں میں ان کی سند سے حدیثیں لی ہیں۔ امام اعظمؒ نے بھی ان کے حوالہ سے ایک سے زیادہ روایات لی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سے احادیث میں حکم سے زیادہ پائیدار کوئی نہیں ہے امام ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ حکم یہ روایت درج کی ہے۔

عن ابی حنیفة عن الحکم عن القاسم بن مخیمرة عن شریح انه' قال سالت عائشة عن المسح فقال سل علیاً فانه' کان یسافر مع النبی صلی الله علیه وسلم فسالت علیاً فقال امسح۔

شریح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے موزوں پر مسح کے بارے میں پوچھا فرمایا کہ حضرت علیؓ سے پوچھو وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہوئے تھے میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا فرمایا کہ مسح کرلو۔(۱)

الامام الحافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں ایک سے زیادہ حدیثیں لائے ہیں۔

ابو حنیفة عن الحکم بن عتیبه عن القاسم عن شریح عن علی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه' قال یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو قرابت سے حرام ہیں۔(۲)

(۱،۲) کتاب الآثار

کوفہ کے سب اساتذہ کا استقصاء منظور نہیں ہے صرف بطور گلے از گلزار چند کا تعارف ہدیہ ناظرین ہے ان کے علاوہ کوفہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان میں سے خاص خاص اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اسماعیل بن خالد ۱۴۶ھ بیان بن بشر، جامع بن ابی راشد ۱۳۱ھ جامع بن شداد المحاربی ۱۱۸ھ الحسن بن سعد بن معبد ــــ ھ زید بن ابی انیسہ ۱۲۴ھ زیاد بن علاقہ ۱۳۵ھ زیاد بن حدیر الاسدی ــــ ھ ابوعبدالرحمن سعید بن مسروق ۱۲۸ھ سلمۃ بن کہیل ۱۲۱ھ سلیمان بن ابی سلیمان ۱۴۱ھ سماک بن حرب ۱۲۳ھ عبدالملک بن عمیر ۱۳۶ھ ابوالحارث علقمہ بن مرثد ۱۲۰ھ ابوروق عطیہ بن الحارث الہمدانی ــــ ھ عبدالرحمن بن عبداللہ ۱۶۰ھ ابوعبداللہ عون بن عبداللہ ۱۲۰ھ عتبہ بن عبداللہ بن عتبہ ــــ ھ قاسم بن عبدالرحمن ــــ ھ منصور بن المعتمر ــــ ھ منصور بن دینار ــــ ھ یزید بن عبدالرحمن ابوداؤد ــــ ھ خالد بن علقمہ ــــ ھ زکریا بن ابی زائدہ۔(۱)

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان سب کا ترجمہ لکھا ہے۔ مسانید امام اعظم میں ان سب سے روایات موجود ہیں۔

امام اعظم کا طالب علم کے لیے سفر:

اس میں شک نہیں ہے کہ امام اعظم کے اپنے گھر میں اتنا ذخیرہ وافر تھا کہ اگر صرف اسی جگہ کا علم حاصل کرتے تو علم میں کمی نہ آتی۔ امام یحییٰ بن معین جو سید الحفاظ اور ناقد فن کہلاتے ہیں کوفہ کے مشہور امام مسعر بن کدام کے متعلق فرماتے ہیں کہ۔

لم یرحل مسعر فی حدیث قط(۲)

لیکن اس کے باوجود صرف کوفہ ہی رہ کر علم حدیث میں ان کی معلومات کا حال یہ تھا کہ امام شعبہ جیسا امام حدیث ان کو علم حدیث کی ترازو کہتا تھا اور محمد بن بشیر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دس کم ایک ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔(۳)

صحابہ و تابعین اگرچہ تمام اسلامی شہروں میں گئے ہیں مگر روایت و حدیث کے باب میں

---

(۱) تہذیب التہذیب تذکرۃ الحفاظ (۲) تذکرۃ الحفاظ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۸

جو مرکزیت کوفہ اور مکہ و مدینہ کو حاصل تھی وہ دوسرے شہروں کو نہ تھی۔ حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ پوچھا آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کے منہ سے نکل گیا کہ شام والے تو اس مسئلہ میں کچھ اور ہی بتاتے ہیں اور آپ کے خلاف ہیں آپ نے فرمایا **متی کان ھذا الشان فی الشام** ؟ شام والوں کو یہ مقام کب سے ملا ہے؟ **انما ھذا الشان وقف علی اھل المدینة و اھل کوفة** یہ شان تو صرف کوفہ اور مدینہ کی ہے۔

شاید اسی لیے امام مالکؒ نے بھی کبھی طلب علم کے لیے سفر نہیں کیا کیونکہ مدینہ دارالعلم تھا۔ اس کے باوجود امام اعظمؒ نے حدیث کی خاطر رخت سفر باندھا تاکہ آپ کے خزانہ علمی میں صرف مقامی نہیں بلکہ بیرونی معلومات کا بھی سرمایہ ہو۔

علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت:

علم دین حاصل کرنے کے لیے جو سفر یا جاتا ہے اسے رحلہ کہتے ہیں قرآن وسنت میں اس مبارک سفر کی بہت زیادہ ترغیب ہے۔

ارشاد ہے:

فلولا نفر من کل فرقة منھم طائفة لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم۔

''پھر کیوں نہ نکلیں ان کی ہر جماعت میں سے چند لوگ تاکہ تفقہ پیدا کریں دین میں اور تاکہ لوگوں کو بیدار کریں جب پلٹ کر جائیں۔''(۱)

---

(۱) یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس میں صرف یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ علم دین حاصل کرنا اچھی بات ہے اور اس کے لیے سفر کی محنتیں برداشت کرنا ایک امر مستحب ہے کیونکہ یہ تو اس آیت کا ظاہر ہے چنانچہ ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں: **انما یقتضی ظاھر ھذہ الآیة الحث علی طلب العلم والندب الیه واستحباب الرحلة** (ج۱ص۴۲۱) یعنی آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب گاری میں سرشاری ہونی چاہیے اور اس کی خاطر سفر مستحب ہے ﴿باقی صفحہ ۲۸۸ پر﴾

قرآن کی اس آیت میں جس مقصد کی خاطر رخت سفر تیار کرنے اور گھر سے بے گھر ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین میں تفقہ ہے اسی کو علم الشریعہ علم الفقہ اور علم قانون کہتے ہیں۔ علوم شریعہ میں علم فقہ کا مقام بالکل انتہائی اور آخری ہے۔ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ آیت فقاہت کی تلاش کے لیے ہے قرآن میں جس موقعہ پر یہ آیت آئی ہے وہاں جہاد کا تذکرہ ہے جہاد اور طلب فقہ میں مناسبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ طالب فقہ اور مجاہد دونوں کا نکلنا اللہ کی راہ میں نکلنا ہے اور دونوں کا مقصد اللہ کے دین کی برتری ہے چنانچہ ترمذی میں ارشاد گرامی ہے۔

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع۔
''جو شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے۔''

ﮦ (باقی ۲۸۷ ﮦ) اور ساتھ ہی اس آیت کے منطوق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں دین سیکھنے کا کام ضرور ہونا چاہیے فی هذه الآیة دلیل علی طلب العلم (ج ۱ ص ۱۸۹) لیکن دین سیکھنے کا یہ بوجوب پر نہیں ہے۔ ان الخروج فی طلب العلم لا یلزم الاعیان۔ طلب علم کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا سب کے ذمہ نہیں ہے بلکہ کچھ کے ذمہ ہے۔ سیکھنے کے بعد جو سیکھ کر آئیں ان کا کام اس آیت میں لوگوں کو بیدار کرنا (انذار) بتایا ہے یعنی پوری جماعت کی پیش پا افتادہ شہری زندگی میں رہنمائی کا فرض انجام دیں اور جن کی دینی زندگی میں رہنمائی کریں وہ ان کی طاعت کریں۔ الانذار یقتضی فعل المامور به والالم یکن انذارا۔ انذار حکم کی تعمیل چاہتا ہے ورنہ انذار ہی نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۹۹) اسی آیت سے دین آشناؤں کے لیے صدر اول ہی میں فقہاء کی تعبیر بیدار ہوگئی تھی امام ترمذی نے لکھا ہے کہ الفقهاء اعلم بمعانی الاحادیث۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ طائفہ لغت میں ایک شخص کو بھی کہتے ہیں ابوبکر العربی نے شیخ ابوالحسن اور قاضی ابوبکر کی بھی یہی رائے لکھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو آیت کے مدلول سے نہ صرف تقلید شخصی کا جواز بلکہ وجوب بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حدیث خبر واحد ہونے کی صورت میں دین میں حجت اور واجب العمل ہے۔ الجصاص کہتے ہیں۔ فیه دلالة علی لزوم خبر الواحد۔ (ج ۳ ص ۱۹۸)

حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق:

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی زبان میں اور صحابہ کرام کے محاورات میں علم نام ہی فقہ کا ہے یعنی صدر اول میں علم کے نام پر جو چیز معروف تھی وہ روایت حدیث نہیں بلکہ فقاہت تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صحابہ و تابعین کا علمی تعارف زیادہ تر فقاہت ہی سے کرایا ہے چنانچہ حضرت امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ **من نبلاء الفقهاء** (ج اص ۱۲) حضرت معاذ بن جبلؓ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں **من نجباء الصحابة وفقهائهم**۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ترجمہ میں ہے **اقرأ اهل البصرة وافقههم**۔ حضرت ابوالدرداءؓ کے متعلق لکھا ہے **مقری اهل دمشق و فقيههم**۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں تصریح ہے۔ **من اكبر فقهاء الصحابة**۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے۔ **الفقيه المدني**۔ حضرت جابرؓ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ **الفقيه المفتي**۔ اس طبقہ اولیٰ میں سارے صحابہ میں دو کو مستثنیٰ کرکے کسی ایک کا بھی تعارف حدیث و روایت کے ذریعے نہیں کرایا۔ دوسرے میری مراد حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ **روی حديثاً كثيراً**۔ ورنہ کسی بھی صحابی کا علمی چہرہ پیش کرتے ہوئے حدیث کا نام تک نہیں لیا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فقہ علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے۔

فقہ اور حدیث میں باہمی ربط کیا ہے؟ یہ بات شاہ ولی اللہ محدث کی زبانی سنیئے۔ شاہ صاحب علم الحدیث کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں

> علم الحدیث کے کچھ طبقات اور اس میں فن کاروں کے کچھ مراتب ہیں علم حدیث کے دو درجے ہیں ایک درجہ چھلکے اور سیپی کا ہے اور دوسرا درجہ مغز اور موتی کا ہے علماء نے دونوں کی خدمت کی ہے علم حدیث میں چھلکے اور سیپی کے درجے کی چیز حدیثوں کو صحت و ضعف' غرابت اور شہرت کی حد تک جاننا ہے یہ خدمت محدثین نے سر انجام دی ہے علم حدیث ہی کا ایک فن یہ بھی ہے کہ اس کے معانی شرعیہ کو سمجھا جائے اس سے احکام جزائیہ مستنبط کیے جائیں عبارت' دلالت' اشارہ و مفہوم کی بنا پر منصوص حکم پر غیر منصوص کو قیاس کیا جائے منسوخ و محکم' مرجوح و مبرم کا پتہ لگایا

جائے حدیث کا یہ فن موتی اور مغز کی حیثیت رکھتا ہے اس فن کی خدمت کرنے والے فقہاء اور مجتہدین ہیں۔(۱)

علامہ خطابی نے حدیث و فقہ میں اس سے بھی زیادہ لطیف ربط بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ حدیث و فقہ میں باہم وہی تعلق ہے جو مکان کی دیواروں اور اس کی بنیاد میں ہوا ہے فقہ حدیث کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے۔ لکھتے ہیں

حدیث کی حیثیت مکان کی اساس و بنیاد کی ہے اور فقہ اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے جو عمارت بغیر بنیاد کے بنائی جائے اس میں استحکام نہیں ہوتا اور صرف بنیادیں بغیر عمارت کے خراب اور چٹیل میدان ہوتا ہے۔(۲)

ابوبکر الحازمی نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

احادیث میں ایک دوسرے کو باہمی ترجیح دینا یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ ان کا پیش نہاد احادیث میں احکام کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور اس موضوع پر ان کی جولا نگاہ کی وسعتیں اور پنہائیاں بے حد ہیں۔(۳)

الغرض اس آیت میں علم کی خاطر رخت سفر باندھنے کا حکم ہے اور اس کا جیسا مجتہد اور فقیہ مخاطب ہے ایسا ہی محدث بھی ہے کیونکہ قرآن و حدیث ہی فقہ کا سرچشمہ اور مرکز ہیں۔(۴)

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ: ج ا ص ۲　(۲) معالم السنن۔ ج ا ص ۵　(۳) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۲۷

(۴) لیکن یاد رہے کہ حدیث اور روایت حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسے قرآن اور روایت قرآن الگ الگ ہیں فقہ کی بنیاد قرآن ہے نہ کہ روایت قرآن۔ ایسے ہی اساس و بنیاد کی حیثیت میں فقہ کا مدار مرکز حدیث ہے نہ کہ روایت حدیث یہی مطلب ہے۔ امام ابن الماجشون کے اس بیان کا جو حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں عبدالملک بن حبیب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ فقہ میں وہ شخص امام نہیں ہوسکتا جو علم قرآن اور حدیث و آثار کے متون نہ جانے اور ان کے معانی پر قابو نہ پائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے مختلف طرق چند در چند سندیں محفوظ رکھنا روایت و اسناد ہے۔ اور زمانہ فتن میں ضرورت کے تحت رونما ہوئی ہے حدیث پہلے سے بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہے۔

قرآن میں میں طلب علم کی خاطر حضرت موسیٰ کے سفر کا تذکرہ ہے چنانچہ امام بخاری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر علمی کے لیے اپنی صحیح میں ایک مستقل عنوان قائم کیا اور عنوان کی بنیاد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست پر رکھی ہے جو اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں نقل کی ہے۔

هل اتبعك على ان تعلمن مما علمت رشدا۔(۱)

''کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ۔''

صرف اس باب پر امام بخاری نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد امام صاحب نے ایک اور باب الخروج فی طلب العلم کے عنوان سے قائم کیا ہے اور دونوں میں ایک حدیث یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی واقعہ کہ آپ نے طلب علم کے لیے مجمع البحرین کا سفر کیا نقل کیا ہے اور اس دو بابوں کے بعد پھر اغتباط در علم و حکمت کا عنوان لائے ہیں گویا ان دونوں عنوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر علمی کا تذکرہ چھیڑ کر امام بخاری یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ طلب علم کی راہ میں کسی حال میں کسی مشقت سے منہ نہ پھیرنا چاہیے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سیادت و نبوت کے مقام اعلیٰ پر پہنچنے کے باوجود بھی طلب علم کے لیے سفر کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

لان موسى لم يمنعهٗ بلوغهٗ من السيادة المحل الاعلىٰ من طلب العلم وركوب البحر والبر لاجله(۲)

''حضرت موسیٰ کا امامت کے بزرگ ترین مقام پر پہنچنا طلب علم اور اس کی خاطر بحری و بری سفر سے مانع نہیں ہوا ہے۔''

امام مسلم نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

---

(۱) پ ۱۵ سورۂ کہف　(۲) فتح الباری ج ۱ ص ۹۷

من سلک طریقاً یلتمس فیه علماً سهل الله به طریقاً الی الجنة(۱)

ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع۔

''جو بھی طلب علم کے لیے نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے۔''

ابوداؤد میں کثیر بن قیس کی زبانی یہ واقعہ آیا ہے۔

کثیر بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص آیا اور بولا کہ اے ابوالدرداء! میں آپ کے پاس مدینة الرسول سے آیا ہوں اور آیا بھی صرف اس لیے ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان کرتے ہیں میرے آنے کا مقصد صرف یہ ارشاد گرامی سننا ہے اور کوئی ضرورت نہیں ہے ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کی خاطر راہ چل کر آئے اللہ پاک اس کو جنت

---

(۱) حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ تلاش علم کی خاطر چلنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الواقع چلے اور علمی مجلسوں میں شرکت کرے اور دوسرے یہ کہ وہ راہ اختیار کرے جو حصول کا ذریعہ ہو مثلاً یاد کرے باہم مدارسہ کرے مذاکرہ اور مطالعہ میں مشغول رہے لکھے اور سمجھے اور اس کے علاوہ جو بھی علم کے حصول کا طریق ہو اسے اپنائے پہلے چلنے کو حقیقی اور دوسرے کو معنوی کہتے ہیں ارشاد نبوت میں دونوں داخل ہیں (جامع العلوم والحکم ص ۲۹۹) اور یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ پاک اس کی برکت سے جنت کا راستہ آسان فرمادے گا۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ طلب علم میں اگر رضائے الٰہی مقصود ہوگی تو اللہ پاک طالب علم کے لیے علم سے انتفاع اور اس پر عمل آسان فرمائے گا اور یہ بھی اس کے مدلول میں داخل ہے کہ اس کی برکت سے دوسرے علوم بھی آسان ہو جائیں گے اور یہ علوم بھی جنت کا ذریعہ ہوں گے قرآن عزیز میں اس کی شہادت ہے۔ والذین اهتدوا زادهم هدی وآتاهم تقواهم۔ (جامع العلوم والحکم ۳۰۰)

کے راستہ پر چلائے گا اور اللہ کے فرشتے طالب علم کی خاطر اپنے بازو بچھاتے ہیں اور آسمان و زمین والے تا آنکہ سمندر کی گہرائی میں مچھلیاں اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہیں عالم عابد پر ایسی ہی برتری رکھتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند عام ستاروں پر، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں انبیاء نے میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑے ہیں بلکہ انبیاء کی میراث تو علم ہے جو اسے لیتا ہے خوب لیتا ہے۔(۱)

امام بخاری نے اپنی مشہور کتاب الادب المفرد میں امام احمد نے اپنے مسند میں اور حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بحوالہ عبداللہ بن محمد بن عقیل حضرت جابر بن عبداللہ کا طلب علم کے لیے سفر اختیار کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

مجھے ایک صاحب کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے میں نے فوراً اونٹ خریدا اس پر کجاوہ کسا اور ان صاحب کی طرف ایک ماہ کا سفر اختیار کر کے سیدھا ملک شام پہنچا یہ صاحب عبداللہ بن انیس تھے میں نے ان کے دربان سے کہا کہ جا کر کہو جابر دروازے پر کھڑا ہے انہوں نے سنتے ہی پوچھا کیا ابن عبداللہ؟ میں نے کہا کہ ہاں فوراً باہر تشریف لائے اور مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک حدیث کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ میری زندگی ایسی حالت میں ختم نہ ہو جائے کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے محروم رہوں اس کے بعد عبداللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کی یہ حدیث آخرت میں قصاص سے متعلق ہے۔

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن بریدہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ

ایک صحابی ایک حدیث کی خاطر سفر کر کے فضالہ بن عبید کے پاس گئے یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے دیکھتے ہی بولے مرحبا! مسافر صحابی نے کہا میں ملاقات کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث کی خاطر آیا ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ

---

(۱) جامع العلوم والحکم ج ا ص ۳۶

ہے وہ حدیث سنی ہے فضالہ نے پوچھا وہ کون سی حدیث ہے؟ میں نے کہا کہ فلاں حدیث جس میں یہ ہے۔

امام دارمی نے بسند صحیح بسر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ میں صرف ایک حدیث کی خاطر شہر بشہر کا سفر کرتا تھا۔ حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کے لیے دن رات چلتا تھا۔ (۱)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام میں علمی سفر کا مقام بہت بلند ہے اور اس کے فضائل بے شمار ہیں۔ اور قرآن حکیم کی اس ترغیب کی وجہ سے اس کا رواج صدر اول میں ہو چکا تھا۔ امام شافعی کے حدود سفر میں حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس میں حسب ذیل مقامات بتائے ہیں مدینہ، یمن، عراق اور مصر۔ امام احمد نے طلب حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، شام اور جزیرہ کا سفر کیا ہے۔ (۲) امام ابو یوسف نے عراق، حجاز، شام اور دیگر ممالک کے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے (۳)۔ اور امام محمد نے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، شام اور بلاد عراق میں جا کر حدیث سنی تھی (۴)۔ حافظ ذہبی نے مناقب میں خود امام محمد کی زبانی نقل کیا ہے کہ والد محترم نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے ان میں سے میں نے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل پر خرچ کیے اور باقی پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تکمیل پر۔

بہر حال علم حدیث کے لیے سفر کرنا اور اس کی جستجو میں ملک ملک پھرنا سلف کا معمول تھا اس زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے خلف (۵) بن ایوب سے ایک مسئلہ دریافت کیا وہ جنہیں گئے تھے تو معلوم نہیں ہے تو اور دونے کہا کہ پھر کسی ایسے شخص کا مجھے پتہ بتائیے جسے یہ مسئلہ

---

(۱) مناقب احمد ص ۲۲　(۲) حسن التقاضی ص ۵۴

(۳) بلوغ الامانی ص ۶　(۴) مناقب ذہبی ص ۵۴

(۵) حضرت خلف بن ایوب اہل بلخ کے امام اور بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے حافظ ذہبی نے آپ کا تذکرہ الحفاظ سے شروع کیا ہے امام الخیر ۔۔۔ علامہ محدث حاکم نے ان کو فقیہ بلخ اور حافظ خلیلی نے صدوق مشہور لکھا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ سلطان بلخ آپ کی زیارت سے (باقی صفحہ ۲۹۵ پر)

معلوم ہو فرمایا ایسے تو حسن بن زیاد ہیں جو کوفہ میں ہیں اس پوچھنے والے نے کہا کہ کوفہ تو بہت دور ہے امام خلف بن ایوب نے فرمایا کہ **من همه الدين فالكوفة اليه قريبة** ۔ یعنی (جسے دین کی فکر ہو اس کے لیے کوفہ نزدیک ہے) اسی بنا پر اصول حدیث کی کتابوں میں اس علمی سفر کے لیے خاص خاص ہدایات آئی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

رحلت یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں کو پہلے معلوم کرے اور ان کو یاد کرے پھر دوسرے شہروں کا سفر کرے تاکہ وہ کچھ حاصل کرے جو اس کے پاس نہ ہو۔(۱)

(بقیہ صفحہ ۲۹۴) کے لیے آئے تو آپ نے منہ پھیر لیا اور امام حاکم نے لکھا ہے کہ آپ نے فقہ کی تعلیم قاضی ابو یوسف اور ابن ابی لیلیٰ سے حاصل کی اور زہد و تصوف حضرت ابراہیم بن ادہم سے حاصل کیا امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں خلف بن ایوب کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى خلف امام فان قراءته له قراءة ۔

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور حاکم نے تاریخ نیشاپور میں ان کا مفصل ترجمہ لکھا ہے حدیث کا سماع آپ کو امام ابو یوسف امام محمد امام زفر اور ابن ابی لیلیٰ کے علاوہ عوف اعرابی قیس بن الربیع اسرائیل بن یونس اسد بن عمرو جریر بن عبدالحمید اور دیگر علماء کی ایک جماعت سے حاصل ہے امام ذہبی نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل ابو کریب اور بہت سے اکابر محدثین نے آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے امام حاکم لکھتے ہیں کہ آپ ۲۰۲ھ میں نیشاپور تشریف لائے تو ہمارے یہاں کے مشائخ نے آپ سے حدیثیں لکھیں آپ کے شاگردوں میں امام احمد کے علاوہ رئیس المحدثین یحییٰ بن خاص طور پر قابل ذکر ہیں امام ترمذی نے بھی اپنی سنن میں ابو کریب محمد بن العلاء کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے مگر افسوس ہے کہ امام ترمذی کو حضرت خلف کے حالات کا علم نہ ہو سکا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے حافظ ابن حزم اپنی جلالت قدر کے باوجود امام ترمذی سے ناواقف ہیں حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں لکھا ہے کہ ابن حزم صرف ترمذی سے نہیں بلکہ مشہور امام ابو القاسم بغوی اسماعیل الصفار اور ابو العباس الاصم سے بھی ناآشنا ہیں۔ جیسا امام ترمذی کو ابن حزم کا نہ جاننا کوئی قیمت نہیں رکھتا ایسے ہی ترمذی کی خلف بن ایوب سے ناواقفیت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ (۱) شرح النخبہ ص ۴۰

امام اعظمؒ نے جب علم حدیث پر توجہ کی تو اسی قاعدے کے مطابق سب سے پہلے اپنے شہر کے اساتذہ فن کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ایک عرصہ تک وطن عزیز ہی میں تحصیل علم میں مصروف رہے اور جن جن اساتذہ سے کوفہ میں استفادہ کیا اس کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے آچکا ہے جب آپ کوفہ سے سیراب ہو چکے تو دوسرے مقامات کا رخ کیا۔

رحلت علمیہ کی تاریخ:

امام اعظمؒ کی رحلت علمیہ کی تاریخ تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جامع بیان العلم وفضلہ میں حافظ ابن عبدالبر نے خود امام صاحبؒ کا جو بیان درج کیا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلا سفر اپنے والد محترم کی معیت مکہ کا کیا ہے اور اسی سفر میں آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارثؓ سے ملاقات ہوئی ہے اس میں تصریح ہے۔

میری عمر سولہ سال تھی کہ میں نے ۹۶ھ میں اپنے والد کی ہمرکابی میں حج کا سفر کیا۔(۱)

حج اس زمانے میں افادہ واستفادہ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا کیونکہ ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال حرمین میں آکر جمع ہوتے تھے اور درس وافتاء کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ امام ابوالحسن مرغینانی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ امام اعظمؒ نے ایک بار نہیں بلکہ ۵۵ بار حج کیا ہے(۲)۔ نیز آپ نے طلب علم کی خاطر بصرہ کا بیس مرتبہ سے زیادہ سفر کیا ہے اور اکثر پورا پورا سال وہاں قیام بھی کیا ہے۔(۳)

ان تاریخی روایات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طلب علم کی خاطر مکہ مدینہ اور بصرہ کا سفر کیا ہے لیکن آغاز سفر کے بارے میں جامع بیان العلم کی روایت کے علاوہ کوئی مثبت تصریح نہیں ہے اس لیے قیاس یہی ہے کہ آغاز اگرچہ ۹۶ھ میں ہو چکا تھا مگر ان علمی سفروں میں باقاعدگی اور تسلسل ۱۰۴ھ کے بعد ہوا ہے الیافعی کی تصریح کے مطابق امام شعبی کا سال وفات ۱۰۴ھ ہے۔ اسی کے بعد آپ نے سفر کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا ہے کیونکہ آپ یہ

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۱۴۳ (۲) صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۵۴ (۳) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۵۳

پہلے سن چکے ہیں کہ امام صاحب امام حماد کے پاس علم الشرائع کی خاطر اٹھارہ سال رہے ہیں امام حماد کی تاریخ وفات ۱۲۰ھ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے ۱۰۲ھ سے مسلسل علمی سفر کیے ہیں اور آخر عمر تک حج سے تو کوئی سال بھی خالی نہیں ہے کیونکہ اگر آپ نے ۵۵ حج کیے ہیں جیسا کہ امام ابوالحسن مرغینانی نے بیان کیا ہے تو پہلا حج ۹۶ھ میں ہی آتا ہے۔ اور یہ وہی حج ہے جب آپ اپنے والد محترم کے ساتھ پہلی بار حج کو تشریف لے گئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی عمر کا کوئی سال بھی حج سے خالی نہیں ہے۔

اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے امام لیث بن سعد کی ملاقت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظم کی شہرت سنتا تھا ملنے کا بے حد مشتاق تھا حسن اتفاق سے مکہ میں اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں مجمع میں میں نے ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے جی میں کہا کہ لو تمنا بر آئی یہی امام ابوحنیفہ ہیں۔(۱)

تذکرۃ الحفاظ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام لیث بن سعد انیس سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے اور یہ بھی بتایا ہے کہ امام لیث کی اکاسی سال عمر تھی ۱۷۵ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے(۲) یہ ان کا ملاقاتی حج ہے ورنہ اس کے بعد بھی صرف امام اعظمؒ کی ملاقات ہی کے لیے لیث بن سعد حج کو گئے ہیں چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ الحافظ ابو محمد الحارثی بسند متصل فقیہ مصر عبدالرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

میں نے لیث بن سعد سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک بار امام اعظمؒ کا برائے حج ارادے کا علم ہوا میں صرف امام اعظمؒ سے ملاقات کی خاطر حج کو گیا۔ مکہ میں آپ سے ملاقات ہوئی میں نے آپ سے مختلف عنوانوں پر بہت سے مسائل دریافت

---

(۱) مناقب ابی حنیفہ الذہبی: ص ۲۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ۔ ج ا ص ۲۰۸

دریافت کیے میں نے آپ سے دیوانی وفوجداری مسائل میں قتل خطا اور شبہ عمد کے بارے میں پوچھا۔(۱)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انیس سال کی عمر میں یعنی ۱۱۳ھ میں امام لیث نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ امام ذہبی نے لکھا ہے۔(۲) اور امام اعظم کو اس موقعہ پر اس طرح پایا کہ

الناس متقصفين عليه۔ (لوگ ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں)

اور بعد کو نام لینے پر معلوم ہوا کہ یہی امام اعظم ہیں۔

۱۱۳ھ میں ہجوم کا یہ ٹوٹا پڑنا بتا رہا ہے کہ یہ امام اعظم کا پہلا سفر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے متعدد بار آچکے ہیں اور ذات گرامی جانی پہچانی ہے۔ ورنہ ایک اجنبی کے گرد یہ ہجوم کہاں ہوتا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد حج کا لگاتار سلسلہ شروع کر دیا تھا اور امام لیث نے تو یہ بات جلوت کے متعلق بتائی ہے کہ

رايت الناس متقصفين عليه۔

مگر امام ابو عاصم النبیل نے جو مکہ ہی کا واقعہ بتایا ہے اس میں تو یہ بات یہاں تک کھول دی ہے کہ لوگوں کی عقیدت امام اعظم کو مکہ میں صرف جلوت ہی میں نہیں بلکہ گھر کی خلوت میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور صرف اصحاب حدیث نہیں بلکہ ارباب فقہ کا بھی آپ کے اردگرد ہجوم رہتا تھا چنانچہ امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالے سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ

ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے آپ کے پاس ارباب فقہ اور اصحاب حدیث کا ہجوم ہو گیا آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو صاحب خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹوائے۔(۳)

اس سے ایک طرف اگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام اعظم مستقل طور پر مکہ جاتے تھے اور وہاں آپ نے بود و باش بھی اختیار کی تھی تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں امام اعظم سے دونوں مدرسے یکساں فائدہ اٹھاتے تھے اور امام صاحب کی علم الفقہ اور علم الحدیث

---

(۱) صدر الائمہ ج ۲ ص ۱۵۳　(۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹　(۳) مقدمہ علامہ اعظمی ص ۲۰

دونوں فنوں میں لوگوں کو جلالت قدر کا یکساں اقرار تھا اس مقصد کی خاطر لوگ دور دور سے چل کر آتے۔

حج کے عام سفروں کے علاوہ اموی حکومت کے آخری دور میں حکومت کے جور وستم اور ظلم وتعدی سے تنگ آ کر آپ نے حجاز کا رخ کیا۔ کردری قمطراز ہیں

فھرب الی مکة واقام بھا سنة مائة وثلاثین۔(۱)

''مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں ۱۳۰ھ تک قیام فرمایا۔''

اسی زمانے میں اموی حکومت کے خلاف سازش ہوئی ہے عباسیوں کے اشارے سے ابومسلم نے بغاوت کھائی جب تک عباسی تحریک اموی حکومت کا خاتمہ کر کے عباسیوں کو تخت حکومت دلانے میں کامیاب نہیں ہوئی امام اعظمؒ حجاز ہی میں رہے اور بالآخر۔

قدم ابو حنیفة الکوفة فی زمن ابی جعفر المنصور۔(۲)

اس کا حاصل یہی ہے کہ سفاح کی حکومت کا پورا زمانہ چار سال نو ماہ امام اعظمؒ نے کوفہ سے باہر حجاز میں گذارے۔

حجاز میں امام اعظمؒ کے مشاغل:

امام اعظمؒ کو اس زمانے کے دستور کے مطابق حجاز کے علماء محدثین سے فائدہ اٹھانے کا یہ زرین موقعہ ملا اور صرف استفادے کا نہیں بلکہ حجاز میں لوگوں نے امامؒ کو افادے کی مجلسیں قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر بن عبداللہ کا بیان ہے۔

میں نے مکہ میں یاسین زیارت کو دیکھا کہ سامنے ایک جماعت ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں لوگو! ابوحنیفہ کے پاس آیا جایا کرو اور ان کی مجلس کو غنیمت سمجھو ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے نہیں ملے گا اور حلال وحرام کے ایسے عالم کو پھر نہیں پاؤ گے اس شخص کو تم نے کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کھو دو گے۔(۳)

---

(۱) مناقب ابی حنیفہ البزازی ص ۲۷ (۲) صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۴ (۳) صدر الائمہ ج ۱ ص ۳۹

اسلام کے اس سب سے بڑے مرکز میں ایک ممتاز عالم محدث یاسین الزیات کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا اس کے سوا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا تھا کہ امام اعظمؒ پر مکہ میں دنیا ٹوٹ پڑے۔ الموفق نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے۔

ابو حنیفہ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان پر خلقت کا ہجوم تھا ہر علاقے کے لوگ ہوتے تھے سب کو جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے۔

امام عبداللہ بن المبارک نے امام اعظمؒ کے اس علمی افادے کے تماشے کو مکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا خود بیان ہے:

میں نے حرم کعبہ میں ابو حنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق و مغرب کے باشندوں کو فتویٰ دے رہے ہیں۔(۱)

امام اعظمؒ کی اس مجلس میں کس قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے یہ عبداللہ بن المبارک ہی کی زبانی سنیئے۔

والناس یومئذ ناس۔

صدر الائمہ نے عبداللہ بن المبارک کے اس جملے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ:

یعنی الفقهاء الکبار و خیار الناس۔

عبداللہ کی مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے فقہاء اور بہترین لوگوں کا مجمع تھا۔

الغرض حجاز میں امام اعظمؒ کی ذات گرامی سے دونوں مدرسے محدثین اور فقہاء مستفید ہو رہے تھے یہ دونوں مدرسے الگ الگ ہیں دونوں میں بڑا جوہری فرق ہے۔

محدث اور فقیہ میں فرق:

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدثؒ کی زبانی آپ فقہ اور حدیث کا باہمی فرق سن چکے ہیں لیجئے سر راہے محدث اور فقیہ کا فرق بھی شاہ صاحبؒ ہی کی زبانی معلوم کر لیجئے:

محدث اور فقیہ میں فرق ہے۔ محدث کا کام صرف حدیث کی روایت ہوتا ہے اور

---

(۱) صدر الائمہ: ص ۵۷

اس سلسلے میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف' محرف ہے یا غیر محرف' عربی زبان میں الفاظ غریبہ کے معانی کیا ہیں؟ راویوں کی لڑی عدالت کی ترازو میں پوری اترتی ہے یا نہیں' حدیث کے توابع و شواہد کیا ہیں۔ حدیث اپنے بیان کرنے والوں کے لحاظ سے شہرت اور غرابت میں کیا مقام رکھتی ہے۔ جو محدث علم حدیث میں یہ باتیں جانتا ہے وہ ضابط' حافظ اور متقن کہلاتا ہے۔

فقیہ کا کام مشتبہ الفاظ کی تحدید اور حدیث میں رکن' شرط اور ادب کی تعیین کرتا ہے۔ وہ امر کے صیغوں کو دیکھ کر استحباب اور وجوب کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور نواہی میں مکروہ اور حرام کے درجات مقرر کرتا ہے وہ پیش پا افتادہ مسائل کی علتیں اور دلائل جانتا ہے اور علتوں کے لحاظ سے کسی حکم کے مطلق اور مقید ہونے کی نشاندہی کرتا ہے وہ اپنی فقاہت کے زور سے احترازی اور اتفاقی قیود واضح کرتا ہے اور اطلاق و تقلید کی روشنی میں وہ زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں ہر موضوع پر قوانین و ضوابط کلیہ بتاتا ہے اور پھر ان قوانین سے حالات و کوائف میں اٹھے ہوئے سوالات کا جواب دیتا ہے دلائل میں تعارض ہو تو تطبیق دینا' باہم مفاہمت کرانا' منسوخ بتانا اور تعارض کے وقت ترجیح دینا فقیہ کا کام ہے۔(۱)

اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مکہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے دونوں فنون حدیث اور فقہ میں استفادہ کرتے تھے۔ یہی حال آپ کا کوفہ میں بھی تھا کہ آپ دونوں فنوں میں ایک امام کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے۔

صدر الائمہ نے اسی سلسلے میں مکی بن ابراہیم کے متعلق لکھا ہے کہ:

انہ' دخل الکوفه ولزم ابا حنیفة وسمع منہ الحدیث والفقه۔(۲)

''کوفہ آئے اور امام ابوحنیفہ کے پاس رہ کر ان سے حدیث و فقہ کی سماعت کی۔''

---

(۱) مصفی شرح موطا: ج ۱ ص ۳۴	(۲) مناقب ابی حنیفہ للموفق ص ۴۴

اسی بناء پر حافظ ابن تیمیہ نے الرد علی البکری میں امام اعظمؒ کو امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ بہرحال امام اعظمؒ کے اسفار علمیہ میں سب سے اونچا مکہ کا ہے اور آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد ۱۰۴ھ میں رخت سفر باندھا ہے۔

حدیث اور روایت حدیث:

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تدوین حدیث کے لیے امیرالمؤمنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے ۱۰۰ھ میں باقاعدہ سرکلر جاری ہوا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ ابھی حدیث میں روایت واسناد کا عام چرچا نہ تھا کیونکہ صحابہ اور تابعین موجود تھے اور سنن عام شہری زندگی میں رائج تھیں۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ خامسہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

اسلام اور مسلمانوں میں عزت وشوکت اور علم اپنے اوج کمال پر تھا دین کی خاطر جدوجہد اور محنت ہو رہی تھی اور سنتیں برسرعام تھیں۔ بدعات سرنگوں تھیں اور اعلان حق کرنے والے کافی تھے۔(۱)

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے ''والسنن مشہورۃ'' کہ اس دور میں سنن شہری زندگی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھیلی ہوئی سنتوں کو سمیٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس کے لیے اسناد و روایت کا سلسلہ چنداں درکار نہ تھا۔ چنانچہ قاضی ابوبکر حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم کی تعمیل میں ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں لکھیں۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین حدیث کے کام پر سرکاری طور پر مامور کیا گیا تھا۔ امام زہری کا خود اپنا بیان ہے۔

امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبنا ھا دفتراً دفتراً(۲)

''ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے جمع سنن کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔''

امام زہری کے ان دفاتر کا معمر نے بھی تذکرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۲۴ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۱ ص ۷۹

ولید یزید قتل ہوا تو امام زہری کی لکھی ہوئی تصانیف کو ولید کے خزانہ سے جانوروں پر لاد کر لایا گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایت و اسناد کا فن رونما ہونے سے پہلے علم حدیث یا السنن کا اندازا کیا تھا؟ کیونکہ حدیث تو دراصل نبوت کے اقوال' افعال اور احوال کا نام ہے اس کے سوا روایت و اسناد پر حدیث کا اطلاق محدثین کی اپنی اصطلاح ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں۔

بخدا طلب حدیث' حدیث سے الگ ہے کیونکہ طلب حدیث تو چند در چند امور زائدہ کے لیے ایک عرفی نام ہے اور یہ امور زائدہ ماہیت حدیث سے الگ ہیں۔(۱)

حافظ ابن تیمیہ اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں۔

لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی روایت کی وجہ سے صحیح ہوئی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ بخاری و مسلم کی احادیث کو روایت کرنے والے اور بھی بے شمار علماء محدثین ہوئے ہیں۔ بخاری و مسلم سے پہلے اور بعد میں ان احادیث کو بیان کرنے والے روایت کرنے والے ان گنت لوگ ہوئے اگر بخاری و مسلم پیدا نہ ہوتے تو نہ دین میں کوئی کمی آتی نہ احادیث کے وجود پر کوئی حرف آتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو اس کی حیثیت اس سے کوئی مختلف نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قرآن کو قراء سبعہ نے روایت کیا ہے۔ قرآن بتواتر منقول ہے۔ قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ پر موقوف نہیں ہے۔ ایسے ہی احادیث کا صحیح ہونا اور ان کا حدیث ہونا بخاری و مسلم کی روایت پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ احادیث بخاری و مسلم کے وجود پذیر ہونے سے پہلے ہی صحیح امت میں مقبول تھیں۔(۲)

اسی بنا پر روایت و اسناد کے رونما ہونے سے پہلے زمانہ تابعین میں ایسی تمام روایات

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۹۱ (۲) منہاج السنۃ: ج ۴ ص ۵۸

روایات جنہیں تابعی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پیش کرے قابل قبول سمجھی جاتی تھیں۔ اور حافظ ابن جریر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ تابعین کا ایسے ارشادات اپنانے پر اتفاق رہا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔

ابو عمر بن عبدالبر نے تمہید کے آغاز میں تصریح کی ہے کہ امام بن جریر کہتے ہیں کہ مرسل روایات کے قبول کرنے پر تابعین کا اجماع ہے۔(۱)

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسناد و روایت کے وجود میں آنے سے پہلے بھی حدیث موجود تھی اصل تو حدیث ہی ہے روایت و اسناد تو حدیث کی حفاظت کی خاطر فتنوں کے زمانے کی پیداوار ہے۔ چنانچہ امام مسلم مقدمہ میں امام ابن سیرین کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم فینظر الی اهل السنة فیوخذ حدیثهم وینظر الی اهل البدع فلا یوخذ منهم ۔(۲)

''لوگ اسناد کے بارے میں پوچھ گچھ ہی نہیں کرتے تھے۔ جب فتنے رونما ہوئے تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اپنے آدمی بتاؤ۔ اگر راوی اہل السنۃ ہوتا تو روایت لیتے اور اگر بدعتی ہوتا تو روایت اس سے نہ لیتے۔''

جوں جوں زمانہ صحابہ و تابعین سے دوری ہوتی گئی اسناد و روایت کے فن میں وسعت آتی گئی حتیٰ کہ جو حدیث زمانہ تابعین میں امام اعظمؒ کو صرف ایک واسطہ اور دو واسطوں سے ملی تھی وہی بخاری و مسلم کے زمانے میں اسناد و روایت کے بازار میں چھ واسطوں کی محتاج ہو گئی مثلاً امام اعظمؒ فرماتے ہیں:

عن عطاء عن حمر ان ان عثمان توضا ثلاثاً وقال هکذا رأیت النبی صلی الله علیه وسلم یتوضا۔(۳)

''حمران کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے وضو میں ایک ایک عضو کو تین تین بار دھویا اور

(۱) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۸، توضیح الافکار: ج ۲ ص ۸۲

(۲) صحیح مسلم: ج ۱ ص ۱۱ (۳) مسند امام ابوحنیفہ: ص ۲۴

فرمایا کہ میں نے ایسے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا ہے۔"
آیئے یہی حدیث امام بخاری کی زبانی بھی سن لیجئے۔

حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسی قال حدثنی ابراهیم بن سعد عن ابن شهاب ان عطاء بن یزید اخبره ان حمران مولی عثمان بن عفان اخبره انه رای عثمان دعا باناء فافرغ علی کفیه ثلاث مرار فغسلها ثم ادخل یمینه فی الاناء فمضمض واستنشر ثم غسل وجهه ثلاثاً ویدیه الی المرفقین ثلاثاً ثم مسح ثم غسل رجلیه ثلاثاً الی الکعبین ثم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من توضا نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لا یحدث فیهما نفسه غفر له ما تقدم من ذنبه۔(۱)

جیسے آج تدوین کتب کے بعد ان کتابوں کے مصنفین پر حد درجہ اعتماد ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ:

ان نسبة الکتاب الی مصنفه معلومة فی الجملة بالضرورة فانا نعلم ان محمد بن اسماعیل البخاری الف کتاباً فی الحدیث وانه هذا الموجود فی ایدی المحدثین۔(۲)

"کتاب کی نسبت مصنف کی طرف بداہتہً معلوم ہے کیونکہ یقین ہے کہ امام بخاری نے حدیث میں ایک کتاب لکھی ہے اور وہی محدثین کے ہاتھوں میں موجود ہے۔"

ایسے ہی دوات و روایت سے پہلے صحابہ اور تابعین پر ائمہ دین کو اعتماد تھا۔ ہم بھی آج جو حدیثیں ان کتابوں سے بیان کرتے ہیں اور برملا کہہ دیتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد وغیرہ نے فرمایا ہے تو یہ اصول محدثین کے مطابق روایات مرسلہ ہیں کیونکہ نہ ہم نے بخاری سے سنا ہے اور نہ مسلم سے بلکہ ہمارے اور امام بخاری کے درمیان ایک سے زیادہ وسائط ہیں جن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں سب کے سب مجاہیل ہیں جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے لکھا ہے۔

---

(۱) اس روایت کو امام مسلم اپنی صحیح میں نو طریقوں سے لائے ہیں ہر طریق بقیہ باقی صفحہ ۳۰۶ پر

ان اقصیٰ مافی الباب ان یروی الحدیث عن المجاهیل من المسلمین والمجاهیل من العلماء (۳)۔

"زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حدیث مجاہیل مسلمان اور مجاہیل علماء سے روایت کی جا رہی ہے۔"

لیکن ہمیں اس پر کوئی قدح نہیں کیونکہ ہمیں ان بزرگوں کی دیانت، صداقت اور ثقاہت وعدالت پر پورا پورا اعتماد ہے ٹھیک ٹھیک ایسا ہی اعتماد روایت واسناد کا سلسلہ پیدا ہونے سے پہلے اس دور کے لوگوں کو تابعین کرام پر تھا۔ اس اعتماد کی وجہ سے آج ہم ان علماء کے مراسیل کو قوی نہیں بلکہ قوی تر بتاتے ہیں۔

ان اقوی المراسیل ما ارسله العلماء من احادیث هذه الکتب (۴)۔

"مراسیل میں قوی تر ان کتابوں کی حدیثوں میں علماء کے مراسیل ہیں۔"

اور جیسے ان بزرگوں کی کتابوں کو آج ترجیح، دوسری کتابوں کے مقابلے میں شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس لیے یہ کتابیں بجائے خود ایک دلیل صحت بن گئی ہیں ایسے ہی دوسری صدی کے لوگ تابعین کو دوسروں کے مقابلے میں ان کی علمی شہرت اور قبول کی بنا پر ترجیح دیتے تھے۔ اور اس نے تابعین کی ہستی بجائے خود ان کے یہاں صحت کی ضمانت تھی۔ بہت بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی دیانت کے اتنے متوالے ہوں کہ ان کی راہ سے آئی ہوئی حدیثوں کو قطعی قرار دیں۔ اور تابعین کے مقام پر ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ فاناللہ والی اللہ المشتکی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث اور ہے اور روایت حدیث اور۔ امام اعظمؒ کے زمانہ طالب علمی میں فن روایت واسناد شاہراہ عام پر نہ آیا تھا اور نہ اس کی تیسری صدی کی طرح عام

﴿بقیہ صفحہ ۳۰۵﴾ سے لائے ہیں ہر طریق میں سات افراد ہیں اور دارقطنی نے سات طریقوں سے درج کیا ہے مگر کوئی طریق آٹھ افراد سے خالی نہیں ہے۔ (۲،۳) الروض الباسم: ص ۱۸

(۴) الروض الباسم: ص ۱۸

شہروں میں دفاتر کھلے تھے اور نہ ہی اس دور میں کبار تابعین کا دور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں۔

ولا یکاد یوجد فی القرن الاول الذی انقرض فی الصحابۃ وکبار التابعین ضعیف(۱)

''وہ قرن اول جس میں صحابہ اور بڑے تابعین ہیں اس میں ضعیف کوئی نہیں ہے۔''

۱۲۰ھ یحییٰ بن سعید القطان کی تاریخ ولادت ہے جن کے بارے میں حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ فن رجال میں سب سے پہلے مصنف یہی ہیں اور کوفہ میں امام شعبہ موجود تھے جن کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں۔

کان شعبۃ امۃ وحدہ فی ھذا الشان۔(۲)

''اس فن میں حضرت شعبہ یگانہ امام ہیں۔''

الغرض امام اعظمؒ نے علم کی خاطر سفر کیا اور آپ کے اسفار علمیہ میں مرکزی حیثیت مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔

مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت:

وہ حرم پاک جہاں سے علم وحی ونبوت کا آغاز ہوا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول ہونے کے بعد تیرہ سال کا عرصہ گذارا امام اعظمؒ کے زمانہ میں یہ بھی کوفہ کی طرح دار العلم تھا۔

حافظ ذہبی الامصار ذوات الآثار میں فرماتے ہیں:

عہد صحابہ میں یہاں علم کم تھا پھر صحابہ کے آخری دور میں علم کی کثرت ہوئی اور اسی طرح عہد تابعین میں مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر اور ابن ابی ملیکہ اور پھر ان کے شاگردوں کے دور میں عبداللہ بن ابی نجیح، قاری ابن کثیر، حنظلہ بن ابی سفیان اور ابن جریج اور ہارون رشید کے وقت میں مسلم زنجی، فضیل بن عیینہ، ابو عبدالرحمن ازرقی، حمیدی اور سعید بن منصور جیسے علماء ہوئے ہیں۔(۳)

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۶۴ (۲،۳) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۳۶

امام بخاری کو حرمین کے عمل پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

باب ما ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و حض علی اتفاق اھل العلم وما اجتمع علیہ الحرمان مکۃ والمدینۃ۔

علامہ کرمانی شارح صحیح بخاری لکھتے ہیں:

امام بخاری کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ اہل حرمین کا اتفاق واجماع حجت ہے۔

مگر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

لعلہ اراد الترجیح لا الاجماع۔(۱)

''غالباً مراد ترجیح ہے اجماع نہیں۔''

امام بخاری کی عبارت کا خواہ مطلب کچھ ہو مگر اتنا معلوم ہے کہ اختلافی مسائل میں ان کے نزدیک وہی مسئلہ قابل ترجیح ہے جس پر علمائے حرمین متفق ہوں۔(۲)

بہرحال دوسری صدی کے آغاز اور پہلی صدی کے آخر میں مکہ مکرمہ علم کی منڈی تھا اور تمام بلاد اسلامیہ میں مکہ کے علمی جلال کا لوہا مانا جاتا تھا اتنا کہ علامہ سحنون نے تصریح کی ہے کہ اگر ابن عباسؓ اہل مدینہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف کر جائیں تو مدینہ کی اجماعی طاقت علمی بھی بے جان ہو جاتی ہے۔

اذا خالف ابن عباسؓ اھل المدینۃ لم ینعقد لھم اجماع۔(۳)

''جب اہل مدینہ کی ابن عباسؓ مخالفت کریں تو اہل مدینہ کا اجماع منعقد نہیں ہوتا۔''

مکہ میں امام اعظمؒ نے جن حفاظ حدیث سے علمی استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل بتانا تو دشوار ہے یہاں صرف چند گرامی قدر ہستیوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مکہ کے گلستان کی باغ و بہار کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

---

(۱) فتح الباری: ج ۱۳ ص ۲۵۷ (۲) یہ مسئلہ بھی مبہمات مسائل میں سے ہے اہل مکہ کا دوسرے اسلامی شہروں کے مقابلے میں اپنی قوت اجماع سے قابل ترجیح ہونا بظاہر اس کی کوئی باقی صفحہ ۳۰۹ پر ہے

امام اعظمؒ کا عطاء بن ابی رباح سے تلمذ:

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ کا آغاز مفتی اہل مکہ، محدث مکہ، القدوہ اور العلم کے زریں القاب سے کیا ہے اور ان کو علم حدیث میں امام اعظمؒ کا استاد بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

عنه ایوب و حسین المعلم و ابن جریج و ابن اسحاق والاوزاعی و ابو حنیفة۔(۱)

''عطاء کے تلامذہ میں ایوب، حسین ابن جریج ابن اسحاق، اوزاعی اور ابو حنیفہ ہیں۔''

بلکہ امام ذہبی نے اپنی مشہور تاریخ کے خلاصہ میں بالتصریح یہ بھی لکھا ہے کہ:

اکبر شیوخه عطاءُ بن ابی رباح۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حیثیت امام مالک کے اسانید میں مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے جسے امام بخاری وغیرہ اجل الاسانید اور اصح الاسانید کہتے ہیں۔ یہی حیثیت امام اعظم کی اسانید میں ابو حنیفۃ عن عطاء عن ابن عباس کی ہے۔ چنانچہ امام شعرانی نے اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے مناقب میں لکھا ہے۔

وسمع الحدیث من عطاء بمکة۔(۳)

(بقیہ صفحہ ۳۰۸ کا) وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ جس پائے کے علماء یہاں موجود تھے دوسرے مقامات پر بھی موجود تھے نیز مہاجرین جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم صحبت یافتہ تھے ان میں سے پھر کسی ایک نے بھی مکہ میں آ کر دوبارہ قیام نہیں کیا ان کو اس کی شرعاً اجازت نہ تھی مکہ کی جو علمی رونق تھی وہ عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ کے دم قدم سے تھی اور بس تفصیل آگے آرہی ہے۔ (۳) عمدۃ القاری: ج ۱۵ ص ۲۰۲

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۹۲　(۲) دول الاسلام: ص ۴۷

(۳) مناقب ذہبی: ص ۱۱

حضرت عطاء بن ابی رباح کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان اکابر کے یہ بیانات پڑھیئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اے اہل مکہ تم میرے پاس بھیڑ رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس تو عطاء موجود ہیں۔ بعینہ یہی الفاظ حافظ ذہبی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی نقل کیے ہیں۔ حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ میں تشریف لائے لوگوں نے ان سے مسائل دریافت کیے آپ نے فرمایا کہ مسائل کی خاطر تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تم میں عطاء موجود ہیں۔(۱)

ذرا غور فرمایئے کہ اس شخص کی جلالت علمی کا کیا حال ہوگا جس کی طلیست کا لوہا ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر اور اساطین حدیث صحابہ مانتے ہوں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح نے ستر حج کیے ہیں اموی دور حکومت میں زمانہ حج آتا تو سرکاری طور پر منادی ہوتی۔

لا یفتی الناس فی الحج الا عطاء۔(۲)

حافظ ابن کثیر ہی نے سعید بن سلام المصری کے حوالہ سے ان سے امام اعظمؒ کی پہلی ملاقات کا پورا حال لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

میں نے خود امام اعظمؒ سے سنا ہے کہ جب امام موصوف سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے عطاء سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ دریافت کرتے ہی جواب دینے سے پہلے امام صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کوفہ کا شہری ہوں۔ فرمایا کہ اس بستی کے جہاں دینی فرقہ بندی کی بنیاد پڑی۔ امام صاحب نے جواباً فرمایا جی ہاں! فرمایا اچھا بتاؤ کہ کن لوگوں سے تعلق رکھتے ہو؟ یعنی کس مدرسہ خیال کے ہو۔ امام صاحب نے جواباً کہا کہ الحمدللہ ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو برا نہیں کہتے یعنی نہ رافضی ہوں نہ خارجی اور نہ قدری۔ اور اہل قبلہ کی بربنائے معصیت تکفیر نہیں کرتے یعنی نہ مرجیہ ہوں نہ جہمی اور نہ معتزلی۔ حضرت نے جواب باصواب سن کر فرمایا: عرفت فالزم پہچان گیا ہوں پس لازم رہو۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۹۳ (۲) البدایہ والنہایہ: ج ۸ ص ۳۰۶ (۳) البدایہ والنہایہ: ج ۸ ص ۳۰۷

الغرض امام عطاء بن ابی رباح اپنے وقت میں جلالت علمی کا سب سے بڑا نمونہ تھے محدثین میں اجلہ حفاظ حدیث کو ان کی بارگاہ علمی میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً امام ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری' قتادہ بن دعامہ' یحییٰ بن کثیر' مالک بن دینار' سلیمان بن مہران اور امام ایوب السختیانی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

كان من سادات التابعين علماً وفقهاً۔(۱)

صرف علم و فقہ ہی میں نہیں بلکہ زہد و تقویٰ' پاکبازی اور پارسائی میں بھی آپ کی زندگی ایک مثالی نمونہ تھی۔ اور ہر شخص کے لیے آپ کا یہی وعظ ہوتا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے یعلی بن عبید کے حوالہ سے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعلی بن عبید کہتے ہیں کہ:

ہم محمد بن سوقہ کے پاس گئے انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا آؤ میں تمہیں ایک مفید بات سناؤں مجھے عطاء بن ابی رباح نے بتایا ہے کہ عزیز من! بزرگان سلف لا یعنی اور فضول باتوں کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے بلکہ فضول کو گناہ سمجھتے تھے۔ صرف اللہ کی کتاب کی تلاوت' نیکی کا پرچار' برائی پر روک ٹوک یا پھر اپنی ضروریات معیشت سے متعلق باتیں کہتے تھے۔ کیا تم اللہ پاک کے اس ارشاد گرامی کو نہیں مانتے **وان عليكم لحافظين كراماً كاتبين** اور **مايلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد۔** اگر تمہارے سامنے تمہارا وہ اعمال نامہ آجائے جس پر وہ باتیں درج ہیں جو نہ دنیا سے متعلق ہیں اور نہ دین سے کیا تمہیں اس پر شرم نہ آئے گی۔ (۲)

امام بخاری' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام ابن ماجہ اور امام نسائی نے اپنی کتابوں میں ان سے روایات لی ہیں۔

قاضی ابو یوسفؒ نے بحوالہ امام اعظمؒ ان سے احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً

عن ابى حنيفة عن عطاء عن عمر انه' قال ليس فى القبلة الوضوءُ۔

''بوسہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔''

---

(۱) تہذیب التہذیب: ج ۷ ص ۲۰۳ (۲) البدایہ والنہایہ: ج ۸ ص ۳۰۸

عن ابی حنیفة عن عطاء عن ابن عباس مثله'۔

ایسے ہی امام موسیٰ بن زکریا الحصکفی نے اپنے مسند میں حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں اور امام محمد نے موطا اور کتاب الآ ثار میں حضرت عطاء سے بحوالہ امام اعظمؒ روایات کی تخریج کی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ:

یہاں یہ بات یاد رکھیئے کہ امام عطاء ابی رباح کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بات پہلے صاف ہو چکی ہے کہ موصوف مکہ میں حضرت امام اعظمؒ کے علم الحدیث میں سب سے بڑے اور مہربان شفیق استاد ہیں۔ شفقت کا اور شفقت کے ساتھ اکرام واجلال کا اندازہ کرنا ہو تو وہ واقعہ پڑھئے جو حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل بحوالہ حارث لکھا ہے۔

ہم عطاء بن ابی رباح کے پاس ہوتے کچھ ہم میں سے کچھ کے پیچھے ہوتے جب امام ابو حنیفہ مجلس میں آتے تو حضرت عطاء امام صاحب کے لیے جگہ بناتے اور ان کو اپنے قریب کر لیتے۔(۱)

عطاء بن ابی رباح نے کن صحابہ کے علوم سے خوشہ چینی کی ہے اس کی ایک معمولی سی جھلک حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب کے مطالعہ سے نظر آتی ہے۔ حافظ صاحب موصوف کے پورے ایک صفحہ پر ان کے اساتذہ میں اجلہ صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں حضرت عطاء کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ:

ادرکت مائتی صحابي۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک میں صحابہ کا پھیلا ہوا علم حضرت عطاء کے ذریعے امام ابو حنیفہ میں منتقل ہوا ہے۔ اسی بنا پر امام خلف بن ایوب کا امام اعظمؒ کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ علم کی دولت اللہ سبحانہ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دولت صحابہ کو وراثت میں ملی اور صحابہ سے تابعین کو اور تابعین سے امام ابو حنیفہ کو ملی ہے۔(رواہ الحافظ خسرو)

---

(۱) الانتقاء فی فضائل الائمۃ الثلاثۃ الفقہاء. ص ۶۷ (۲) تہذیب التہذیب: ج ۷ ص ۲۰۳

حافظ عمرو بن دینار سے امام اعظمؒ کا تلمذ:

حافظ ذہبی نے ان کا تعارف لکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں الامام الحافظ عالم الحرم۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے حافظ جلال الدین المزی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عمرو بن دینار امام اعظمؒ کے علم حدیث میں شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی، حافظ کردری اور صدر الائمہ نے بھی تصریح کی ہے۔ الخزرجی نے ان کو خلاصہ میں احد الاعلام لکھا ہے۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ کی ان کے بارے میں رائے یہ تھی کہ ہمارے نزدیک عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہ، زیادہ عالم اور زیادہ حافظ کوئی نہیں ہے۔(۱)

امام عمرو بن دینار ان لوگوں میں سے ہیں جو وقت کی ناپسندیدہ حکومت سے کسی درجے میں تعاون نہ کرتے تھے یعنی ان کے نزدیک حکومت میں عدالت ضروری تھی۔ اموی حکومت کے سربراہ ہشام کا واقعہ حافظ کردری نے لکھا ہے کہ سرکاری طور پر ان کو یہ پیش کش کی گئی کہ منصب افتاء سنبھالو۔ سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملے گی۔ صاف اور کھلے طور پر انکار کر دیا۔(۲)

حکومت اور عدالت:

یہ موضوع بہت طویل الذیل ہے مگر یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ الامام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں زیر آیت "لاینال عهدی الظالمین" سیر حاصل بحث کی ہے اس آیت کے منطوق اور مدلول سے اس مسئلہ کے دونوں مثبت و منفی پہلو واضح کیے ہیں۔ مثبت پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں:

افادت الآیۃ ان شرط جمیع من کان فی محل الائتمام به فی امر العدالة والصلاح۔(۳)

آیت نے بتایا ہے کہ ایسے تمام عہدوں کی جن کا تعلق قیادت سے ہو بنیادی شرط امیدوار میں صلاحیت اور عدالت کا ہونا ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۰۷　(۲) مناقب الکردری: ج ۲ ص ۹۷

(۳) احکام القرآن: ج ۱ ص ۸۰

اور منفی پہلو کو اس آیت کے مدلول سے ثابت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

فثبت بدلالة هذاه الاية بطلان امامة الفاسق وانه لا يكون خليفة۔(۱)

اس آیت سے فاسق کی امامت کا غلط ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی کہ فاسق تخت خلافت کا اہل نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں الجصاص نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض حلقوں کی جانب سے امام اعظمؒ کے بارے میں پھیلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ:

لا فرق عند ابی حنيفة بين القاضی و بين الخليفة فی ان شرط كل واحد منهما العدالة ۔(۲)

ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ اور قاضی کے درمیان بلحاظ عدالت شرط ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے بہرحال امام عمرو بن دینار سے سرکاری منصب افتاء قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انکار افتاء سے نہیں افتاء کا کام تو وہ پہلے بھی کرتے تھے انکار تو حکومت کا اجیر بننے سے ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں اجلہ صحابہ کو ان کا استاد بتایا ہے مثلاً ابن عباسؓ، ابن الزبیرؓ، ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابوہریرہؓ، جابر بن عبداللہؓ، ابوالطفیلؓ اور سائب بن یزیدؓ اور تابعین کی ایک بڑی تعداد کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا ہے ان کے شاگردوں میں امام اعظمؒ کے ساتھ امام شعبہؒ امام ابن جریجؒ حماد بن زیدؒ حماد بن سلمہؒ امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

امام عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ مجھ سے خود امام شعبہ نے بتایا ہے کہ میں نے عمرو بن دینار جیسا کوئی نہیں دیکھا۔(۳)

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ میں کوفہ آیا تو امام ابوحنیفہ نے میرے تعارف میں یہ جملہ بول کر مجھے معاشرے میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کہ:

(۱،۲) احکام القرآن: ج ا ص ۸۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۱۰۸

هذا اعلمهم بحديث عمرو بن دينارٍ۔(۱)

اس کے بعد انہوں نے میرے پاس آمد و رفت شروع کر دی۔ امام اعظمؒ نے عمرو بن دینار سے دو حدیثیں بالواسطہ روایت کی ہیں۔ امام علی بن المدینی کے حوالے سے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی علمی وراثت چھ حضرات کو ملی ہے۔ سعید بن جبیرؒ عطاء بن ابی رباحؒ عکرمہؒ جابرؒ زیدؒ طاؤسؒ اور ان چھ اکابر کا علم حضرت عمرو بن دینار کو وراثت میں ملا ہے۔(۲)

ائمہ ستہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری:

مشہور محدث ملا علی قاری حدیث و رجال میں معلوماتی شخصیت ہونے کے باوجود یہاں ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں۔

عمرو بن دینار کی کنیت ابو یحییٰ ہے سالم بن عبداللہ وغیرہ کے شاگرد ہیں حماد بن زیدؒ حماد بن سلمہ اور معمر نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے۔(۳)

یہ غلط ہے اور بہت بڑا سہو ہے۔ غلط فہمی کا سرچشمہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے امام عمرو بن دینار مکی کو عمرو بن دینار بصری سمجھ لیا ہے۔ اول الذکر صحاح کے راویوں میں سے ہیں۔ امام اعظم کا شیخ اور کبار تابعین میں سے امام اور مجتہد ہیں۔ اور مؤخر الذکر طبقہ سادسہ میں سے ہیں اور ان کا شمار ضعفاء میں ہوتا ہے۔ الغرض امام کے شیوخ میں عمرو بن دینار مکی ہیں۔ عمرو بن دینار بصری نہیں ہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان سے روایات لی ہیں۔

عن ابی حنیفة عن عمرو بن دینارٍ عن جابرٍ عن زیدٍ انه قال اذا خيرت المراة نفسها فقامت من مجلسها قبل ان تختار فليس بشیءٍ

حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب عورت اپنے لیے اختیار کرے پھر وہ اپنی جگہ سے اختیار ملنے سے پہلے کھڑی ہو جائے تو کچھ نہیں ہے۔

(۱) تلقیح فہوم اہل الاثر: ص ۲۳۶ (۲) صدر الائمہ: ج ۱ ص ۹۲ (۳) شرح مسند امام: ص ۱۸۶

حافظ ابوالزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظمؒ کا تلمذ:

حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث کے طبقہ اربعہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ جلال الدین اسعاف المبطاء میں، صدر الائمہ، علامہ جرزی اور امام ذہبی نے مناقب میں ان کو امام اعظمؒ کا علم حدیث میں استاد قرار دیا ہے۔

یعلی بن عطاء فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مسلم حدیث بیان کرتے تھے ہمارا اندازہ ان کے بارے میں یہ تھا کہ سب سے زیادہ زیرک اور سب سے زیادہ قوت حافظہ کے مالک ہیں۔ عطاء بن ابی رباح یہ کہہ کر ان کو خراج تحسین ادا کرتے تھے کہ ہم سب حضرت جابر بن عبداللہؓ کے پاس جا کر حدیثیں سنتے۔ سننے کے بعد باہم مذاکرہ کرتے تو حضرت ابوالزبیر کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوتی تھیں۔ امام ایوب السختیانی جب ان کے حوالے سے کوئی ارشاد نبوت نقل کرتے تو فرماتے کہ ہم سے ابوالزبیر نے بیان کیا اور ابوالزبیر تو ابوالزبیر ہی ہیں۔

سب ائمہ حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظمؒ ان کی روایات کو پیش کیا ہے۔

ابو حنیفه عن ابی الزبیر عن جابرٍ ان سراقة بن مالکؓ قال یا رسول الله ارایت عمر تناهذه لعامنا ام للابد قال للابد۔(۱)

سراقہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! یہ عمرہ ہمارا اسی سال کے لیے ہے۔ یا ہمیشہ کے لیے۔ فرمایا ہمیشہ کے لیے ہے۔

حافظ ابوالزبیر کے اساتذہ میں عبادلہ اربعہ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، ابوالطفیلؓ صحابہ ہیں ان کے علاوہ باقی جلیل القدر ائمہ تابعین ہیں۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظمؒ کے علاوہ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً زہری، امام اعمش، امام یحییٰ بن سعید الانصاری، امام ابراہیم بن طہمان، امام حماد بن سلمہ، امام ہشیم، امام سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ شامل ہیں۔ (۲)

امام مالک نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔ امام اعظمؒ نے ان سے جس قدر احادیث

(۱،۲) تہذیب التہذیب: ج ۹ ص ۴۴۱، ص ۴۴۲

سنی ہیں ان سب کا مرکز حضرت جابر بن عبداللہؓ ہیں۔ سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ امام شعبہ نے حافظ محمد بن مسلم کو رکن ومقام کے درمیان اس بات پر قسم دی تھی کیا تم نے یہ احادیث حضرت جابر بن عبداللہؓ سے سنی ہیں؟ فرمایا:

واللہ انی سمعتھا من جابر۔

بخدا میں یہ احادیث حضرت جابرؓ سے سنی ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ یہی جملہ آپ نے تین بار دہرایا۔(۱)

مکہ میں امام اعظمؒ کے دوسرے شیوخ کو ان ہی پر قیاس کر لیجئے کچھ کے اسماء یہ ہیں۔ عبداللہ بن ابی زیاد ○ ابوالحصین المکی ۱۵۰ھ ○ حمید بن قیس الاعرج ابوصفوان القاری المکی ۱۳۰ھ ○ ابوعثمان عبداللہ بن عثمان القاری المکی ۱۳۴ھ ○ عبداللہ بن عبدالرحمٰن النوفلی المکی ○ ابراہیم بن میسرہ الطائفی نزیل مکہ ۱۳۲ھ ○ اسماعیل بن امیہ بن سعید الاموی ۱۴۴ھ ○ اسماعیل بن مسلم ابواسحاق المکی ○ ابوعبداللہ عبدالعزیز بن رفیع الاسدی المکی ۱۳۰ھ حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حوالہ سے حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔

المدینۃ المکرمۃ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دارالہجرۃ اور آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ علوم نبوت کا اصلی مخزن اور منبع ہونے کا اسی شہر کو فخر حاصل ہے۔ مکہ کے ساتھ اس کو بھی حرم کہا جاتا ہے وہ بنائے خلیل ہے یہ بنائے حبیب ہے۔ عہد نبوی سے لے کر حضرت علی مرتضیٰؓ کے ابتدائی زمانے تک ساری دنیائے اسلام کا علمی مرکز یہی تھا۔ ۱۰۱ھ تک مدینے کی علمی بہار پر فقہائے سبعہ آفتاب وماہتاب بن کر تاباں رہے ہیں۔ یہ سات شخصیتیں یعنی سعید بن المسیب' عروۃ بن الزبیر' قاسم بن محمدؒ خارجہ بن زیدؒ عبید اللہ بن عبداللہؒ سلیمان بن یسارؒ ساتویں شخصیت کی تعیین میں علماء کا قدرے اختلاف ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی اور علامہ نووی نے تین شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

سالم بن عبداللہؒ ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن۔

---

(۱) تہذیب التہذیب: ج ۹ ص ۴۴۱' ص ۴۴۲

مدینہ کے فقہائے سبعہ:

امام ذہبی نے ابوبکر بن عبدالرحمن کو ہی احد الفقہاء السبعہ لکھا ہے(۱)۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہم زبان ہیں(۲)۔ اسی رائے کے مطابق محمد بن یوسف شاعر نے ان ساتوں کو دو شعروں میں جمع کر دیا ہے۔(۳)

الا کل من لا یقتدی بائمہ	فقسمتہ ضیزیٰ عن الحق خارجہ
فخذھم عبید اللہ عروۃ قاسم	سعید ابوبکر وسلیمان خارجہ

ابن العماد حنبلی نے ان کو ہی قابل اعتماد قرار دیا ہے(۴)۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے ان ہی اکابر کو ابوبکر کے ساتھ فقہائے سبعہ بتایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

هؤلاء هم الفقهاء السبعة المشهورون في المدينة۔(۵)

حافظ ابن القیم الجوزی نے مدینہ کے مفتیوں کے تذکرے میں ان اکابر کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے۔

هؤلاء هم الفقهاء۔(۶)

فقہائے سبعہ کے نام پر تو تاریخ میں شہرت کا شرف ان ہی اکابر کو حاصل ہے لیکن مؤرخین میں سے ابو الفداء نے فقہائے مدینہ کی تعداد دس بتائی ہے۔ جرجی زیدان مؤرخ ابو الفداء کے حوالے سے رقمطراز ہے:

وبعض المورخين يحسبهم عشرة۔(۷)

لیکن یہ محض اختلاط ہے اور شاید اس اختلاط و التباس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ ابو حنیفہ دینوری نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمانہ گورنری میں مدینہ میں جن اکابر پر مشتمل مشاورتی کونسل بنائی تھی اس کے اراکین کی تعداد دس تھی اور اس میں ان فقہاء میں سے چھ کو رکن بنایا گیا تھا۔(۸)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ص۵۹ (۲) تہذیب التہذیب: ج۲ص۲۱۲ (۳) الجواہر المضیئہ: ج ص۴۲۲
(۴) شذرات الذہب: ج۱ص۱۱۴ (۵) الاحکام فی اصول الاحکام: ج۵ص۲۶۸
(۶) اعلام الموقعین: ج۱ص۹ (۷) ابو الفداء: ج۱ص۲۰۹ بحوالہ تاریخ الفقہ العربیہ: ج۱ص۹۰
(۸) الاخبار الطوال: ص۳۳۶

حافظ ابن کثیر نے اس مشاورتی کونسل کے ارکان کے نام یہ بتائے ہیں:
عروۃ بن الزبیر ○ عبید اللہ بن عبداللہ ○ ابوبکر بن عبدالرحمٰن ○ ابوبکر بن سلیمان سلیمان بن یسار ○ قاسم بن محمد ○ سالم بن عبداللہ ○ عبید اللہ بن عمر ○ عبید اللہ بن عامر ○ خارجہ بن زید۔(۱)

ان کا کام پیش پا افتادہ معاملات میں مشورہ دینا اور شہریوں کی پیدا شدہ شکایات کو گورنر تک پہنچانا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کہا تھا کہ:

انی لا ارید ان اقطع امرًا الا برایکم۔

میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کروں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مشاورتی کونسل کے افراد ہیں۔ تاریخ میں فقہائے مدینہ کے نام سے جو مشہور ہوئے ہیں وہ صرف سات ہی ہیں۔

ابن العماد حنبلی نے ان اکابر کو فقہائے سبعہ کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے۔

یہ فقہائے سبعہ ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی دور میں ہوئے ہیں مدینہ میں ان کے ذریعے علم وفتویٰ کی بیش از بیش نشرو اشاعت ہوئی ہے حالانکہ ان کے ہی زمانے میں دوسرے فقہائے تابعین بھی موجود تھے لیکن ان کا علم کی اشاعت میں وہ حصہ نہیں ہے جو فقہائے سبعہ کا ہے۔(۲)

حافظ سخاوی نے ان ہی سات کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

جب کوئی مسئلہ درپیش آتا یہ سب ایک ساتھ مل کر اس پر غور کرتے اور جب تک وہ ان کے سامنے پیش ہوکر طے نہ ہوجاتا عدالت اس کی بابت کوئی فیصلہ صادر نہ کرتی۔(۳)

اس دور میں مدینہ کی علمی بہاران ہی فقہاء کے دم قدم سے قائم تھی۔ علم حدیث کا سارا دارو مدار یہی فقہائے سبعہ ہیں۔ ان میں خارجہ بن زید کو چھوڑ کر کہ ان کو امام ذہبی نے قلیل الحدیث لکھا ہے باقی چھ کا نام سرفہرست ہے۔ امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ مشہور استاد علامہ ابومنصور عبدالقاہر بغدادی نے فقہاء سبعہ کو ائمہ حدیث بتایا ہے فرماتے ہیں۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ج۹ص ۷۱　(۲) شذرات الذہب: ج ۱ص ۱۰۴　(۳) فتح المغیث: ص ۳۹۹

والفقهاء السبعة من التابعين من هذه الجملة فانهم كانوا مع فقههم ائمة في الحديث۔(۱)

اس دور میں مختلف شہروں میں حدیث کے مدرسے کھل گئے تھے ان مدرسوں کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

مدینے میں مدرسہ حدیث کے مشہور امام سعید بن المسیب ۹۴ھ ○ عروۃ بن الزبیر ۹۴ھ ○ ابوبکر بن عبدالرحمٰن ۹۴ھ ○ عبیداللہ بن عبداللہ ۱۰۱ھ ○ سلیمان بن یسار ۹۳ھ ○ قاسم بن محمد ۱۱۲ھ ○ نافع مولی ابن عمر ۱۱۷ھ ○ امام زہری ۱۲۴ھ ○ ابوالزناد ۱۳۰ھ ○ مکے میں حدیث کے مشہور امام عکرمہ ۱۰۵ھ ○ عطاء بن ابی رباح ۱۱۵ھ ○ ابوالزبیر ۱۲۸ھ ○ کوفہ میں امام شعبی ○ عامر بن شراحیل ۱۰۴ھ ○ ابراہیم نخعی ۹۶ھ ○ علقمہ ۶۲ھ ○ بصرہ میں حسن بصری ۱۱۰ھ ○ ابن سیرین ۱۱۰ھ ○ شام میں عمر بن عبدالعزیز ۱۰۱ھ ○ مکحول ۱۱۸ھ اور قبیصہ ۸۶ھ۔(۲)

مدینے کے علم وعمل پر اعتماد:

مدینے کے علم وعمل پر کتنا اعتماد ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ:

عمل اهل المدينة الذى يحتج به ما كان في زمن الخلفاءِ الراشدين۔(۳)

زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کا عمل دین میں حجت ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اہل مدینہ کا کسی مسئلہ پر جمع ہونا یقیناً تمام مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلہ کو بھاری بنا دیتا ہے لیکن بحث اس میں ہے کہ جب صحابہ کرام بڑی کثرت کے ساتھ دوسرے شہروں میں جا بسے اس وقت بھی کسی مسئلہ کے متعلق مدینے والوں کا عمل حجت ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر امام بخاری کی رائے پہلے بتائی جا چکی ہے کہ بقول حافظ ابن حجر امام بخاری کے نزدیک حرمین کے اتفاق سے ترجیح ہو سکتی ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں۔

---

(۱) اصول الدین: ص ۳۱۳　(۲) الحدیث والمحدثون: ۱۳۲　(۳) زاد المعاد: ج ۱

وفضل المدینة ثابت لا یحتاج الیٰ اقامة دلیل خاص۔(۱)

مدینہ کی بزرگی اور فضیلت ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اگر مقصد صرف یہ ہے کہ مدینہ والوں کی علمی برتری دوسروں پر ثابت ہو تو اگر کسی خاص زمانے میں ان کی فوقیت مقصود ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ نبوت اور صحابہ کے اس دور میں جب کہ صحابہ مدینہ سے دوسرے شہروں میں نہ گئے تھے مدینے کو یہ شرف حاصل ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہر زمانے میں علمی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے تو یہ بات محل تامل ہے اور اس قسم کے جذباتی نعروں کی تحقیق کے بازار میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔(۲)

حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے لکھتے ہیں کہ:

جمہور کی رائے میں مدینہ اور دوسرے شہروں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے اصل یہ ہے کہ جن کے پاس سنت ہے اس ہی مقام کا عمل بھی قابل اتباع ہے۔ورنہ اختلاف کے وقت ایک کا عمل دوسروں کے لیے حجت نہیں ہے حجت تو صرف اتباع سنت ہے سنت کو صرف اس لیے نہیں چھوڑا جائے گا کہ کسی شہر کا عمل اس کے خلاف ہے اگر اسے مان لیا جائے تو بہت سی سنتیں متروک ہو جائیں گی اور سنت کی معیاری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ کسی بھی شہر کو عصمت کا مقام حاصل نہیں ہے دیواروں، مکانوں اور زمینوں کا کسی بات کے راجح قرار دینے میں کوئی اثر نہیں ہے۔مؤثر تو ان شہروں کے مکین ہیں اور معلوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہی دوسروں پر علم وعمل میں مقدم ہیں جیسا کہ وہ فضیلت اور دین میں مقدم ہیں۔ اور صحابہ کا عمل ہی نا قابل مخالفت ہے اور صحابہ کرام کی اکثریت مدینہ سے رخت سفر باندھ کر دوسرے شہروں میں چلی گئی بلکہ صحابہ کے اکثر علماء کوفہ بصرہ اور شام چلے گئے

(۱،۲) فتح الباری: ج ۳ ص ۲۶۳

مثلاً علی بن ابی طالبؓ، ابی موسیٰ اشعریؓ عبداللہ بن مسعودؓ، عبادۃ بن الصامتؓ، ابی الدرداءؓ، عمرو بن العاصؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، اور معاذ بن جبلؓ...... بلکہ کوفہ بصرہ میں تقریباً تین سو سے زائد صحابہ آ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اکابر جب تک مدینے میں رہے ان کا عمل حجت تھا اور جب یہی لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تو ان کا عمل حجت نہ رہا۔(۱)

بہر حال زمانہ نبوت سے لے کر خلافت راشدہ تک مدینہ کو علم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانے میں دارالخلافہ کے کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہو جانے پر گو اس کی وہ علمی شان باقی نہ رہی تھی تاہم امام مالک کے زمانے تک مدینے کی علمی رونق برقرار تھی۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

مدینہ طیبہ در زمان او بیشتر از زمان متاخر مرجع علماء و محط رجال علماء است۔(۲)

حافظ ذہبی کے حوالہ سے حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ:

مدینہ دارالہجرۃ میں عہد صحابہ میں قرآن و سنت کا علم بہت زیادہ تھا اور زمانہ تابعین میں فقہاء سبعہ جیسے حضرات موجود تھے اور صغار تابعین کے دور میں بھی قرآن و سنت کا علم تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ، ابن ابی ذئب، ابن عجلان، جعفر صادق، مالک، امام نافع قاری، ابراہیم بن سعد، سلیمان بن بلال اور اسماعیل بن جعفر سب کے سب مدنی ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی فرماتے ہیں کہ

پھر ان کے بعد وہاں علم بہت کم ہو گیا اور بعد ازیں تو بالکل ہی ناپید ہو گیا۔

مدینہ طیبہ میں علم کب ناپید ہوا۔ یہ بھی امام ذہبی کی زبانی سن لیجئے۔

خصوصاً اس وقت جبکہ روافض کی ایک جماعت نے مدینہ میں ڈیرا لگا لیا اور مدینہ پر ان کی حکومت ہو گئی۔(۳)

امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں۔

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۲ ص ۳۶۱　(۲) مصفیٰ شرح مؤطا: ج ۱ ص ۷　(۳) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۳۶

السنة المتقدمة من اهل المدينة خير من الحديث۔(۱)

مدینہ کی علمی وسعتوں کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں۔ کہ امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں قاضی ابوبکر بن حزم کو جمع سنن کے کام پر مامور کیا اس وقت مدینہ میں علمی شخصیتیں موجود تھیں جن کے بارے میں امیر المؤمنین نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں لکھا ہے کہ امیر المؤمنین نے لکھا تھا کہ وہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اسے قلم بند کر کے روانہ کیا جائے۔ اور ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے۔

كتب عمر الى ابن حزم ان يكتب له' احاديث عمرة۔

''عمر نے ابوبکر بن حزم کو عمرہ کی احادیث قلم بند کرنے کے لیے لکھا۔''

قاضی ابوبکر بن حزم مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے امام مالک فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں قضا کے بارے میں جس قدر ان کو علم تھا اتنا کسی کو نہ تھا بڑے عابد شب زندہ دار تھے۔ صرف قاضی ابوبکر نہیں بلکہ ان کے علاوہ مدینے ہی کے دوسرے اکابر کو بھی عمر بن عبدالعزیز نے یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے یہاں تو میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مدینے میں علمی وسعتوں کی وجہ سے عمرؓ نے یہ حکم روانہ کیا تھا۔ بہرحال امام اعظمؒ کے زمانہ طالب علمی تک مدینہ کا علمی جلال مانا ہوا تھا اور امام اعظمؒ کو فقہاء سبعہ کی علمی بہاروں سے متمتع ہونے کا موقعہ ملا ہے کیونکہ فقہائے سبعہ میں سے قاسم بن محمد کی وفات ۱۱۲ھ میں ہوئی اور امام اعظمؒ نے حجوں کا سلسلہ ۹۶ھ سے شروع کیا ہے۔ واضح رہے کہ امیر المؤمنین عمر نے تدوین حدیث کے لیے سرکلر ۱۰۰ھ میں جاری کیا تھا اور امام اعظمؒ نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اسفار علمی کا آغاز ۱۰۲ھ میں کیا تھا۔

امام مالک کو مدینے کے علم پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ مستقل حجت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مدینہ اسلامی آبادیوں

(۱) تزئین الممالک: ص ۵۲

کی روح اور شہروں کا دل تھا علماء یہاں آتے رہتے تھے اور اپنے علوم کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کر کے استصواب کرتے تھے کیونکہ اب تک مدینہ کے علوم بیرونی معلومات کی آمیزش سے بالکل صاف تھے۔(۱)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسناد و روایت میں اطمینان چاہتا ہے اسے مدینہ والوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

امام اعظم حج کے علمی سفروں میں مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تھے آپ نے اگر پچپن حج کیے ہیں تو پچپن ہی بار مدینہ طیبہ تشریف لے گئے ہیں۔ اولاً اس لیے کہ چونکہ امام صاحب کے یہ سفر علمی ہوتے تھے اور مدینہ اپنی علمی بزرگی میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ایوب بن یزید سے حافظ سخاوی نے نقل کیا ہے کہ علم کو مدینے میں رسوخ حاصل ہوا ہے اور یہیں سے اس کا ظہور ہوا ہے۔(۲)

خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبویؐ میں عبادت:

مدینہ طیبہ میں خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبویؐ میں نماز کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت ہے۔ وفاء الوفاء میں ہے کہ

عمر بن عبدالعزیز صرف سلام کی خاطر دمشق سے مدینہ قاصد روانہ کرتے تھے علامہ السبکی فرماتے ہیں کہ یہ بات امیر المومنین سے روایتی لحاظ سے درجہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے۔(۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے

من جاءَ نی زائراً لا یھمہ‘ الا زیارتی کان حقا علی ان اکون لہ‘ شفیعاً۔

”جو شخص میری زیارت کو آیا اور میری زیارت اس کا مقصد ہو۔ مجھ پر حق ہے کہ میں اس کی شفاعت کروں۔“

یہ حدیث طبرانی میں ہے۔ علامہ عراقی نے حافظ ابوالسکن کے حوالہ سے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔(۴)

---

(۱) مقدمہ مسوی: ص ۳۳ (۲) الاعلان بالتوبیخ: ص ۲۷ (۳) وفاء الوفاء: ۴۰۹

(۴) شرح الاحیاء العلامۃ العراقی: ج ۴ ص ۴۱۶

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے

من زار قبری و جبت له شفاعتی۔

''جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت کا وہ حق دار ہو گیا۔''

علامہ شوکانی نے اس حدیث کی تصحیح حافظ عبدالحق' حافظ تقی الدین السبکی اور حافظ ابن السکن سے نقل کی ہے۔(۱)

حافظ طلحہ بن محمد نے مسند ابی حنیفہ میں زیارت کا مسنون طریق بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بحوالہ امام اعظمؒ روایت کیا ہے۔

ابو حنیفة عن نافع عن ابن عمر قال من السنة ان تاتی قبر النبی صلی الله علیه وسلم من قبل القبلة و تجعل ظهرک الی القبلة و تستقبل القبر لوجهک ثم تقول السلام علیک ایها النبی ورحمة الله وبرکاته۔

---

(۱) نیل الاوطار : ج ۴ ص ۳۲۵۔ اس حدیث کے راویوں میں موسیٰ بن العبدی کو دار قطنی نے مجہول قرار دیا ہے۔ مگر حافظ سخاوی نے دار قطنی کی طرف نسبت کر کے یہ لکھا ہے کہ من روی عن ثقات فقد ارتفعت جهالة (فتح المغیث : ص ۱۳۷) الرفع والتکمیل میں ہے کہ موسیٰ سے صرف دو ثقہ ہی نے روایت نہیں کی بلکہ ان سے ایک سے زیادہ ثقات نے روایت کی ہے حافظ تقی الدین السبکی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے۔ جہالت دو طرح کی ہوتی ہے جہالت عین' جہالت وصف۔ اگر مجہول کہنے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ میں جہالت عین ہے تو یہ تو سرتاسر غلط ہے کیونکہ موسیٰ سے روایت کرنے والے احمد بن حنبل' محمد بن جابر المحاربی' محمد بن اسماعیل الاحمسی' ابو امیہ محمد بن ابراہیم' عبید بن محمد وراق' الفضل بن سہل اور جعفر بن محمد بزوری جیسے اکابر ثقہ ہیں۔ جہالت تو دو کی روایت سے پامال ہو جاتی ہے اور یہ تو یکدم دو نہیں سات ہیں۔ اگر جہالت سے جہالت وصف مراد ہے تو یہ بھی بے بنیاد ہے کیونکہ احمد بن حنبل جیسا فنکار اور ناقد رجال جس سے روایت کرے اس کی شان کی کیا کہنے ہیں۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام) اس پر مبسوط بحث الرفع والتکمیل میں ہے۔

زیارت کا مسنون طریق یہ ہے کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آؤ قبلہ کی جانب سے اور پشت قبلہ کی طرف کر کے چہرہ قبر کی طرف کرو اور یوں کہو اسلام علیک۔ الخ۔

مشہور محدث ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

اعلم ان زیارۃ قبرہ سید المرسلین باجماع المسلمین من اعظم القربات وافضل الطاعات والحج الساعی لنیل الدرجات قریبۃ من درجۃ الواجبات لمن له سعة وترکه غفلة وجفوۃ کبیرۃ۔(۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق بہت بڑی قربت بزرگ ترین طاعت حصول درجات کی بہترین کوشش ہے بشرطیکہ اس کی گنجائش ہو اسے چھوڑنا غفلت ہے۔

بہرحال امام اعظمؒ حج کے موقعہ پر مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے اور امام مالک سے بھی ملاقات آپ کی ہوتی چنانچہ انتصار السالک للامام الکبیر مالک میں ہے کہ جب امام اعظمؒ سے مدینہ کی علمی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا کہ میں نے اس بستی میں علم پھیلا اور بکھرا ہوا دیکھا ہے اگر اسے کوئی سمیٹے گا تو یہ سرخ و سپید رنگ کا لڑکا ہے یعنی امام مالک۔(۲)

اس بستی میں جس میں علم پھیلا ہوا ہے امام اعظمؒ نے جن مشائخ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے ان کی تفصیل تو از بس دشوار ہے لیکن میں یہاں بطور گلے از گلزار چند گرامی قدر ہستیوں کا تعارف ہدیہ ناظرین کرتا ہوں تاکہ اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکیں۔

الحافظ ابو عبداللہ نافع العدوی ۱۱۸ھ:

آپ علم حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ اور حضرت امام ابولبابہؓ کے شاگرد ہیں۔ اور آپ کے سامنے الثقات النبلاء اور الائمۃ الاجلہ مثلاً امام اعظمؒ امام مالکؒ امام لیث بن سعدؒ قاضی ابوبکر بن

(۱) لباب المناسک: ص ۳۳۴ (۲) التعلیق علی الانتقاء فی فضائل الثلاثہ

حزم اور امام زہری نے زانوئے ادب تہ کیا ہے(۱)۔ حافظ عسقلانی نے آپ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پورے تیس سال خدمت کی ہے۔(۳) حضرت عبداللہ امام نافع کو اپنے لیے اللہ سبحانہ کا انعام فرماتے تھے۔(۴) ان کی علم میں جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کو بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ حکومت میں سنن کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مصر روانہ کیا تھا۔(۵) سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک نافع عن ابن عمر اور سالم عن ابن عمر کو کون سا طریق ولر ہا ہے؟ تو آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی راجح نہ بتایا۔(۶) حافظ ابن الصلاح اور حاکم کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام بخاری کے متعلق تو تنقیح الانظار میں حتمایہ دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری کی رائے ہے کہ جس قدر اسانید موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح صرف وہ سلسلہ سند ہے جو بحوالہ امام مالک از نافع از عبداللہ بن عمر آتا ہے بلکہ علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں حافظ ابن الصلاح کی بیان فرمودہ قید اصح الاسانید کلھا سے یہ بات پیدا کر لی ہے کہ "کل مسند فی الدنیا" یعنی دنیا میں جس قدر رواتی اور تاریخی سلاسل موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ معتبر نافع از ابن عمر ہے۔ حافظ ذہبی نے یونس بن یزید کی زبانی نقل کیا ہے کہ امام نافع کو امام زہری سے یہ شکایت تھی کہ زہری بھی عجیب شخص ہیں میرے پاس آتے ہیں اور بحوالہ ابن عمر مجھ سے احادیث سنتے ہیں اور یہاں سے سالم ابن عمر کے پاس جاتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے اپنے والد سے یہ بات سنی ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں۔ ان سے تصدیق کے بعد میری بیان کردہ حدیثوں کو ان کے نام سے پیش کرتے ہیں اور مجھے درمیان سے حذف کر دیتے ہیں۔(۷) امام خلیلی فرماتے ہیں نافع ائمہ تابعین میں سے ہیں ان کی امامت پر اتفاق ہے۔(۸)

ائمہ ستہ کے علاوہ امام مالک نے مؤطا میں' امام محمد نے کتاب الآثار میں اور قاضی ابو یوسف نے ان سے روایات کی تخریج کی ہے۔

---

(۱) اسعاف المبطاء: ص۲۹ (۲) تہذیب: ج۱۱ ص۴۱۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ ص۱۹۴

(۴) تہذیب: ج۱ ص۴۲۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ ص۹۴ (۶) تہذیب التہذیب: ج۱۰ ص۴۱۲

(۷) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ ص۹۴ (۸) تہذیب التہذیب: ج۱۰

عن ابی حنیفة عن نافع عن ابن عمر قال یقتل المحرم الفارة و العقرب والحداة و الکلب العقور والحیات الا الجان۔(۱)

ابن عمر کہتے ہیں کہ احرام والا چوہے، بچھو، چیل، بڑ کے کتے اور سانپوں کو علاوہ سنک کے مار سکتا ہے۔

امام محمد نے کتاب الآثار میں یہ روایت درج کر کے لکھا ہے کہ وبہ ناخذ و ھو قول ابی حنیفة اور مؤطا میں بھی امام موصوف نے یہ روایت بحوالہ مالک عن نافع ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلھن جناح الغراب والفارة والعقرب والحداة والکب العقور (۲)

یہی روایت بالکل ان ہی الفاظ کے ساتھ بروایت یحیٰی مؤطا امام مالک میں بھی موجود ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی روایت کا بحوالہ مالک عن نافع صرف اس قدر حصہ پیش فرمایا ہے۔

خمس من الدواب لیس علی المحرام فی قتلھن جناح۔

اور بحوالہ یونس بن شہاب از سالم پوری روایت نقل کی ہے اور پھر اسی کی تائید میں امام ابوبکر محمد بن شہاب الزہری از عائشہ سے بھی یہی حدیث اس طرح نقل کی ہے۔

خمس من الدواب کلھھن فاسق یقتلن فی الحرم۔

روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف:

یہاں عموماً یہ خلش محسوس کی جاتی ہے کہ جن الفاظ میں محدثین کی معروف کتابوں میں روایات ہوتی ہیں امام اعظم کی روایات میں وہ الفاظ نہیں ہوتے۔ لوگ تعبیر کے اس اختلاف کو دیکھتے ہیں تو بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بات نبوت کی ہے اور تعبیر جامہ بیان کرنے والوں کو اپنا اپنا ہے۔ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ

---

(۱) کتاب الآثار: ص ۸۲ (۲) مؤطا امام محمد: ص ۱۲۰

میں دس شخصوں سے حدیث سنتا تھا بات ایک ہوتی مگر مگر الفاظ مختلف ہوتے تھے

المعنی واحد و اللفظ مختلف۔(۱)

حافظ ذہبی نے سفیان ثوری جیسے امام المحدثین کا قول نقل کیا ہے کہ

ہم اس کا ارادہ کریں کہ جس طرح ہم نے حدیث سنی ہے بعینہ وہ ہی تم کو سنا دیں تو شاید ہم ایک حدیث بھی بیان نہ کر سکیں۔(۲)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی حدیث میں روایت لفظی نہیں ہے بلکہ معنی شیخ کے ہیں اور الفاظ ان کے۔ ابوحاتم جیسا امام تصریح کرتا ہے میں نے کسی محدث کو نہیں دیکھا کہ وہ حدیث کو ایک لفظ میں ادا کرتا ہو بجز قبیصہ کے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں۔

وذالک نادر جدًا و انما یوجد فی الاحادیث القصار علیٰ قلۃ ایضاً فان غالب الاحادیث روی بالمعنی(۳)

روایت باللفظ سے بالکل نادر ہے۔ چھوٹی چھوٹی حدیثوں میں بھی بہت کم ہے احادیث کا زیادہ حصہ روایت بالمعنے پر مشتمل ہے۔

شاید اسی بنا پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ بالغہ میں یہ فرما گئے۔

کان اہتمام جمہور الرواۃ عندالروایۃ بالمعنی بروس المعانی دون الاعتبارات التی یعرفھا المتعمقون۔(۴)

عام راوی روایت بالمعنے کے وقت میں صرف معانی کا اہتمام کرتے تھے۔ ان حیثیات کو پیش نظر نہ رکھتے جن کو تعمق پسند لحوظ رکھتے ہیں۔

اور اسی لیے روایات سے استدلال کرتے وقت صرف مدلول کلام پر نظر ہوتی ہے اسلوب کلام سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

---

(۱) الکفایہ فی علم الراویہ: ص ۲۰۶　(۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۹۲

(۳) توجیہ النظر: ص ۲۳۳　(۴) حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۱۵۶

فاستدلالهم بنحو الفاء والواو وتقديم و تاخير هاونحو ذالک من العمق(۱)

اس لیے حدیث میں فا' واؤ حرف کی تقدیم و تاخیر اور اس قسم کی چیزوں سے استدلال کرنا سرتاسر تعمق ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین جب روایت بالمعنے کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بقول حافظ سیوطی احادیث کا زیادہ ذخیرہ روایت بالمعنے ہی کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی صورت میں الفاظ کے اختلاف سے بدک کر کسی حدیث کا انکار کرنا فن حدیث کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ محدثین کے یہاں جن روایات کو مرفوع کہا جاتا ہے وہ سب فقہاء کے یہاں سنن اور فتاویٰ کی شکل میں موجود تھیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے یہ بات لکھ کر سمجھنے والوں کے لیے کچھ اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ

اصل مذهبه فتاوىٰ عبدالله بن مسعود و قضايا علي و فتاواه وقضايا شريح۔(۲)

ابوحنیفہ کے مذہب کی اساس عبداللہ کے فتاوی اور حضرت علی کے فیصلے ہیں۔

احادیث فقہ اور روایات حدیث:

اسی بنا پر محمد بن ساہ کا کہنا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں۔(۳) یعنی فقہ کے وہ سارے مسائل جو امام صاب کے شاگردوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان سب کا مقام فتاویٰ صحابہ ہونے کی وجہ سے روایات حدیث کا ہے اور ان کا نام احادیث فقہ ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں جس دفتر کا پتہ دیا ہے کہ اس میں فاروق اعظمؓ، علی بن ابی طالبؓ اور ابن مسعودؓ کی مرویات صحیحہ مدون ہیں وہ فقہ کے سوا اور کون سا ہے بلکہ قرۃ العینین میں شاہ صاحبؒ نے جو یہ بات لکھ دی ہے کہ

قرآن حکیم کے بعد اصل دین اور سرمایہ یقین علم حدیث ہے جیسا کہ خود قرآن میں ہے ويعلمهم الكتاب والحكمة اور علم حدیث جو کچھ بھی امت کے پاس موجود

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ا ص ۱۵۶ (۲) حجۃ اللہ البالغہ۔ ص ۱۴۰ (۳) مقدمہ: ص ۷۰

ہے یہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی محنتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ جن جن بزرگوں نے ان دونوں سے
حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کے نام سے روایات بیان کی ہیں وہ صرف اسی قدر
نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مکثرین کی بیشتر احادیث مرفوعہ ابوبکرؓ و عمر کی حدیثیں ہیں
عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ نے ان کی بیان کردہ روایات کو مرفوعاً
پیش کیا ہے اور اہل مسانید نے ظاہر حال کے پیش نظر ان بزرگوں کے مسانید میں
جمع کر دی ہیں۔ یہ بات فن حدیث کے ماہر سے پوشیدہ نہیں ہے۔(۱)

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث دراصل ان بزرگوں کے فتاویٰ ہیں۔
احادیث فقہ اور روایات حدیث کے فرق پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ اگر روایات فقہ اپنے مصنفین سے متواتر ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے۔(۲) تو پھر احادیث فقہ قوت و وثاقت میں بہت زیادہ قوی اور قابل اطمینان ہیں کیونکہ فقہ کے نام پر جو کچھ ہے وہ امام اعظمؒ کا خود ساختہ نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو کچھ علقمہ نے سنا اور علقمہ

---

(۱) قرۃ العینین: ص ۵۵ (۲) منہاج السنہ میں ہے قد نقل ذالک ساتر اصحابه وهم خلق كثير ينقلون مذهبه بالتواتر (ج ۴ ص ۵۷) امام اعظمؒ سے مسائل فقہ بتواتر منقول ہیں حافظ جلال الدین السیوطی نے شیخ الاسلام ملک العلماء عزالدین بن عبدالسلام سے ایک سوال کا جواب کتب فقہ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ کتب فقہ پر اعتماد کرنا علماء میں متفق ہے اور اس بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں ہیں کہ روایات فقہ بالکل صحیح ہیں (تدریب الراوی: ص ۵۸) استاد ابو اسحاق اسفرائنی فرماتے ہیں کہ معتمد کتابوں سے نقل کرنا درست اور اس پر اجماع ہے اور اس کے لیے ان کے مصنفین تک اتصال سند شرط نہیں ہے خواہ یہ کتابیں حدیث کی ہوں یا فقہ کی (تدریب ص ۸۵) اسی بناء پر علماء کے مراسیل کو سب سے زیادہ قوی اور معتبر بتایا ہے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں۔ اعلم ان اقوى المراسيل ما ارسله العلماء من احاديث هذه الكتب اور یہ بھی لکھا ہے اجمعت الامة على جواز اسناد ما في الكتب الصحيحة الى اهلها بعد سماعها اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس معاملہ میں حدیث او... کی کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے لافرق فيما ذكره من علم الحديث و بين سائر علوم الاسلام و مصنفات العلماء الاعلام (الروض الباسم: ص ۱۶-۱۷) (باقی صفحہ ۳۳۲ پر)

سے جو کچھ ابراہیم نخعی نے سنا اور ابراہیم سے جو کچھ حماد نے اور حماد سے جو کچھ امام اعظم نے سنا اسی کا نام فقہ ہے۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ راویوں کی اصل نظر روایت میں مدلول کلام پر ہوتی ہے اسی لیے کتاب الآثار میں جو بات حضرت ابن عمرؓ کی جانب سے بصورت فتویٰ تھی وہ ہی چیز کتب روایت میں حدیث مرفوع بن کر آئی ہے اور بس ورنہ بات ایک ہے۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک جملہ معترضہ تھا یہ اس کتاب کا موضوع نہیں اللہ نے توفیق دی اور انفاس حیات باقی رہے تو انشاءاللہ اس کی تفصیلات امام اعظمؒ اور علم الفقہ میں آئیں گی۔

الحافظ ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ۱۲۴ھ:

یہ بھی صحابہ کرام اور کبار تابعین کے شاگرد ہیں اور بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی' امام لیث' امام مالک وغیرہ ان کے شاگرد ہیں حافظ جلال الدین السیوطی نے اسعاف المبطا میں' حافظ جمال الدین ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اور حافظ ذہبی نے مناقب میں تصریح کی ہے کہ یہ امام اعظمؒ کے استاد ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کا تعارف ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔

احد الاعلام من ائمة الاسلام تابعی جلیل ۔(۱)

(بقیہ صفحہ ۳۳۱) اس لیے جیسے آج ائمہ ستہ حدیث کی کتابوں کو بے اصل بتانا جہل اور احمق ہے ایسے ہی فقہ کی کتابوں کو غیر معتبر کہنا علم کا منہ چڑانے کے مترادف ہے امام محمد کی چھ کتابوں جامع صغیر' جامع کبیر' زیادات' مبسوط' الیسر الصغیر' السیر الکبیر اور قاضی ابو یوسف کی کتابوں الرد علیٰ سیر الاوزاعی' اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ' الامال اور کتب الخرج میں بھی مسائل ہیں بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن المبارک اور امام وکیع کی تصانیف میں بھی یہی مسائل ہیں اور امام سفیان ثوری کی جامع کا بھی یہی ماخذ ہے حافظ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں۔ سفیان الثوری اکثر متابعۃ لابی حنیفۃ منی (ص ۱۲۸) (۱) البدایہ والنہایہ: ج ۹ ص ۳۴۰

اور امام ذہبی فرماتے ہیں

اعلم الحفاظ المدنی الامام ۔(۱)

قوت حافظہ اللہ پاک کی جانب سے بے پایان ارزانی ہوئی تھی۔ صرف اسی روز میں قرآن عزیز نوک زبان کر لیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

اموی خاندان کے مشہور سربراہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہری سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کے لیے کچھ حدیثیں قلم بند کر دیجئے امام زہری نے منشی کو چار سو حدیثیں املا کرائیں باہر تشریف لائے اور محدثین کو ان کا درس دیا۔ کچھ روز کے بعد ہشام نے امام زہری سے کہا کہ وہ آپ کی چار سو حدیثوں والی دستاویز تو ضائع ہو گئی ہے۔ فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر وہی تمام حدیثیں منشی کو بلا کر املا کرائیں۔ ہشام پہلی کتاب نکال کر لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ واقعہ نگار کہتا ہے کہ فاذا هو لم یغادر حرفاً ایک حرف کا بھی دونوں میں فرق نہ تھا۔ (۲)

ان کی علمی جلالت قدر کا یہ حال تھا کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ امام زہری سے استفادہ کرو اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ امام زہری سے زیادہ سنت کا عالم کوئی نہیں رہا۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ محدثین تین ہیں۔ زہری' یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن جریج۔

سب سے صحیح سند:

فن روایت و اسناد میں سب سے معتبر' سب سے مستند اور سب سے زیادہ صحیح اسناد کے متعلق آپ امام بخاری کی رائے سن چکے ہیں۔ لیجئے دوسرے علماء کے خیالات بھی سن لیجئے۔ امام عبدالرزاق جو امام بخاری کے استاذ الاساتذہ ہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ صحیح طریق الزہری عن علی بن الحسین عن الحسین عن علی ہے۔ مشہور محدث بن سلیمان نے امام اسحاق بن ابراہیم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصح الاسانید الزہری عن سالم عن ابن عمر ہے۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ عن عبدالرحمٰن عن القاسم عن عائشہ کو سب سے زیادہ پائیدار اور معیاری

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۰۲　(۲) البدایہ والنہایہ: ج ۷ ص ۳۴۰

سند کہتے ہیں۔ فضیل بن عیاض منصور عن ابراہیم علقمہ عن عبداللہ بن مسعود مقرر کرتے ہیں اور امام بخاری کے مشہور استاد عبداللہ بن المبارک سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ کی سند کو اتنی پائیدار اور صحیح قرار دیتے ہیں اس طریق سے روایت کا آنا گویا ذات نبوت سے سننے کے مترادف ہے اور بھی علماء کے اس موضوع پر خیالات ہیں۔(۱)

ایک لطیف نکتہ:

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کے کام پر زہری کو بھی مقرر کیا تھا اس کی وجہ خود امام زہری کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجھے قاسم بن محمد نے کہا کہ میں تم کو علم کا حریص دیکھتا ہوں کیا میں تم کو علم کا مرکز نہ بتادوں زہری نے فرمایا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس جاؤ کیونکہ یہ حضرت عائشہؓ کی آغوش میں پرورش پائی ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں ان سے ملا ہوں میں نے ان کو علم کا دریائے ناپیدا کنارہ پایا ہے۔(۲)

عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد یہ دونوں حضرت عائشہؓ کے شاگردوں میں سے تھے۔

قاسم بن محمد کی شان علمی:

قاسم بن محمد تو حضرت عائشہ کے برادر زادے اور فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ امام بخاری نے ان کے متعلق تصریح کی ہے۔

قتل ابوہ فربی یتیماً فی حجر عائشۃ فتفقہ بہا۔(۳)

ان کے والد قتل ہو گئے۔ انہوں نے یتیمی کا عرصہ حضرت عائشہؓ کی آغوش میں گذارا اور ان سے علم حاصل کیا۔

قاسم بن محمد مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہترین عالم شمار کیے جاتے ہیں امام یحییٰ بن سعید انصاری نے اپنا اور اس دور کے دوسرے علماء کا ان کے بارے میں یہ تاثر بتایا ہے کہ

---

(۱) الکفایہ فی علوم الروایہ: ص ۳۹۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۰۶

(۳) تہذیب التہذیب: ج ۷ ص ۳۳۴

ہم نے اپنے زمانے میں مدینہ میں علم وفضل میں قاسم سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔
مشہور فقیہ حضرت ابوالزناد ان کے متعلق فرماتے تھے۔
میں نے کسی نوجوان کو فقہ وسنت کا اتنا بڑا عالم اور ذہنی طور پر پختہ رس نہیں پایا جتنا قاسم بن محمد کو۔
خالد بن نزار اور ابن عیینہ کا متفقہ بیان ہے کہ
دنیا میں حدیث عائشہؓ کے سب سے بڑے عالم تین ہیں۔ قاسم عروہ اور عمرہ۔
امام ابن عون بصرہ کے مشہور امام اور حفاظ میں سے ہیں اور جن کو حضرت قاسم سے شرف تلمذ حاصل ہے اور جن کے بارے میں عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں پورے عراق میں عون سے زیادہ دانائے سنت کوئی نہ تھا (تذکرۃ الحفاظ) وہ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے ہیں۔
تین آدمی ایسے ہیں کہ مجھے ان جیسا کوئی نہیں ملا۔ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے اکٹھے ہو کر علم وفضل کو سمیٹا ہے عرق میں ابن سیرین حجاز میں قاسم بن محمد اور شام میں رجاء بن حیوہ۔
حافظ ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ اولیاء میں شاہ اقرانہ علیہ بالعلم کا عنوان قائم کر کے ان کی علمی حیثیت کے بارے میں ان کے معاصرین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔
علوم میں قاسم بن محمد کو صرف فضل وکمال ہی حاصل نہ تھا بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو خاص مجتہدانہ شان سے بھی نوازا تھا۔ الذہبی نے ابن عیینہ کی طرف نسبت کر کے ان کے متعلق جو بات لکھی ہے کہ کان القاسم اعلم اھل زمانہ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے دور کی بے مثال علمی شخصیت تھے ان کی علمیت کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ
زمانہ ابوبکرؓ وعمرؓ ہی سے عائشہؓ مسند افتاء پر فائز تھیں میں ان کے پاس ہی رہا۔ عبداللہ بن عباسؓ سے میں نے استفادہ کیا ابن عمرؓ اور ابوہریرہؓ کے علوم سے بہت زیادہ بہرہ یاب ہوا ہوں۔ (۱)
الغرض ان کی علمی جلالت اور شان امامت پر سب یک زباں ہیں۔

(۱) تہذیب الاسماء: ج ۱ ص ۵۵

عمرہ بنت عبدالرحمٰن کا علمی مقام:

عمرہ بنت عبدالرحمٰن قاضی ابوبکر بن حزم کی والدہ کی بہن تھیں اس لیے قاضی صاحب کی خالہ ہوتی ہیں یہ بھی فقاہت میں بہت بڑی شان جلالت کی مالک تھیں۔ امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ مابقی احد اعلم بحدیث عائشة من عمرة حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کو عمرہ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔(۱) قاسم بن محمد نے امام زہری کو عمرہ سے استفادے کا مشورہ دیا تھا امام زہری کا ان سے ملاقات کے بعد ان کے بارے میں تاثر یہ تھا۔

فوجدتها بحرًا لاینزف۔(۲)

''میں نے ان کو بحر بیکراں پایا ہے۔''

چونکہ امام زہری کے پاس قاسم اور عروہ دونوں کا علم تھا اور حدیث عائشہؓ کا ان دونوں سے بڑھ کر عالم کوئی نہ تھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز نے امام زہری کو بھی قاضی ابوبکر کے ساتھ تدوین سنن کا حکم دیا تھا۔

امام زہری صرف احادیث مرفوعہ ہی نہیں بلکہ آثار صحابہ بھی قلم بند فرماتے تھے چنانچہ معمر کہتے ہیں کہ مجھے صالح بن کیسان نے بتایا ہے کہ میں اور امام زہری طلب علم میں دونوں ہم سفر تھے ہم دونوں مرفوع حدیثیں لکھتے تھے مجھ سے امام زہری نے کہا کہ آثار صحابہ بھی لکھیں کیونکہ وہ بھی سنت ہیں میں نے کہا کہ نہیں امام زہری نے آثار صحابہ بھی لکھے اور میں نے نہیں لکھے۔(۳)

ان کی مرویات ۲۲۰۰ ہیں جو کچھ سنتے تھے قلم بند کرتے جاتے تھے۔(۴)

ارشادات نبوت پر ان کا لکھا ہوا قلمی سرمایہ کس قدر تھا اس کا اندازہ امام معمر کے ا بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بحوالہ امام عبدالرزاق نقل کیا ہے کہ ولید

(۱،۲) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ص۱۱۶ (۳) البدایہ والنہایہ: ج۹ص۳۴۴

(۴) ذکرۃ الحفاظ: ج۱ص۱۰۲

بن یزید کے قتل ہونے کے بعد امام زہری کا علمی سرمایہ جانوروں پر لاد کر سرکاری کتب خانہ سے نکالا گیا۔ علمی توجہ اور طلب علم میں ذوق ولگن اور شوق کا حال یہ تھا کہ امام لیث (۱) بن سعد کہتے ہیں۔

کہ ایک بار کھانے میں زہری کے سامنے پلیٹ رکھی گئی کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس اثنا میں کوئی حدیث یاد آ گئی اس قدر محو ہوئے کہ آپ کا ہاتھ پلیٹ میں رہا اور صبح ہوگئی۔ (۲)

ان کا بھی قلمی سرمایہ ان کے شاگردوں کی وساطت سے آج ذخیرۂ حدیث کی زینت ہے گویا یہ علم حدیث کا زمانہ تابعین یعنی پہلی صدی کے آخر میں کتابی ذخیرہ ہے۔

---

(۱) امام لیث بن سعد کو اکثر اہل علم نے علماء احناف میں شمار کیا ہے چنانچہ قاضی ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اور شیخ الاسلام زکریا انصاری نے شرح بخاری میں ان کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے امام لیث امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں ان کا معمول تھا کہ اکثر حج کے موقعہ پر امام اعظمؒ کی خدمت میں استفادے کی غرض سے حاضر ہوتے اور فقہ کی تحصیل کرتے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ امام ابو محمد حارثی نے فقیہ مصر عبدالرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے لیث بن سعد سے سنا فرماتے تھے کہ مجھے اطلاع ملی کہ امام اعظمؒ کا حج کا ارادہ ہے میں بھی امام صاحب سے استفادے کے خیال سے حج کے لیے چل پڑا۔ آخر مکہ مکرمہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے مختلف ابواب کے بہت سے مسائل دریافت کیے۔ مفتی حجاز علامہ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان میں امام اعظمؒ کے فضائل میں لکھا ہے کہ مشائخ ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظمؒ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے جیسے امام عبداللہ بن المبارک جن کی جلالت شان پر اتفاق ہے اور امام لیث بن سعد اور امام مالک بن انس۔ امام اعظمؒ کی جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے یہی ائمہ کافی ہیں۔ امام لیث نے امام اعظمؒ کی بعض حدیثوں کو امام ابو یوسف کے حوالہ سے روایت کیا ہے چنانچہ امام طحاوی نے مشہور حدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة کو شرح معانی الآثار میں اسی طریق سے روایت کیا ہے اس حدیث کو امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بھی ذکر کیا ہے اس سند کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں چار ائمہ مجتہدین جمع ہیں۔ عبداللہ بن وہب لیث بن سعد ابو یوسف اور ابو حنیفہ۔

(۲) البدایہ والنہایہ: ج ۸ ص ۳۴۴

قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنی مسند میں ان سے روایات لی ہیں۔

عن ابی حنیفة عن الزهری عن انس ان النبی صلی الله علیه وسلم قال من کذب علی متعمدًا فلیتبوء مقعده من النار۔(۱)

''جو شخص مجھ سے جھوٹ بولتا ہے جان کر اسے اپنے ٹھکانا دوزخ بنالینا چاہیے۔''

یہ روایت امام اعظمؒ نے یحییٰ بن سعید کے حوالہ سے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث کو عشرہ مبشرہ اور ستر صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ شیخین، امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ حضرت انسؓ، امام احمد، امام بخاری، امام ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ زبیر۔ امام ترمذی نے بحوالہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دوسرے محدثین نے مختلف صحابہ سے یہ روایت کی ہے حتیٰ کہ امام نووی نے اس کے تواتر کا دعویٰ نقل کیا ہے۔(۲)

ان کے علاوہ مدینے کا باقی شیوخ جن کے سامنے امام اعظم نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ یہ ہیں ...... ابو عبداللہ محمد بن المنکدر ۱۳۰ھ ○ الحافظ یحییٰ بن سعید الانصاری ۱۲۰ھ ○ ہشام بن عروہ ۱۴۶ھ ○ واصل بن داؤد ہاشم ○ بن عتبہ بن ابی وقاص ○ موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ ۱۰۴ھ ○ ابو عبداللہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس ۱۰۷ھ ○ عبداللہ بن دینار ○ عطاء بن یسر ○ عبدالرحمٰن بن ہرمز ۱۱۷ھ ○ عطاء بن السائب ۱۳۶ھ ○ عدی بن ثابت ○ عبداللہ بن علی بن الحسین ○ سالم بن عبداللہ ۱۰۶ھ۔

امام اعظمؒ نے امام مالکؒ سے روایت لی ہے:

مدینہ طیبہ کے مشائخ میں بعض علماء نے امام مالک کے شاگردوں میں حضرت امام اعظم کو بھی شمار کیا ہے اور بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ بھی امام مالک کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس موضوع پر تزئین الممالک میں حافظ سیوطی کو بہت زیادہ اصرار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ شہادتیں بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ

---

(۱) جامع المسانید (۲) فتح الباری: ج ۱ ص ۱۶۴

امام مالک کے استاد ہونے کا ذکر دار قطنی نے کتاب المدبج میں ابن خسرو بلخی نے مسند ابی حنیفہ میں اور خطیب بغدادی نے کتاب الرواۃ میں کیا ہے۔(۱)

دراصل حافظ سیوطی نے دار قطنی اور خطیب بغدادی کی جن دو روایتوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دونوں خود روایتی نقطہ نظر سے محدثین کے نزدیک محل نظر ہیں۔ دونوں روایتیں یہ ہیں۔

عن محمد بن مخزوم عن جده محمد بن ضحاک ثنا عمران بن عبدالرحیم ثنا بکار بن الحسن ثنا حماد بن ابی حنیفة عن ابی حنیفة عن مالک بن انس عن عبدالله بن الفضل عن نافع بن جبیر عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال الایم احق بنفسها من ولیها والکبر تستامر و صمتها اقرارها. اخرجه ابن الشاهین و الدارقطنی۔

رانڈ عورت اپنی زیادہ حقدار ہے اپنے ولی کی نسبت اور نوجوان سے دریافت کیا جائے اس کی خاموشی اقرار ہے۔

خطیب کی روایت یہ ہے:

عن محمد بن علی الصلی الواسطی ثنا ابو زرعة احمد بن الحسین ثنا علی بن محمد بن مهرویه ثنا الجبر بن الصلت ثنا القاسم بن الحکم العرفی ثنا ابو حنیفة عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ قال اتی کعب بن مالک النبی صلی الله علیه وسلم فساله عن راية كانت ترعى فی غنمه فتخوفت علیٰ شاةالموت فذبحتها بحجر فامر النبیؐ باکلها۔

اقوام المسالک میں ہے کہ تمام دفتر حدیث میں ان مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے جس سے امام اعظمؒ کا امام مالکؒ سے تلمذ ثابت ہو لیکن ان دونوں کی تاریخی حیثیت محدثین کے یہاں ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان دونوں روایتوں کی روایتی حیثیت کو محل کلام قرار دیتے ہوئے النکت علی ابن الصلاح میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ

---

(۱) تزئین الممالک: ص ۵۸

لم تثبت روایة ابی حنیفة عن مالک و انما اوردها الدار قطنی ثم الخطیب لروایتین وقعتا لهما باسنادین فیهما مقال۔

امام اعظمؒ کی امام مالکؒ سے روایت ثابت نہیں ہے دارقطنی اور خطیب نے اس بات کا دعویٰ ان دو روایتوں کی وجہ سے کیا ہے جن کی اسناد محل کلام ہے۔(۱)

حافظ صاحب نے ان روایات کی جس اسنادی کمزروی کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ دارقطنی کی روایت میں عمران بن عبدالرحیم راوی ہے۔ یہی شخص اس من گھڑت کہانی کا ذمہ دار ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں حافظ سلیمانی کے حوالہ سے اس کا نام لے کر یہ انکشاف کیا ہے۔

هو الذی وضع حدیث ابی حنیفة عن مالک۔(۲)

''یہی شخص ہے جس نے ابوحنیفہ از مالک کی حدیث بنائی ہے۔''

دراصل روایت صرف اس قدر تھی کہ حماد بن ابی حنیفہ نے امام مالک سے سنا مگر عمران نے درمیان میں ابوحنیفہ کا اپنی جانب سے اضافہ کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابوعبداللہ بن مخلد نے اپنے رسالہ نامی ''مارواہ الاکابر عن مالک'' میں اس کی سند اس طرح بیان کی ہے۔

حدثنا ابو محمد القاسم بن هارون نابکار بن الحسن الاصبهانی ثنا حماد بن ابی حنیفة ثنا مالک بن انس الحدیث۔(۳)

یہ بھی اس کی تائید ہے کہ اصل سند میں حماد بن ابی حنیفہ عن مالک ہے۔ ابوحنیفہ عن مالک نہیں ہے اور جامع المسانید میں بھی سند اس طرح ہے۔ حافظ سیوطی نے اسی سلسلے میں مسند ابی حنیفہ لابی الضیاء کا بھی حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ثم وقفت علیٰ مسند ابی حنیفة لابی الضیاء الذی جمعه من خمسة عشر مسنداً وفیه من روایة ابی حنیفة عن مالک۔(۴)

''مجھے مسند ابی حنیفہ ابن الضیاء کا نسخہ ملا ہے اسے مؤلف نے پندرہ مسندوں سے جمع کیا ہے اور اس میں ابوحنیفہ از مالک کی روایت ہے۔''

---

(۱) التعلیقات علی الانتقاد (۲) میزان الاعتدال: ج ۲ ص ۲۷۸ (۳) التعلیقات علی الانتقاد، (۴) تزیین الممالک: ۵۹

یہ مسند ابی حنیفہ دراصل جامع المسانید کا خلاصہ ہے جامع المسانید بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے اس میں کتاب الآثار کے حوالہ سے یہ روایت ضرور ہے مگر اسے امام محمد بحوالہ امام اعظم عن نافع عن ابن عمر روایت کرتے ہیں۔ البتہ امام محمد نے اپنے مؤطا میں یہی روایت بحوالہ مالک عن نافع عن ابن عمر پیش فرمائی ہے۔

دوسری جگہ روایت خطیب کی ہے اس میں محمد بن الصلت کو غلط فہمی ہوئی اس نے عبدالملک کی جگہ مالک کہہ دیا کیونکہ اس روایت کی جن محدثین نے تخریج کی ہے اس کی تفصیل علامہ خوارزمی نے دی ہے ان تمام روایات میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابو حنیفہ از مالک آیا ہو۔ اس میں اول تو محمد بن المظفر ہ بحوالہ قاسم از ابی حنیفہ ہے اور قاسم کے علاوہ دوسرے طرق میں بحوالہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف ابو حنیفہ از عبدالملک بن عمیر آیا ہے کسی بھی طریق میں ابو حنیفہ از مالک نہیں ہے۔(۱)

اشہب کی روایت سے غلط فہمی:

زیادہ تر غلط فہمی اشہب کی اس روایت سے ہوئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا ہے جیسے بچہ باپ کے سامنے۔ اشہب کا یہ بیان بھی اصول روایت کے مطابق صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب کا سن ولادت حسب بیان ابن یونس ۱۴۵ھ ہے یعنی امام اعظم کی وفات والے سال ان کی عمر صرف پانچ سال کی ہے اس عمر میں ان کا مصر سے مدینہ جانا اور امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے دیکھنا انسانی عقل باور نہیں کرتی۔ کوثری لکھتے ہیں:

> امام ذہبی نے امام مالک کے ترجمہ میں جو واقعہ بیان کیا ہے صحیح نہیں ہے ہاں اگر امام ابو حنیفہ کے صاحبزادے حماد کے متعلق ہو تو شاید درست ہو کیونکہ اشہب کی تاریخ پیدائش ۱۴۵ھ ہے۔(۲)

تعلیقات میں ہے:

---

(۱) جامع المسانید ج ۲ ص ۲۲۶ (۲) اقوام المسالک ص ۷

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اشہب کی زبانی جو کہانی بیان کی ہے وہ تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب امام شافعی کی عمر کے لگ بھگ ہیں یا محتاط سے محتاط اندازے کے موافق امام ابو حنیفہ کی وفات کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال ہوگی ان کی ملاقات امام مالک سے اس دور میں ثابت نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے امام مالک معلم الاطفال نہ تھے کہ اس عمر کے بچے ان کے پاس ہوں۔
دراصل واقعہ کا تعلق ابو حنیفہ سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے حماد سے ہے۔(۱)
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت حدیث محتاج ثبوت ہے اور جن راہوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش سیوطی اور دار قطنی نے کی ہے وہ محدثین کے یہاں نا قابل اعتبار ہیں۔ ورنہ امام اعظم کے لیے یہ خبر قطعا قابل عار نہیں ہے کہ وہ امام مالک سے حدیثوں کا سماع کریں بلکہ محدثین کا کہنا ہے کہ ایک محدث اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ اعلیٰ ہمسر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ امام مالک تو امام اعظم کے اقران میں سے ہیں امام اعظم نے تو اپنے تلامذہ تک سے حدیثیں کی ہیں چنانچہ امام خراسان ابراہیم بن طہمان کے متعلق امام ذہبی نے تصریح کی ہے کہ:

حدث عنه ابو حنيفة۔(۲)

ابن ابی حاتم نے تقدمۃ الجرح والتعدیل میں ابراہیم کے حوالہ سے امام مالک سے روایات سننے کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔
ابراہیم بن طہمان کہتے ہیں میں مدینہ آیا اور حدیثیں لکھی ہیں۔ وہاں سے کوفہ گیا اور امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کیا آپ نے پوچھا مدینہ میں کس سے استفادہ کیا؟ میں نے نام بتایا آپ نے دریافت کیا کہ کیا مالک بن انس سے بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ دکھاؤ۔ بعد ازیں آپ نے قلم دوات منگا کر نقل کیا۔(۳)

---

(۱) التعلیقات علی الانتقاء: ۲۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۹۷ (۳) تقدمۃ الجرح والتعدیل: ص ۳

لیکن روایت اقران کے لیے حلقہ درس میں شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ مذاکرے کے ضمن میں بھی روایت ہو سکتی ہے۔ پھر یہاں خود امام ابوحنیفہ کی امام مالک سے روایت کرنا محققین سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ مغلطائی کی تحقیق:

اگر تاریخی طور پر یہ صحیح ثابت ہو جائے اور حافظ دارقطنی، خطیب بغدادی اور حافظ سیوطی کی بات ہی اپنائی جائے تو پھر حافظ علاء الدین مغلطائی کا یہ دعویٰ صحیح ہو جائے گا کہ اسانید و روایت کی دنیا میں سب سے زیادہ جلیل القدر یہ سلسلہ سند ہے ابو حنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ۔ آپ اصح الاسانید کے سلسلے میں امام بخاری کی رائے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کا طریق سلسلۃ الذہب ہے۔ اسی پر قدم جماتے ہوئے حافظ ابو منصور عبدالقاہر تمیمی نے شافعی از مالک از نافع از ابن عمر کو اجل الاسانید لکھا ہے اس پر حافظ مغلطائی نے حافظ عبدالقاہر کا تعاقب کیا اور بتایا کہ اگر صحت روایت کا مدار جلالت شان اور عظمت قدر پر ہے تو پھر تاریخ کی دنیا میں اجل الاسانید

ابو حنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ

ہے۔ اور اگر جلالت شان نہیں ہے بلکہ اس کا مدار اتقان و ضبط ہے تو پھر ابن وہب (۱) عن مالک الخ یا القعنبی (۲) عن مالک الخ کا طریق بزرگ ترین ہونا چاہیے۔

---

(۱) امام عبداللہ بن وہب بن مسلم اور کنیت ابومحمد ہے۔ ان کا مولد و مسکن مصر ہے چار سو ائمہ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ ابن عدی، ابن یونس ان کی جلالت علمی کا لوہا مانتے ہیں فقہ، حدیث اور عبادات کا ایک مثالی نمونہ تھے ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۷ھ میں وفات پائی ان کے حالات اتحاف النبلاء میں ہیں۔

(۲) نام عبداللہ بن سلمہ بن قعنب الحارثی ہے مشہور قعنبی ہے اصلاً مدنی ہیں مگر بود و باش بصرے میں تھی۔ آخر عمر میں مکہ تشریف لے آئے بہت سے شیوخ وقت سے استفادہ کیا مؤطا کے راویوں میں سے ایک ہیں اتحاف میں ہے کہ از جملہ اصحاب مالک و فضلا و ثقات و خیار ایشاں بود یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ حدیث میں قعنبی نے صرف دو میں دیکھی ہے وکیع بن الجراح اور قعنبی ۱۳۰ھ تاریخ ولادت ہے اور ۲۲۱ھ میں وفات پائی۔

حافظ بلقینی (۱) نے محاسن الاصطلاح میں حافظ مغلطائی کے اس فیصلہ کی صحت اور قوت کو مانتے ہوئے لکھا ہے کہ

امام ابو حنیفة فهو ان روی عن مالک کما ذکره الدارقطنی لکن لم یشتهر روایته عنه کاشتهار روایة الشافعی۔

یعنی اگر ابو حنیفہ عن مالک کو شافعی عن مالک جیسی شہرت ہوتی تو پھر امام بلقینی کے خیال میں امام ابو حنیفہ کی جلالت قدر کی وجہ سے ابو حنیفہ عن مالک الخ ہی سب سے صحیح اور سب سے بزرگ تر سلسلہ سند ہوتا اور دنیائے روایت میں اسی کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا۔ حافظ عراقی نے حافظ مغلطائی اور حافظ بلقینی دونوں کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

امام اعظمؒ کی امام مالکؒ سے روایت جو دارقطنی نے غرائب میں لکھی ہے اس کا سلسلہ سند نافع عن ابن عمر نہیں ہے۔(۲)

یعنی اگر روایت کا سلسلہ فی الواقع یہ ہو کہ ابو حنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر اور روایتی نقطہ نظر سے اس کی صحت ثابت ہو جائے تو پھر حافظ عراقی کی رائے میں اسے ہی اصح الاسانید اور اجل الاسانید ہونا چاہیے۔ یہی بات حافظ عسقلانی نے فرمائی ہے۔

امام اعتراضه بابی حنیفة فلا یحسن لان ابا حنیفة لم تثبت روایة عن مالک۔

حافظ مغلطائی کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ امام اعظمؒ کی امام مالکؒ سے روایت ثابت نہیں ہے۔(۳)

اس کا مدلول بھی یہی ہے کہ اگر ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت ثابت ہو جائے تو پھر تاریخ واسناد کی دنیا میں حافظ عسقلانی کے خیال میں اصح الاسانید یہی ہے اس تمام تفصیل اور

---

(۱) قاضی القضاۃ علم الدین صالح بن سراج الدین البلقینی پورا نام ہے اپنے زمانے میں مذہب شافعی کے زعیم ہیں اصول میں عزالدین بن جماعہ کے شاگرد ہیں حافظ سیوطی نے بھی ان سے اجازت حدیث لی ہے ان کا سن ولادت ۷۹۱ھ ہے اور وفات ۸۶۸ھ میں ہوئی ہے۔

(۲) التعلیق الممجد: ص ۱۶ (۳) مقدمہ فتح الملہم: ص ۳۲

ردوکد سے ضمنی طور پر یہ بات بالکل بے نقاب ہوکر سامنے آ گئی ہے کہ بارگاہ محدثین اور روایت واسناد کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں امام اعظمؒ کا مقام سب سے اونچا ہے۔ اتنا اونچا کہ محدثین کے یہاں آپ کی ذات کو اصح الاسانید کے موقعہ پر بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ اگر معاذ اللہ حضرت امام کی ذات گرامی کسی درجے میں بھی محدثین کے نزدیک مجروح و مقدوح ہوتی یا کوئی بات بھی آپ میں نہ قابل گرفت ہوتی تو اصح الاسانید جیسے نازک ترین موقعہ پر نہ کوئی آپ کا نام لیتا اور نہ بلقینی' عراقی اور عسقلانی جیسے اساطین حدیث ایسے مقام پر خاموش رہتے۔ دراصل یہ ان لوگوں کے لیے سرمہ چشم بصیرت ہے جو امام موصوف کی شان جلالت پر حرف گیری ہی کو پروانہ محدثیت قرار دیتے ہیں۔

امام مالکؒ کی نظر میں امام اعظمؒ کا مقام:

اصل یہ ہے کہ امام مالکؒ امام اعظمؒ کا غایت درجہ اکرام کرتے تھے چنانچہ محمد بن اسمٰعیل بن فدیک کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک اور امام اعظمؒ دونوں کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ دونوں باہم ہاتھ پکڑے جارہے تھے جب دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے تو امام مالک نے ادباً امام اعظمؒ کو آگے کردیا امام اعظمؒ یہ کہتے ہوئے **بسم اللہ ھذا موضع الامان فآمنی من عذابک ونجنی من عذاب النار**۔(۱)

حافظ ابن ابی العوام نے عبدالعزیز بن محمد دراوردی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام اعظمؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں علم پھیلا ہوا دیکھا ہے اگر کوئی سمیٹ سکتا ہے تو یہ سرخ وسفید لڑکا ہے یعنی امام مالکؒ۔(۲)

ظاہر ہے کہ یہ بات امام اعظمؒ نے امام مالکؒ کے بارے میں اس وقت کہی ہے جب کہ عمر چودہ پندرہ سال ہے۔ اس وقت لامحالہ امام اعظمؒ کی عمر پچیس سال کی ہوتی ہے گویا یہ بات امام اعظمؒ نے ۱۰۵ھ میں فرمائی ہے اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہی سال امام اعظمؒ کے اسفار علمیہ کا پہلا سال ہے۔

---

(۱) صدر الائمہ: ج ۱ ص ۳۴ (۲) التعلیقات: ص ۱۲

خود امام مالکؒ امام ابوحنیفہ کا بیحد اکرام کرتے تھے اور اکرام اس لیے نہیں کرتے تھے کہ عمر میں بڑے تھے بلکہ اس لیے کہ امام مالکؒ کو امام اعظمؒ کی فقاہت اور مجتہدانہ شان کا اقرار تھا۔ اور اتنا اقرار تھا کہ اپنے اعمال میں امام اعظمؒ کے کردار کی کاپی کو اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے چنانچہ امام لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ

میں مدینہ میں امام مالک سے ملا ان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہیں۔ فرمایا کہ ابوحنیفہ کے سامنے عرق آلود ہو جاتا ہوں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ امام لیث کہتے ہیں کہ بعد ازیں میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا میں نے ان سے عرض کیا کہ امام مالک کی نظر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے امام اعظم نے فرمایا کہ میں نے سچے اور کھرے جواب میں مالک سے زیادہ تیز اور کھرا کوئی نہیں دیکھا۔(۱)

الغرض امام مالکؒ امام اعظمؒ کے استاد نہیں چنانچہ حافظ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں اور امام ذہبی نے اپنی تصانیف میں امام اعظمؒ کے مشائخ میں امام مالکؒ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیۃ میں علامہ خوارزمی نے جامع المسنید میں اور حافظ ابن حجر نے امام صاحب کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ حضرت امام شافعیؒ نے عبدالعزیز بن محمد راوردی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ

کان مالک ینظر فی کتب ابی حنیفۃ وینتفع بہ۔(۲)

''امام مالکؒ امام اعظمؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ فرماتے۔''

بصرہ:

مشہور اسلامی شہر جو تیسری صدی تک علوم اسلامیہ کا گہوارہ رہا اور وسعت علم کثرت حدیث اور دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اس کا ایک امتیازی مقام تھا۔ امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بصرے کے اندر سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی ایک فہرست دی ہے

---

(۱) التعلیقات: ص ۱۴ (۲) اقوام المسالک: ص ۴۴

اور ایسے ہی کتاب کی نوع ۴۹ میں جہاں امام حاکم نے مختلف شہروں کے ان ائمہ ثقات کا تذکرہ کیا ہے جن کی احادیث پر حفظ و مذاکرہ کی حدود میں اعتماد کیا جا سکتا ہے بصرہ کے ائمہ ثقات اور حفاظ حدیث کا بھی ایک طویل تذکرہ کیا ہے اور تقریباً نصف صد سے زیادہ حفاظ حدیث کے نام بتائے ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

بصرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابن عباسؓ، اور متعدد صحابہ آکر فروکش ہوئے ان میں سب سے آخری حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاصؓ ان کے بعد حسن بصریؒ ابن سیرینؒ ابوالعالیہؒ پھر قتادہؒ ایوبؒ ثابت البنانیؒ یونس بن عونؒ پھر حماد بن سلمہؒ حماد بن زید اور ان کے تلامذہ ہوئے ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی نے لکھا ہے۔

مازال هذا الشان و افر الی راس المائة الثالثة وتناقص جدا الی ان تلاشی۔(۱)

بصرے میں حدیث کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ بصری کے تذکرے میں حافظ ابن المدینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

کان عند یحییٰ بن خریس عن حماد عشرۃ الاف حدیث۔(۲)

بصرے میں محدثین کی اس قدر فراوانی تھی کہ مسند وقت حافظ مسلم بن ابراہیم بصری کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیثیں قلم بند کیں اور دجلہ کا پل جو بصرے سے دس میل ہے اتر کر نہیں گیا۔(۳) ائمہ مجتہدین میں سے امام حسن بصرہ کے رہنے والے ہیں جن کے متعلق امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں ہے۔(۴) اور الامام الربانی محمد بن سیرین جو علم الرویا کے امام ہیں بصرہ کے رہنے والے ہیں اور جن کے پاس امام اعظم نے اپنے ایک خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے اپنے ایک دوست کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں۔

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ بحوالہ الامصار ذوات الآثار (۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حماد بن سلمہ

(۳) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ مسلم بن ابراہیم (۴) کتاب الآثار: ص ۲۰۹

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہے ہیں۔ کھود کر آپ کی ہڈیوں کو جمع کر رہے ہیں اور ان کو جوڑ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو آپ بہت گھبرائے آپ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بصرہ جاؤ تو امام ابن سیرین سے خواب کی تعبیر دریافت کرنا۔ گئے اور جا کر خواب کی تعبیر پوچھی آپ نے فرمایا کہ یہ خواب دیکھنے والا شخص احیاء سنت کا کام کرے گا۔(۱)

امام اعظمؒ ابو حنیفہ طلب علم حدیث کے لیے بصرہ تشریف لے گئے ایک بار نہیں بلکہ بیس مرتبہ سے زیادہ آپ کو بصرہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور وہاں سال بھر قیام کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی نے بحوالہ یحییٰ بن شیبان خود امام صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں اور اکثر سال سے زیادہ وہاں قیام بھی کیا ہے۔(۲)

حضرت امام اعظمؒ کے اسفار علمیہ میں بصرہ ابتدائی اور آخری منزل ہے جیسا کہ آپ پہلے حافظ ابن تیمیہ کی زبانی سن چکے ہیں کہ اسلامی مملکت میں علوم نبوت کے لیے پانچ شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد بصرہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد مکہ و مدینہ میں فاروق اعظمؓ کے تلامذہ نبوت کے حامل تھے۔ بصرہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے علوم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود ابو بکر بصری کا بیان ہے کہ۔

ابن عباسؓ بصرہ تشریف لائے تو تمام عرب میں جسم، علم، بیان، جمال اور کمال میں کوئی ان کی مثال نہ تھا۔(۳)

علامہ کمال الدین البیاضی نے امام اعظمؒ کے علوم کی سند اور ان کے علمی سفر نامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فهو اخذ عن اصحاب عمر عن عمر وعن اصحاب ابن مسعود عن ابن مسعود و عن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس ممن يبلغ العدد المذكور بالكوفة والبصرة والحجاز فى حجه سنة ست و تسعين و بعده۔

امام اعظمؒ کے علوم کا ماخذ بواسطہ اصحاب عمرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور بواسطہ اصحاب

(۱) مناقب امام للذہبی: ۲۲ (۲) الجواہر المضیۃ: ص ۳۶۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۳۸

ابن مسعودؓ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بحوالہ تلامذہ ابن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں ان ہی لوگوں کی مذکورہ بالا تعداد سے امام اعظمؒ نے کوفہ بصرہ مکہ مدینہ میں ۹۶ھ اور اس کے بعد علوم حاصل کیے۔(۱)

بصرہ میں جن حفاظ حدیث سے امام اعظمؒ نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

الامام ابوبکر ایوب بن ابی تمیمہ السختیانی:

علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ نے ان کو سید العلماء کہا ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہم ان کے پاس جاتے تھے جب ان کے سامنے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد گرامی بیان کیا جاتا۔ تو بے اختیار رو پڑتے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ احد الاعلام لکھا ہے۔ امام اشعث ان کو جہبذ العلماء فرماتے ہیں۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ انہوں نے ۴۵ حج کیے ہیں علم حدیث میں جن اساتذہ کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ وہ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ ہیں۔ مثلاً عمرو بن سلمہ القاسم بن محمدؒ نافعؒ عطاءؒ عکرمہ عمرو بن دینار۔

اور جن تلامذہ نے ان سے علمی استفادہ کیا ہے ان میں سے حماد بن زید حماد بن سلمہ امام اعمش، امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ امام مالک اور حضرت امام اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۲) امام شعبہ نے ایک بار ان کی طرف نسبت کر کے حدیث بیان کی تو فرمایا حدثنی ایوب و کان سید الفقہاء۔(۳) ابومعمر کہتے ہیں کہ ایک بار حج کو تشریف لے گئے راستہ میں رفقائے سفر کو پیاس کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ایوب نے فرمایا کہ دوستو! کسی سے نہ کہنا وعدہ کرو سب نے ہاں کی۔ ہاتھ سے زمین پر گول دائرہ بنایا اور دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے دیکھتی آنکھوں پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ خوب پیا جانوروں کو سیراب کیا۔ بعد ازیں حضرت ایوب نے اس پر ہاتھ پھیر دیا زمین ہموار ہوگئی اور پانی ختم ہوگیا۔ ابوالربیع کہتے ہیں کہ میں نے ابومعمر

---

(۱) اشارات المرام: ص ۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ و تہذیب التہذیب (۳) تہذیب الاسماء واللغات

کی زبانی یہ واقعہ رے میں سنا تھا۔ بصرہ آیا تو حماد بن زید سے بیان کیا۔ حماد کہتے ہیں کہ میرے سے عبدالواحد زیاد نے بھی واقعہ اس طرح بیان کیا۔(۱)

حافظ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ حدیث کے ذخیرے میں ان کی آٹھ سو حدیثیں ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حج کا ارادہ کیا حج کی خاطر رخصت ہونے کے لیے امام ایوب کے پاس گیا آپ نے مجھے بتایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امام اعظمؒ بھی حج کو جا رہے ہیں تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے میرا سلام کہنا۔(۲)

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں لکھا ہے کہ امام ایوب کی علمی جلالت، امامت، حافظہ، ثقاہت، علمی بہتات، فہم وفراست اور سیادت پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ امام اعظمؒ نے ان سے جو حدیثیں سنی ہیں وہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں اور اصحاب مسانید میں سے حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ ابوعبداللہ الحسین نے درج کی ہیں۔ مثلاً

ابو حنیفة عن ابی بکر ایوب البصری ان امرأة ثابت بن قیس بن شماس اتت النبی صلی الله علیه وسلم فقالت لا یجمعنی و ثابتاً سقف ابدا فقالت اتختلعین منه بحد یقة التی اصدقک قالت اجل وزیادة قال صلی الله علیه وسلم اماالزیادة فلا واشار الی ثابت فعل۔(۳)

امام ایوب کا تذکرہ امام حاکم نے ان ائمہ حدیث میں کیا ہے جن پر حدیث کے معاملے میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔(۴)

مجھے تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی علمی طلبگاریوں کے وقت ان شہروں کی رونق کا کیا حال تھا۔

امام ایوب کے علاوہ بصرہ کے جن محدثین سے امام اعظمؒ نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ بہز بن حکیم، بکر بن عبداللہ المزنی، عطاء بن عجلان، قتادہ بن دعامہ، مبارک بن فضالہ، یزید بن ابی زید، محمد بن الزبیر، شداد بن عبدالرحمن، ابوسفیان طریف بن سفیان، نصر بن سعد، یزید بن ابی حبیب۔

---

(۱) تہذیب الاسماء واللغات (۲) الانتقاء

(۳) الانتقاء: ص ۱۲۵) (۴) کتاب الآثار

حدیث میں امام اعظمؒ کا نمایاں مقام:

امام اعظمؒ کی علمی رحلتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ امام موصوف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی شیفتگی اور آپ کی حدیثوں کے فراہم کرنے میں محبت اور جانفشانی اس وقت کی جبکہ ابھی تدوین حدیث یعنی تاریخ سنت کی صبح صادق ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے کوفہ کوفہ سے باہر جو تگ و دو کی ہے اس کا اندازہ امام صاحب کے اساتذہ سے ہو سکتا ہے۔

امام اعظمؒ کوفہ سے باہر تلاش حدیث کے لیے اس وقت تشریف لے گئے جبکہ پہلے اپنے گھر کی تمام حدیثیں سمیٹ چکے تھے اور کوفہ میں پھیلا ہوا سارا علمی سرمایہ آپ کی ذات گرامی میں جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم الجوزی نے مشہور محدث یحییٰ بن آدم کے حوالے سے لکھا ہے۔

كان نعمان قد جمع حديث بلده كله

اور علمی سفروں سے فراغت کے بعد بھی بایں وسعت نظر ہمیشہ اس بات کے متلاشی رہتے تھے کہ کوفہ میں کوئی نامور محدث آئے تو اس کی محدثانہ معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔

چنانچہ مشہور محدث امام النضر (۱) بن محمد مروزی جو امام عبداللہ بن المبارک کے گہرے دوست ہیں فرماتے ہیں۔

---

(۱) ان کا پورا نام نضر بن محمد کنیت ابو عبداللہ ہے مرو کے رہنے والے ہیں ابو اسحاق الشیبانی عبدالعزیز بن رفیع' العلاء بن المسیب' محمد بن المنکدر' امام اعمش' امام مسعر بن کدام' امام ابو حنیفہ' یزید بن ابی زیاد اور ابی خباب الکلبی کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ' حسان بن موسیٰ اور علی بن الحسن کے استاد ہیں۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ نضر بن محمد علم' فقہ' عقل اور فضل میں پیش پیش تھے امام عبداللہ بن المبارک کے گہرے دوست تھے امام نسائی اور دار قطنی نے ان کی ثقاہت کو مانا ہے افسوس ہے کہ ایسے بلند پایہ حافظ حدیث اور امام وقت بھی اہل ظاہر کے جملوں سے نہ بچ سکے اور بعض محدثین نے محض اختلاف خیال کی بنا پر ان پر جرح کر ڈالی۔ ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ ہے تقریب' تہذیب اور الجواہر المضیۂ میں ان کا ترجمہ ہے۔

لم ار رجلاً الزم للاثر من ابی حنیفة قدم علینا یحییٰ بن سعید و ھشام بن عروة و سعید بن ابی عروبة فقال لنا ابو حنیفة انظروا اتجدون عند ھؤلاء شیئاً لسمعه۔

میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ حدیث سے وابستہ کوئی نہیں دیکھا ہے ایک بار کوفہ میں یحییٰ بن سعید' ہشام بن عروہ اور سعید بن عروبہ تشریف لائے تو ہم سے امام صاحب نے فرمایا دیکھو ان حضرات کے پاس کوئی حدیث ایسی ہے جو ہم سنیں۔(۱)

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگرچہ مستقل طور پر آپ تکمیل حدیث بصرہ' مکہ' مدینہ اور کوفہ کے اساتذہ سے کر چکے تھے اور تکمیل کے بعد مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے تھے لیکن گاہ گاہ دوسرے شیوخ حدیث سے بھی استفادہ اس خیال سے کرتے تھے کہ ممکن ہے ان کے علمی سرمایہ میں کوئی چیز ایسی ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو امام الجعفر بن محمد نے جو نام بتائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ تلاش وجستجو ان اساتذہ فن حدیث تک ہوتی تھی جو فن روایت اور جمع حدیث میں ممالک اسلامیہ کے اندر شہرت علمی کے مدارج طے کر چکے تھے۔اس کا صحیح اندازہ حافظ عبدالعزیز بن ابی رزمہ کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے جو حافظ (۲) حارثی نے داؤد بن ابی العوام کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

عبدالعزیز بن ابی رزمہ نے ایک بار امام ابوحنیفہ کے علم کا تذکرہ چھیڑا اور اسی سلسلے

---

(۱) الجواہر المضیہ للحافظ عبدالقادر القرشی: ج ۲ص ۱۸۲ (۲) پورا نام ابوعبداللہ حارثی بخاری ہے فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحفص صغیر سے کی تھی اور انہوں نے اپنے والد ماجد امام ابوحفص کبیر سے جو امام محمد کے شاگرد ہیں۔علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان' عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور بہت سے شیوخ سے اس فن کی تحصیل کی تھی۔ حافظ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ خراسان' عراق اور حجاز گئے اور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ استاذ کے لقب سے مشہور ہیں اور علم حدیث میں معرفت کے مالک ہیں۔سمعانی نے مکثر من الحدیث لکھا ہے۔حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں ان کا ذکر شاندار لفظوں میں کیا ہے ماوراء النہر کے عالم' محدث' امام' علامہ ابومحمد عبداللہ جو الاستاذ کے لقب سے مشہور ہیں۔ان کی تاریخ وفات ۳۴۰ھ ہے۔

میں یہ بھی بتایا کہ ایک بار کوفہ میں محدث آئے تو امام ابوحنیفہ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے دیکھو تو ان کے پاس حدیث میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ عبدالعزیز فرماتے ہیں دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے آپ نے پھر اپنے اصحاب سے یہی فرمایا۔(۱)

حافظ ابن ابی العوام قاضی مصر نے امام ابو یوسف کے حوالہ سے امام اعظمؒ کی دستور یہ کا ضابطہ یہ بتایا ہے کہ

امام اعظمؒ کے سامنے جب کوئی بھی مسئلہ درپیش آتا تو اپنے اصحاب سے سب سے پہلے یہ فرماتے بتاؤ اس موضوع پر احادیث وآثار کیا کہتی ہیں۔(۲)

ان تصریحات سے ایک معمولی فہم کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ امام اعظمؒ نہ صرف حدیث کے وافر سرمایہ اور تاریخ السنۃ کے عظیم الشان ذخیرے کے مالک تھے بلکہ مقام اجتہاد پر فائز ہونے اور باوجود تمام علمی پنہائیوں کے آپ ارشادات کے جویا رہتے تھے۔ اور اپنے اصحاب کو ہر نو وارد محدث کے علوم سے خوشہ چینی کی ہدایت فرماتے تھے اور اس دعوے کے ساتھ فرماتے کہ دیکھو شاید ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ اس سے اس طلب وجستجو کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو قدرت کی بخشائشوں نے امام صاحب میں ودیعت فرمائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی کو اپنے زمانے میں ان تمام احادیث کے لیے جن کا تعلق احکام وفقہ اور اجتہاد سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی حافظ اسرائیل بن یونس کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

نعم الرجل نعمان ما کان احفظہ لکل حدیث فیہ فقہ۔(۳)

گویا وقت کے حفاظ حدیث اس معاملے میں امام اعظمؒ کے علمی جلال کا لوہا مانتے تھے اور صرف اسرائیل بن یونس ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے امام صاحب کے بارے میں یہی تاثر رکھتے تھے حافظ محمد بن یوسف الصالح شافعی مؤلف السیرۃ الکبریٰ اپنی مشہور کتاب عقود الجمان میں رقمطراز ہیں۔

---

(۱) صدر الائمہ مکی: ج ۱ ص ۸۳　(۲) تانیب: ص ۱۵۲　(۳) تاریخ بغداد ترجمہ امام اعظمؒ

امام ابو حنیفہ کبار حفاظ اور ناموروں میں سے تھے اگر آپ کی علمی توجہ کا مرکز حدیث نہ ہوتی تو مسائل فقہیہ کا استنباط ہی ممکن نہ تھا۔(۱)

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔آ ئندہ اوراق میں یہ بات آپ کے سامنے کھل کر آئے گی۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت:

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظمؒ نے جن سے روایات لی ہیں ان میں کچھ مجہول ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کی بعد میں آنے والے محدثین نے تضعیف کی ہے۔اسے بنیاد بنا کر کہنے والوں نے مختلف باتیں بنائی ہیں۔

آج سے بہت پہلے شیعی حلقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ چونکہ امام اعظم ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں اس لیے ان کی ذات گرامی حدیث و روایت کے بازار میں کوئی معیاری حیثیت کی مالک نہیں ہے اور یہ امام موصوف کی قلت حدیث کی دلیل ہے۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

امام لحدیث فلانه کان یروی عن المضعفین وما ذالک الا لقلة علمه بالحدیث۔(۲)

چونکہ یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا گیا ہے وہ بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے اس لیے میں پہلے اس فریب کا دامن چاک کر کے ناظرین کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔

اصل یہ ہے کہ راویوں کی تضعیف وتوثیق ایک اجتہادی چیز ہے۔ایک شخص ایک کی رائے میں ضعیف ہے اور وہی دوسرے کے خیال میں ثقہ ہے۔اسی بنا پر حافظ سخاوی نے حافظ ذہبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

اس فن کے علماء میں دو کا کبھی کسی ایک ضعیف کے ثقہ ہونے پر یا ایک ثقہ کے ضعیف ہونے پر اتفاق نہیں ہوا ہے۔(۳)

---

(۱) تانیب:ص ۱۵۶ (۲) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۵۸ (۳) الاعلان بالتوبیخ: ۱۶۷

بادی النظر یہ ایک مبالغہ آمیز دعوی ہے لیکن دو سے عدد مراد نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ سب کا اتفاق مشکل ہے اور یہ ایسا ہے جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں کہ اس مسئلہ پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ یہاں دو سے عدد مراد نہیں اختلاف کی نفی ہے۔ تضعیف و توثیق کے اجتہادی ہونے کی وجہ سے حافظ ذہبی نے اس فن میں لب کشائی کرنے والوں کی ایک سے زیادہ قسمیں قرار دی ہیں۔ فرماتے ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو تخریج میں متشدد ہیں مگر توثیق میں معتدل ہیں۔ ایک دو غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں یہ لوگ جب کسی شخص کی توثیق کریں تو اسے دانتوں سے دبا لینا چاہیے اور اگر کسی کی تضعیف کریں تو دیکھنا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کا کوئی ہمنوا ہے اگر ہے اور اہل فن میں سے کسی نے اس کو توثیق نہ کی ہو تو یہ راوی بہرحال ضعیف ہے اور اگر کسی نے توثیق کی ہے تو پھر ایسے شخص کے بارے میں جرح مبہم ہرگز قبول نہ کی جائے۔(۱) اور اسی بنا پر حافظ سخاوی نے امام نسائی کا یہ زریں فیصلہ نقل کیا ہے۔

لا یترک حدیث الرجل حتی یجتمع الجمیع علیٰ ترکہ۔(۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تضعیف و توثیق اگر منصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہیں تو اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے اور جب امام اعظمؒ کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ آپ فن جرح و تعدیل کے امام ہیں جیسا کہ آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ امام اعظمؒ کا علم حدیث میں پایہ اس لیے کم ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں میں کچھ راوی ضعیف بھی ہیں۔ یہ تو فکر و نظر کا اختلاف ہے ایک شخص ایک محدث کی نظر میں اگر ضعیف ہو تو ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کی نظر میں ضعیف ہو۔ یہ رجال کا سارا دفتر موجود ہے اسے کنگھالئے اور دیکھ لیجئے کہ راویوں کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کیسے کیسے مختلف خیال رکھتے ہیں۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

امام اعظمؒ کا مذہب یہ ہے کہ روایت مجہول قابل پذیرائی ہے اور یہ صرف امام اعظمؒ کا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اکابر کا بھی مسلک ہے۔(۳)

---

(۱) فتح المغیث: ص ۴۸۲ (۲) الرفع والتکمیل: ص ۳۲ (۳) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۵۸

علم اسناد و روایت میں مجہول کا مسئلہ:

مجہول کا مسئلہ علم اسناد و روایت کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کی خاطر ذرا سی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ مجہول کی تعریف خطیب بغدادی نے یہ کی ہے کہ:

محدثین کی زبان میں مجہول وہ شخص ہے جو علمی طلبگاریوں میں کوئی شہرت نہ رکھتا ہو جس سے اہل علم روشناس نہ ہوں اور اس کی حدیث صرف ایک آدھ راوی کی وساطت سے آئی ہو۔ اگر ایک کی جگہ اس سے روایت کرنے والے دو ہوں تو جہالت تو ختم ہو جائے گی مگر عدالت ثابت نہ ہوگی۔(۱)

حافظ ابن الصلاح نے خطیب کی اس تعریف پر اعتراض کیا ہے کہ اگر مجہول وہی ہے جس سے روایت کرنے والا ایک آدھ راوی ہو تو پھر صحیح بخاری میں ایک سے زیادہ ایسی حدیثیں ہیں جن کا راوی ایک کے سوا کوئی نہیں ہے مثلاً مرداس اسلمی کہ ان سے قیس بن حازم کے سوا کوئی اور راوی نہیں ہے۔ مسلم میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں کہ ایک کے علاوہ ان کا راوی کوئی نہیں۔ صحیحین کے مؤلفین کا یہ طرز عمل بتا رہا ہے کہ اگر ایک بھی روایت کنندہ ہو تو مجہول مجہول نہیں رہتا۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے خطیب کی تعریف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محدثین نے راوی کی ذات اور اس کی عدالت کے بارے میں نہ علم کی شرط لگائی اور نہ وہ یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ عدالت کو بتانے والوں کی تعداد درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو۔ اگر وہ ایسی کوئی شرط لگاتے تو دلائل ان کا قطعاً ساتھ نہ دیتے اور یہ شرط بے دلیل ہوتی۔ کیونکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے اور ظنیات میں علمی مقدمات کی شرطیں بے سود اور بے محل ہیں۔ قوت دلیل کی روح تو یہی ہے کہ اگر اس سے ایک بھی روایت کرے اور وہ اس کی توثیق کر دے تو راوی سے جہالت کا دھبہ ہٹ جائے گا اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ خطیب نے مجہول کی تعریف میں دو چیزیں بلا دلیل

---

(۱) الکفایہ فی علوم الروایۃ: ص ۸۸

اضافہ کر دی ہیں۔ ایک مجہول کی طلب علم میں شہرت اور دوسرے اہل علم میں سے دو کا اس سے روایت کرنا۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے خطیب اور ابن الصلاح کے اختلاف کا تذکرہ کر کے خطیب کی ہم نوائی کی ہے اور ابن الصلاح کی بات کو یہ کہہ کر بے وقار کر دیا ہے کہ جن حضرات کو ابن الصلاح نے مثالاً پیش کیا ہے وہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت اتفاقی ہے۔ علامہ نووی بھی السیوطی کے ہم زبان ہیں۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ سیوطی اور نووی نے جس تار پر انگلی رکھی ہے یعنی یہ کہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت مسلم ہے۔ یہ خود ایک مستقل مسئلہ ہے کہ کیا صحبت کے ثبوت کے لیے صرف ایک کا روایت کرنا کافی ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کرنے والے دو ہوں۔ اس سے ہٹ کر پھر بھی بات اپنی جگہ رہتی ہے یعنی اگر غیر صحابی سے روایت کرنے والا ایک ہو تو پھر بھی راوی معروف یا مجہول۔ صحیح بخاری میں خود غیر صحابہ کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن سے روایت کرنے والے ایک ہیں۔

اگر خطیب ہی کی بات صحیح ہو تو پھر بھی بخاری و مسلم جیسی شخصیتیں بھی اس سے محفوظ نہیں۔ حافظ عسقلانی نے اصل اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرمائی صرف عراقی کی مثالوں کی توجیہ کر کے خاموش ہو گئے۔

مجہول کی دو قسمیں:

دراصل مجہول کی دو قسمیں ہیں مجہول العین اور مجہول الوصف۔

مجہول الوصف دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک وہ جو ظاہر و باطن میں مجہول العدالۃ ہو۔ دوسرے وہ جو باطن میں مجہول اور ظاہر میں معروف ہو۔ ان میں ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں مجہول محدثین کے یہاں چند قسموں پر منقسم ہے۔

مجہول العدالۃ ظاہراً و باطناً اس کی روایت جماہیر محدثین کے نزدیک نا قابل قبول ہے۔ دوسرا وہ جو باطن میں مجہول العدالۃ ہو مگر ظاہر میں معروف ہو اسی کا نام محدثین کی زبان میں مستور ہے۔ اس کی روایت قابل قبول ہے۔ امام سلیم رازی کی بھی یہی رائے ہے اور

حدیث کے مشہور مؤلفین کا راویوں کے بارے میں اسی رائے پر عمل بھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ اگر راوی ظاہراً و باطناً مجہول العدالۃ ہو تو جمہور کے نزدیک اس کی روایت ناقابل قبول ہے مگر محدثین ہی کی ایک جماعت اسے قبول کر لیتی ہے۔ روایت مستور کچھ محدثین کے یہاں قابل قبول ہے ابن الصلاح نے اسی کو اپنایا ہے اسے اور نووی نے شرح المہذب میں اسی کی تصحیح کی ہے۔

جمال الدین رسنوی فرماتے ہیں جب کسی شخص کے بارے میں بلوغ اور اسلام کا علم ہو جائے اور اس کی عدالت کا پتہ نہ ہو تو اس کی روایت قابل اعتماد نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ ایسے شخص کی روایت قابل پذیرائی ہے لیکن ضروری ہے کہ وہ اپنے فسق میں معروف نہ ہو کیونکہ معرف الفسق بالاجماع مردود ہے۔

ابن السبکی نے جمع الجوامع میں لکھا ہے کہ مستور کی روایت امام ابو حنیفہ کے نزدیک قابل قبول ہے اور دوسرے محدثین کا خیال اس کے برعکس ہے۔

صاحب فواتح الرحموت فرماتے ہیں کہ مستور کی روایت جمہور کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے غیر ظاہر روایت میں اس کو قبول کیا ہے یہی ابن خلکان کا مختار ہے۔

اختلاف عصر وزمان:

اگرچہ ہماری رائے میں یہ مسئلہ اختلاف عصر و زمان سے تعلق رکھتا ہے جن کے زمانے میں معاشرے میں عدالت غالب ہے وہ مستور کی روایت کو قبول کرتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام اعظمؒ کے دور کے بارے میں لکھا ہے۔

ولاشک ان الغالب علی حملة العلم النبوی فی ذالک الزمان العدالة۔

اسی لیے موصوف نے العصوام الروض الباسم اور تنقیح الانظار میں اور امیر بن اسماعیل یمانی نے توضیح الافکار میں اسے پوری وضاحت اور دلائل سے ثابت کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس مسئلہ کی اساس یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں عدل اصل ہے یا فسق؟ اور اگر عدل ہی اصل ہے تو پھر عدالت کا کیا ہے؟

حافظ ابن تیمیہ نے عدالت کو بھی اختلاف عصر و زمان کا مسئلہ قرار دیا ہے جیسا کہ الجوائری نے ان سے نقل کیا ہے۔ان کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے۔

العدل فی کل زمان ومکان و قوم بحسبه۔

الغرض یہ موضوع بڑا طویل الذیل ہے۔ کچھ جو اتنی بات اتفاق ہے کہ راوی کے لیے عدالت شرط ہے اور کفر مانع روایت ہے۔ کلام صرف اس میں ہے کہ جن کی عدالت کا علم نہ ہو اس میں فیصلہ کن بات یہی ہے کہ اگر راوی اس دور سے تعلق رکھتا ہو جس میں عدالت غالب ہو تو اس کی روایت قابل اعتماد ہوگی۔فخر الاسلام لکھتے ہیں۔

لان العدالة اصل فی ذالک الزمان ۔(۱)

امام اعظمؒ کا زمانہ عدالت کا زمانہ ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ زمانہ امام اعظمؒ میں راویوں پر عدالت غالب تھی اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتی ہے۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم۔(۲)

امام اعظمؒ کی ضعفاء سے روایت ان کی تعدیل ہے:

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد کو اگر کسی مسئلہ پر حدیث صحیح نہ ملتی تھی تو ضعیف ہی پر عمل کرتے تھے اور اپنے مسند میں بھی اس قسم کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔امام موصوف کا یہ طرز عمل حدیث سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ غایت احتیاط کی وجہ سے ہے۔ حافظ ابن مندہ فرماتے ہیں کہ امام ابو داؤد کو جب کسی موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ملتی تو ضعیف راویوں سے روایت لیتے ہیں (الروض الباسم) ان محدثین کا یہ طرز عمل اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ضعیف راویوں سے روایت لینا علم حدیث سے ناواقف ہونے کی نہیں بلکہ فن کا رہونے کی علامت ہے جس حدیث کو یہ اکابر روایت کرتے ہیں جن کے راویوں کو ضعیف کہا جاتا ہے۔ یہ راوی کذاب اور فاسق نہیں ہیں اور نہ ان کی روایات کا درجہ باطل' موضوع' ساقط اور متروک کا ہے۔

---

(۱) الروض الباسم: ج۱ص۱۶۲ (۲) مقدمہ فتح الباری

ضعیف وہ کہلاتی ہے جس کا راوی صادق تو ہو مگر حافظہ اور ضبط کی دولت سے مالا مال نہ ہو یا روایت کے رفع یا اسناد میں اضطراب ہو۔ یہی وہ حدیث ہے جس کے بارے میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اس میں تضعیف کا مدار راوی کا حافظہ ہے اس لیے امام اعظمؒ کا ضعفاء سے روایت لینا فن نا آشنائی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی دلیل ہے۔

بات آئندہ اوراق میں تفصیل سے آئے گی کہ امام اعظمؒ صرف فقہ و حدیث کے امام نہیں بلکہ امام الجرح والتعدیل بھی ہیں۔ اس لیے جن راویوں سے امام اعظمؒ روایت کرتے ہیں یہ ان راویوں کی تعدیل ہے بعد میں آنے والے لوگوں نے اگر امام موصوف سے اپنے علم کی بنا پر ان راویوں کے بارے میں جرح کر کے اختلاف کیا ہے تو یہ ایسی کوئی وزنی بات نہیں ہے جس کو حدیث سے ناواقفیت کی بنیاد قرار دیا جائے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے اسے ذرا کھول کر سمجھایا ہے۔

جن راویوں سے امام اعظمؒ نے روایات لی ہیں اور ان میں سے جن کی تضعیف کی گئی ہے ان کا ضعف اختلافی ہے اور ان کے بارے میں امام اعظمؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ ضعیف نہیں ہیں اس لیے ان سے روایت میں کوئی قباحت نہیں اور اس معاملے میں امام اعظمؒ منفرد نہیں ہیں دوسرے محدثین کا بھی طرز عمل کچھ ایسا ہی ہے اور تو اور امام بخاری اور امام مسلم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ امام احمد کی حدیث میں جلالت شان سے کون واقف نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ضعیف راویوں سے حدیثیں روایت کرتے ہیں۔(۱)

بلکہ خود امام بخاری بھی ایسے حضرات سے روایت کرتے ہیں جن کی توثیق و تضعیف خود ائمہ حدیث کے نزدیک اختلافی ہے۔ حسن بن عمارہ کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب المناقب میں حدیث موجود ہے۔ حالانکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ:

اطبقوا علیٰ ترکہ(۲)

---

(۱) الروض الباسم: ج اص ۱۶۲ (۲) مقدمہ فتح الباری

ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں۔ ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں ایک حدیث روایت کی ہے مگر ان کا حال یہ ہے کہ نسائی متروک کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے ان پر جھوٹی حدیثیں بنانے کی تہمت لگائی ہے۔ حافظ ابن حبان کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ احادیث کی چوری بھی کرتا ہے حتیٰ کہ مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے صاف لکھ دیا ہے کہ

لم ار لاحد توثیقاً۔(۱)

اور امام مسلم اپنی صحیح میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے حدیث لائے ہیں۔ اس بنیاد پر کیا کوئی عقل مند امام بخاری اور امام مسلم کو علم حدیث سے بے بہرہ اور ناآشنائے فن کہہ سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ انصاف انصاف

ذرا معاملے کے اس پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ امام اعظمؒ کے یہاں قرآن کے بعد اصل چیز سنت ہے اور مسائل کے اثبات کے لیے وہ سنت ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ اور سنت ہی کو وہ احادیث کی صحت کا معیار قرار دیتے ہیں اور جو حدیث سنت کے خلاف ہو اسے وہ شاذ قرار دیتے ہیں چنانچہ امام ابو یوسف ایک مقام پر اس معیار کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں۔

احادیث میں بہتات ہو رہی ہے اور ایسی روایات نمایاں ہو رہی ہیں جو نہ معروف ہیں نہ ان کو فقہاء جانتے ہیں اور نہ وہ قرآن وسنت کے موافق ہیں اس لیے ایسی شاذ روایات سے بچ کر رہو اور ان حدیثوں کو اپناؤ جن کی پشت پر جماعتی عمل کی تائید ہو جو فقہاء کے یہاں معروف ہوں اور جو کتاب وسنت کے موافق ہوں۔(۲)

ضعیف روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے:

اگر ایک مسئلہ امام اعظمؒ کے یہاں سنت سے اس دور میں ثابت ہے جب کہ امام ذہبی کی تصریح کے مطابق السنن مشہورۃ والبدع مکبوتۃ۔ سنتیں معاشرے میں عام ہیں تو پھر ان احادیث کی حیثیت امام اعظمؒ کے یہاں صرف توابع اور شواہد کی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ فتح الباری (۲) الرد علی سیر الاوزاعی

امام اعظمؒ نے ضعفاء سے جو روایات لی ہیں ان کا درجہ شواہد اور متابعات کا ہے ورنہ نفس مسئلہ تو قرآنی عموم، سنت یا قیاس سے ثابت ہے۔ ثابت شدہ مسائل کے لیے ان روایات کو بطور شواہد پیش فرمایا ہے۔ یہی طرز عمل امام مالک کا بھی ہے۔ چنانچہ امام موصوف نے عبدالکریم بن ابی المخارق المصری کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر تمہید میں رقمطراز ہیں کہ عبدالکریم کا مجروح ہونا اتفاقی ہے۔ ایسے ہی امام شعبہ نے باوجود جلالت قدر کے ابان بن ابی عیاش سے روایت لی ہے حالانکہ موصوف نے خود ابان کی پوزیشن یہ بیان کی ہے کہ ابان کی روایت کے مقابلے میں مجھے گدھے کا پیشاب پی لینا گوارا ہے۔ امام سفیان ثوری نے بعض لوگوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان سے روایت نہ لی جائے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ تو ان سے روایت لیتے ہیں۔ فرمایا میں ان ہی احادیث کی ان سے روایت کرتا ہوں جن سے میں خود واقف ہوں۔ امام مسلم کی صحیح کو اٹھا کر دیکھئے وہ گاہ گاہ علو اسناد کی خاطر صحیح سند کو چھوڑ کر ضعیف سند سے روایت لیتے ہیں یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ علم حدیث کے فن کاروں کا ضعفاء سے روایت لینا ناآشنائے فن ہونے کی نہیں بلکہ امام فن ہونے کی علامت ہے۔(۱)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس بنیاد پر امام اعظمؒ کو ناآشنائے فن قرار دیتے ہیں۔ وہ خود علم حدیث کی گہرائیوں سے ناآشنا ہیں اگر ان کو فنی واقفیت ہوتی تو ان کی زبان قلم پر ایسی غیر ذمہ دارانہ بات ہرگز نہ آتی۔ یہاں بھی حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر پتے کی بات فرما گئے ہیں۔

امام اعظمؒ اس فن کے مشہور حفاظ میں سے تھے صرف اتنی بات ہے کہ عمر رسیدہ ہونے کے بعد آپ کے حافظہ میں پہلے جیسی قوت نہ تھی اور آخر عمر میں حافظہ میں قوت نہ رہنا صرف امام اعظمؒ کی خصوصیت نہیں ہے اس میں دوسرے ائمہ بھی امام اعظمؒ کے شریک ہیں یہ نہ کوئی عیب ہے اور نہ ان کی شان اجتہاد اور محدثانہ مقام پر کوئی حرف ہے۔ امام الحسن المصری، ابو قلابہ، ابو العالیہ اور امام عطاء کے مقابلے میں

---

(۱) الروض الباسم: ۱۶۹

سعید بن المسیب' محمد بن سیرین اور ابراہیم نخعی کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے سوا اوروں کا علم مخدوش ہے امام اعظم کی احادیث پر جن محدثین نے کلام کیا ہے اس کا منشاء بھی قوت حفظ ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے علم حدیث اور اجتہاد پر حرف گیری ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مقابلے میں فلاں کا حافظہ تیز ہے۔(۱) لیکن صرف حافظہ کی قوت نہ سرمایہ فضیلت ہے اور نہ علمی تفوق و برتری کی نشانی ہے آخر صحابہ میں ابو ہریرہؓ سے زیادہ حافظ حدیث کون ہوگا لیکن صحابہ میں اعلم' افقہ اور افضل حضرت ابوہریرہؓ نہ تھے۔(۲)

حافظہ پر حافظ ابن القیم نے الوابل الصیب میں ایک مفید اور کارآمد نصیحت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا باہم فتاویٰ میں کیا مقابلہ حضرت ابوہریرہؓ بے شک حافظ حدیث ہیں اور تمام امت میں علی الاطلاق حافظ ہیں حدیث کو جیسے سنا بیان کر دیا ان کی ساری تگ و دو کا مرکز صرف حفظ روایات تھا۔ برخلاف حضرت ابن عباسؓ کے کہ ان کی تمام تر ہمت تفقہ اور استنباط مسائل پر مرکوز تھی۔(۳)

---

(۱) واضح رہے کہ حافظ بن ابراہیم الوزیر کے اس فکر کی بنیاد کہ عمر رسیدہ ہونے پر حافظہ میں پہلے جیسی قوت نہ رہی تھی اس پر ہے کہ موصوف کی تحقیق میں امام اعظمؒ نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں وقد جاوز التسعین فی العمر شاید حافظ صاحب موصوف امام اعظم کی ولادت ابن زداد کی روایت کے مطابق ۶۱ھ مانتے ہیں سمعانی نے انساب میں ۷۰ھ لکھا ہے ابن حبان کی کتاب الجرح والتعدیل اور ابوالقاسم سمنانی کے روضۃ الصفاء میں بھی یہی تاریخ ولادت ہے بلا ریب ولادت اگر ۶۱ھ اور وفات ۱۵۰ھ ہے تو عمر نوے سال ہوتی ہے بعض محققین کے نزدیک راجح یہی ہے۔

(۲) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۶۹

(۳) الوابل الصیب: ص ۴۸

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حبر الامۃ اور ترجمان ہیں مگر ان کی ساری ان حدیثوں کی تعداد جن میں دید وشنید کی تصریح ہے شاید بیس سے زیادہ نہ ہو لیکن حدیث وقرآن سے ان کے فقہ واستنباط کا حال یہ ہے کہ ان کے علم وفقہ سے دنیا بھرپور ہے۔
حافظ ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے۔

جمعت فتاواہ فی سبعۃ اسفار کبار (۱)

حالانکہ جس طرح اور لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضرت ابن عباسؓ نے بھی سنا یہاں الجزائری نے جو امام ترمذی سے اسی موضوع پر نقل کیا ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے فرماتے ہیں۔
کچھ محدثین نے اجلہ اہل علم پر کلام کر دیا ہے اور صرف حافظہ کی بنا پر ان کی تضعیف کی ہے اگرچہ اوروں نے ان کی جلالت شان اور صداقت کے پیش نظر ان کی توثیق کی ہے۔(۲)
الجزائری نے یہ نقل کرنے کے بعد جو اس کے متعلق آخری بات بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے۔

لم یسلم من الخطاء والغلط احد من الائمۃ مع حفظھم۔(۳)

خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں:

یہ واقعہ ہے کہ علم وتحقیق کے میدان میں غلطی اور خطا کے دھبے کچھ نہ کچھ سب کے دامنوں پر ہیں۔
حافظ ذہبی نے سچ لکھا ہے۔

انا لاندعی العصمۃ من السھو والخطاء فی الاجتھاد فی غیر الانبیاء۔(۴)

---

(۱) ابوابل الصیب: ص ۲۸ (۲) توجیہ النظر (۳) میزان الاعتدال: ج ا ص ۲۔

ایسے ہی خطیب نے لکھا ہے لم یکونوا معصومین من الزلل ولا امنین مفارقۃ الخطاء والخطل۔ (موضح اوہام الجمع والتفریق: ج ا ص ۶)

(۴) التقیید والایضاح لما اطلق واغلق من مقدمۃ ابن الصلاح: ص ۱۲۴

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم نے تاریخ ورجال کے سلسلے میں امام بخاری کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ابی حاتم نے امام بخاری کے تاریخی اوہام پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "کتاب خطاء البخاری" ہے اس کتاب میں ابن ابی حاتم نے ان دونوں حضرات سے بیشتر استفادہ کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جمع فیہ اوھامہ فی التاریخ

علامہ سخاوی فرماتے ہیں۔

لابن ابی حاتم جزء کبیر عندی انتقد فیہ علی البخاری۔(۱)

خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

قد جمع عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی الاوھام التی اخذ ابو زرعة فی کتاب مفرد۔(۲)

وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب بالکل نوعمری میں مرتب کی تھی جب کہ امام موصوف کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی اس لیے اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے نام امام موصوف کو ایسے نوشتوں سے نقل کرنے پڑے کہ جن پر نہ نقطے لگے ہوئے تھے۔ اور نہ ان کو ضبط کیا گیا تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے ابوعلی صالح بن محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ

ایک بار ابوزرعہ رازی نے ان سے فرمایا کہ اے ابوعلی! اسماء الرجال پر محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب میری نظر سے گذری اس میں تو بڑے غلطیاں ہیں میں نے ان سے عرض کیا مصیبت یہ ہے کہ ان کے پاس بخارا کا جب کوئی شخص عراق سے ہوکر آتا تھا یہ اس کی کتاب لے کر دیکھتے تھے۔ اہل بخارا کی عادت ہے کہ نہ تو وہ اسماء کو ضبط کرتے ہیں اور نہ ان پر نقطے لگاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کی نظر سے کوئی ایسا نام گذرتا کہ جس سے یہ پہلے واقف نہ ہوتے اور نہ ان کی اپنی کتابوں میں موجود

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۱۰ (۲) موضح اوہام الجمع والتفریق: ج ۱ ص ۸

موجود ہوتا تو یہ اسے غلط طور پر اپنی کتاب میں نقل کر دیتے۔ ورنہ خراسانیوں میں ان سے زیادہ سمجھ دار میں نے کسی کو نہیں پایا۔(۱)

خطیب بغدادی نے موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے ان اوہام و اغلاط کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ اور کتاب مذکور میں ۲۱۲ صفحات اسی تذکار پر مشتمل ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ امام بخاری کے بعض حامیوں نے بجائے اس کے کہ ان تنقیدات وتعصبات کا کوئی علمی اور تحقیقی جواب دیتے۔ امام ابوزرعہ امام ابوحاتم اور امام مسلم پر نہایت ہی گری ہوئی زبان میں حملے لیے اور الزامات لگائے۔ چنانچہ کہنے والے یہاں تک کہہ گئے۔

تاریخ میں محمد بن اسماعیل کی کتاب ایسی ہے کہ اس پر کوئی کتاب سبقت نہ لے جا سکی اور ان کے بعد جس نے بھی تاریخ یا اسماء الرجال پر کچھ لکھا ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں ہے کچھ لوگوں نے اس کتاب کو اپنی ہی بنا لیا ہے جیسے ابوزرعہ ابو حاتم اور مسلم۔ اور کچھ نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

یہ حاکم کبیر کی رائے ہے جسے علامہ تاج الدین السبکی نے الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حاکم کبیر کو زیادہ غصہ امام مسلم پر ہے وہ فرماتے ہیں۔

جو شخص بھی امام مسلم کی کتاب الاسماء والکنیٰ کا غور سے مطالعہ کرے گا۔ اسے پتہ لگ جائے گا کہ امام مسلم کی کتاب بالکل امام بخاری کی کتاب کی کاپی ہے۔

لیکن یہ حاکم کبیر کی غلطی اور محض بدگمانی ہے جو سرتا سر واقعہ کے خلاف ہے۔ تعجب ہے کہ کچھ بزرگوں نے خود امام بخاری پر بھی یہی الزام لگایا ہے چنانچہ ان ہی حاکم کبیر کے معاصر حافظ مسلمہ بن قاسم اندلسی کتاب الصلہ میں لکھتے ہیں کہ

امام بخاری نے اپنے استاد علی بن المدینی کی کتاب العلل کو ان کی غیر حاضری میں ان کے صاحبزادے کو مال کی طمع دے کر حاصل کیا اور پھر اسی کتاب کی عبارتوں کو اپنی طرف سے علی بن المدینی کے سامنے پیش کرتے رہے اور آخر اسی کی وجہ سے درس سے بے نیاز ہو کر خراسان کی راہ لی۔

---

(۱) موضوع اوہام الجمع: ج ۱ ص ۷۔ تہذیب مغدیب ترجمہ امام بخاری

یہ واقعہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال میں امام ابو زرعہ، امام ابو حاتم اور امام مسلم کا جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان بزرگوں کی نسبت اس قسم کی خیانت علمی اور سرقہ کا کون گمان کر سکتا ہے غور فرمایئے تاریخ و رجال میں راویوں کے نام ان کے شیوخ و تلامذہ، اوطان، سنین ولادت و وفات اور جرح و تعدیل کا بیان ہوتا ہے۔ اب راویوں کے نام وہی، شیوخ و تلامذہ وہی، وطن وہی، سنین ولادت و وفات وہی اور جرح و تعدیل میں اکثر و بیشتر اتفاق رائے۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ یہ سب امور یکساں اور متحد ہے معاصرین ائمہ فن کی تصنیفات میں اکثر و بیشتر معلومات کا ایک جیسا ہو جانا کون سے تعجب کی بات ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ ان ائمہ نے اپنی تصانیف میں امام بخاری کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کتاب سامنے نہ ہوتی تو تنقید کس پر کرتے بلکہ ترتیب بھی ہی اختیار کی ہے۔ اور اسی لیے حاکم کبیر کو شبہ ہو گیا کہ امام مسلم وغیرہ امام بخاری کی کتاب کو اپنے نام سے منسوب کر رہے ہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادی ان ہی حاکم کبیر سے ناقل ہیں۔

مجھ سے حاکم کبیر ابو احمد محمد بن محمد نیشاپوری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں رَے میں تھا کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ ابو محمد بن ابی حاتم کے پاس کتاب الجرح والتعدیل پڑھ رہے ہیں پھر جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے ابن عبدویہ وراق سے کہا کہ یہ کیا ہنسی کر رکھی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب التاریخ کو اس کتاب کی شکل میں اپنے استاد کے سامنے پڑھ رہے ہو۔ حالانکہ تم اسے ابو زرعہ اور ابو حاتم کی بتاتے ہو اس پر وراق نے کہا کہ اے ابو احمد تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت ابو زرعہ اور ابو حاتم کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو ان بزرگوں نے کہا کہ یہ علم خوب ہے اس سے بے پروائی نہیں ہوتی جا سکتی اور ہم لوگوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم اسے دوسرے سے نقل کریں اس لیے ان دونوں حضرات نے ابو محمد عبدالرحمٰن رازی کو بٹھایا وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک راوی کے متعلق ان سے پوچھتے گئے اور پھر یہ دونوں حضرات

کہیں اس کتاب سے زیادہ اور کہیں اس سے کم بیان کرتے چلے گئے اور اسے عبدالرحمٰن نے ان دونوں کی طرف منسوب کر دیا۔(۱)

حاکم کبیر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امام بخاری کی تاریخ امام ابوزرعہ اور امام ابو حاتم کے سامنے آئی ان بزرگوں کی علمی جلال نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے وطن کا علمی معاشرہ اس فن میں باہر کا دست نگر رہے۔ انہوں نے اسی ڈھنگ اور اسی اسلوب پر عبدالرحمٰن رازی کو ایک مستقل کتاب املاء کرائی جو معلومات کے سرمایہ میں امام بخاری کی کتاب سے زیادہ ہے۔ اسی کتاب کا نام الجرح والتعدیل ہے۔ امام ذہبی رقمطراز ہیں۔

كتابه في الجرح والتعديل يقضي له بالرتبة العليا في الحفظ۔(۲)

بہر حال خطا اور غلطی سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے اور خطا اور غلطی سے فن آشنائی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

خیر یہ بات تو ضمنی تھی۔ گفتگو تو امام اعظمؒ کے اساتذہ کے متعلق ہو رہی تھی۔ اور درمیان میں یہ بات آ گئی تھی کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ

- امام اعظمؒ نے مجاہیل سے روایت کی ہے۔
- امام اعظمؒ نے ضعفاء سے روایت کی ہے۔
- امام اعظمؒ کے حافظہ میں قوت نہ رہی تھی۔

اس لیے امام اعظمؒ کا علم حدیث میں کوئی مقام نہیں ہے۔ ان ہی وساوس اور ہواجس کو دور کرنے کی میں نے ان صفحات میں کوشش کی ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظمؒ کے مشائخ:

آیئے اب امام اعظمؒ کے مشائخ میں ان اکابر پر ایک نظر ڈال لیجئے جن کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔

---

(۱) موضح اوہام الجمع والتفریق: ج ۱ ص ۸ (۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن ابی حاتم

۱-	ایوب بن ابی تمیمہ ابوبکر السختیانی	طبقہ رابعہ	۱۳۱ھ
۲-	الحکم بن عتیبہ ابومحمد الکوفی	//	۱۱۵ھ
۳-	ربیعہ بن عبدالرحمن	//	۱۳۶ھ
۴-	زید بن ابی انیسہ	//	۱۲۵ھ
۵-	سالم بن عبداللہ	طبقہ ثالثہ	۱۰۶ھ
۶-	شیبان بن عبدالرحمن ابومعاویہ	طبقہ خامسہ	۱۶۴ھ
۷-	طاؤس بن کیسان ابوعبدالرحمن الیمانی	طبقہ ثالثہ	۱۰۶ھ
۸-	عامر الشعبی ابوعمر الہمدانی	//	۱۱۰ھ
۹-	عبداللہ بن دینار ابوعبدالرحمن	طبقہ رابعہ	۱۲۷ھ
۱۰-	عبدالرحمن بن ہرمز	طبقہ ثالثہ	۱۱۷ھ
۱۱-	عبدالملک بن عمیر	طبقہ ثالثہ	۱۳۶ھ
۱۲-	عطاء بن ابی رباح	//	۱۱۴ھ
۱۳-	عطاء بن یسار	//	۱۱۳ھ
۱۴-	عکرمہ مولی ابن عباس	//	۱۰۷ھ
۱۵-	عمرو بن دینار الحافظ ابومحمد	طبقہ رابعہ	۱۲۶ھ
۱۶-	عمرو بن عبداللہ ابواسحاق	//	۱۲۷ھ
۱۷-	القاسم بن معین بن عبدالرحمن	طبقہ خامسہ	۱۷۵ھ
۱۸-	قتادہ بن دعامہ	//	۱۱۷ھ
۱۹-	مبارک بن فضالہ للقرشی	//	۱۳۰ھ
۲۰-	محمد بن المنکدر رابوعبداللہ القرشی	//	۱۳۰ھ
۲۱-	مسلم بن تدرس ابوالزبیر المکی	طبقہ رابعہ	۱۲۸ھ

۲۲-	محمد بن مسلم بن شہاب الزہری	//	۱۲۴ھ
۲۳-	منصور بن المعتمر ابو عتاب الکوفی	//	۱۳۲ھ
۲۴-	نافع مولیٰ ابن عمر ابو عبداللہ	طبقہ ثالثہ	۱۱۷ھ
۲۵-	ہشام بن عروہ القرشی	طبقہ رابعہ	۱۴۶ھ
۲۶-	یحییٰ بن سعید الانصاری	//	۱۴۳ھ

یہ وہ حفاظ حدیث ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ کا مقام:

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے یہ صحابہ سے لے کر امام ذہبی کے زمانے تک کے حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

هذه تذكرة باسماء معدلى حملة العلم النبوى ومن يرجع الى اجتهادهم فى التوثيق والتضعيف والتصحيح والتزييف۔

یہ ان حاملان علم نبوی کا تذکرہ ہے جن کی بارگاہ علم سے راویان حدیث کو ثقاہت اور عدالت کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے اور جن کی رائے راویوں کے ثقہ ہونے' ضعیف ہونے' کھرا ہونے اور کھوٹا ہونے میں فیصلہ کن ہے۔

حافظ صاحب نے اس کتاب میں یہ اصول پیش نظر رکھا ہے اور اس کتاب میں کسی ایسے شخص کا تذکرہ نہیں کیا جس میں ان کی بیان فرمودہ حیثیت موجود نہ ہو بلکہ کم از کم درجے میں کسی ایسے شخص کا بھی ترجمہ نہیں لکھا جو عالم فقیہ ہونے کے باوجود حافظ نہیں ہے۔ چنانچہ خارجہ بن زید اگرچہ فقہائے سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے متعلق صاف لکھ دیا۔

انه' قليل الحديث فلهذا لم اذكره فى الحفاظ۔(۱)

"یہ قلیل الحدیث ہیں اسی لیے میں نے ان کا حفاظ میں تذکرہ نہیں کیا۔"

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۸۲

اسی طرح امام ذہبی نے اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو اگرچہ حافظ حدیث تھے مگر ارباب حدیث کی بارگاہ میں متروک الروایۃ خیال کیے جاتے تھے چنانچہ ہشام بن محمد کلبی کے بارے میں جو بہت بڑے محدث اور حافظ تھے لکھتے ہیں۔

هشام بن محمد الكلبي الحافظ احد المتروكين ليس بثقة فلهذا لم ادخله بين حفاظ الحديث۔(۱)

''یہ متروک ہیں' ثقہ نہیں ہیں اسی لیے میں نے ان کو حدیث کے حفاظ میں داخل نہیں کیا۔''

ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ نتائج خود بخود آ جائیں گے۔

(الف) امام اعظمؒ کے تمام اساتذہ ان ائمہ حدیث میں سے ہیں جن کی حیثیت صرف محدث کی نہیں بلکہ ان معدلین کی ہے جن کی گرامی قدر رائے راویان حدیث کی توثیق و تضعیف میں محدثین کے یہاں میزان و معیار ہے۔

(ب) یہ قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہیں۔ اگر یہ قلیل الحدیث ہوتے تو پھر امام ذہبی ان کا ذکر نہ کرتے۔

(ج) یہ وہ حفاظ ہیں جن کا مقام علم حدیث میں اعتباری اور استدلالی ہے اگر وہ متروک ہوتے تو ہشام کی طرح تذکرۃ الحفاظ ان کے تراجم سے خالی ہوتا۔ اور اگر ایک طرف ان تصریحات سے امام اعظمؒ کے اساتذہ کے متعلق یہ ثابت ہو رہا ہے تو دوسری طرف خود امام اعظمؒ کے بارے میں بھی یہ حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔

امام اعظمؒ کا حفاظ حدیث میں مقام:

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام اعظمؒ کا ترجمہ تذکرۃ الحفاظ میں موجود ہے تو پھر امام ذہبی کے اصول کے مطابق امام اعظمؒ کی ذات گرامی ارباب حدیث کے نزدیک ان معدلین رواۃ کی ہے جن کی رائے پر راویوں کی ثقاہت' عدالت اور صداقت کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں امام ذہبی نے اسے واقعہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ

بنا کر پیش کیا ہے چنانچہ فقیہ مدینہ حضرت عبداللہ بن ذکوان مدنی کے متعلق تذکرہ میں جہاں سفیان ثوری نے امام احمد سے توثیق کے الفاظ نقل کئے ہیں وہاں سب سے پہلے امام اعظمؒ کے الفاظ کو نمایاں طور پر پیش کر کے فقیہ مدنی کی تعدیل کی ہے۔

قال ابو حنیفة رایت ربیعة و اباالزناد و ابو الزنادا فقه الرجلین۔

''ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابوالزناد زیادہ فقیہ ہیں۔''

امام جعفر الصادق کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں ہے نامی گرامی شخصیت ہیں امام مالک' سفیان ثوری جیسے اساطین حدیث کے استاد ہیں۔ امام ذہبی نے جہاں ان کی توثیق بعد کے محدثین سے نقل کی ہے تو وہاں پہلے امام اعظمؒ کی جانب سے ان کو عدالت کا سرٹیفکیٹ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

عن ابی حنیفة قال مارایت افقه من جعفر بن محمد

بالفاظ دیگر امام ذہبی نے امام اعظمؒ کی معدلانہ حیثیت کو خود اپنے عمل سے علی رؤس الاشہاد ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ یہ صرف فکر و نظر کا تراشا ہوا پیمانہ نہیں بلکہ امر وقعہ ہے۔ اور اگر یہ حقیقت ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں غیر ثقہ اور متروکین میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا جیسا کہ خود آپ امام ذہبی سے سن چکے ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال میں امام اعظمؒ کا تذکرہ الحاقی ہے جیسا کہ پہلے آپ تفصیلاً پڑھ چکے ہیں۔ اور امام ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ میں اس التزام نے کہ قلیل الحدیث کو تذکرے میں جگہ نہ دی جائے گی یہ بات بھی صاف کر دی اور اسے بے غبار بنا دیا کہ حافظ ذہبی کے نزدیک امام اعظمؒ کی ذات گرامی قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہے۔ اگر خارجہ(۱) کی طرح جو فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔

---

(۱) خارجہ بن زید قلیل الحدیث ہیں یہ امام ذہبی کی رائے ہے ان کے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں یہ ہیں۔

احد الفقهاء السبعة من كبار العلماء الا انه قليل الحديث (تذكرة الحفاظ: ج ۱ ص ۸۶)

ابن سعد نے طبقات میں ذہبی سے اختلاف کیا ہے اور ابن سعد ذہبی سے مقدم ہیں ﴿باقی صفحہ ۳۷۳ پر﴾

امام اعظمؒ بھی فقیہ ہونے کے ساتھ قلیل الحدیث ہوتے تو ذہبی ان کا تذکرۃ الحفاظ میں ذکر نہ فرماتے۔ اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ذہبی کی نگاہ میں امام اعظمؒ کی ذات گرامی محدث، حافظ، امام الحدیث، کثیر الروایہ، امام متبوع، الامام الناقد، حامل العلم، ثبت متقن، حجۃ معدل ہونے کے ساتھ مجتہد اور فقیہ تھے۔ اسی بنا پر حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے یہ کھلا اقرار کیا ہے۔

قد تواتر علمه وفضله، واجمع عليه۔(۱)

﴿بقیہ صفحہ ۳۷۲﴾ وہ فرماتے ہیں۔ كان ثقة كثير الحديث (طبقات: ج ۵ ص ۲۶۲) النووی رقمطراز ہیں۔ كان بارعا في العلم (تهذيب الاسماء: ص ۱۷۲) امام ذہبی کے خارجہ کو قلیل الحدیث کہنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خارجہ نے دوسرے تابعین کی طرح روایت کا زیادہ کام نہیں کیا اس لیے وہ قلیل الروایہ ہیں اور قلت روایہ کی بنا پر ان کو ذہبی نے قلیل الحدیث کہہ دیا ہے ورنہ نفس حدیث کی حد تک وہ کثیر الحدیث ہیں جیسا کہ ابن سعد کی رائے ہے۔ حدیث نبوت کے علم اور حدیث نبوت کی روایت میں جوہری فرق ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے ارشادات کا علم ہو اس سے حدیث کی روایت بھی ہو صحابہ میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ہیں جن سے روایت حدیث کم ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو اس کا موقعہ ہی نہیں ملا ہے جیسا کہ ابن سعد رقمطراز ہے۔ انما قلت الرواية عن الاكابر من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لانهم هلكو اقبل ان يحتاج اليهم (ج ۲ ص ۳۷۶) اس لیے امام ذہبی کا یہ کہنا کہ خارجہ قلیل الحدیث ہیں بلحاظ روایت حدیث ہے اور ابن سعد کا یہ بتانا کان خارجة كثير الحديث بلحاظ علم حدیث ہے ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے حافظ ابو نعیم نے ان کے قلیل الروایہ ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ فقيه لم انفردو آثر العزلة ولم ينشر عنه من كلامه كثير شئى (حلیۃ الاولیاء: ج ۲ ص ۱۹۰) اس عزلت گزینی انفراد اور خلوت پسندی کو خارجہ نے ان سیاسی حالات کی بنا پر اختیار کیا جو اس وقت پوری امت اسلامیہ کو درپیش تھے۔ تفصیل کے لیے طبقات ابن سعد: ج ۵ ص ۲۶۴ دیکھو۔

۱؎ الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۹۶، ص ۱۹۲) واضح رہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر محقق ہیں۔ اتحاف النبلاء میں نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وا صل مرتبہ اجتہاد مطلق گردید اور ان کے تعارف میں نواب صاحبؒ نے تین سطروں پر مشتمل القاب لکھے ہیں اس لیے امام اعظمؒ کی شان محدثانہ پر ان کی شہادت کسی عقیدت کے بوجھ سے دبی ہوئی نہیں بلکہ امر واقعہ اور حقیقت کا اظہار ہے۔ ﴿باقی صفحہ ۳۷۴ پر﴾

یعنی یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کے لیے روایت و اسناد کے کسی بھی سہارے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تواتر سے ثابت ہے اور اس موضوع پر امت کی پوری علمی طاقت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں اور علم سے مراد علم حدیث ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

قد کان الحفاظ المشهور بالعناية في هذا الشان۔(۲)

حافظ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی مؤلف السیرۃ الشامیۃ الکبریٰ عقود الجمان میں فرماتے ہیں۔

کان ابو حنيفة من كبار حفاظ الحديث واعيانهم۔(۳)

اسی بنا پر امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث کی نوع تاسع والاربعین میں امام اعظمؒ ابو حنیفہ کا بھی دوسرے محدثین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس نوع کو شروع کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ: یہ نوع تابعین اور اتباع تابعین میں سے ان ائمہ حدیث کے تذکار پر مشتمل ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، مذاکرہ اور تبرک کی خاطر فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ائمہ حدیث ثقات اور مشہور ہیں۔ اس کے بعد مختلف شہروں کے محدثین کا ذکر کیا ہے۔ مدینہ، مکہ، شام، یمن، یمامہ، بصرہ، الجزیرہ اور کوفہ کے محدثین میں ابو حنیفہ النعمان بن ثابت التیمی کا کھلے اور واشگاف الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

امام اعظمؒ اور اسناد عالی:

آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث میں صحابہ اور تابعین کی وہ عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہستیاں ہیں جو اسلامی علوم میں مرکزی حیثیت کی مالک ہیں ان مشائخ

﴿بقیہ صفحہ ۳۷۳﴾ نواب صاحبؒ نے جو القاب لکھے ہیں　ہیں۔ السید السند، الامام العلامۃ، المحدث الاصولی، المتکلم، الفقیہ، البلیغ الرحلۃ، الحجۃ، فرید العصر، نادرۃ الدہر، خاتمۃ النقاد، حامل لواء الاسناد، بقیۃ اہل الاجتہاد، کشاف اصداف الفرائد، خطاف ازہار الفوائد، فاتح اقفال اللطائف، مانح الفال الفکر الفائف، مصیب شواکل المشکلات، مطبق مفاصل المعضلات، مفکک کمائم الکشف، عزیز الدین، محی السنۃ۔ (اتحاف: ص ۳۷۴)

(۳) تانیب۔ ص ۱۵۶

کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم سے جس قدر قرب امام اعظمؒ کو حاصل ہے بعد کے محدثین اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کو نہیں ہے بڑے بڑے محدثین آخر عمر تک سند عالی کی جستجو میں رہے اور اس کی تلاش میں بہتوں نے سفر کی بڑی بڑی محنتیں اور قربانیاں گوارا کیں۔

حافظ ابن حزم نے ایک قابل قدر تحقیق فرمائی ہے جس میں اقوام دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کی اسنادی خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر کے بتایا ہے۔

نقل و روایت کا یہ سلسلہ صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے اور زمانے کی ساری گردشوں کے باوجود اللہ نے مسلمانوں میں یہ سلسلہ باقی رکھا ہے کتنے اللہ کے بندے اس کی خاطر کتنی مسافتیں طے کرتے ہیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔(۱)

جیسے روایت و تاریخ میں اسناد مسلمانوں کی خصوصیت ہے ایسے ہی اسناد میں اسناد عالی وہ ممتاز سنت ہے جس کی علماء ہمیشہ جستجو کرتے رہے ہیں کیونکہ جس قدر عالی ہوگی اسی قدر خطا اور علت کے شائبہ سے پاک ہوگی۔

امام ابو عبداللہ الحاکم نے جو سب سے پہلی قسم بتائی ہے اس کا عنوان ہی معرفۃ عالی الاسناد ہے اور لکھا ہے کہ

طلب الاسناد العالی سنة صحیحة۔

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ

---

(۱) الفصل فی الملل والنحل: ج ۲ ص ۸۲۔ ابوعلی الجبائی کہتے ہیں کہ اللہ نے اس امت کو تین خصوصیتوں سے نوازا ہے ایک اسناد دوسرے انساب تیسرے اعراب۔ اسناد بلاریب دین ہے اور یہ سنن میں سنت مؤکدہ ہے عبداللہ بن السبارک فرماتے ہیں۔ کہ اسناد سرتاسر دین ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو اس کے منہ میں جو آتا کہہ دیتا۔ سفیان ثوری کا کہنا ہے کہ اسناد مومن کا ہتھیار ہے۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ایک روز امام زہری نے ایک حدیث بیان کی میں نے کہا کہ یہ بغیر سند کے ہے فرمایا کیا تم کوٹھے پر بغیر سیڑھی کے چڑھنا چاہتے ہو۔ تعلیقات علی توضیح الافکار محمد محی الدین عبدالحمید: ج ۱ ص ۲۹۶)

۔ طلب العلو فیه سنة۔(۱)

حافظ سیوطی کہتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ

اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے کیونکہ اصحاب ابن مسعودؓ کوفہ سے مدینہ جاتے تھے اور حضرت عبداللہؓ کی پیش فرمودہ احادیث کو حضرت عمرؓ سے سنتے تھے۔(۲)

امام نووی فرماتے ہیں کہ

اسی بنا پر اس کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔(۳)

امام حاکم نے اس کے مستحب ہونے کا اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت انس بن مالکؓ اس طرح آئی ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کی اجازت نہ تھی ہمیں یہ بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ کوئی بیرونی شخص آئے اور آپ سے پوچھے اور ہم سنیں چنانچہ ایک روز ایک شخص آیا اور یوں گویا ہوا۔

نووارد:۔ ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اس نے آپ کی جانب سے بتایا ہے کہ آپ کو اللہ سبحانہ نے رسول بنایا ہے۔

حضورؐ انور:۔ ہاں یہ ٹھیک ہے واقعی میں اللہ کا رسول ہوں۔

نووارد:۔ آسمان کس نے بنایا ہے؟

حضورؐ انور:۔ اللہ سبحانہ نے۔

نووارد:۔ اور زمین کس نے بنائی؟

حضورؐ انور:۔ اللہ سبحانہ نے۔

نووارد:۔ آسمان و زمین اور پہاڑوں میں منافع کس نے رکھے؟

حضورؐ انور:۔ اللہ پاک نے۔

نووارد:۔ اچھا بتایئے آپ کو اس اللہ کی قسم جس نے آسمان و زمین اور پہاڑ بنائے کیا آپ کو اس نے رسول بنایا ہے؟

(۱) تقریب: ص ۱۸۲ (۲) تدریب الراوی: ص ۱۸۳ (۳) تقریب: ص ۱۸۲

حضورؐ انور:۔ ہاں۔
نووارد:۔ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟
حضورؐ انور:۔ میرے قاصد نے ٹھیک بتایا ہے۔
نووارد:۔ آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا؟
حضورؐ انور:۔ ہاں
نووارد:۔ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں صدقہ ضروری ہے؟
حضورؐ انور:۔ ٹھیک ہے۔
نووارد:۔ آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا یہ حکم آپ کو اسی نے دیا ہے؟
حضورؐ انور:۔ ہاں اسی نے دیا ہے۔
نووارد:۔ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہم پر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں؟
حضورؐ انور:۔ ہاں ٹھیک ہے۔
نووارد:۔ آپ کو آپ کے روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو روزہ کا اس نے حکم دیا ہے؟
حضورؐ انور:۔ ہاں مجھے روزے کا اسی نے حکم دیا ہے۔
نووارد:۔ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ بشرط استطاعت حج فرض ہے۔
حضورؐ انور:۔ ہاں ٹھیک ہے۔
نووارد:۔ آپ کو روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو اسی نے حج کا حکم دیا ہے؟

حضورِ انور:۔ ہاں۔

نووارد:۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر روانہ کیا میں اس میں کمی نہ کروں گا اور نہ زیادتی .... یہ کہہ کر وہ چلا گیا حضورِ انور نے فرمایا کہ اگر سچا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔

امام ابو عبداللہ الحاکم نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔(۱)

فیہ دلیل علیٰ طلب اجازۃ المرء العلو من الاسناد۔(۲)

اور استدلال کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دیہاتی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی زبانی فرائض اور اسلامی زندگی کا علم ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود بدوی سفر کی تکلیف برداشت کر کے بالمشافہ دریافت کرنے کے لیے خدمت گرامی میں آیا۔ اگر بدوی کا یہ عمل ناپسندیدہ ہوتا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ضرور گرفت فرماتے۔

حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ مدینہ سے عقبہ بن عامر کے پاس صرف ایک حدیث کی خاطر مصر تشریف لے گئے چنانچہ جب وہ مصر پہنچے۔ لوگوں نے ان کی آمد سے عقبہ بن عامر کو مطلع کیا۔ اطلاع ملتے پر فوراً باہر تشریف لائے۔ ملے حضرت ابو ایوبؓ نے فرمایا وہ حدیث سنایئے جو مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے کیونکہ اس کا ارشاد کا حضورؐ سے سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا ہاں میں نے حضورؐ سے سنا ہے۔

من ستر مسلماً علی خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامۃ۔(۳)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ حدیث سنتے ہی سواری پر سوار ہو گئے اور مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور واپسی میں اتنی جلدی کی کہ اونٹنی کا کجاوہ تک نہ کھولا۔(۴)

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۵ (۲) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۶

(۳) اللہ سبحانہ اس شخص کی قیامت کے دن پردہ پوشی کرے گا جو کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ ج (جامع بیان العلم وفضلہ)

امام ابو عبداللہ الحاکم بسند متصل بیان فرماتے ہیں کہ ایک خراسانی حضرت امام شعبی کے پاس آیا اور بولا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس کنیز ہو اس نے آزاد کی اور پھر اس سے نکاح کر لیا۔ امام شعبی نے فرمایا کہ ہم سے ابو بردہ نے اپنے والد کے حوالہ سے بتایا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کنیز ہو اس نے اس کو باادب اور باسلیقہ بنایا ہو اور تعلیم دی اور خوب تعلیم دی ہو۔ پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کیا ہو اسے دُگنا اجر ملے گا اور جس غلام نے اللہ سبحانہ اور اپنے آقا کا حق پورا کیا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ امام شعبی نے یہ حدیث بیان فرمانے کے بعد لو وارد خراسانی سے کہا تمہیں حدیث مفت ہی بتا دی ورنہ اس سے بھی کمتر کے لیے مدینہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔(۱)

الغرض محدثین نے علو اسناد کو ہمیشہ ایک قابل فخر چیز سمجھا ہے کیونکہ روایت میں جس قدر وسائط کم ہوں گے اسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہو گا۔ حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں۔

لان قرب الاسناد قرب الی رسول الله صلی الله علیه وسلم والقرب الیه قرب الی الله عزوجل۔(۲)

یہی علو اسناد کی پانچ قسموں میں سے سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں۔

اجلها القرب من رسول الله صلی الله علیه وسلم من حیث العدد باسناد صحیح نظیف۔(۳)

اسی لیے اہل فن کے نزدیک صحت اور علو اسناد کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے اور کسی چیز کا نہیں ہوتا بلکہ امام مسلم تو علو سند کی خاطر گاہ گاہ سند صحیح چھوڑ کر سند ضعیف سے حدیث لاتے ہیں۔

چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں۔

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث (۲) مقدمہ ابن الصلاح: ص ۱۰۶ (۳) تدریب الراوی: ص ۱۸۳۔ یعنی علو اسناد کی بزرگ ترین قسم یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلحاظ عدد و سند صحیح نزدیکی حاصل ہو۔

ربما اخرج مسلم الاسناد الضعیف واقتصر علیه لعلوه وترک الاسناد الصحیح لنزوله۔(۱)

اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث کے تذکرے میں ان کے علو اسناد کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے بلکہ خاص خاص اسانید عالیہ کو علماء نے مستقل اجزاء میں علیحدہ مدون کر دیا ہے۔

امام اعظمؒ کی احادیات:

ائمہ اربعہ میں چونکہ تابعی ہونے کا فخر امام اعظمؒ کو حاصل ہے اور یہ وہ فخر ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی امام صاحبؒ کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہے نہ امام اوزاعی کو شام میں' نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں' نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں' نہ امام مالک کو مدینہ میں' نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ امام لیث بن سعد کو مصر میں(۲) اور اس کے نتیجے میں امام اعظمؒ ابو حنیفہ ائمہ اربعہ میں اس شرف خاص میں ہی امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کو بارگاہ رسالتؐ سے براہ راست صرف بیک واسطہ تلمذ حاصل ہے۔ امام صاحب کی ان روایات کو جو آپ نے صحابہ سے کی ہیں احادیات یا وحدان کہتے ہیں یعنی وہ روایات جو آنحضرتؐ سے بیک واسطہ منقول ہوں۔ چنانچہ علامہ سخاویؒ فتح المغیث میں فرماتے ہیں۔

والثنائیات فی الموطا للامام مالک والوحدان فی حدیث الامام ابی حنیفة۔(۳)

امام اعظمؒ کے یہ وحدان مندرجہ ذیل صحابہ سے آئے ہیں۔

حضرت انس بن مالکؓ ○ حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزءؓ ○ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ ○ حضرت واثلہ بن الاسقعؓ ○ حضرت عبداللہ بن انیسؓ ○ حضرت عائشہ بنت عجردؓ۔

اس لیے ان روایات کی تعداد چھ ہے۔

۱۔ عن ابی حنیفة عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

۱ (الرفع الباسم: ص ۱۶۵) ۲ (المط فی ذکر الصحابۃ الستۃ: ص ۲۲) ۳ (فتح المغیث: ص ۳۴۱)

۲۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن الحارث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن ابی اوفی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۴۔ عن ابی حنیفہ عن واثلہ بن الاسقع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۵۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن انیس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۔ عن ابی حنیفہ عن عائشہ بنت عجرد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

متقدمین میں سے بہت سے علماء نے امام صاحب کی ان احادیات پر رسالے لکھے ہیں علامہ زاہد کوثری نے اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ رسائل تصنیف کرنے والوں میں حافظ ابو حامد محمد بن ہارون الحضرمی جوفن حدیث میں حافظ دارقطنی کے استاد ہیں۔ حافظ ابوالحسین علی بن احمد بن عیسیٰ النہقی ' حافظ ابومعشر عبدالکریم بن عبدالصمد الطبری الشافعی اور حافظ ابوبکر عبدالرحمٰن بن محمد السرخسی کے رسائل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور حفاظ کی مرویات میں داخل ہیں چنانچہ حافظ حضرمی' الحافظ النہقی اور حافظ طبری کے رسالے حافظ ابن حجر عسقلانی نے المعجم المفہرس میں اور حافظ ابن طولون نے الفہرست الاوسط میں پورے روایت کیے ہیں۔ اور حافظ ابوبکر السرخسی کا رسالہ مشہور محدث سبط بن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں اپنی مرویات میں شمار کیا ہے۔(۱)

حافظ ابومعشر طبری کے رسالہ کو حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی تبییض الصحیفہ میں نقل کیا ہے۔

اسناد عالی کی دوسری قسمیں:

اسناد عالی کی قسم اعلیٰ تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی چار قسمیں اور بتائی گئی ہیں۔

(الف) یہ کہ مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو چکا ہے اس امام کے بعد راویوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

---

(۱) التعلیقات: ص ۷' التانیب: ص ۲۱

(ب) حدیث کی معتمد کتابوں میں سے کسی سے قرب حاصل ہو۔ حافظ عسقلانی نے اس کی چار صورتیں بتائی ہیں۔ موافقت' بدل' مساوات اور مصافحہ۔

(ج) یہ کہ علو کا سبب کسی راوی کی وفات کا تقدم ہو خواہ دوسری سندوں اور راویوں کی تعداد برابر ہی کیوں نہ ہو۔

(د) یہ کہ ایک راوی حدیث سننے میں دوسرے راوی سے پہلے ہو دونوں نے ایک حدیث ایک ہی استاد سے سنی ہو مگر ایک نے پہلے دوسرے نے بعد میں سنی ہو۔

دراصل علو حقیقی تو پہلی ہی قسم ہے۔ ان قسموں میں اسنادی علو صرف نسبتی اور اضافی ہے۔ ان چار قسموں میں سے امام ابوعبداللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں پہلی قسم کو جس میں کسی مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو راجح قرار دیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے ان مشہور ائمہ حدیث ہشیم' اوزاعی' مالک' اعمش' ابن جریج اور شعبہ کے نام بتائے ہیں۔(۱) اور الجزائری نے امام حاکم کے حوالے سے یہ ضابطہ لکھا ہے کہ

کل اسناد یقرب من الامام المذکور منه فاذا صحت الروایة الی ذالک الامام بالعدد الیسیر فانه عالی۔(۲)

ہر اسناد جس میں امام مذکور سے قرب ہو جائے جب عدد یسیر کے ذریعے اس امام تک روایت صحیح ہو جائے تو بس یہی اسناد عالی ہے۔

اس کے بعد اسی ضابطہ کی مثال میں یہ روایت پیش کی ہے۔

حدثنا علی بن الفضل حدثنا الحسن بن عرفة حدثنا هشیم عن یونس بن عبید عن نافع عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مطل الغنی ظلم۔(۳)

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

یہ ہم جیسوں کے لیے تمام اسانید میں عالی ہے۔ اس کی سند میں حضور انورؐ تک سات راوی ہیں۔ اور اس کے عالی ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ہشیم بن بشیر امام حدیث سے قریب تر ہے۔(۴)

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۳۶۳ (۲) توجیہ النظر للجزائری (۴،۳) توجیہ للنظر للجزائری

مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے جن کے قرب سے محدثین کے یہاں اسناد عالی ہوتی ہے اور جس علو پر ان کو فخر ہے ان کا حال یہ ہے کہ ان میں بیشتر امام اعظمؒ کے تلامذہ ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو یہی امام ہشیم بن بشیر جن کے قرب سے یہ اسناد عالی ہوئی ہے امام اعظمؒ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ حدیث کے بارے میں تصریح کی ہے کہ وہ حدیث میں امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ ان میں ان کا نام بھی ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے امام ذہبی نے ان کو الحافظ الکبیر' محدث العصر لکھا ہے۔ ہشیم ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے انہوں نے تابعین سے علم حدیث حاصل کیا مثلاً امام ابو حنیفہ امام عمرو بن دینار اور زہری۔ حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کے فتاوی پر ان کی نظر وسیع تھی۔ درس میں تہلیل' تسبیح اور تحمید ورد زبان ہوتی تھی جب وہ لا الـه الا اللـه کہتے تو وفور تاثر سے ان کی آواز بلند ہو جاتی۔ حافظ ہشیم بخارا کے رہنے والے تھے ان کے والد واسط میں مقیم تھے۔ واسط میں قاضی وقت حافظ ابو شیبہ ابراہیم (۱) بن عثمان کے درس میں پابندی سے حاضر ہوتے

---

(۱) ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ اگر چہ ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو جرحی تیروں سے بری طرح زخمی کیا ہے لیکن یحییٰ بن معین نے یزید بن ہارون کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ابراہیم سے زیادہ اپنے زمانے میں عادل کوئی نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ یزید ابراہیم کے اس وقت منشی تھے جبکہ وہ واسط میں محکمہ قضا میں متقرر تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ احادیث صالحۃ (تہذیب: ص ۱۴۴) یہ ابو اسحاق السبیعی' ولید بن مسلم' زید بن الحباب' یزید بن ہارون' علی بن الجعد اور اپنے ماموں حکم بن عتیبہ کے شاگرد ہیں۔ ائمہ نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ ابن ماجہ اور ترمذی کے راویوں میں سے ہیں اسی بنا پر حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ان کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ ان کا ذکر تہذیب التہذیب میں کیا ہے تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ اما ائمۃ موثوقون و اما ثقات مقبولون و اما قوم ساء حفظھم و لم یطرحوا و اما قوم ترکوا او جرحوا۔ حافظ صاحب نے تقریب میں ان کو متروک الحدیث کہہ کر طبقہ سابقہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں من لم یوثق البتۃ و ضعف مع ذالک بقادح (ص ۳) ﴿باقی صفحہ ۳۸۴ پر﴾

اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کرتے تھے۔ ایک بار ہشیم بیمار ہو گئے اور مجلس درس میں حاضر نہ ہوئے ابو شیبہ کو فکر ہوئی انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہو گئے اپنے شاگردوں سے کہا چلو ہشیم کی عیادت کو چلیں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کے ساتھ ہشیم کی عیادت کو ان کے والد بشیر کے گھر پہنچے۔ جب قاضی صاحب فرض عیادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے کہا بیٹا! میں تمہیں طلب حدیث سے روکتا تھا لیکن آج

﴿بقیہ صفحہ ۳۸۳﴾ اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم حافظ صاحب کے نزدیک اس لیے ضعیف نہیں کہ ان پر جھوٹ کی تہمت ہے ان پر دوسرے ناقدین کی جانب سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ضعیف ہیں اور منکر الحدیث ہیں۔ یہ ایک مبہم جرح ہے حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ کلمہ شعبة فی قصة یہ قصہ کیا ہے حافظ ذہبی نے اسے بھی بے نقاب کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نے بحوالہ حکم عن ابن ابی لیلیٰ بتایا ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری شریک تھے۔ امام شعبہ کہتے ہیں کہ ابراہیم جھوٹ کہتے ہیں کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاذ حکم سے ملا ہوں انہوں نے مجھے بتایا کہ صفین میں بدر والوں میں سے صرف حضرت خزیمہؓ شریک تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم کا یہ کہنا غلط ہے کہ صفین میں ستر بدری شریک تھے تو امام شعبہ کا یہ بتانا بھی سرتاسر غلط ہے کہ صفین میں حضرت خزیمہؓ کے سوا کوئی بدری نہ تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ بدری نہیں ہیں۔ اس لیے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف ضعیف ہونے کی بنا پر اگر ابراہیم کی روایت قابل قبول نہیں ہے تو پھر ایسی روایات تو بخاری میں بھی موجود ہیں جن کے راویوں کے بارے میں بالاتفاق متروک ہونے کا اعلان ہے مثلاً بخاری کی کتاب المناقب میں حسن بن عمارہ کے حوالہ سے حدیث آئی ہے جن کے بارے میں لکھا ہے اطبقوا علی ترکہ۔ ایک اور راوی اسید بن الجمال ہے ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں حدیث روایت کی ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ لم ار لاحد توثیقاً۔ اس سے معلوم ہوا کہ ارباب فن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے۔ روایت ضعیف ہونے کے باوجود بھی مقبول ہوتی ہے اگر بخاری کی یہ روایات ضعیف ہونے کے باوجود تلقی امت بالقبول کی وجہ سے صحیح ہیں تو ابراہیم کی ابن عباسؓ والی وہ روایت جس میں تراویح کی تعداد بیس بتائی ہے تلقی الخلفاء بالقبول، تلقی العلماء بالقبول، تلقی الائمۃ بالقبول تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے بھی صحیح ہے۔

سے اپنی ممانعت واپس لیتا ہوں۔ قاضی ابو شیبہ جیسا شخص اور میرے دروازے پر آئے۔(۱)
واضح رہے کہ واسط میں امام اعظم کے تلامذہ میں سے صرف ہُشیم نہیں بلکہ کردری نے صرف واسط میں امام اعظم کے جو تلامذہ بتائے ہیں ان کی تعداد تیس ہے ان میں سے ایک امام ہُشیم ہیں۔ امام احمد بن حنبل پانچ سال تک ان کے درس حدیث میں شریک رہے اور فن حدیث میں عبور حاصل کیا۔

امام اعظمؒ کی ثنائیات:

امام ابو حنیفہ اگرچہ خود تابعی ہیں مگر ان کو بڑے بڑے تابعین سے حدیث پڑھنے کا موقعہ ملا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام شعبی کو الامامؒ علامۃ التابعین کہہ کر بتایا ہے کہ ھو اکبر شیخ الامام ابی حنیفۃ۔ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ امام شعبی کے پاس رہو میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہ لوگ ان سے مسائل پوچھتے تھے اور الصحابۃ متوافرون حالانکہ صحابہ بہت تھے۔ خود امام شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو پایا ہے۔ ایسے ہی امام ذہبی نے دول الاسلام میں مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح کے متعلق تصریح کی ہے کہ اکبر شیوخہ عطاء بن ابی رباح۔ امام اعظمؒ کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ اس لیے احادیات کے بعد امام اعظمؒ کی مرویات میں ثنائیات کا درجہ ہے یعنی وہ حدیثیں جو آپ نے تابعین سے کی ہیں اور تابعین نے صحابہ کرام سے۔ امام مالکؒ چونکہ تابعی نہیں ہے اس لیے ان کی مرویات میں سب سے عالی مرویات ثنائیات ہی ہیں۔

امام محمد کی کتاب الآثار میں ثنائی روایات حسب ذیل اسانید سے آئی ہیں۔

۱- ابو حنیفہ عن ابی الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۲- ابو حنیفہ عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳- ابو حنیفہ عن عبداللہ بن ابی حبیبہ قال سمعت ابا الدرداء قال قال رسول اللہ
۴- ابو حنیفہ عن عبدالرحمن عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۵- ابو حنیفہ عن عطیہ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۴ ص ۸۷

۶- ابوحنیفہ عن شداد عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۷- ابوحنیفہ عن عطاء عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۸- ابوحنیفہ عن عاصم عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم
۹- ابوحنیفہ عن عون عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم
۱۰- ابوحنیفہ عن محمد بن عبدالرحمن عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۱۱- ابوحنیفہ عن مسلم الاعور عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۱۲- ابوحنیفہ عن محمد بن قیس عن ابی عامر انہ کان یہدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظمؒ کی ثلاثیات:

امام شافعیؒ امام احمدؒ کی کسی تابعی سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے ان کی مرویات میں سب سے اونچا مقام ثلاثیات کا ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن کو ان بزرگوں نے اتباع تابعین سے۔ انہوں نے تابعین سے اور تابعین نے صحابہ کرام سے سنا ہے۔

صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے امام بخاریؒ امام ابن ماجہؒ امام ابوداؤدؒ امام ترمذی نے بعض اتباع تابعین کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس لیے اسناد عالی کے بازار میں یہ اکابر بھی امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے ہم پلہ ہیں۔ حالانکہ امام شافعیؒ کی وفات کے وقت امام بخاری کی عمر دس سال تھی اور امام ابوداؤد صرف دو سال کے تھے اور امام ابن ماجہ تو ابھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ امام بخاری کی ثلاثی روایات کی تعداد صرف اکیس ہے اور یہ ان کی مرویات میں سب سے اونچی روایات ہیں۔ امام بخاری کو جن ذرائع سے یہ روایات ملی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱- امام مکی بن ابراہیم	گیارہ احادیث
۲- ابوعاصم النبیل	پانچ احادیث
۳- محمد بن عبداللہ الانصاری	تین احادیث
۴- خلاد بن یحیٰ	ایک حدیث
۵- عصام بن خالد	ایک حدیث

ان میں سے دو اول الذکر حضرت مکی بن ابراہیم اور امام ابو عاصم النبیل جن سے ثلاثیات کی تعداد بالترتیب گیارہ اور پانچ ہے اور جو امام بخاری کے مشائخ میں طبقہ اولیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں دونوں امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

امام مکی بن ابراہیم:

مکی بن ابراہیم بلخ کے رہنے والے ہیں حافظ ذہبی سے علامہ سخاوی ناقل ہیں۔

بلخ میں دوسری صدی کے اواخر میں علماء پیدا ہوئے جیسے کہ عمر بن ہارون' مکی بن ابراہیم' خلف بن ایوب' قتیبہ بن سعید' محمد بن ابان' عیسیٰ بن احمد' محمد بن علی بن طرخان۔ پھر وہاں علم حدیث گھٹ کرنا پید ہو گیا۔(۱)

موصوف امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے ہیں چنانچہ صدر الائمہ مکی رقمطراز ہیں کہ

مکی بن ابراہیم بلخی بلخ کے امام ہیں ۱۲۰ھ میں کوفہ میں آئے اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں ملازمت اختیار کی اور آپ سے حدیث و فقہ کا سماع کیا اور بکثرت روایتیں کی ہیں۔(۲)

امام مکی فن حدیث کے بہت بڑے امام گزرے ہیں حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے

مکی بن ابراهیم الحافظ الامام شیخ خراسان ابو السکن التمیمی۔(۳)

بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل' امام یحیٰی بن معین' امام ذہلی اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ امام بخاری نے بیشتر ثلاثی حدیثیں ان ہی سے روایت کی ہیں۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے دس سال تک حرم محترم میں ڈیرہ رکھا اور سترہ تابعین سے احادیث لکھیں۔ ان کا بیان ہے کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پڑے گی تو سوائے تابعین کے اور کسی سے حدیثیں نہ لکھتا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا اور سترہ سال کی عمر میں حدیث کی تحصیل شروع کی۔

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۸۲ (۲) مناقب للامام: ج ۱ ص ۲۰۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۸۲

مکی بن ابراہیم کو تحصیل علم کی طرف امام ابوحنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا چنانچہ امام حارثی عبدالصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ

میں بخارا میں تجارت کرتا تھا ایک بار امام صاحب کی خدمت میں آنا ہوا تو فرمانے لگے مکی! تم تجارت کرتے ہو لیکن تجارت میں جب تک علم نہ ہو بڑی خرابی رہتی ہے علم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث قلمبند کیوں نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ مجھے برابر اس طرف متوجہ کرتے رہے۔ تا آنکہ میں تحصیل علم میں مشغول ہو گیا آخر اللہ سبحانہ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ اسی لیے میں ہر نماز میں اور جب بھی ان کا ذکر آتا ہے ان کے حق میں دعا کرتا ہوں لان اللہ تعالیٰ ببرکتہ فتح لی باب العلم۔(۱)

مکی بن ابراہیم کو امام اعظمؒ سے خاص عقیدت تھی ایک بار امام صاحب کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ کان اعلم زمانہ۔(۲)

اسماعیل بن بشیر ناقل ہیں کہ ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے انہوں نے روایت شروع کی حدثنا ابو حنیفۃ۔ حاضرین میں سے ایک اجنبی شخص نے چلا کر کہا کہ حدثنا عن ابن جریج و لاتحدثنا عن ابی حنیفۃ۔ اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا فرمانے لگے۔

اما لانحدث السفہاء حرمت علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی۔

ہم بیوقوفوں سے حدیث نہ بیان کریں گے مجھ سے حدیثیں نہ لکھو میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ جب تک اس شخص کو مجلس سے نہیں اٹھایا گیا آپ نے حدیث بیان نہیں کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدثنا ابو حنیفۃ کا سلسلہ شروع کر دیا۔(۳)

الضحاک بن مخلد ابو عاصم النبیل:

مشہور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے علامہ صیمری نے ان کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر

(۱) مناقب الامام: ج ۲ ص ۱۶۱ (۲) تاریخ بغداد و ترجمہ امام اعظم (۳) مناقب امام: ج ۱ ص ۲۰۴

المضیہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نام تو ان کا الضحاک ہے کنیت ابو عاصم اور نبیل ان کا لقب ہے۔ نبیل کے معنے معزز کے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو اس لقب سے کیوں پکارا گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس سلسلے میں بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام زفر کے یہاں اکثر ان کی حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں اسی نام کے ایک شخص اور بھی آیا کرتے جن کی وضع قطع بالکل گری ہوئی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی لونڈی نے آکر پوچھا کون؟ جواب ملا ابو عاصم! لونڈی نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عاصم دروازے پر ہیں امام زفر نے دریافت کیا کہ کون سے ابو عاصم؟ لڑکی نے بے ساختہ کہہ دیا کہ النبیل منھا۔ ابو عاصم اجازت لے کر اندر آئے تو امام زفر نے کہا کہ اس لونڈی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ ابو عاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔ حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل بیان کیا ہے ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال تھی۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ فقہاء میں بھی بڑے نامور تھے۔ ابن سعد رقمطراز ہیں کہ کان ثقة فقیھا۔ امام عجلی کہتے ہیں۔ ثقة کثیر الحدیث و کان له فقه۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ ابو عاصم کو ایک ہزار حدیثیں نوک زبان تھیں۔(۱)

الغرض ان ہی دونوں مکی بن ابراہیم اور ابو عاصم النبیل کے حوالہ سے امام بخاری کو بالترتیب گیارہ اور پانچ ثلاثیات ملی ہیں۔

دوسرے محدثین میں ابو داؤد اور ترمذی کی ثلاثیات میں صرف ایک ایک روایت ہے مگر ابن ماجہ کی ثلاثی روایات کی تعداد پانچ ہے۔

حضرت امام اعظمؒ کی روایات میں ثلاثیات کا مقام تیسرے درجے پر ہے یعنی جو روایات امام بخاری' امام ابن ماجہ' امام ابوداؤد' امام ترمذی کی درجہ اول میں ہیں وہ امام اعظمؒ کے یہاں بلحاظ مقام تیسرے درجہ پر ہیں۔ اس قسم کی روایات کا امام صاحب کے یہاں وافر ذخیرہ ہے مثلاً۔

(۱) تذکرة الحفاظ' تہذیب التہذیب' الجواہر المضیہ

- عن ابی حنیفہ عن بال عن وہب عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- عن ابی حنیفہ عن موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبداللہ عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- عن ابی حنیفہ عن عبداللہ عن ابی نجیح عن عبداللہ بن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظمؒ کی رُباعیات:

امام مسلم اور امام نسائی کی کسی تبع تابعی سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اور اس وجہ سے ان کو ان سے کوئی حدیث سننے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان دونوں امامان حدیث کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جن کو ان کے اساتذہ نے اتباع تابعین سے اور انہوں نے تابعین سے اور انہوں نے صحابہ کرام سے سنا ہے مثلاً امام مسلم کی رباعیات میں ہے۔

حدثنا سوید بن سعید قال حدثنا مروان الضراری عن ابی مالک سعد بن طارق عن ابیه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من قال له الا الا الله و کفر بما کان یعبد من دون الله حرم ماله و دمه و حسابه علی الله۔

اور امام نسائی کی رباعیات میں ہے۔

اخبرنا حمید قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا شعیب عن انس بن مالک۔

امام اعظمؒ کی مرویات میں رباعیات بالکل آخری درجہ پر ہیں جو روایات نبوت سے قرب میں امام مسلم اور امام نسائی کے یہاں درجہ اول پر ہیں ان کی امام اعظمؒ کے یہاں آخری درجہ کی حیثیت ہے چنانچہ امام محمد نے کتاب الآثار میں ایسی روایات نقل کی ہیں۔ مثلاً

ابو حنیفة عن حماد عن ابراهیم عن الاسود بن یزید عن عمر بن الخطاب الخ۔

ابو حنیفة عن حماد عن ابراهیم عن عقلمة عن عبدالله الخ۔

اس ساری تفصیل کو پڑھ کر یہ بات پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ارشادات اور حدیث نبوت کے سلسلے میں ائمہ اسلام میں سے قرب کا جو شرف خاص بارگاہ رسالت سے امام اعظمؒ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ وحدانیات میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل

ہے ثنائیات میں امام مالکؒ کو سبقت کرنے کے بعد ان کا ہمسر کوئی نہیں۔ ثلاثیات اور رباعیات تو ان کے یہاں ایک عام درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاریخ تدوین حدیث:

آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کہ حدیث تاریخ سنت کا نام ہے تاریخ سنت یا حدیث پر تین دور گذرے ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنے استاد حدیث شیخ عبداللہ بن سالم کے تذکرے میں لکھا ہے۔

صحت حدیث میں جس ضبط کا اعتبار ہے امت مرحومہ اس میں تین دوروں سے گذر کر آئی ہے۔

صحابہ وتابعین کے زمانے میں ضبط حدیث کی صورت یہ تھی کہ زبانی یاد کرتے تھے۔ اتباع تابعین اور اوائل محدثین کے زمانے میں ضبط حدیث کی یہ صورت تھی کہ لکھتے تھے۔ اس کے بعد حفاظ حدیث نے اسماء الرجال غریب احادیث اور ضبط الفاظ کے لیے تصانیف کیں اور تشریحات کا دور شروع ہو گیا۔(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے تک حدیثوں کو سن کر زبانی یاد رکھنے کا رواج تھا اور اہل علم میں یہی چیز باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ اور یہ رواج ٹھیک اسی طرح تھا جیسا آج کل ہماری سوسائٹی میں قرآن حکیم کے لیے ہے بلکہ ان علماء پر جو کتاب وغیرہ پاس رکھتے تھے اور لکھی ہوئی حدیثیں بیان کرتے تھے ان پر ایک طرح کی رجل صحفی کی پھبتی کسی جاتی تھی گویا اس معاشرے میں علم صحیح کا اصلی دارومدار ہی حفظ اور زبانی یادداشت تھا۔ اساتذہ کی جانب سے تلامذہ کو ہدایت ہوتی تھی کہ لکھو مت بلکہ جیسے ہم نے احادیث زبانی یاد کی ہیں تم بھی زبانی ہی یاد کرو۔ چنانچہ ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے دریافت کیا کہ کیا تم لکھتے ہو؟ شاگردوں نے کہا جی ہاں! فرمایا احفظوا عنا کما حفظنا زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کی ہیں۔(۲)

---

(۱) انفاس العارفین: ص ۱۸۹ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۱ ص ۶۶

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جیسے اس وقت تک قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو گھوٹنے اور نوک بیان کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے اتباع تابعین کے زمانے تک قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی دستور رہا ہے۔

طرق واسانید حدیث کی تعداد:

اگر یہ صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام احمدؒ فرمارہے ہیں کہ احادیث کی کل تعداد سات لاکھ سے کچھ زائد ہے تو یہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں ہیں بلکہ آپ کے افعال' اخلاق' احوال اور آپ کی موجودگی میں لوگوں کے کیے ہوئے وہ کام جن پر آپ نے گرفت نہیں فرمائی اور اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال' ان کے مفتیوں کے فتاویٰ' زمانہ خلافت میں ان کی عدالتوں کے فیصلے بلکہ تابعین کے فتاویٰ اور جمع ہونے کی حیثیت میں ان کے فیصلے اور قرآنی آیات پر تشریحی نوٹس بھی ان ساتھ لاکھ میں شمار کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل عامی ہے کہ صرف ارشادات نبوت ہی کا نام حدیث ہے۔ الجزائری لکھتے ہیں۔

ان کثیرًا من المتقدمین کانوا یطلقون اسم الحدیث علی مایشمل آثار الصحابة والتابعین وتابعیهم وفتاواهم۔

متقدمین کی اکثریت صحابہ' تابعین اور اتباع اور ان کے فتاویٰ پر لفظ حدیث بولتی ہے(۱)۔

اور یہ تعداد بھی سات لاکھ متون حدیث کی نہیں بلکہ طرق کی ہے یعنی سات لاکھ ان اسانید کی تعداد ہے جن کے ذریعے احادیث کے یہ متون ہم تک پہنچے ہیں ایک حدیث اگر چار سندوں سے آئے تو یہ محدثین کی اصطلاح میں چار حدیثیں ہیں۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں:

ویعدون الحدیث المروی باسنادین حدیثین۔

علامہ ابن جوزی نے تمام ذخیرۂ حدیث کے متعلق کھلے لفظوں میں لکھا ہے کہ:

المراد هذا العدد الطرق لا المتون۔(۲)

(۱) توجیہ النظر: ۹۳ (۲) تلقیح فہوم اہل الاثر

نواب علامہ صدیق حسن خاںؒ نے الحطہ میں میر سید شریف سے بھی یہی جملہ نقل کیا ہے۔(۱)

واضح رہے کہ محدثین کے متعلق جو اصول کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ الجامع الصحیح کی موجودہ احادیث چھ لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے یا امام مسلم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیثوں کو میں نے تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں ان کا انتخاب سنن ابو داؤد میں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ مسند احمد سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے۔(۲) اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشادات نبوت کی یہ تعداد ہے بلکہ یہ ارشادات جن طرق اور اسانید سے آئے ہیں ان کی تعداد ظاہر کرنی مقصود ہے اور تاریخ حدیث میں یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ جہاں تک طرق واسانید کا معاملہ ہے وہ اس سے بھی کہیں زائد ہیں یہ تو صرف وہ ہیں جو ان بزرگوں نے اپنی عرق ریزیوں اور دشت پیمائیوں کے بعد فراہم کیے ہیں ان کے علاوہ اگر دوسرے محدثین کی محنتوں اور یادداشتوں کو یکجا کیا جائے تو یہ سلسلہ بے حدود بے حساب ہے۔ کیونکہ تابعین کے زمانے میں اگر طرق واسانید کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی تو اتباع تابعین کے دور میں یہی تعداد لاکھ تک جا پہنچی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس شاگردوں سے بیان کیا اب وہ محدثین کی اصطلاح میں دس اسانید اور طرق ہو گئے۔

احادیث صحیحہ کی اصلی تعداد:

شاید آپ بے چین ہوں اور ذہنوں میں یہ خلش محسوس کر رہے ہوں کہ اگر یہ طرق واسانید کی تعداد ہے تو پھر احادیث صحیحہ کی تعداد کیا ہے؟

محدثین وحفاظ حدیث کی بدولت ہم کو طرق واسانید کے ساتھ متون احادیث صحیحہ کی تعداد کا بھی علم ہو گیا ہے۔ امام ابو جعفر محمد بن الحسین بغدادی نے کتاب التمیز میں امام سفیان ثوری، امام شعبۃ بن الحجاج، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر کا متفقہ بیان نقل کیا ہے۔

(۲،۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ

ان جملة الاحادیث المسندة عن النبی صلی الله علیه وسلم یعنی الصحیحة بلا تکریر اربعة الاف واربع مائة حدیث۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور صحیح بلا تکرار ارشادات کی تعداد صرف چار ہزار چار سو ہے۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ ارباب صحاح میں سے ہر ایک نے اپنی کتابوں میں اسی تعداد کے لگ بھگ احادیث کی تخریج کی ہے۔ چنانچہ حافظ زین الدین عراقی نے مکررات کو نکال کر صحیح بخاری میں آئی ہوئی حدیثوں کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں

عدد احادیث البخاری باسقاط المکرر اربعة الاف۔(۲)

امام زرکشی نے سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی تعداد چار ہزار آٹھ سو بتائی ہے امام محمد بن اسماعیل یمانی فرماتے ہیں:

قال الزرکشی ان عدة احادیث ابی داؤد اربعة الاف و ثمانمائة۔(۳)

خود امام ابوداؤد نے اس خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ سنن میں احادیث کی تعداد صرف چار ہزار آٹھ سو ہے اور ان میں چھ سو مراسیل ہیں۔

ابن ماجہ کے متعلق علامہ یمانی نے ابوالحسن بن القطان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

عدة اربعة الاف حدیث۔(۴)

مؤطا امام مالک جو ذخیرۂ حدیث میں قدیم ترین کتاب ہے ابوبکر ابہری فرماتے ہیں کہ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اور تابعین کے تمام آثار صرف ایک ہزار سات سو بیس ہیں ان میں ارشادات نبوت کی تعداد چھ سو ہے مرسل ۲۲۰ موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے فتاویٰ ۲۸۵ ہیں۔(۵) یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا ہے۔

قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ احادیث:

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جو لوگ قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو زبانی یاد کر سکتے

(۱) توضیح الافکار: ج ا ص ۶۲ (۲) تنقیح الانظار: ج ا ص ۵۶ (۳) التقریب: ص ۵۱

(۴) توضیح الافکار: ج ا ص ۶۱ (۵) توضیح الافکار: ج ا ص ۶۲

ہیں ان کو چار ہزار چار سو حدیثوں کو یاد رکھنا کون سی مشکل بات ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں یاد رکیا جاتا؟ کیا صرف اس لیے ہمارے معاشرے میں قرآن کے ساتھ صحابہ اور تابعین کی طرح سنت کی تاریخ کو زبانی یاد کرنے کا رواج نہیں ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

اگلے لوگ لکھتے نہ تھے صرف زبانی یاد کرتے تھے اور اگر کوئی لکھتا تو یاد کرنے ہی کے لیے لکھتا تھا اور جب زبانی یاد کر لیتا تو اسے مٹا دیتا۔(۱)

قرآن کی طرح حدیث کے یاد کرنے کے جس رواج کا میں نے ذکر کیا ہے یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ اکابر سے اس موضوع پر ایسی مثبت تصریحات منقول ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ دعویٰ کیا ہے چنانچہ حافظ ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ینبغی لنا ان نحفظ حدیث رسول الله علیه وسلم کما نحفظ القران۔(۲)

حافظ ابن عبدالبر نے معتمر بن الریان کے حوالے سے لکھا ہے:

ابونضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدریؓ سے حدیث لکھنے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ ہم نہیں لکھائیں گے تم ہم سے ایسے ہی لو جیسے ہم نے نبی سے لی ہے یعنی زبانی یاد کرو۔(۳)

ایک دوسری روایت میں صریح الفاظ ہیں کہ:

نبیکم صلی الله علیه وسلم یحدثنا فحفظ فاحفظوا کما کنا نحفظ۔(۴)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہم سے حدیثیں بیان کرتے ہم ان کو لکھنے کے لیے جاتے آپ نے فرمایا کہ کیا مجھ سے سن کر قلم بند کرتے ہو۔ ہم نے کہا جی ہاں۔ فرمایا میرے پاس لاؤ آپ نے پانی سے سب کو دھو دیا اور فرمایا کہ زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کیا ہے۔(۵)

امام ذہبی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دادا ابواسحاق کی روایات کے بارے میں کہتے تھے:

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ (۲) تذکرۃ الحفاظ (۳،۴،۵) جامع بیان العلم وفضلہ

کنت احفظ حدیث ابی اسحاق کما احفظ السورۃ من القرآن۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے شہر بن حوشب کے حالات میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ شہر بن حوشب کو عبدالحمید بن بہرام کے حوالہ سے ساری حدیثیں اس طرح زبانی یاد تھیں گویا کوئی قرآن کی سورت پڑھ رہا ہے۔(۲) اور امام ابو داؤد طیالسی کے متعلق مشہور محدث عمر بن فلاس کا مشاہدہ بتایا ہے کہ میں نے محدثین میں ابو داؤد سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا۔ خود ان کو کہتے سنا ہے کہ فخر نہیں مگر تیس ہزار حدیثیں نوک زبان ہیں۔(۳) مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ کے بارے میں امام معمر فرماتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن ابی عروبہ سے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورہ بقرہ سناتا ہوں۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سنا ایک حرف کی بھی غلطی نہ تھی پھر قتادہ نے کہا کہ:

لانا لصحیفۃ جابر احفظ من سورۃ البقرۃ۔(۴)

یاد رہے کہ جابر کا صحیفہ وہ ہی ہے جس کا تذکرہ ہم آغاز کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت قتادہ قرآن کے ساتھ اس کے بھی حافظ تھے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صدر اول میں قرآن کی طرح سنت کو بھی زبانی یاد کرنے کا رواج تھا اور اس رواج کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو اپنی خداداد قوت حافظہ پر ناز تھا۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ:

کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذالک۔(۵)

صرف یہی نہیں بلکہ ان کو قوت حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھنا تو بڑی بات ہے وہ سن کر دوبارہ نہ پوچھنے کو بڑے طمطراق اور ناز سے بیان کرتے تھے چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں خود امام زہری کا بیان ہے کہ:

ما استعدت علما قط۔

سنن دارمی میں ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اے شباک! میں تم سے حدیث دوبارہ بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی حدیث کے دوبارہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۲) تہذیب التہذیب: ج ۴ ص ۳۷۱ (۳) تہذیب: ص ۱۸۳

(۴) تہذیب: ج ۸ ص ۳۵۳ (۵) جامع بیان العلم وفضلہ

امادے کی درخواست نہیں کی۔ تذکرے ہی میں امام شعبی کا یہ بھی بیان ہے کہ ما کتبت سوادا فی بیاض میں نے کبھی لکھی نہیں ہے۔ ولا استعدت حدیثاً من الانسان اور نہ کبھی کسی شخص سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست کی ہے۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ حدیث نبوی پر قرآن ہی جیسا ایسا دور گذرا ہے جس میں سارا زور صرف زبانی یاد پر ہی تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس موضوع پر کراہیۃ کتابۃ العلم کے نام سے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور ساری بحث کا اس پر خاتمہ کیا ہے۔

جب حضرات نے کتابت کو ناپسند فرمایا ہے جیسے حضرت ابن عباسؓ، امام شعبیؒ امام زہریؒ امام نخعی اور قتادہ وغیرہ یہ سب کے سب وہ ہیں جو طبعی طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے ان میں سے ایک ایک شخص صرف ایک بار سننے پر اکتفاء کرتا تھا۔ امام زہری سے منقول ہے کہ میں جب بقیع سے گذرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں کہ شاید کہیں کوئی بری بات اس میں نہ پڑ جائے کیونکہ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں پڑی ہو اور اس کو بھول گیا ہوں۔ امام شعبی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ یہ سب لوگ عرب سے تھے اور یہ مشہور ہے کہ عربوں کو زبانی یاد رکھنے میں خاص خصوصیت حاصل ہے ان میں سے ایک ایک شخص اشعار کو ایک بار سن کر ہی یاد کر لیتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے عمر بن ربیعہ کے قصیدے کو ایک ہی بار سن کر یاد کر لیا تھا اور آج کوئی شخص بھی اس قسم کا حافظہ نہیں رکھتا۔ (۱)

تدوین حدیث اور عمر بن عبدالعزیز:

خلافت راشدہ میں اگر چہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سنت کی تدوین کا کام حکومت کی جانب سے کرنے کا ارادہ کیا صحابہ سے مشورہ لیا اور ان سب نے تدوین ہی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے کچھ مصلحتوں کی بنا پر یہ کام یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ:

میں سنن لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مجھے اس قوم کا خیال آ گیا جو ہم سے پہلے ہوئی ہے

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ

اور جس نے خود کتابیں لکھیں اور اس کی طرف ہمہ تن اس قدر متوجہ ہو گئے کہ اللہ کی کتاب ہی کو چھوڑ بیٹھے بخدا میں اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی آمیزش نہ کروں گا یہ کہہ کر آپ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔(۱)

یہاں بھی التباس اور اختلاط کا وہی اندیشہ بول رہا ہے جو حدیث ابی سعید خدریؓ میں بیان ہوا اس پر تفصیلی بحث پہلے گذر چکی ہے۔

جمع قرآن اور صحابہ:

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے تو قرآن لوگوں کے سینوں میں عرب رواج کے مطابق محفوظ تھا آج کے رواج کے موافق کتابی شکل میں نہ تھا۔ امام خطابی رقمطراز ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مرتب اس لیے نہ تھا کہ ہمہ وقت حضور انور کو نسخ کا انتظار رہتا تھا۔ زمانہ نزول ختم ہونے پر یہ کام خلافت راشدہ نے کیا۔(۲)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ کتابی صورت میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن خاص کتابی شکل میں ایک جگہ بترتیب سور مرتب نہ تھا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ:

قد کان القران کتب کله فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور۔(۳)

دراصل قرآن کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر موجودہ شکل وصورت تک پہنچنے کے لیے تین کروٹیں آئی ہیں۔ اول زمانہ نبوت' دوم زمانہ صدیق وفاروق' سوم زمانہ عثمان غنی زمانہ نبوت میں قرآن لکھا ہوا تھا مگر ایک جگہ نہ تھا اور نہ سورتوں میں ترتیب تھی۔ زمانہ صدیق میں فاروق اعظمؓ کے کہنے پر قرآن کو یکجا کیا گیا اور اس کے لیے زید بن ثابت کو مقرر کیا حضرت زید کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ صرف زبانی یادداشت کے سہارے قرآن کو جمع نہ کیا جائے جب تک آیت سنانے والا لکھی ہوئی آیت نہ سنا دے۔ علامہ ابو شامہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے۔

وکان غرضهم الا یکتب الا من ما کتب بین یدی النبی لا من مجرد اللفظ۔(۴)

---

(۱) مقدمہ تنویر الحوالک: ص ۴ (۳،۴) الاتقان فی علوم القرآن: ص ۵۷' ص ۵۸

بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے زیدؓ اور عمرؓ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ:

من جاء بشاهدين على كتاب الله فاكتباه۔(۱)

علامہ ابوعبداللہ الزنجانی نے تاریخ القرآن میں اس شہادت کا پس منظر بتایا ہے۔

گویا اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کر رہے ہیں اس کو انہوں نے حضور انورؐ کے سامنے وفات والے سال پیش کیا ہے اور آپ کے سامنے لکھا گیا ہے۔(۲)

اس طرح قرآن عزیز نے اوراق میں کتابی صورت اختیار کی زمام زہری سے حفاظ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے۔

جمع على عهد ابى بكرؓ فى الورق۔

اور حضرت سالم بن عبداللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جمع ابو بكرؓ فى قراطيس۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا جو مجموعہ زمانہ نبوت میں کاغذوں اور اوراق میں نہیں بلکہ عسب یعنی کھجور کی ٹہنیوں۔ لخاف چھوٹے چھوٹے پتھروں یعنی ٹھیکروں، رقاع کھال کے ٹکڑوں، اکتاف اونٹ کی ہڈیوں اور اقتاب کجاوے کی لکڑیوں میں لکھا ہوا تھا وہ زمانہ ابوبکر میں کاغذ کے اوراق میں اکٹھا ہو کر کتاب کی صورت میں سرکاری طور پر محفوظ کر دیا گیا چونکہ قرآن کے نسخے عام شائع نہ ہوئے تھے ادھر اسلام دور دراز ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اس لیے الفاظ قرآن کے اعراب اور وجوہ قرأت میں کچھ اختلاف رونما ہوا اور یہ اختلاف بڑھنے لگا۔ حضرت حذیفہؓ نے اس معاملہ کی صورت حال سے حضرت عثمانؓ کو آگاہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کا مرتب کردہ قرآن حضرت حفصہؓ کے گھر میں موجود تھا حضرت عثمانؓ نے منگایا۔ زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمن بن الحارثؓ سے اس کی نقلیں کرائیں۔ اور مختلف صوبوں میں یہ قرآن روانہ کیے گئے۔

جامع القرآن کا حضرت عثمان غنیؓ کے لیے لقب:

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمانؓ کا لقب جامع القرآن مشہور ہو گیا حالانکہ ان کا جمع

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن (۲) تاریخ الاسلام السیاسی: ج ۲ ص ۳۸۷

قرآن میں کوئی دخل نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ صدیق اکبرؓ کے مرتب کردہ قرآن کی چند نقلیں کرائیں اور ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کر دیں۔ الاتقان میں ہے:

المشهور عند الناس ان جامع القران عثمان وليس كذالك انما حمل الناس عثمان على القراءة بوجه واحد۔

لوگوں میں مشہور یہی ہے کہ عثمانؓ جامع قرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے عثمانؓ نے تو صرف یہ کام کیا ہے کہ لوگوں کو ایک طرز پر پڑھنے کی راہ بتائی۔

بہر حال قرآن نہ صرف تواتر کتابت کے ذریعے آج امت میں حضرت زید بن ثابتؓ (۱) کے صدق موجود ہے بلکہ تواتر اسناد، تواتر حفظ، تواتر روایت، تواتر قرأت اور تواتر تعلّی کے ذریعے بھی محفوظ ہے۔

اس تمام تفصیل سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس اندیشے کی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے تدوین سنن کا کام ملتوی کر دیا تھا وہ اندیشہ حضرت عثمانؓ کے قرآن کی متعدد نقلیں کرانے اور اطراف مملکت میں روانہ کرنے کے بعد بالکل ختم ہو گیا اب قرآن کتابی شکل میں آنے کے بعد اس خطرے سے بالا ہو گیا کہ غیر قرآن کی قرآن سے آمیزش ہو جائے۔

۹۹ھ تک سنت تین راہوں سے مسافت طے کرتی رہی۔ ایک سینہ دوسرے محدود اور خاص سفینہ اور تیسرے عمل کا محسوس پیانہ۔

---

(۱) یہ بات کہ اس کام کے لیے زید بن ثابتؓ ہی کو کیوں منتخب کیا اس سوال کا جواب عثمان بن سعید دانی نے اپنی کتاب المقنع میں جو دیا ہے اور جسے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے تاریخ الاسلام السیاسی: ج ۱ ص ۳۸۸ پر نقل کیا ہے وہ ہی پیش کرتا ہوں　زید بن ثابتؓ کو اس کام کے لیے چند وجوہ سے منتخب کیا گیا۔ اول یہ کہ زید حضور انورؐ کے کاتب وحی تھے دوم یہ کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن پڑھ کر سنایا تھا۔ سوم یہ کہ آپ نے ہی حضور انور کی زندگی میں آخری طور پر جامع قرآن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ تین خوبیاں زید بن ثابتؓ کے سوا کسی دوسرے صحابی میں نہ تھیں اس لیے دونوں بار زمانہ صدیق اور زمانہ عثمانؓ میں کام کے لیے زیدؓ ہی کے نام پر قرعہ فال نکلا۔

فرق صرف یہ ہے کہ حفظ و روایت اور عمل اس وقت معاشرے میں عام اور کتابت کا کام خاص خاص تک محدود تھا۔ ایک بار اس خاص کام پر جو زمانہ نبوت اور زمانہ خلافت راشدہ میں خدمت سنت کے نام پر ہوا ہے۔ اس پر پہلے ایک مجموعی نظر ڈال لیجئے تاکہ اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

۱ھ سے ۹۸ھ تک موضوع حدیث پر علمی سرمایہ:

۱۔ کتاب عمرو بن حزم عمرو بن حزم نے اپنی دستاویز کے ساتھ حضور انورؐ کے اکیس فرامین یکجا کیے ہیں۔

۲۔ کتاب الصدقہ یہ نوشتہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے پاس تھا۔

۳۔ صحیفہ صادقہ عبداللہ بن عمرو نے زمانہ نبوت میں احادیث قلمبند کی ہیں۔

۴۔ صحیفہ جابر یہ حج کے موضوع پر جابر بن عبداللہ کا لکھا ہوا رسالہ ہے۔

۵۔ صحیفہ علی قصاص حرم، زکوٰۃ، قیدیوں کی رہائی پر حضرت علیؓ کا رسالہ ہے۔

۶۔ صحیفہ صدیقی یہ صدیق اکبرؓ کی لکھی ہوئی صدقات کی تفصیل ہے۔

۷۔ رسالہ سمرہ بن جندب کا ترتیب دادہ رسالہ ہے۔

۸۔ صحیفہ صحیحہ بروایت ہمام بن منبہ ابو ہریرہؓ کی تالیف ہے۔

نبوت اور خلافت کے زمانے میں انفرادی طور پر کچھ حضرات نے حدیث کا کتابی سرمایہ جو چھوڑا ہے اس کا خاکہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ تدوین حدیث کے لیے خلافت راشدہ میں ان خاص وجوہ و اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل صفحات بالا میں دی گئی ہے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن عزیز کے لیے عمل میں آیا ہے اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ شروع ہی سے دونوں میں فرق مراتب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور سوچا گیا ہے کہ سنت کا سرمایہ بلحاظ ثبوت قطعیت میں قرآن کے برابر نہ ہوتا تاکہ کلام الٰہی اور کلام رسول کا وہ جوہری فرق قائم رہے جسے خود وحی الٰہی نے روز اول ہی سے قائم رکھا ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد رکھا ہے۔

شاطبی لکھتے ہیں:

رتبة السنة التاخر عن الكتاب في الاعتبار۔(۱)

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر بظاہر قرآن اور حدیث میں معارضہ ہو جائے تو قرآن کو مقدم اور حدیث کو مؤخر کیا جائے گا۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن سے ثابت شدہ احکام کا درجہ فرض کا اور سنت سے معلوم شدہ مسائل کی حیثیت وجوب' سنت' استحباب اور ندب سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آپ ایک لمحہ کے لیے سوچئے کہ اگر سارا سرمایہ قرآن ہی کی طرح قطعیت رکھتا تو اسلام میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حیثیت بھی فرض سے کم نہ ہوتی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ترک فرض کی عقوبت کا اندیشہ ہوتا۔ پوری زندگی اجیرن ہو جاتی اور اس کے نتیجے میں وہ اسلامی معاشرہ وجود میں نہ آ سکتا جو آج اسلام کے نام پر موجود ہے اور وہ سہولت اور آسانی یکسر ختم ہو جاتی جو قرآن نے قائم کی تھی۔

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر۔

افراط و تفریط کے درمیان راہ اعتدال یہی ہے کہ نہ تو سارے علمی سرمایہ کی قطعیت قائم کر کے ایک ایک چیز کو فرض قرار دیا جائے اور نہ سارے ہی کو بالکل ختم کر کے فکر و عمل کی ایسی آوارگی اور آزادی پیدا کی جائے کہ اسلامی زندگی ناپید ہو کر رہ جائے اس لیے ارادتاً حدیث کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا کہ اس کا درجہ قرآن سے دوسرا ہو گیا۔ بہرحال حدیث نے اسی طرح سینہ اور سفینہ سے گذر کر قرن اول کو عبور کیا اور صفر ۹۹ھ میں خلیفہ صالح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ آپ نے اپنے ممالک محروسہ میں سرکلر جاری کیا کہ حدیث نبوی کو جمع کیا جائے۔ جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف اہل مدینہ کو نہیں بلکہ تمام اطراف مملکت میں حکمنامہ روانہ کیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ ابونعیم اصفہانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

كتب عمر بن عبدالعزيز الى الافاق انظر واحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجمعوه۔(۲)

---

(۱) الموافقات: ج ۴ ص ۷ (۲) فتح الباری: ج ۱ ص ۳۰

حضرت عمر نے اطراف میں خط روانہ کیا کہ حدیث کو تلاش کرو اور ایک جا کرو۔
مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر کو جو سرکاری حکم اس سلسلے میں ملا تھا اس کا اجمالی تذکرہ آپ پہلے پڑھ چکے امام بخاری نے اگر چہ قاضی ابوبکر کے اس حکم کا صرف ابتائی حصہ درج کیا ہے کہ:

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔(۱)

لیکن ابن سعد نے طبقات میں یہ اضافہ بھی کیا ہے:

انظر مالکان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او سنۃ ماضیۃ او حدیث عمر فاکتبہ فانی کفت دروس العلم و ذھاب العلماء۔(۲)

حدیث رسول اللہ' سنۃ ماضیہ' حدیث عمر کو لکھو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔
امام محمد موطا میں یہ خط اس طرح درج کیا ہے کہ:

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او سنۃ اوحدیث عمر او نحوھذا فاکتبہ لی فانی قد خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔(۳)

بعض روایات میں عمرہ کے ساتھ قاسم بن محمد کا نام بھی آیا ہے چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر کو یہ بھی لکھا ہے کہ عمرہ اور قاسم کے پاس جو علم ہے اس کو لکھ کر بھیجیں۔(۴)
ان تمام بیانات کو پڑھ کر تاریخ کا طالب علم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ:
(الف) امیر المومنین نے صرف ایک ابوبکر کے نام ہی نہیں بلکہ تمام ممالک محروسہ میں مختلف اطراف میں ایک سے زیادہ حضرات کے نام یہ پیام بھیجا۔ چنانچہ علامہ سیوطی امام زہری سے ناقل ہیں کہ:

---

(۱) بخاری شریف جلد اول (۲) طبقات ابن سعد (۳) موطا امام محمد ص ۳۹۱ (۴) تہذیب التہذیب

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ کر بھیجیں چنانچہ سالم نے جو کچھ انہوں نے پوچھا تھا وہ ان کو لکھ بھیجا۔(۱)

اور امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے امام زہری کا یہ بیان نقل کیا ہے:

ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت تھی ایک دفتر بھیج دیا۔(۲)

ان کے علاوہ دمشق میں اس وقت شام کے مشہور امام اور فقیہ مکحول دمشقی موجود تھے۔ ابن الندیم نے الفہرست میں ان کی تصانیف کے سلسلے میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے غالبًا یہ کارنامہ بھی امام مکحول نے امیرالمومنین کے حکم ہی کی تعمیل میں انجام دیا ہے۔ نیز علامۃ التابعین امام شعبی کے متعلق جو حافظ سیوطی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

اما جمع حدیث الی مثله فقد سبق الیه الشعبی فانه روی عنه انه قال هذا باب من الطلاق جسیم۔(۳)

چونکہ امام شعبی بھی قاضی ابوبکر کی طرح کوفہ میں عمر بن عبدالعزیز ہی کے زمانے میں منصب قضا پر تھے جیسا کہ حفظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے۔ اس لیے خیال ہے کہ امام شعبی نے کوفہ میں احادیث جمع کرنے کا کام سرکاری حکم کے تحت کیا ہوگا۔ امام موصوف چونکہ بالغ النظر یگانہ روزگار فاضل تھے اس لیے آپ نے اس تالیفی کارنامہ میں صرف احادیث جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو ابواب پر بھی تقسیم کیا۔ امام زہری، امام سالم، امام مکحول اور امام شعبی کے علمی کارناموں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آیئے اب قاضی ابوبکر کے کارنامے کا بھی کچھ حال سن لیجیے۔

اتنی بات تو آپ سن چکے ہیں کہ قاضی ہونے کی حیثیت میں آپ کے نام بھی سرکاری حکم آیا تھا۔ آپ نے اس حکم پا بجائی کس حد تک کی؟

---

(۱) تاریخ الخلفاء: ص ۱۶۱ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ (۳) تدریب الراوی: ص ۴۰

حافظ ابن عبدالبر نے تمہید میں امام مالک کی زبانی یہ انکشاف کیا ہے کہ:

فتوفی عمر وقد کتب ابن حزم کتبا قبل ان یبعث الیہ۔(۱)

عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے وقت ابن حزم کتابیں لکھ چکے تھے لیکن ابھی روانہ نہیں کی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں حدیث کی ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں مگر قاضی صاحب کا یہ علمی کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو عمر بن عبدالعزیز اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

(ب) دوسری بات اس خلافت کے فرمان میں یہ سمجھنے کی ہے کہ فرمان خلافت میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کرنے کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ سنت ماضیہ اور فاروق اعظمؓ کے فیصلے بھی لکھنے کا حکم دیا تھا سنت سے مقصود اسلام کا وہ محسوس نظام عمل ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں چھوڑا تھا اور جس پر امت عمل پیرا تھی۔

السنۃ ھی الطریقۃ المسلوکۃ لجماعۃ المسلمین المتوالۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔(۲)

حدیث سے روایت سنت کا وہ سرمایہ مراد ہے جو لوگوں نے بڑی محنتوں اور عرق ریزیوں کے بعد فراہم کیا۔ یاد رہے کہ اسناد و روایت کی باتیں اسلام کے علمی سرمایہ میں سنت کے لیے نہیں بلکہ تاریخ سنت حدیث کے لیے ہیں۔ سنت تو تواتر اور توارث کے ذریعے ہمیشہ سے موجود ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے دین کے اسی حصہ یعنی سنت کے متعلق لکھا ہے۔

اس کی ایسی حالت ہے جیسے خود کسی معائنہ اور براہ راست شنید کی ہوتی ہے۔

انہوں نے اس راہ سے آنے والی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد الرکعات و مقادیر الزکوۃ۔

---

(۱) تنویر الحوالک مقدمہ: ص ۴ (۲) التانیب: ص ۷

تواتر کا علم الاسناد کے مباحث سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ملا محب اللہ فرماتے ہیں:

ان التواتر لیس من مباحث علم الاسناد۔

بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر مولانا بحر العلوم نے یہ انکشاف کیا ہے۔

التواتر کالمشاهدة فی افادة العلم ۔(۱)

حافظ ابن حزم نے اس موقعہ پر ایک تفصیلی بیان قلم بند فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں:

اسلام کا علمی سرمایہ جو نبوت سے امت کو ملا ہے صرف یہ ہے۔

- قرآن' نمازیں' رمضان کے روزے' حج اور زکوۃ اور سارے اسلامی شرائع۔ یہ سب بطور تواتر منقول ہو کر امت کو ملا ہے۔ اس کو بیان کرنے والے اور پیش کرنے والے ہمیشہ زمانہ نبوت سے مشرق و مغرب میں اس قدر رہوئے ہیں کہ ان پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔
- نقل عام جیسے آیات و معجزات جو خندق اور تبوک میں نمایاں ہوئے۔ احکام حج اور مقادیر زکوۃ ان کو نبوت سے نقل کرنے والے اتنی تعداد میں ہوئے ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں کہ ہر دور کے علماء اور اہل تحقیق نے اسے قبول کیا ہے اسے مشہور کہتے ہیں۔
- حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات' صحابہ کے فیصلے اور تابعین کے فتاویٰ یہ امت کو خبر واحد کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں ان کے نقل کرنے والے ذات نبوت تک ثقہ اور معتبر اشخاص ہیں۔ ان کا نام و نسب معلوم اور ہر ایک کا حال' زمان' مکان اور عدالت معروف ہے اس طریق سے جو معلومات آئی ہیں ان میں بیان کرنے والے متعدد ہوتے ہیں گاہ واسطہ بواسطہ اور نام بنام بات ذات نبوت تک پہنچتی ہے کبھی صحابہ تک اور کبھی کسی ایسے تابعی تک جسے صحابہ کی دید کا شرف حاصل ہوا ہو۔(۲)

اس ساری تفصیل کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا علمی سرمایہ جو امت کو نبوت سے وراثت میں تواتر' شہرت اور خبر واحد کے ذریعے ملا ہے۔ یہ قرآن' سنت' حدیث۔

---

(۱) فواتح الرحموت: ج ۲ ص ۱۱۹ (۲) الفصل فی الملل والاهواء والنحل: ج ۲ ص ۸۲

قرآن وسنت دونوں متواتر ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر علمی اور سنت کا تواتر عملی ہے اور سنت کی تاریخ جس ذریعے سے ہم کو پہنچی ہے یعنی خبر واحد یا خبر خاصہ اس کا نام حدیث ہے۔ حافظ سیوطی نے حدیث کی یہ تعریف کی ہے۔

نقل السنة و نحوها واسناد ذالک الی من عزی الیه تحدیث او اخبار او غیر ذالک۔(۱)

فرمانِ خلافت میں حدیثِ عمرؓ کا اضافہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں حدیث عمرؓ کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ پورے اسلام کی تاریخ نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے جیسا کہ اس کے متعلق کچھ اشارات پہلے ہو چکے ہیں۔ حدیث عمر کے ساتھ اس فرمان میں اونحو ہذا کا اضافہ پورے نظام خلافت کی طرح رہنمائی کر رہا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے التعلیق المجد میں اس کی تصریح فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

من احادیث بقیة الخلفاء۔(۲)

اسلام میں خلفائے راشدین کی سنت:

یہاں ذہنوں میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت دین میں حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں یہ بات صراحۃً بتائی ہے۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں۔

وکتب عمر بن عبدالعزیز الیٰ ابی بکر بن حزم انظر ماکان من حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فاکتبه لی فانی خشیت دروس العلم و ذهاب العلماء ولا یقبل الا حدیث النبی صلی الله علیه وسلم ولیفشوا ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلک حتی یکون سرًا۔(۳)

(۱) تدریب الراوی: ص۴۲ (۲) التعلیق المجد: ص۳۹۲ (۳) صحیح بخاری

یہ وسوسہ اس لیے پیدا ہوا کہ اس پوری عبارت کو عمر بن عبدالعزیز کی عبارت تصور کر لیا گیا حالانکہ فرمان کی عبارت صرف ذھاب العلماء تک ہے۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے مستخرج میں اس کی تصریح کی ہے اور لا تقبل سے امام بخاری کی اپنی عبارت شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عینی سے رقمطراز ہیں۔

فاذا کان کذالک یکون هذا من کلام البخاری اورده عقیب کلام عمر بن عبدالعزیز بعد انتهائه۔(۱)

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبارت مذکورہ کے بعد جب اس فرمان کی سند پیش کی تو تصریح کردی کہ یہ تعلیق صرف ذھاب العلماء تک ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

حدثنا العلاء بن عبدالجبار حدثنا عبدالعزیز بن مسلم عن عبدالله بن دینار بذالک یعنی حدیث عمر بن عبدالعزیز الیٰ قوله ذهاب العلماء۔(۲)

علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ:

والمقصود منه ان العلاء روی کلام عمر بن عبدالعزیز الیٰ قوله ذهاب العلماء فقط۔(۳)

اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فرمان میں حدیث رسول کے سوا کچھ اور لکھنے سے منع کیا گیا تھا ایک سنگین غلط فہمی ہے۔ اس موضوع پر جمہور امت کی ہمیشہ سے یہ طے شدہ پالیسی رہی ہے جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کی حیثیت دین میں معیار حق اور حجت و دلیل کی ہے اور اسلام میں سنت کا اطلاق نبوت اور خلافت دونوں کے اعمال پر ہوا ہے۔ قرآن میں یہ بات دلالت اور ارشادات نبوت میں صراحۃً آئی ہے۔ قرآنی آیات آپ پہلے سن چکے ہیں۔ آیئے خاص اسی موضوع پر ارشادات نبوت بھی گوش گذار فرمالیجیے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) عمدۃ القاری: ج ا ص ۱۳۰　(۲) صحیح بخاری　(۳) عمدۃ القاری: ج ا ص ۱۳۰

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة۔(۱)

تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم جانو اس کو دانتوں سے دبالو۔ نئی نئی باتوں سے بچ کر رہو یاد رکھو کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں ارقم فرماتے ہیں:

اس لیے کہ خلفائے راشدین نے دراصل آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کر کے اس کو اختیار کیا۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر اختیار کیا ہے وہ بھی سنت ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت امت کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو اور جو چیز آپ سے مروی نہ ہو اور خلفائے راشدین میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا اس کے متعلق حکم دیا ہو تو وہ سنت نہ کہلائے گی چنانچہ مشہور عالم امیر یمانی محمد بن اسماعیل لکھتے ہیں:

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔(۳)

لیکن یہ تحقیقی بات نہیں ہے کیونکہ

خلفاء کی سنت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے ہو بہو موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو۔ کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے وہ بھی سنت ہے حالانکہ یہ ایک بین حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے اگر چہ اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً

(۱) مستدرک حاکم: ج ۱ ص ۹۶ (۲) مرقاۃ المفاتیح: ج ۱ ص ۳۰ (۳) سبل السلام: ج ۲ ص ۱۲

دیکھئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس چالیس کوڑے سزا دی اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں ہے مگر حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا دی ہے یہ بھی سنت ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ:

جلد النبی صلی الله علیه وسلم اربعین و ابوبکر اربعین و عمر ثمانین و کل سنة۔(۱)

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔

واتمها عثمان ثمانین و کل سنة۔(۲)

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور کہنے والے حضرت علیؓ خلیفہ راشدین ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں:

هذا دلیل ان علیاً کان معظمًا لاثار عمر وان حکمه وقوله سنة وامره حق و کذالک ابوبکر۔(۳)

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ:

قول الشیخین حجة اذا اتفقالا یجوز العدول عنه وان اتفاق الائمة الاربعة ایضاً حجة۔(۴)

ابوبکر و عمر کا قول حجت ہے جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

عمل اهل المدینة الذی یحتج به ما کان فی زمن الخلفاء الراشدین۔(۵)

اہل مدینہ کا وہ عمل حجت ہے جو زمانہ خلفائے راشدین میں ہوا ہو۔

---

(۱) صحیح مسلم: ج ۲ ص ۷۲ (۲) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۱۸۱ (۳) شرح مسلم: ج ۲ ص ۷۲

(۴) منہاج السنہ: ج ۳ ص ۱۶۲ (۵) زاد المعاد: ج ۱ ص ۱۶۸

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ اسلام کا پورا نقشہ نبوت اور خلافت سے مل کر بنتا ہے۔
خیر یہ بات تو حدیث و سنت میں فرق بتانے کے لیے ضمناً آ گئی ہے بتا یہ رہا تھا کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کا حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا ان میں مدینہ کے قاضی ابوبکر امام زہری، امام سالم اور کوفہ میں امام شعبی، دمشق میں امام مکحول کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں امام نافع کے بارے میں کوئی مثبت تصریح نہیں ہے لیکن اگر ہم ان دو باتوں کو ملا لیں کہ آپ نے یہ حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا تھا۔

اور ساتھ ہی امام نافع کے بارے میں امام ذہبی کی یہ تصریح بھی پڑھیں کہ:

بعث عمر بن عبدالعزیز نافعاً الیٰ اهل مصر لیعلمهم السنن۔

عمر نے حضرت نافع کو مصر والوں کے لیے معلم سنن بنا کر روانہ فرمایا۔

تو پھر یہ یقین آ جاتا ہے کہ امام نافع کو بھی مصر میں یہ حکم ضرور پہنچا ہوگا اور انہوں نے بھی اس حکم کی تعمیل میں ضرور تدوین سنن کا کام کیا ہوگا بلکہ میں تو جزیرہ کے مشہور قاضی میمون بن مہران کو بھی اسی میں داخل کرتا ہوں۔

ان تمام تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۹۸ھ سے ۱۰۱ھ تک حدیث کے نام پر امیر المومنین کے اس فرمان کے نتیجے میں یہ علمی سرمایہ منصۂ شہود پر آ گیا۔

۱- کتب قاضی ابوبکر بن حزم۔
۲- دفاتر امام زہری۔
۳- ابواب امام شعبی۔
۴- کتاب السنن امام مکحول۔
۵- کتاب الصدقات امام سالم۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو رحلت فرمائی۔ آپ کی مدت خلافت کل دو سال پانچ ماہ ہے۔ یہ تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ صحابہ کی تصانیف کو بھی اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۱ھ تک خالص حدیث کے موضوع پر تیرہ کتابیں منصۂ منصہ چکی تھیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جن بزرگوں کتابیں تالیف کی ہیں یہ سب کبار تابعین ہیں۔ان میں امام نافعؒ' امام سالمؒ' امام زہری اور امام شعبی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے اساتذہ ہیں اور امام شعبی کے متعلق تو حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ یہ فن حدیث میں امام اعظم کے شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں چنانچہ امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا نام لیا ہے ساتھ ہی یہ لکھ دیا ہے:

وھو اکبر شیخ لابی حنیفۃ۔(۱)

جمع قرآن: بیان قرآن پر ایک اہم نکتہ تفسیری:

یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ کام کیوں کیا۔

یہ بات تو آپ سن چکے ہیں کہ دور خلافت میں جمع قرآن' قرأت قرآن کے ساتھ تدوین سنن کا کام کیوں نہیں ہوا۔

دراصل جہاں تک میں سمجھتا ہوں جمع قرآن' قرأت قرآن یا تدوین سنن تینوں کام اپنے اپنے وقت پر منشاء الہی کے مطابق منصۂ شہود پر آئے ہیں۔

منشاء الہی سے میری مراد یہ ہے کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہوا ہے۔ یہی قرآن کا وعدہ تھا۔آپ پڑھ آئے ہیں کہ سورۂ قیامہ کی آیت:

ان علینا جمعہ وقرانہ فاذاقرأناہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ

میں ان علینا بیانہ سے قرآن کی دوسری آیت:

انزلنا الیک الذکر لتبین للناس

کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان مراد ہے کیونکہ سورۂ قیامہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول وحی کے وقت یہ حکم دیا ہے:

لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ

اس کا منشاء یہ ہے کہ آپ نزول وحی کے وقت سنا کریں حضرت جبریل کے ساتھ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد اول ترجمہ امام شعبی

پڑھانہ کریں اور مستقبل میں قرآن کے بارے میں تین وعدے فرمائے ایک جمع قرآن دوم قرأۃ قرآن سوم بیان قرآن۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ان علینا جمعه و قرانه فاذا قرأناه فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانه۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ قرآن کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں اس کو جمع کرنا' پڑھوانا اور پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اگرچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ تشریح آئی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت بڑی مشقت سے دوچار ہوتے اور آپ ہونٹوں کو ہلاتے تھے یعنی وحی سنتے جاتے اور پڑھتے جاتے مگر با آواز بلند نہیں بلکہ صرف ہونٹوں کو ہلاتے تھے اس پر اللہ پاک نے یہ حکم نازل کیا لاتحرک به الخ۔ جمع سے مراد سینہ میں جمع کرنا ہے اور قرآن سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا ہے۔ فاتبع قرانه کا مطلب یہ ہے کہ چپ رہو اور کان لگا کر سنو ثم علینا بیانه میں بیان کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم تمہیں پڑھا دیں گے۔

اس روایت کے بارے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

اس روایت میں مرفوع حدیث صرف اسی قدر ہے جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے متعلق ہے باقی آیت کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ کی رائے ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اس آیت کی تفسیر ابن عباسؓ پر یہ تنقید کی ہے:

فقیر کہتا ہے کہ یہ تفسیر محل نظر ہے کیونکہ اس تفسیر پر تینوں الفاظ جمع' قرآن اور بیان کا منشا ایک ہے تینوں الفاظ کو ایک ہی معنے کا جامہ پہنانا شان بلاغت نہیں ہے۔ پھر ثم ان علینا بیانه کا ایسا مطلب بتانا جو بغیر معقول تاخیر کے واقع ہوا ہو اور بھی شان بلاغت کے منافی ہے۔ کیونکہ لفظ ثم کلام عرب میں تراخی کے لیے آتا ہے۔(۱)

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی ان ہی کی زبان سے سن لیجئے:

---

(۱) ازالۃ الخفاء: ج ا ص ۱۹۲

زیادہ اچھی تفسیر یہ ہے کہ ان علینا جمعہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ قرآن کو کتابی صورت میں یک جا کرنے کا وعدہ ہمارے ذمہ ہے قرآنہ کا مطلب یہ ہے کہ امت کے قاریوں کو اور نیز رائے عامہ کو تلاوت کی توفیق دینا ہمارا کام ہے تاکہ سلسلۂ تواتر قائم رہے بالفاظ دیگر حق سبحانہ کا ارشاد ہے۔ کہ اے پیغمبر تم فکر نہ کرو اور اس کے یاد کرنے کی مشقت نہ اٹھاؤ دیکھو ہم نے قرآن کے لیے وہ بات اپنے ذمہ کر لی ہے جو تمہارے فرض منصبی سے بھی کئی درجہ پیچھے ہے یعنی قرآن کو مصاحف میں جمع کرا دینا اور اس کو امت سے پڑھا دینا۔ لہٰذا تم اپنا دل اس کے یاد کرنے میں نہ لگاؤ بلکہ جب ہم بزبان جبریل پڑھیں اسے سنو۔ پھر ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح۔ ہم ہر زمانے میں قرآن کی تشریح اور اس کے شان نزول کو بیان کرنے کی ایک جماعت کو توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ قرآن کا مصداق بتائیں۔ (۱)

جمع قرآن اور قرأت قرآن دونوں ایک وقت میں ہوئے ہیں اور تاریخی لحاظ سے یہ شیخین کا زمانہ ہے کیونکہ قرآن میں ان دونوں کو واو عطف کے ذریعے جمع کیا گیا ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ جیسے جمع کا کام فاروق اعظمؓ کے مشورے سے صدیق اکبرؓ کے زمانے میں ہوا ایسے ہی پورے قرآن کے حفظ و قرأت کا سلسلہ بھی فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

اول شروع حفظ آں از جانب ابی بن کعب وعبداللہ بن مسعود بودہ است در زمان عمر۔ (۲)

اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جمع قرآن کو کتابی صورت میں کرنے کے بعد حفظ و قرأت قرآن کی طرف فاروق اعظمؓ نے رمضان میں قرآن کی سالگرہ منا کر اقدام فرمایا تھا۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فاروق اعظمؓ نے حفظ ہی کی خاطر سرکاری خزانے سے وظائف اور معلمین قرآن کی تنخواہیں مقرر کیں۔ جیسا کہ ابن الجوزی نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے۔ خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن حکیم کی جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا چنانچہ ایک

(۲،۱) ازالۃ الخفاء۔ ج ۱ ص ۱۹۳

شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا۔ چند آدمیوں کے ساتھ اس کام پر لگایا کہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن حکیم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اسے سزا دے۔(۱)

ظاہر ہے کہ امتحان کی منزل اسی وقت درپیش آتی ہے جبکہ پہلے اس مقصد کی خاطر پوری آبادی میں تعلیم قرآن کا ایک ہمہ گیر نظام قائم کر دیا ہو۔ جن صحابہ کو پورا قرآن یاد ہو گیا تھا فاروق اعظمؓ نے ان کو بلا کر فرمایا: شام کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداءؓ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عبادۃ ابن الصامتؓ کو اس مشن پر روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو ہدایت کی کہ پہلے حمص جائیں وہاں کچھ روز قیام کر کے جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے تو ایک اسی جگہ قیام کرے۔ باقی دو میں سے ایک دمشق اور ایک فلسطین جائے۔ حافظ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ کا دمشق میں معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تشریف فرما ہوتے اردگرد قرآن پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ حضرت ابوالدرداءؓ دس دس آدمیوں کی الگ الگ جماعت بنا دیتے اور ہر جماعت پر ایک قاری مقرر کر دیتے اور خود ٹہلتے رہتے جب طالب علم پورا قرآن یاد کر لیتا تو حضرت ابوالدرداءؓ اسے اپنی شاگردی میں لے لیتے۔ ایک بار حضرت ابوالدرداءؓ کی خاص کلاس کے طلبہ کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد سولہ سو حفاظ پر مشتمل تھی۔

حضرت عمرؓ نے قرآن کے حفظ و قرأت کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اور بہت سے وسائل اختیار کیے ضروری سورتوں مثلاً البقرہ' النساء' المائدہ' الحج اور النور کی نسبت حکم دیا کہ رائے عامہ کو اس قدر قرآن ضرور یاد ہونا چاہیے۔(۲)

سرکلر جاری کر دیا کہ جو لوگ قرآن سیکھ لیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں فوجیوں کو ہدایت تھی کہ قرآن شریف یاد کریں۔ گاہ گاہ دفاتر سے قرآن خواں حضرات کے رجسٹر منگاتے رہتے تھے۔ ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان گنت لوگ قرآن پڑھ گئے اور حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ایک بار فوجی افسروں کو خط لکھا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس روانہ کیا

---

(۱) الاغانی: ج ٦ ص ۵۸' الاصابہ (۲) کنز العمال: ج ۱ ص ۲۱۰' ص ۲۲۴

جائے تا کہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لیے مختلف جگہ روانہ کروں تو حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ ہیں۔(۱)

الغرض کتابی صورت میں جمع کے ساتھ فاروق اعظمؓ نے حفظ وقرأت کا ایک بندھا ٹکا نظام قائم کر دیا حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے صحیح فرمایا ہے:

امروز ہر کہ قرآن می خواند از طوائف مسلمین منت فاروق درگردن اوست(۲)

آج جو بھی قرآن پڑھتا ہے اس کی گردن پر فاروق اعظمؓ کا احسان ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جمع قرآن در مصاحف اور قرأت قرآن کا وعدہ الٰہی زمانہ خلافت راشدہ میں پورا ہوا۔ اور ان علینا جمعه و قرآنه کی عملی تفسیر ہو گئی لیکن آخری وعدہ قرآن کے متعلق جو اسی آیت میں ثم ان علینا بیانه کے ذریعے کیا گیا ہے وہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ دیر کے بعد خلافت عمر بن عبدالعزیزؒ میں پورا ہوا۔ کیونکہ یہ وعدہ ثم کے ذریعے آیت میں آیا ہے اور آپ سن آئے ہیں کہ عربی زبان میں ثم تراخی کے لیے ہی آتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے ثم ان علینا بیانه کی تشریح یہ کی ہے:

ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانے میں ہم ایک جماعت کو قرآن کی لغوی تشریحات اور اس کی شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے تا کہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مصداق بیان کریں اور یہ بات یاد کرنے اور تمہاری تبلیغ کے بعد ہو گی کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کے مبین ہیں۔(۳)

انزلنا الیک الذکر لتبین لناس مانزل الیهم لعلهم یتفکرون۔

چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے مبین ہیں اس لیے حضورﷺ کی سنت ہی قرآن کا بیان ہے اس بیان کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ حفظ قرآن کے دیر بعد ہو۔ کیونکہ اللہ پاک نے اول تو جمع قرآن کے بعد بیان قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس کو ثم کے ذریعے

---

(۱) کنز العمال: ج ۱ص ۲۱۰، ص ۲۲۴　(۲) ازالۃ الخفاء　(۳) ازالۃ الخفاء جلد دوم

پیش کیا ہے جو عربی زبان میں قطعاً تراخی کے لیے آتا ہے۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ بیان قرآن سے مراد بیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور جمع قرآن کی طرح اس بیان کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ لیکن ایک عرصہ بعد اور یہ حضور انورؐ کے دنیا سے روانہ ہونے کے پورے ستاسی سال بعد ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

در وعدہ بیان کلمہ ثم کہ برائے تراخی است ذکر نمودن می فہماند کہ در وقت جمع قرآن در مصاحف اشتغال بتلاوت آں شائع شد و تفسیر آں من بعد بظہور آمد و در خارج ہم چنیں تحقق شد۔(۱)

لہٰذا تدوین سنن یعنی بیان قرآن کا کام زمانہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ قانونی طور پر عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایماء سے خلافت راشدہ کے بعد ہوا۔

عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی:

اللہ اکبر! دونوں کے عمل میں کس قدر آہنگی ہے۔ جنگ یمامہ میں صحابہ کی ایک جماعت جام شہادت نوش کرگئی۔ قرآن کے حافظوں کے اس قدر اچانک نقصان سے قرآن کی حفاظت میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ فاروق اعظمؓ نے اس خطرے کو محسوس کیا اور فرمایا:

یمامہ کے دن قاری قرآن جام شہادت نوش کر گئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قراء قرآن ایسے ہی جام شہادت نوش کرتے رہے تو قرآن کا زیادہ حصہ چلا جائے گا اس لیے جلدی قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیجئے۔

یہ تو یمامہ کے دن قاریوں کی شہادت سے حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا۔ آیئے اب دنیا سے وہ رخصت ہو رہے ہیں جنہوں نے قرآن کے بیان کو مدینے کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور جنہوں نے قرآن کی ہدایات پر اٹھی ہوئی کامل ترین، مؤثر ترین اور محبوب ترین زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے قرآن مجید سے اقامت صلاۃ کا حکم سنا تھا مگر انہوں نے اس کی عملی تصویر اور اس کی صحیح کیفیت اسی وقت معلوم کی جب آپ کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور آپ کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھی جس کو انہوں نے

(۱) ازالۃ الخفاء جلد دوم

نسمع له ازيزا كازيز المرجل

کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔اور اب ان کی جگہ وہ آ رہے ہیں جنہوں نے جمال جہاں آراء کو نہیں دیکھا اس لیے عمر بن عبدالعزیزؒ کو نبوت کی اداؤں اور اعمال کے حافظوں کو جاتا دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں محبوب عالم کی ادائیں ان کے رخ انور کے نظارہ کرنے والوں کو ختم ہونے سے داستان تاریخ بن کر نہ رہ جائیں اور اس اندیشے کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

خفت دروس العلم وذهاب العلماء

حضرت عمرؓ کو قاریوں کے اور عمر ثانیؒ کو علماء کے اٹھ جانے کا یکساں اندیشہ ہوا۔دونوں کے تاثرات کو ایک ترازو میں رکھ کر تو لیے۔آپ کو محسوس ہوگا کہ دونوں جگہ ایک ہی روح کام کر رہی ہے۔

تدوین حدیث کی اولیت کا شرف:

امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمع حدیث کا جو حکم دیا اور جن جن اکابر نے اس حکم کی تعمیل میں کام کیا اس کی داستان تو آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان میں قاضی ابوبکر کے علاوہ زہری، شعبی اور مکحول بھی ہیں چونکہ یہ چاروں معاصر ہیں اس لیے یقین سے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ سب سے پہلے اس موضوع پر کس نے تدوین کا کام انجام دیا ہے۔حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس خط کی شرح کرتے ہوئے جو قاضی ابوبکر کے نام امام بخاری نے درج کیا ہے لکھا ہے:

يستفاد منه ابتداء تدوين الحديث(١)

علامہ قسطلانی نے بھی شرح بخاری میں اس کی ہمنوائی کی ہے۔اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر مدون اول ہیں لیکن چونکہ قاضی صاحب کا کارنامہ شاہراہ عام پر نہیں آیا اس لیے ان کا نام تدوین میں زیر بحث نہیں آتا۔تہذیب التہذیب میں امام مالکؒ سے منقول ہے کہ میں نے ان کتابوں کے بارے میں قاضی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمن بن ابی بکر

---

(١) فتح الباری: ج ا ص ۱۷۶

سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ضائع ہو گئیں۔ اس لیے حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں' جلال الدین السیوطی نے الفیہ اور تدریب میں اور امام مالک اور عبدالعزیز دراوردی نے مدون اول کی حیثیت سے امام زہری کا نام پیش کیا ہے۔ لیکن اولیت کا یہ شرف امام زہری کو صرف تدوین میں ہے ورنہ جہاں تک حدیث کی تبویب کا تعلق ہے اس کی اولیت کا شرف کوفہ میں امام شعبی کو حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر حدیث کی تدوین کا شرف اگر اہل مدینہ کو حاصل ہے تو اس کی تبویب پر کوفہ والوں کو فخر ہے۔

دوسری صدی ہجری میں علم حدیث:

پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ راشد کے حکم سے جمع تدوین حدیث کی جو صبح صادق طلوع ہوئی اسے دوسری صدی میں اتنی ترقی ہوئی کہ تصنیف و تالیف کا آفتاب نکل آیا اور احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے آثار اور تابعین کے فتاوی بھی اس دور کی تصانیف میں مرتب و مدون کر دیے گئے۔

دوسری صدی میں جن اکابر نے موضوع حدیث پر تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم سب کا ذکر کریں لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم بالکل ان کو نظر انداز کر دیں کیونکہ یہی وہ اکابر ہیں جو دور اول کے مصنفین کے جانشین اور ترکۂ علم حدیث کے وارث ہوئے ہیں تحریر و تالیف کے لحاظ سے بھی اور اپنی جلالت علمی کے اعتبار سے بھی۔

اس لیے ہم یہاں چند گرامی قدر ہستیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ محدثین اور مؤرخین نے اس دور کے مصنفین میں ایک سے زیادہ اکابر کا نام لیا ہے ان کے متعلق تصریح ہے کہ ان اکابر نے اپنے اپنے وقت میں تصنیف کا کام کیا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیت کا شرف دوسری صدی میں کسے حاصل ہے؟

امام اعظمؒ کے بارے میں حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

انه اول من دون الشریعة و رتبه ابوابا۔(۱)

سعید بن ابی عروبہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:

(۱) تبییض الصحیفہ: ص ۳۶

هوا اول من صنف الابواب بالبصرة ۔(۱)

ربیع بن صبیح کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے رامہرمزی کی مشہور کتاب المحدث الفاصل کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ:

انه' اول من صنف بالبصرة ۔(۲)

امام عبدالملک بن عبدالعزیز کو امام ذہبی نے صاحب التصانیف لکھ کر بتایا ہے کہ امام احمد کا بیان ہے کہ:

اول من صنف الکتب ۔(۳)

امام معمر بن راشد کا حافظ ذہبی نے تعارف پیش کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

کان اول من صنف بالیمن ۔(۴)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ اولیت چسپاں ہے۔ ان تصریحات کو دیکھ کر ایک ناواقف حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بہتوں نے یہ کہہ کر اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا ہے کہ مدونین کے نام میں جن جن کا نام لیا جاتا ہے سب صحیح ہے اور اس کا تعلق مختلف امکنہ اور شہروں سے ہے۔ مکہ شہر میں تالیف کا کام ابن جریج نے' شام کے شہر بیروت میں امام اوزاعی نے' کوفہ میں سفیان ثوری نے' بصرہ میں حماد بن سلمہ نے' واسطہ میں ہشیم نے' یمن میں معمر نے' خراسان میں عبداللہ بن المبارک نے' رے میں جریر بن عبدالحمید نے انجام دیا ہے۔ لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

یہ سب اکابر ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اس لیے حتماً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع اولیت کا شرف کسے حاصل ہے۔(۵)

دراصل بات یہ ہے کہ یہاں تدوین اور تصنیف میں کچھ اختلاط ہو گیا ہے ان دونوں کو اگر الگ الگ رکھ کر عقدہ کو حل کیا جائے تو آسانی سے معاملہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مدونین

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ص ۱۶۷ (۲) تہذیب: ج ۲ص ۲۴۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ص ۱۶۱

(۴) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ص ۱۷۹ (۵) مقدمہ فتح الباری: ص ۵

کی فہرست میں تو آپ امام زہری' امام شعبی' امام مکحول اور قاضی ابوبکر کے اسمائے گرامی سن چکے ہیں۔ یہ دور دور تدوین ہے اور اس کا آغاز ۱۰۰ھ سے شروع ہو کر ۱۴۳ھ کے ختم پر ہے۔ اس کے بعد دور تصنیف شروع ہوا ہے دور تصنیف میں پہل کا سہرا کس کے سر ہے اس سلسلے میں عبدالملک بن جریج ۱۵۰ھ' ابوحنیفہ ۱۵۰ھ' محمد بن اسحاق ۱۵۱ھ' سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ الربیع بن صبیح ۱۶۰ھ امام مالک ۱۷۹ھ' حماد بن سلمہ ۱۶۷ھ' سفیان ثوری ۱۶۱ھ' اوزاعی ۱۵۶ھ' ہشیم ۱۸۸ھ' عبداللہ بن المبارک ۱۸۱ھ' معمر بن راشد ۱۵۳ھ' جریر بن عبدالحمید ۱۸۸ھ' سفیان بن عیینہ ۱۹۸ھ' لیث بن سعد ۱۷۵ھ اور شعبۃ بن الحجاج ۱۶۰ھ ...... یہ اکابر اگرچہ معاصر ہیں مگر ان کا تعلق مختلف امکنہ سے ہے اور یہ اسلامی ممالک میں متفرق شہروں مکہ' مدینہ' بصرہ' کوفہ' دمشق' واسط' خراسان' یمن' رے اور مصر میں کام کر رہے ہیں اور ان کا یہ کام ایک منہج پر نہیں بلکہ مختلف مناہج پر ہوا ہے۔ جمع حدیث کی حد تک اس دور کے مصنفین میں اولیت بلا ریب مکہ میں ابن جریج' بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ مختلف احادیث کو صرف کتاب کا لبادہ پہنا دیا جائے۔ ڈاکٹر السباعی نے درست لکھا ہے کہ:

> ان کا کام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات' احوال صحابہ' فتاویٰ تابعین کو یکجا کرنا تھا۔

حافظ ابن حجر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ:

کونوا یصنفون کل باب علی حدۃ۔(۱)

امام اعظمؒ شرائع کے مدونِ اول ہیں:

لیکن ابھی تک کسی ترتیب اور تبویب کے ساتھ یہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ تصنیف کی بالکل ابتداء تھی اس لیے کیف ما اتفق حدیثوں کو سمیٹنا ہی ان بزرگوں کے پیش نظر تھا اور اس اولیت کا شرف حسنا ابن جریج' ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے لیکن جہاں تک احکام کو پیش نظر رکھ کر تبویب اور ترتیب فقہی کا تعلق ہے اس میں اولیت کا شرف یقیناً امام اعظمؒ کو حاصل ہے جیسا کہ حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

---

(۱) مقدمہ فتح الباری: ص ۴

انه اول من دون الشريعة ورتبه ابواباً۔(۱)

اور یہ بھی السیوطی نے بتایا ہے کہ ابو حنیفہ صرف مدون اول ہی نہیں بلکہ اس میں وہ یگانہ بھی ہیں۔ لکھا ہے:

انفردبها ولم يسبق ابا حنيفة احده۔(۲)

چونکہ دور اول میں تبویب کا سہرا بھی کوفہ میں امام شعبیؒ کے سر ہے اس لیے اس دور ثانی میں بھی تبویب و ترتیب احکام کا سہرا کوفہ ہی میں امام شعبیؒ کے شاگرد ابو حنیفہ کے سر رہا۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

اما جمع حديث الى مثله فى باب واحده فقد سبق اليه الشعبى فانه روى عندانه قال هذا باب من الطلاق جسيم۔(۳)

مدینہ میں اس کا آغاز امام مالکؒ سے ہوا ہے چنانچہ السیوطی رقمطراز ہیں:

لم تبعه مالك بن انس فى ترتيب الموطا۔(۴)

یعنی تدوین شرائع اور ان کی ترتیب و تبویب میں امام اعظمؒ مدون اول ہیں بلکہ وہ اس میں یگانہ ہیں اور موطا میں امام مالکؒ ان کے مقتدی ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے:

- حافظ ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ امام مالکؒ نے موطا کی تالیف یقیناً یحییٰ بن سعید انصاری کی وفات کے بعد کی ہے اور یحییٰ کی وفات ۱۴۳ھ میں ہوئی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ان الموطا الفه مالك بعدموت يحيىٰ بن سعيد الانصارى بلاشك وكانت وفاة يحيىٰ فى سنة ثلاث واربعين ومائة(۵)

- مشہور مؤرخ علامہ ابن فرحون نے ابو مصعب احمد بن عوف الزہری سے جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور امام مالکؒ سے موطا کے راوی ہیں نقل کیا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالکؒ سے فرمائش کی تھی کہ:

---

(۱) تبییض الصحیفہ: ص ۳۶　(۲) تبییض الصحیفہ: ص ۳۶　(۳) السنہ۔ ص ۱۴۴

(۴) تبییض الصحیفہ: ص ۳۶　(۵) توجیہ النظر: ص ۱۷

امام مالکؒ نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو ابو جعفر منصور نے جواب دیا کہ:

صنفه فما احد اليوم اعلم منك

آخر امام موصوف نے مؤطا کی تصنیف شروع کی مگر ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ ابو جعفر سربراہ مملکت عباسی کا انتقال ہو گیا۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا کی تصنیف منصور کی فرمائش پر خود اس کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس کی وفات کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی۔ منصور کی وفات ۶ ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے اور اس کی جگہ اس کا فرزند محمد المہدی مسند خلاف پر متمکن ہوا اور اسی کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں مؤطا کی تصنیف مکمل ہوئی۔

● امام اعظمؒ کی تصانیف سے امام مالکؒ کے استفادے کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت سے مذکور ہے۔ قاضی ابو العباس احمد بن محمد بن عبداللہ بن ابی العوام اخبار ابی حنیفہ میں بسند متصل عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالکؒ امام اعظمؒ کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے جیسے کہ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔

یہ شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ مؤطا بعد میں تصنیف ہوا ہے اور مؤطا سے پہلے یعنی ۱۴۰ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیانی عرصہ میں امام اعظمؒ کی تصانیف منصۂ شہود پر آ چکی تھی اس لیے ابواب و احکام کے موضوع پر تصنیف کے میدان میں اولیت کا شرف امام اعظمؒ ہی کو حاصل ہے۔

حدیث میں امام اعظمؒ کی تصنیف:

امام اعظمؒ ۱۲۰ھ میں جامع کوفہ کی اس مشہور علمی درسگاہ میں جلوہ افروز ہوئے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانے سے باقاعدہ چلی آ رہی تھی تو آپ نے جہاں فقہ کا عظیم الشان فن اجتماعی محنت سے مدون کیا وہیں فقہ کے ابواب پر مشتمل حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی صحیح اور معمول بہ روایات سے انتخاب فرما کر مرتب کیا اور اس کو اپنے تلامذہ کے سامنے لیکچرز کی صورت میں پیش کیا اسی کا نام کتاب الآثار ہے اور آج امت اسلامیہ کے علمی سرمایہ میں احادیث

---

(۱) الدیباج المذہب: ص ۵۵

کی سب سے قدیم کتاب یہی ہے جو دوسری صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے۔ امام اعظمؒ سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے مجموعے اور صحیفے تھے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے کیف ما اتفق حدیثوں کے مجموعے تیار کیے تھے۔ گویا جس کام کی ابتداء بقول حافظ ابن حجر عسقلانی امام شعبی نے کی تھی اسی کو امام اعظمؒ نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل فرمایا اور بعد کے آنے والوں کے لیے ترتیب و تبویب کی شاہراہ قائم کر دی۔

کتاب الآثار اس دور کی تمام تصانیف سے پہلے کی تصنیف ہے اس دور کے تمام مصنفین ابن جریج کو چھوڑ کر امام اعظمؒ کے بعد ہیں۔ سب اگرچہ قرن ثانی کی پیداوار اور معاصر ہیں مگر امام اعظمؒ سے کسی نہ کسی درجے میں متاخر ہیں اور صرف متاخر نہیں بلکہ امام اعظمؒ کی جلالت علمی کے قدردان ہیں۔

کتاب الآثار کا طریق تالیف:

کتاب الآثار کا طریق تالیف تعلیم کتب اور تعلیم روایات کا نہیں بلکہ تعلیم علوم وفنون کا ہے۔ یعنی بذریعہ درس واملا شیوخ سے علم حاصل کرنا۔ تمام علوم اور مہمات فنون عربیہ کے لیے صدر اول میں یہی طریق رائج تھا۔ آغاز میں اس طرز تالیف کی بنیاد یوں پڑی کہ تلامذہ اپنے حفظ و یادداشت کے لیے اساتذہ کے تمام امالی یا ان کا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے لیکن آگے چل کر یہ چیز اس قدر مقبول ہوئی کہ اقسام تصنیف میں ایک خاص قسم بن گئی اور خود اساتذہ اور علماء فن اپنی مرویات بطور تصنیف مرتب کرنے لگے اس طرح کہ حلقہ درس میں مطالب و مسائل املا کراتے اور ساتھ ساتھ خود بھی لکھتے جاتے یا پہلے مجموعہ مرتب کر لیتے اور پھر اسی کو املا کراتے۔ حدیث میں یہ طریق تمام علوم سے زیادہ رائج اور مقبول ہوا اور محدثین کے یہاں اسے ایک خصوصی مقام حاصل ہو گیا چنانچہ محدثین نے سماع من لفظ الشیخ کی دو مختلف صورتوں میں سے ایک قسم املا کو قرار دیا ہے اور یہ محدثین کی بیان کردہ ان تمام قسموں میں سے جو تحمل روایت کے لیے مشہور ہیں ایک اور اعلیٰ قسم ہے چنانچہ علامہ یمانی نے توضیح الافکار میں حافظ زین الدین عراقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

سواء احدث من کتابه او من حفظه باملاء او بغیر املاء و هو ارفع الاقسام.

محدثین نے اس انداز تالیف کی خاطر تلامذہ کے لیے جو تعبیری زبان مقرر کی ہے

ان میں سب سے اعلیٰ وارفع اگرچہ خطیب بغدادی کے خیال میں تو سماع ہی ہے لیکن ابن الصلاح حدثنا کو اور ابن کثیر حدثنی کو ارفع بتاتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن عبدالعزیز ۱۵۰ھ جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے بارے میں حافظ عسقلانی نے انکشاف کیا ہے کہ حدیث کے پہلے مصنف یہی ہیں ان سے حجاج بن محمد مصیصی نے ان کی کتابیں اسی طرح روایت کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

لاسیما من عرف انه لایروی الا ماسمعه کحجاج بن محمد فروی کتب ابن جریج بلفظ قال ابن جریج فحملها الناس عنه واحتجوا بها۔(۱)

علامہ محی الدین عبدالحمید نے اس طریق کو بے حد سراہا ہے اور اسے تالیف و تدریس میں سب سے اعلیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

حدیث حاصل کرنے کے طریقوں میں سب سے اونچا' ترقی یافتہ اور قوی ترین طریق یہ ہے کہ راوی شیخ کے الفاظ سے خواہ شیخ کسی دستاویز سے املا کرا رہا ہو یا زبانی یادداشت سے۔ املا کرانا تحدیث میں غیر املا سے اونچا ہے۔(۲)

حافظ ابن الصلاح نے بھی نقل حدیث اور تحمل روایت میں اسے سب سے اونچی قسم قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

هذا القسم ارفع الاقسام عندالجماهير۔(۳)

کتاب الآثار بھی اسی قسم کا املائی مجموعہ ہے اور امام اعظمؒ کا قائم کردہ یہ طریق تصنیف کچھ ایسا مقبول ہوا ہے کہ بعد کو امام کے تلامذہ نے بھی اپنی تصانیف میں اسے ہی اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ قاسم بن منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

ان المتقدمين من علمائنا كانوا يملون المسائل الفقهية و اولها من الاحاديث النبوية باسانيد هم كابي يوسف في كتاب الخراج والامالي و محمد في كتاب الاصل والسير و كذا الطحاوي والخصاف والرازي والكرخي۔(۴)

---

(۱) تنقیح الانظار: ج ۲ ص ۲۹۸ (۲) تعلیقات علی التوضیح: ج ۲ ص ۲۹۵

(۳) مقدمہ ابن الصلاح (۴) منیۃ الالمعی: ص ۸

کتاب الآثار کے نسخے:

جیسے مؤطا کو امام مالکؒ سے ایک سے زیادہ اصحاب مالکؒ نے روایت کیا ہے۔ ایسے ہی کتاب الآثار کو بھی امام اعظمؒ سے ان کے ایک سے زیادہ اصحاب روایت کیا ہے اور اس روایت کے ایک سے زیادہ ہونے کی وجہ سے جیسے مؤطا اور حدیث کی دوسری کتابوں کے نسخے متعدد ہو گئے ایسے ہی کتاب الآثار کے بھی راویوں کے متعدد ہونے کی وجہ سے نسخے ایک سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

کتاب الآثار کو امام اعظمؒ سے جن تلامذہ نے روایت کیا ہے ان کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن ان میں مشہور چار ہیں:

۱۔ کتاب الآثار — بروایت امام محمدؒ
۲۔ کتاب الآثار — بروایت امام ابو یوسفؒ
۳۔ کتاب الآثار — بروایت امام زفرؒ
۴۔ کتاب الآثار — بروایت امام حسن بن زیادؒ

یہ چاروں امام اعظمؒ سے کتاب الآثار کے راوی ہیں۔

کتاب الآثار بروایت امام محمدؒ

یہ امام محمدؒ کا روایت کردہ نسخہ ہے اور یہ نسخہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے اسی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الاربعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے.

والموجود من حديث ابى حنيفة مفردًا انما هو كتاب الآثار التى رواها محمد بن الحسن عنه۔(۱)

اس نسخے میں جن راویوں سے حدیثیں مروی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حالات پر دو کتابیں لکھی ہیں پہلی تصنیف جو مستقل طور پر رجال کتاب الآثار سے متعلق ہے اس کا نام الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے۔ اس کا ذکر نواب علامہ صدیق حسن خاں نے اتحاف

(۱) تعجیل المنفعۃ برجال الائمۃ الاربعۃ: ص ۴

العلماء والمتقین میں کیا ہے مگر نام غلط درج ہو گیا الایثار بمعرفتہ معانی الاثار نہیں بلکہ الایثار بمعرفتہ رواۃ الآثار ہے۔اتحاف میں مصنف کا بھی ذکر نہیں ہے اس کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔اس کتاب کا ذکر خود حافظ عسقلانی نے تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب الآثار کے رجال پر علیحدہ مستقل کتاب لکھی ہے کیونکہ بعض حنفی ماہر بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے میرے سے درخواست کی کہ میں کتاب الآثار کے رجال پر مستقل کتاب لکھوں۔ میں نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی اور کتاب الآثار کے رجال پر کتاب لکھی اس میں جو اکابر تہذیب میں آچکے ہیں ان کا تو صرف نام ہی ذکر کر دیا اور تہذیب کا حوالہ دے دیا ہے اور ان کے علاوہ کے حالات لکھے ہیں۔(۱) دوسری تصنیف کتاب تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الاربعہ ہے۔ یہ کتاب اب حیدرآباد میں چھپ چکی ہے۔اس میں حافظ ابن حجر نے صرف ان راویوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ائمہ اربعہ امام اعظمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اپنی اپنی تصانیف میں حدیثیں نقل کی ہیں مگر صحاح ستہ میں ان کے حوالے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے دراصل حافظ ابوعبداللہ محمد بن حمزہ الحسینی نے ایک کتاب التذکرہ برجال العشرہ کے نام سے لکھی تھی اور اس میں حافظ ابوعبداللہ نے ائمہ ستہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے ساتھ ائمہ اربعہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی تصانیف کے راویوں اور رجال کا تذکرہ لکھا اور اس کا نام التذکرہ برجال العشرہ رکھا اور ائمہ ستہ کے ساتھ ائمہ اربعہ کے رجال لکھنے کی وجہ خود ہی یہ بتائی ہے کہ:

ذكرت رجال الائمة الاربعة المقتدى بهم لان عمدتهم في الاستدلال لهم لمذاهبهم في الغالب على ماروره في مسانيد هم باسانيد هم فان الموطا لمالك هو مذهبه الذى يدين الله به اتباعه و يقلدونه مع انه لم يروفيه الا الصحيح عنده وكذالك سند الشافعي موضوع لادلة على ماصح عنده من مروياة وكذالك مسند ابى حنيفة و امامسند احمد فانه اعم من ذالك و اشمل۔(۲)

---

(۱) تعجیل المنفعۃ: ص ۹ (۲) تعجیل المنفعۃ: ص ۴

علامہ ابوجعفر الکتانی نے ائمہ ستہ فی الحدیث اور ائمہ اربعہ فی المذہب کی کتابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

فهذه هى كتب الائمة الاربعة وباضافتها الى الستة الاولىٰ تكمل الكتب العشرة التى هى اصول الاسلام و عليها مدار الدين۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے چونکہ تہذیب التہذیب اور تقریب کے نام سے ائمہ ستہ کی کتابوں کے رجال پر دو کتابیں لکھی ہیں اس لیے حافظ عسقلانی نے ائمہ اربعہ کی تصانیف کے راویوں کے لیے ایک مستقل کتاب تعجیل المنفعۃ کے نام سے اس میں جیسا کہ خود حافظ صاحب نے تصریح کی ہے صرف ان اشخاص کے حالات لکھے ہیں جو ائمہ اربعہ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فلذالك اقتصرت على رجال الاربعة وسميته تعجيل المنفعته بزوائد رجال الائمة الاربعة۔(۲)

حیرت ہے کہ مشہور علامہ نواب صدیق حسن خانؒ نے اتحاف النبلاء المتقین میں علامہ شوکانی کے حوالہ سے کتاب کا نام تعجیل المنفعۃ برجال الاربعہ لکھ کر الاربعہ کو سنن اربعہ کا مصداق قرار دیا ہے اور صاحب کشف الظنون کی اس بات میں تغلیط کی ہے کہ اربعہ سے ائمہ اربعہ مجتہدین مراد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کشف الظنون گفتہ بروایت رجال الائمۃ الاربعہ یعنی المذاہب وایں مسامحت است از وے۔(۳)

حالانکہ خود حافظ صاحب کی تصریح سے یہ بات معلوم ہے کہ اربعہ سے مراد ائمہ اربعہ ہیں یعنی ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد نہ کہ ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ۔ علامہ ابوجعفر الکتانی نے مسند امام ابوحنیفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

والذى اعتبره الحافظ ابن حجر فى كتابه تعجيل المنفعته بزوائد

---

(۱) الرسالۃ المستطرفۃ: ص ۱۸ (۲) تعجیل المنفعۃ: ص ۸ (۳) اتحاف النبلاء: ص ۴۱

رجال الاربعة هو ماخرجه الامام الذكي الحافظ ابو عبدالله الحسين بن محمد بن خسرو۔(۱)

غالباً نواب صاحبؒ نے خود تعجیل المنفعۃ کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ زبان قلم پر یہ بات نہ آتی الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ عسقلانی نے رجال ائمہ اربعہ کے ذیل ہی میں کتاب الآثار کے بھی رجال لکھے ہیں۔ مشہور محدث حافظ سخاوی نے الاعلان لاتوبیخ میں کتاب الآثار کے رجال پر ایک اور کتاب کی بھی نشان دہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

وللدين قاسم الحنفي رجال كل من الطحاوي والموطا لمحمد بن الحسن والآثار و مسند ابي حنيفة لابن المقرى۔(۲)

حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا کی اس کتاب کا علامہ الکتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملا کاتب چلپی نے کشف الظنون میں کتاب الآثار امام محمد پر حافظ ابوجعفر طحاوی کی شرح کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں علامہ تقی الدین احمد بن علی مقریزی کی کتاب العقود فی تاریخ العہود کے حوالہ سے حافظ قاسم کی تصانیف میں التعلیقات علی کتاب الآثار بھی لکھی ہے۔

امام محمد سے اس کتاب کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے مطبوعہ نسخہ امام ابوحفص کبیر اور ابوسلیمان (۳) جوزجانی کا روایت کردہ ہے۔

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ: ۱۶ (۲) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۱۷ (۳) ان کا نام موسیٰ بن سلیمان اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ مامون نے ان کے سامنے عہدۂ قضا کی پیش کش کی فرمایا امیر المومنین عدالتی معاملہ میں حقوق الٰہی کی نگرانی کیجئے۔ اور اپنی امانت پر مجھ جیسے کو سپرد نہ فرمایئے مجھے غصہ میں رہنے پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنے اللہ کے بندوں میں فیصلہ کرنے کے کام کو پسند نہیں کرتا مامون نے یہ سن کر کہا کہ آپ درست کہتے ہیں۔ امام محمد اور قاضی ابویوسف کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان سے ان کی کتابوں کے راوی بھی ہیں۔ دینداری پارسائی' فقہ وحدیث میں معلی بن منصور کے رفیق رہے ہیں۔ معلی بن منصور امام مالک' لیث بن سعد' حماد اور ابن عیینہ کے شاگرد ہیں ان کی تصانیف میں الیسر الصغیر' کتاب الصلاۃ اور کتاب الرہن جیسی کتابیں ہیں۔ ﴿باقی صفحہ ۴۳۰ پر﴾

کتاب الآثار بروایت امام ابو یوسفؒ:

کتاب الآثار کا یہ نسخہ قاضی ابو یوسف سے ان کے صاحبزادے یوسف کی جلالت قدر کا حدیث میں اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے جب تحصیل حدیث شروع کی تھی تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسف ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے احادیث لکھیں۔ حافظ ابن الجوزی مناقب میں بسند متصل نقل ہیں۔

اخبرنا ابو منصور عبدالرحمن بن محمد القزاز قال اخبرنا ابوبکر احمد بن علی بن ثابت قال اخبرنا الازھری قال ثنا عبدالرحمن بن عمر قال ثنا محمد بن یعقوب قال حدثنا جدی قال سمعت احمد بن حنبل یقول اول من کتب عندالحدیث ابو یوسف۔(۱)

اور حافظ ذہبی مناقب ابی حنیفہ میں حافظ عباس دوری سے نقل کرتے ہیں:

سمعت احمد بن حنبل یقول اول ما کتبت الحدیث اختلفت بعد الی الناس۔(۲)

یہ واقعہ ۱۷۹ھ کا ہے جب امام احمد کی عمر سولہ سال تھی۔(۳)

امام احمدؒ نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے تین قمطر (وہ صندوق جس میں کتابیں رکھی جاتی ہیں) بھر کر علم دین کی کتابت کی تھی۔ چنانچہ حافظ ابوالفتح بن سید الناس یعمری شافعی لکھتے ہیں:

قال ابراھیم بن جعفر حدثنی عبداللہ بن احمد بن حنبل قال کتب ابی عن ابی یوسف و محمد ثلاثۃ قماطر قلت لہ کان ینظر فیھا قال کان ربما نظر فیھا۔(۴)

☆ بقیہ صفحہ ۴۲۹ ۱۸۰ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے حماد بن زید سے سنا ہے وہ فرماتے تھے میں ابو حنیفہ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ ایوب سختیانی سے تعلق رکھتے ہیں یاد رہے کہ ایوب سختیانی امام اعظمؒ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ (۱) مناقب ابن الجوزی: ص ۲۲

(۲) مناقب ذہبی: ص ۴۰ (۳) مناقب ابن الجوزی: ص ۳۳ (۴) عیون الاثر: ج ۱ ص ۲۰

امام احمد بن حنبل کا خود قاضی صاحب موصوف کے متعلق حسب تصریح علامہ سمعانی یہ تاریخی اقرار موجود ہے۔

ابو یوسف الامام یقول فیه احمد بن حنبل انه ابصر الناس بالاثار۔(۱)

ان تصریحات کی موجودگی میں خلال کی اس رائے کی کوئی قیمت نہیں کہ:

امام احمدؒ نے پہلے پہل اہل الرائے کی کتابیں لکھیں اور پڑھیں اور ان کے مسائل ازبر کیے لیکن پھر ان کی طرف کوئی التفات نہیں رہا۔

یہ ایسی بات ہے جسے باور کرنے کی ہمیں مذکورہ تصریحات اجازت نہیں دیتی ہیں۔ الغرض کتاب الآثار کے امام اعظمؒ سے دوسرے راوی قاضی ابو یوسفؒ امام احمد بن حنبلؒ کے استاد ہیں۔ ان کے اس نسخہ کا تذکرہ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیۂ میں کیا ہے۔ چنانچہ امام یوسف بن ابی یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روی کتاب الاثار عن ابیه عن ابی حنیفة۔

پروفیسر الشیخ محمد ابوزہرہ لیکچرار یونیورسٹی نے ابو حنیفہ نامی کتاب میں اس پر جو عالمانہ تبصرہ کیا وہ بھی پڑھ لیجئے۔

یہ کتاب علمی طور پر تین وجہ سے قیمتی ہے۔ اول یہ کہ امام ابو حنیفہؒ کی مرویات کا ذخیرہ ہے اور اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے استخراج مسائل میں احادیث کو کیسے دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے دوم یہ کہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ امام موصوف کے یہاں مواقع استدلال میں فتاوی صحابہ اور احادیث مرسلہ کا کیا مقام تھا۔ سوم یہ کہ اس کتاب کے ذریعے تابعین فقہائے کوفہ کے خصوصاً اور فقہائے عراق کے عموماً فتاوی تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔(۲)

کتاب الآثار بروایت امام زفرؒ:

پورا نام زفر بن الہذیل العنبری ہے ان سے کتاب الآثار کی روایت ان کے تین شاگردوں نے کی ہے۔ ابو وہب محمد بن مزاحم۔ شداد بن حکیم۔ حکیم بن ایوب۔

---

(۱) التعلیق المجد: ص ۲۲ (۲) ابو حنیفہ: ص ۲۰۰

محمد بن مزاحم اور شداد بن حکیم کے حوالہ سے جو کتاب الآثار مروی ہے اس کا مشہور محدث ابوعبداللہ الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

نسخته لزفر بن الهذیل الجعفی تفرد بها عنه شداد بن حکیم البلخی ونسخته ایضا لزفر بن الهذیل الجعفی تفرد ابو وهب محمد بن مزاحم المروزی۔(۱)

ایک نسخہ زفر کا جسے ان سے شداد نے صرف روایت کیا ہے۔ ایک نسخہ زفر کا اور جسے ان سے صرف ابو وہب محمد بن مزاحم نے روایت کیا۔

حدیث کے مشہور امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام لیل و قیام رمضان و کتاب الوتر میں امام اعظمؒ کی جس کتاب کا

زعم النعمان فی کتابه۔ امام ابوحنیفہ کا اپنی کتاب میں خیال ہے

کے پیرائے میں تذکرہ کیا ہے وہ بھی ابو وہب محمد بن مزاحم والی کتاب الآثار ہے جو امام مروزی کو ان کے شاگرد ابوالنضر محمد بن محمد کے حوالہ سے ملی ہے۔ یہ نیشاپور کے نامی گرامی قاضی ہیں ان سے حافظ ابوعبداللہ الحاکم نے حدیث پڑھی ہے۔ امام حاکم نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے کہ ان کے لیے ۳۲۵ھ میں حرمین میں باقاعدہ مجلس درس لگتی تھی ان کی وفات ۳۳۸ھ میں ہوئی ہے۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں ابو وہب محمد بن مزاحم کو احمد بن بکر بن یوسف کا استاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

یروی عن ابی وهب محمد بن مزاحم المروزی عن زفر عن ابی حنیفة کتاب الاثار۔(۲)

کتاب الآثار احمد بن بکر اپنے استاد محمد بن مزاحم سے بحوالہ زفر از ابی حنیفہ روایت کرتے ہیں۔

حکیم ابن ایوب کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب طبقات المحدثین میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ۱۶۴ (۲) الحات المنظر، الجواہر المضیئہ: ج ۱ ص ۶۲

احمد بن رسته بن بنت محمد بن المغيرة كان عنده السنن عن محمد عن الحكم عن زفر عن ابى حنيفة۔(۱)

احمد بن رستہ کے پاس بحوالہ محمد از حکم از زفر از ابی حنیفہ کتاب السنن تھی۔

امام طبرانی نے معجم صغیر میں اس نسخہ کی ایک حدیث روایت کی ہے۔

حدثنا احمد بن رسته بن عمر الاصفهانى ثنا المغيرة الحكم بن ايوب عن زفر بن الهذيل عن ابى حنيفة۔(۲)

حافظ ابن ماکولا نے بھی الاکمال میں احمد بن بکر کے تذکرے میں لکھا ہے:

احمد بن بكر بن سيف ابوبكر الجصينى ثقه يميل ميل اهل النظر روى عن ابى وهب عن زفر بن الهذيل عن ابى حنيفة كتاب الآثار۔(۳)

ان تصریحات کی موجودگی میں الشیخ محمد ابو زہرہ لیکچرار فواد یونیورسٹی قاہرہ کا ''ابو حنیفہ'' نامی کتاب میں یہ کہنا درست نہیں ہے۔

زفر لم يوثر عنه كتب ولم تعرف له رواية لمذهب شيخه۔(۴)

امام زفر سے کتابیں مروی نہیں ہیں اور ان کی اپنے استاد سے کوئی روایت مشہور نہیں ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام حسن بن زیادؒ:

کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ امام حسن بن زیاد نے امام اعظمؒ کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ چنانچہ امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری اپنی اسناد کے ساتھ امام حسن سے ناقل ہیں کہ:

كان ابو حنيفة يروى اربعة الآف حديث الفين لحماد والفين لسائر المشيخة۔(۵)

---

(۱) امام ابن ماجہ اور علم حدیث: ص ۱۷۳ (۲) معجم صغیر طبرانی: ص ۳۳

(۳) امام ابن ماجہ اور علم حدیث: ص ۱۷۲ (۴) ابو حنیفہ: ۱۱۸ (۵) مناقب موفق: ج ا ص ۹۶

قرین قیاس یہی ہے کہ امام لولؤی نے امام اعظمؒ کی ان تمام حدیثوں کو اپنے نسخہ میں روایت کیا ہوگا۔

اس نسخہ کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ محمد بن ابراہیم بن جیش بغوی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں:

محمد بن ابراهيم جيش البغوى روى عن محمد بن شجاع الثلجى عن الحسن بن زياد عن ابى حنيفة كتاب الآثار۔(۱)

محدث علی بن عبدالحسن دوالیبی حنبلی نے اپنے ثبت میں اس نسخہ سے ساٹھ حدیثیں نقل کی ہیں۔ جن کو محدث شیخ محمد زاہد کوثری نے الامتاع میں نقل کیا ہے۔

محدث خوارزمی نے جامع مسانید میں اس نسخہ کو مسند ابی حنیفہ للحسن بن زیاد کے نام سے پیش کیا ہے۔ خوارزمی نے اس نسخہ کی اسناد بھی امام حسن تک اپنے چاروں اساتذہ یعنی شیخ ابومحمد یوسف بن عبدالرحمن، شیخ ابومحمد ابراہیم بن محمود، شیخ ابونصر الاغر بن ابی الفضائل اور شیخ ابو عبداللہ محمد بن علی کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے:

اخبرنا الحافظ ابو الفرج عبدالرحمن بن على الجوزى قال اخبرنا ابو القاسم اسماعيل بن احمد السمرقندى قال اخبرنا ابو القاسم عبدالله بن الحسن قال اخبر ابو الحسن عبدالرحمن بن عمر قال اخبرنا ابو الحسن محمد بن ابراهيم بن جيش البغوى قال حدثنا ابو عبدالله محمد بن شجاع البلخى قال حدثنا الحسن بن زياد اللؤلؤى عن ابى حنيفة۔(۲)

خوارزمی کی طرح دیگر محدثین بھی اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے روایت کرتے ہیں۔ خود حافظ ابن حجر عسقلانی کی مرویات میں بھی یہ نسخہ موجود تھا۔ اس نسخہ کی اسانید اجازت کو محدث علی بن عبدالحسن الدوالیبی حنبلی نے اپنے ثبت میں، حافظ ابن طولون نے الفہرست الاوسط میں، حافظ محمد بن یوسف نے عقود الجمان میں، محدث ایوب الخلوتی نے اپنے ثبت میں اور خاتمۃ الحفاظ محمد عابد سندھی نے حصر الشارد فی اسانید الشیخ محمد عابد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا

---

(۱) لسان المیزان (۲) جامع المسانید: ج ا ص ۷۳

ہے اور شیخ محمد زاہد کوثری نے ان کو الامتاع بسیرۃ الامامین الحسن بن زیاد محمد بن شجاع میں نقل کر دیا ہے۔

ایک ضروری توضیح:

جامع المسانید اور لسان المیزان میں اس روایت کے ناموں میں کچھ تصحیف ہوگئی اصل سند تو اس طرح ہے کہ:

محمد بن ابراہیم بن جیش البغوی روی عن محمد بن شجاع الثلجی عن الحسن بن زیاسد عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار۔

لیکن جامع المسانید میں خوارزمی نے محمد بن ابراہیم بن خنیس اور لسان المیزان میں حافظ ابن حجر نے محمد بن ابراہیم بن حسن لکھا ہے۔ دونوں غلط ہیں۔ اسی طرح جامع المسانید میں محمد بن شجاح البلخی اور لسان المیزان میں محمد بن شجیع البلیخی طبع ہوگیا ہے یہ بھی غلط ہے۔ اور لسان المیزان میں عن الحسن بن زیاد عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفہ میں محمد بن الحسن کا اضافہ یقیناً غلط ہے۔ محمد بن ابراہیم بن حبیش بغوی اور امام محمد بن شجاح الثلجی دونوں نہایت معروف و مشہور عالم ہیں۔ دونوں کا مبسوط حال خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے۔ حافظ بدالدین عینی نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے کہ محمد بن شجاح الثلجی میں نسبت نسب کی ہے اور محمد بن شجاح کو ثلج بن عمرو بن مالک بن عبد مناف سے نسی تعلق کی وجہ سے ثلجی کہتے ہیں۔ امام ذہبی نے سیر النبلاء میں ان کے اساتذہ میں ابن علیہ، وکیع، یحییٰ بن آدم اور حسن بن زیاد کا نام لیا ہے۔(۱) اور حافظ عبدالقادر قرشی نے یحییٰ بن اکثم کو ان کا شاگرد لکھا ہے۔(۲)

حافظ ابن القیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین میں ایک موقعہ پر امام حسن بن زیاد کی اسی کتاب الآثار کی حدیث سے استدلال کیا ہے ان کا موقعہ استدلال میں اس کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب الآثار کا نسخہ ان کے مطالعہ میں رہا ہے بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کتاب کا ابن القیم کے یہاں اعتباری اور استدلالی مقام ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الفوائد البہیہ: ص ۲۷ (۲) الجواہر المضیۃ: ج ۱ ص ۶۲

قال الحسن بن زید اللؤلؤی ثنا ابو حیفة قال کنا عند محارب بن دثار فتقدم الیہ رجلان فادعی احد ھما علی الاخر مالا فجحدہ المدعی علیہ فساله البینة فجاء رجل فشھد علیه فقال المشھود علیه لا والله الذی لا الہ الا ھو ماشھد علی بحق وما علمته الارجلاً صالحاً غیر ھذہ الذلة فانه فعل ھذا لحقد کان فی قلبه علی وکان محارب متکئا فاستوی جالساً ثم قال یاذالرجل سمعت ابن عمر یقول سمعت رسول اللہ صلی الله علیه وسلم یقول لیا تین علی الناس یوم تشیب فیہ الوالدان وتضع العوامل مافی بطونھا و تضرب الطیر باذنابھا و تضع مافی بطونھا من شدة ذالک الیوم ولا ذنب علیھا وان شاھد الزور لا یفارقدساہ علی الارض حتی یقذن به فی النار فان کنت شھدت بحق فاتق الله الم علی شھادتک وان کنت شھدت بباطل فاتق الله وغط راسک واخرج من ذالک الباب۔(۱)

ان چار بزرگوں کے حوالے اور وساطت سے امام اعظمؒ کی کتاب الآثار آج امت کے ہاتھوں میں ہے ان کی شخصیتیں امت میں معروف ومشہور ہیں۔

کتاب الآثار کی روایتی صحت:

امام ابوحنیفہؒ سے احادیث کو اگرچہ ہزاروں آدمیوں نے روایت کیا ہے لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے کتاب الآثار کی روایت کا سلسلہ چلا ہے وہ یہ مذکورہ بالا چار بزرگ ہیں۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اپنا سلسلہ سند ان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ مسند محمد سعید نے اوائل السنبلہ میں بھی اپنا سلسلہ سند بتایا ہے۔ ہم ان بزرگوں کے علاوہ چند اور محدثین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ سے کتاب الآثار کا باقاعدہ سماع کیا ہے۔

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۲ ص ۱۲۰

امام عبداللہ بن المبارک کے بارے میں مشہور محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں حمیدی شیخ بخاری کی زبانی نقل کیا ہے۔

سمعت عبداللہ بن المبارک یقول کتبت عن ابی حنیفۃ اربعمائۃ حدیث۔(۱)

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے چار سو حدیثیں لکھی ہیں:

امام حفص بن غیاث سے حافظ حارثی نے بسند متصل نقل کیا ہے:

سمعت من ابی حنیفۃ حدیثا کثیراً(۲)

میں نے امام ابوحنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

شیخ الاسلام عبداللہ بن یزید مقری کے بارے میں علامہ کردری فرماتے ہیں:

سمع من الامام تسعمائۃ حدیث۔(۳)

انہوں نے امام ابوحنیفہ سے نوسو حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام وکیع بن الجراح کے متعلق سید الحفاظ یحییٰ بن معین کی زبانی انکشاف کیا ہے۔

ما رأیت احد اقدمہ علیٰ وکیع وکان یفتی برائی ابی حنیفۃ وکان یحفظ حدیثہ کلہ وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثا کثیرًا۔(۴)

میں وکیع پر کسی کو مقدم نہیں کرتا وکیع امام ابوحنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے اوران کو ابوحنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں وکیع نے ابوحنیفہ سے سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ موصوف ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں امام حماد بن زید کے بارے میں لکھا ہے:

روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیرًا۔(۵)

حماد بن زید نے امام ابوحنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

---

(۱) تاریخ بغداد　(۲) مناقب موفق: ج۱ص۹۰　(۳) کردری: ج۲ص۲۳۱

(۴) جامع بیان العلم: ج۲ص۱۴۹　(۵) الانتقاء: ص۱۳۰

حافظ ابن عبد البر نے خالد الواسطی محدث کے متعلق انکشاف کیا ہے کہ:

روی عنه خالد الواسطی احادیث کثیرة۔(۱)

خالد نے ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

یہ وہ اکابر محدثین ہیں کہ جن میں سے ہر ایک علم حدیث وفقہ کا آفتاب و ماہتاب ہے۔ یاد رہے کہ بجز مؤطا امام مالک کے اور کسی کتاب کے راوی اس قدر جلالت علمی کے مالک نہیں ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے۔ کہ یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے امام اعظمؒ سے کتاب الآثار کا سماع کیا ہے ورنہ امام اعظمؒ سے احادیث روایت کرنے والے تو اس قدر زیادہ ہیں کہ بقول حافظ ذہبی:

روی عنه من المحدثین والفقهاء عدة لا یحصون۔(۲)

امام ابو حنیفہ سے محدثین وفقہاء میں سے بے شمار نے روایت کی ہے۔

کتاب الآثار کی علمی حیثیت:

علمی طور پر کتاب الآثار کا مقام اور اس کی مرویات کی علمی حیثیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابو العباس محمد بن عبداللہ بن ابی العوام اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ میں بسند متصل لکھتے ہیں:

حدثنی یوسف بن احمد المکی ثنا محمد بن حازم الفقیه ثنا محمد بن علی الصائغ بمکة ثنا ابراهیم بن محمد عن الشافعی عن عبدالعزیز الدراوردی قال کان مالک ینظر فی کتب ابی حنیفة و ینتفع بها.

امام مالک امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے۔

غور فرمائیے کہ جب امام مالک مؤطا کی تالیف میں امام اعظمؒ کی کتابوں سے استفادہ فرماتے ہیں تو پھر کتاب الآثار کی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ اگر یہ واقعہ

(۱) الانتقاء: ص ۱۳۰ (۲) مناقب ذہبی: ص ۱۱

نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز لکھ رہے ہیں کہ مؤطا کا درجہ صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے لیے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کتاب الاثار کا مقام بھی مؤطا امام مالک کے لیے یہی ہے یعنی جو نسبت بخاری و مسلم کی کتابوں کو مؤطا امام مالک سے ہے وہ ہی نسبت مؤطا کو کتاب الآ ثار سے بھی ہے۔

حافظ مغلطائی فرماتے ہیں کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالکؒ ہیں حفظ ابن حجر کا بیان ہے کہ مالکؒ کی کتاب خود ان کے نزدیک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے۔(۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ مغلطائی کے نزدیک اس بارے میں اولیت کا شرف امام مالکؒ کو حاصل ہے لیکن کتاب الآ ثار مؤطا سے پہلے کی تصنیف ہے جس سے خود مؤطا کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں:

من مناقب ابی حنیفة التی انفرد بها انه اول من دون الشریعة ورتبه ابوابا ثم تبعه مالک فی ترتیب المؤطا و لم یسبق ابا حنیفة احد۔(۲)

ابو حنیفہ کی ان بزرگیوں میں سے جن میں وہ یگانہ روزگار ہیں یہ ہے کہ قانون اسلامی کے اولین مدون اور مرتب ہیں امام مالک ان کے تابع ہیں۔

کتاب الآ ثار میں جو حدیثیں ہیں وہ مؤطا کی روایات سے قوت و صحت میں کم نہیں ہیں۔ جس طرح مؤطا کے مراسیل کے توابع و شواہد موجود ہیں اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے اس لیے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلطائی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک مؤطا صحیح ہے ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآ ثار صحیح اترتی ہے۔ مؤطا کو کتاب الآ ثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

کتاب الآ ثار کا تاریخی مقام:

اسناد و روایت کے لحاظ سے کتاب الاثار کا مقام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے

---

(۱) تنویر الحوالک: ص ۴ (۲) تبییض الصحیفہ: ص ۳۶

کہ کتاب الآثار چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کا انتخاب ہے۔ امام بخاری کا زمانہ چونکہ اتباع تابعین کے بعد ہے زمانے کی دوری کی وجہ سے ایک ایک حدیث کے ہزاروں طرق رونما ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی کتاب خود ان کے اقرار کے مطابق:

اخرجة من نحو ست مائة الف۔(۱)

چھ لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ انتخاب کیا ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ کا زمانہ صحابہ اور کبار تابعین کا زمانہ ہے اس لیے یہاں طرق میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہے اس کے باوجود چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر بن محمد زرنجری فرماتے ہیں:

انتخب ابو حنيفة الاثار من اربعين الف حديث۔(۲)

امام ابوحنیفہ کی کتاب الآثار ۴۰ ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے۔

امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری جو ارباب صحاح ستہ کے معاصر ہیں امام اعظمؒ سے بالسند ناقل ہیں۔

میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اندوز ہوں۔(۳)

اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

میں امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے اٹا ہوا تھا میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے فرمایا کہ یہ سب احادیث ہیں اور میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں بیان کی ہیں۔(۴)

امام اعظمؒ کی حدیث میں احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابومحمد عبداللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں۔ نقل کرتے ہیں:

(۱) الحطہ: ص ۸۷ (۲، ۳) مناقب للموفق: ج ۲ ص ۹۵ (۴) عقود الجواہر المنیفہ: ج ۱ ص ۲۳

جیسی احتیاط امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی۔(۱)

اسی طرح علی بن جعد جوہری سے جو حدیث کے بہت بڑے حافظ اور امام بخاری و ابوداؤد کے شیخ ہیں نقل کیا ہے:

قال علی بن الجعد ابو حنیفة اذجاء بالحدیث جاء به مثل الدر۔(۲)

ابو حنیفہ جب بھی حدیث پیش کرتے تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے۔

اور امام یحییٰ بن معین جن پر فن جرح وتعدیل کا دارومدار ہے۔فرماتے ہیں:

ابو حنیفہ ثقہ ہیں جو حدیث ان کو یاد ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں۔اور جو حفظ نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے۔(۳)

امام عبداللہ بن المبارک جن کی جلالت شان پر محدثین کا اتفاق ہے انہوں نے امام اعظمؒ کی شان جو مدحیہ اشعار کہے ہیں ان میں بھی کتاب الآ ثار کی نباہت شان کا ذکر ہے۔

روی آثاره فاجاب فیها　　كطيران الصقور من الامنیفة

انہوں نے آثار کو روایت کیا تو اتنی تیزی سے چلے جیسے بلندی سے پرندے شکاری اڑتے ہوں۔

فلم یک بالعراق له نظیر　　ولا بالمشرقین ولا بکوفه

نہ تو عراق میں ان کی نظیر تھی۔نہ مشرق ومغرب میں اور نہ کوفی میں۔(۴)

اسی طرح مشہور امام ابو یحییٰ غسان بن محمد نے اپنی ایک نظم میں بھی کتاب الآ ثار کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے امام ابو حنیفہ کی شان میں لکھی ہے:

وبنی علی الاثار اسناته　　فاثت غوامضه علی الاساس

والناس تبعون فیها قوله　　لما استبان لعنباء ه للناس۔(۵)

---

(۱) المناقب للموفق: ج۱ص۱۹۷
(۲) جامع المسانید: ج۲ص۳۰۸
(۳) تاریخ بغداد از تہذیب التہذیب
(۴) المناقب: ج۲ص۱۹۰
۵) تاریخ بغداد: ج۱۳ص۳۵

﴿باقی صفحہ ۴۴۲ پر﴾

اسی طرح امام اہل سمرقند ابو مقاتل سمرقندی اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

روی الاثار عن نبل ثقات غزار العلم مشیخة حصیفه۔(۱)

کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت:

چونکہ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث ہیں جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے اور جن کی حیثیت سنن کی ہے اس لیے وہ سینکڑوں ابواب جو صحیحین اور جامع ترمذی جیسی حدیث کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کتاب الآثار میں نہیں ہیں کیونکہ ان ابواب کا تعلق فقہیات سے نہیں ہے اسی لیے بعض محدثین نے کتاب الآثار کو کتاب السنن کے نام سے پکارا ہے۔ کتاب الآثار کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس کی مرویات اس دور کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے ہی شہر اور اقلیم کی روایات میں محدود نہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرضیکہ حجاز، عراق دونوں جگہ کا علم تحریر و تدوین میں یک جا موجود ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

دین و فقہ و علم کی اشاعت امت میں اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ، اصحاب زید بن ثابتؓ، اصحاب عبداللہ بن عمرؓ اور اصحاب عبداللہ بن عباسؓ سے ہوئی ہے اور لوگوں کا عام علم ان چار ہی کے ساتھیوں سے لیا ہوا ہے چنانچہ مدینہ والوں کا علم زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کے اصحاب سے اور مکہ والوں کا علم عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب کا اور عراق والوں کا علم عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ہے۔(۲)

امام مالک نے مؤطا کی تالیف مدینے میں کی ہے اور اس میں مدنی شیوخ کے علاوہ اور لوگوں سے برائے نام روایتیں ہیں لیکن کتاب الآثار کے راویوں میں حجاز یا عراق کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ حجاز، عراق اور شام جملہ بلاد اسلامیہ کے علماء سے اس میں روایتیں موجود

﴿بقیہ صفحہ ۴۴۱﴾ امام اعظمؒ نے اپنی عمارت کی بنیاد آثار پر رکھی تو آپ کے دقیق مسائل درست ہو گئے۔ لوگ ان مسائل میں آپ کی بات کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے آپ کے ارشادات کی تابانی آ گئی ہے۔ (۱) المناقب: ج ۲ص ۱۹۰ (۲) اعلام الموقعین: ج ۱ص ۸

ہیں۔ آپ صرف امام محمدؒ کے حوالہ سے آئی ہوئی کتاب الآ ثار کا مطالعہ کیجئے۔ اور امام اعظمؒ کے تمام شیوخ کو پڑھ لیجئے تو آپ کو ایک سو پانچ میں سے تیس کے قریب ایسے مشائخ ملیں گے جن کا وطن کوفہ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ صحابہ میں جن بزرگوں میں سے مسائل منقول ہیں ان کی تعداد حافظ ابن القیم نے یہ بتائی ہے:

والذین حفظت عنهم الفتوىٰ من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مائة ونيف وثلاثون نفسا مابين رجل وامراة۔(۱)

اصحاب میں سے ارباب فتویٰ مردوزن تقریباً ایک سو تیس سے کچھ اوپر نفوس قدسی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں فرق مراتب بھی تھا۔

ان میں کثیر الفتاویٰ۔ قلیل الفتاویٰ اور متوسط بھی تھے۔(۲)

سب سے زیادہ کثیر الفتاویٰ یہ حضرات ہیں:

كان المكثرون منهم سبعة عمر بن الخطاب' على بن ابى طالب' عبدالله بن مسعود' عائشة ام المومنين وزيدبن ثابت و عبدالله بن عمر۔(۳)

کثیر الفتاویٰ سات بزرگ ہیں: عمرؓ' علیؓ' عبداللہؓ' عائشہؓ' زید بن ثابتؓ' عبداللہ ابن عمرؓ۔

ان سات میں بھی چار بزرگ بہت زیادہ ممتاز گذرے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

واكابر هذا الوجه عمر وعلى ابن مسعود و ابن عباس۔(۴)

ان میں بزرگ ترین عمرؓ' علیؓ' ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ ہیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فتاویٰ کو اگر جمع کیا جائے تو مستقل ایک ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے اور ابوبکر محمد بن موسیٰ کے بارے میں حافظ ابن القیم کی تصریح ہے کہ: احد ائمة الاسلام فی العلم والحدیث۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ کو یکجا کیا تو:

جمع فى عشرين كتابا(۵) بیس کتابوں میں جمع کیا۔

(۱،۲،۳) اعلام الموقعین: ص ۵ (۴) حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۱۳۳ (۵) الاحکام فی اصول الاحکام

مؤطا میں حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بہت کم روایات ہیں۔ شاہ ولی اللہ مصفی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

امام مالکؒ نے حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے کم روایات لی ہیں۔ ہارون رشید نے امام مالکؒ سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: لم یکونا ببلدی ولم القی رجالھما یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہیں ہوئی۔(۱)

اس کے برعکس کتاب الآثار میں جس مقدار میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات ہیں اسی کے قریب قریب حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی بھی روایات ہیں۔

کتاب الآثار کی مقبولیت:

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ:

مسند ابی حنیفہ وآثار محمد بنائے فقہ حنیفہ است۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مرحومہ کا سواد اعظم جس کی تعداد تمام عالم کے مسلمانوں میں دو تہائی ہے اس کے مذہب کا علمی سرمایہ امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار ہے اور اسے امت کی اکثریت کی تلقی بالقبول کا شرف حاصل رہا ہے۔ صرف اور صرف احناف ہی کو نہیں بلکہ ہر دور میں شروع ہی سے ائمہ نے بھی اس کتاب کی جلالت کو مانا ہے۔

امام مالکؒ کے بارے میں آپ پہلے پڑھ آتے ہیں کہ عبدالعزیز دراوردی فرماتے ہیں کہ امام موصوف امام ابو حنیفہؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے۔ امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے کہ:

من لم ینظر فی کتب ابی حنیفة لم یتجر فی الفقه۔(۳)

---

(۱) مناقب　(۲) مصفی: ج ۱ ص ۱۳　(۳) قرۃ العینین: ص ۱۸۵

خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ایک بار ابو مسلم مستملی نے شیخ السلام یزید بن ہارون جبکہ وہ بغداد میں منصور بن المہدی کے پاس فروکش تھے ہم بالا خانے میں پہنچ گئے۔ ابو مسلم نے دریافت کیا کہ:

ماتقول یا ابا خالد فی ابی حنیفة والنظر فی کتبه۔

اے ابو خالد تمہاری ابو حنیفہ اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔

انظر والیها ان کنتم تریدا ان تفقهوا فانی ما رأیت احدا من الفقهاء یکره النظر فی قوله۔(۱)

اگر تم فقیہ بننا چاہتے ہو تو ان کا مطالعہ کرو میں نے کسی بھی فقیہ کو ان سے بے نیاز نہیں دیکھا۔

ایک اور موقع پر یزید بن ہارون حدیث کا درس دے رہے تھے طلبہ کو خطاب کر کے کہنے لگے۔

تمہارا پیش نہاد تو بس حدیث سننا اور جمع کر لینا ہے اگر علم تم لوگوں کا مقصد ہوتا تو حدیث کی تفسیر اور اس کے معانی کی تلاش کرتے اور ابو حنیفہ کی تصانیف اور ان کے اقوال میں غور کرتے تب حدیث کی حقیقت تم پر واضح ہوتی۔(۲)

اور حافظ عبداللہ بن داؤد الخریبی فرماتے ہیں:

جو شخص چاہتا ہے کہ نابینائی اور جہالت کی ذلت سے نکلے اور فقہ کی لذت سے آشنا ہو اس کو چاہیے کہ ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھے۔(۳)

ان ہی حافظ عبداللہ بن داؤد الخریبی کا بیان خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے۔

عبداللہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں میں امام ابو حنیفہؒ کے لیے دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے فقہ اور سنن کو محفوظ کر دیا ہے۔(۴)

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۴۲)   (۲) مناقب ملا علی قاری: ج ۲ ص ۴۴۵

(۳) مناقب الموفق: ج ۲ ص ۴۸)   (۴) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۴۴

حافظ ابو یعلی خلیلی نے کتاب الارشاد میں امام مزنی کے ترجمہ میں لکھا ہے: امام مزنی امام شافعی کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں اور امام طحاوی کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں۔ ایک بار ان سے محمد بن احمد شرطی نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کے خلاف ابو حنیفہ کا مذہب کیوں اختیار کیا:

امام طحاوی نے فرمایا اس لیے کہ:

میں اپنے ماموں کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ ہمیشہ ابو حنیفہ کی کتابون کا مطالعہ کیا کرتے ہیں لہٰذا میں نے بھی ان کے مذہب کو اختیار کر لیا۔(۱)

یہ ائمہ فقہ وحدیث کی تصریحات اور امام اعظمؒ کی تصانیف کے بارے میں ان کے طرز عمل کی داستان ہے۔ اس سے آپ کتاب الآثار کی ان ائمہ میں جلالت قدر اور مقبولیت کا اندزاہ لگا سکتے ہیں۔

کتاب الآثار کا محدثین پر اثر:

کتاب الآثار نے محدثین پر کیا اثر ڈالا اور امام اعظمؒ کے بعد آنے والے محدثین امام اعظمؒ سے اس فن کی تدوین میں کس قدر اثر پذیر ہوئے اس کا ایک معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایات کی ترتیب اور تبویب کے سلسلے میں امام اعظمؒ نے کتاب الآثار میں جو طریقہ اختیار کیا تھا بعد کے تمام مؤلفین نے اسی کو اپنایا۔ السیوطی کی صریح کے مطابق مؤطا کی ترتیب اسی کو پیش نظر رکھ کر گئی۔ اسی طرح روایات کی صحت کے بارے میں امام اعظمؒ نے جو معیار قائم کیا تھا بعد کے ارباب صحاح نے اختلاف مذاق کے باوجود اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ حافظ ابن عدی نے بسند متصل امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ:

ما ادخلت فی کتابی الاماصح۔(۲)

امام مسلم نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ میں نے صحیح میں وہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر اور مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا چنانچہ خود ان کا بیان ہے۔

---

(۱) وفیات الاعیان (۲) مقدمہ فتح الباری: ص ۵

انما وضعت ههنا ما اجمعوا علیه۔(۱)

امام اعظم نے روایت سے احتجاج کے بارے میں ان بزرگوں سے پہلے یہ طرز عمل بنایا تھا کہ:

انی اخذت بکتاب الله اذا اجدته فما لم اجده اخذت بسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم والآثار الصحاح عنه التی فشت فی ایدی الثقات۔(۲)

میں مسئلہ کو جب کتاب اللہ میں پاتا ہوں تو وہاں سے لیتا ہوں اگر وہاں نہ ملے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی صحیح حدیثوں سے لیتا ہوں کہ جو ثقات کے ہاتھوں شائع ہو چکی ہیں۔

امام سفیان ثوری نے امام اعظم کے اس طرز عمل کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے:

یاخذ بما صح عنده من الاحادیث التی کان یحملها الثقات وبالاخر من فعل رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جن کو ثقہ روایت کرتے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے وہ ہی لیتے ہیں۔(۳)

کتاب الآثار میں ان ہی آثار صحیحہ کو جن کیا اشاعت ثقات کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے جمع کر دیا ہے۔ امام اعظم نے اس کتاب میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا بعینہ وہی طرز عمل امام اعظم کی پیروی میں السیوطی کی تصریح کے مطابق امام مالکؒ نے مؤطا میں اختیار فرمایا ہے جیسا کہ پیچھے اشارہ پڑھ آئے ہو کہ مؤطا کو شاہ عبدالعزیز نے اصل وام صحیحین قرار دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے عجالہ نافعہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

صحیح بخاری و مسلم اگرچہ تفصیل کے لحاظ سے مؤطا سے دس گنی ہے لیکن روایت احادیث کا طریقہ رجال کی تمیز اور اعتبار و استنباط کا ڈھنگ مؤطا ہی سے سیکھا ہے۔(۴)

---

(۱) صحیح مسلم (۲) مناقب ملا علی قاری (۳) الانتقاء: ص ۱۴۲ (۴) عجالہ نافعہ: ص د

اگر بخاری و مسلم نے مؤطا سے سیکھا ہے تو امام مالکؒ نے مؤطا میں امام اعظمؒ کی کتاب الآثار کی پیروی کی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ روایات کی ترتیب و تبویب اور صحت کے بارے میں جو معیار امام اعظمؒ نے قائم کر دیا تھا اس کی سب نے پیروی کی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب الآثار صحیحین کی ام الام ہوئی ہے۔

تبویب اور ترغیب تو بڑی بات ہے محدثین نے نام تک تجویز کرنے میں امام اعظمؒ تقلید کی ہے۔ چنانچہ امام طبری نے اپنی کتاب کا نام تہذیب الآثار' حافظ ابوجعفر طحاوی نے معانی الآثار' مشکل الآثار اما مکی نے صحیح الآثار رکھا۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب الآثار سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب ابواب پر مرتب نہیں تھی۔ کتاب الآثار تصنیف ہوئی تو حدیث کی تبویب کا رواج شروع ہوا اور چونکہ اس میں تبویب کے ساتھ صحیح روایات درج کرنے کا التزام تھا اس لیے بعد میں ابواب پر تصنیف کے لیے بھی یہ ضروری ہو گیا کہ صحیح روایات درج کتاب کی جائیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں۔

ابواب پر تصنیف کرنے والا اس مضمون کی صحیح تر وہ روایات لاتا ہے جو لائق استدلال ہوں۔(۱)

ان تصریحات سے آپ کو اتنی بات کا ضروری اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حسن ترتیب' جودت تالیف' صحت روایات اور ان کے انتخاب میں کتاب الآثار نے بعد میں آنے والے مصنفین کے لیے کیسا اچھا نقش قدم چھوڑا ہے۔

کتاب الآثار کی علمی خدمت:

حدیث کی دوسری کتابوں کی طرح کتاب الآثار کی بھی علمی خدمت کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے اساتذہ میں سے ہر استاد کی مرویات کو یکجا کر کے اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے موسوم کر دیا ہے اور علامہ خوارزمی نے ان سب مسانید کو یکجا کر کے جامع المسانید نام رکھا ہے۔ ورنہ یہ مسانید امام اعظمؒ کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن مرہ الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں لکھا ہے کہ:

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۵۶

مسند الشافعی موضوع للادلة علی ماصح عنده من مرویاته وکذالک مسند ابی حنیفة۔(۱)

مسند امام شافعی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام موصوف کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال مسند ابی حنیفہ کا ہے۔

یعنی مسند شافعی کی طرح مسند ابی حنیفہ بھی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام ابو حنیفہ کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ یہ حسینی حنفی نہیں بلکہ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں اور ان کا شمار معمولی محدثین میں نہیں بلکہ حفاظ وقت اور ناقدین فن میں ہے۔ ان کا مبسوط ترجمہ حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں اور حافظ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں لکھا ہے حافظ ابن فہد نے لکھا ہے:

کان رضی النفس حسن الاخلاق من الثقات الاثبات اماماً مؤرخاً حافظاً له قدر کبیر۔(۲)

حافظ مغلطائی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رافع اور حافظ حسینی معاصر ہیں۔ حافظ حسینی کی کتاب التذکرہ برجال العشرہ بڑے پایہ کی کتاب ہے اس میں جن دس کتابوں کے رجال مذکور ہیں وہ ائمہ اربعہ فقہ مجتہدین اور ائمہ ستہ حدیث کی کتابیں ہیں چنانچہ حافظ سیوطی فرماتے ہیں:

الف التذکرة فی رجال العشرة الکتب الستة والموطا والمسند ومسند الشافعی وابی حنیفة۔(۳)

مشہور محدث محمد بن جعفر الکتانی رقمطراز ہیں:

فهذه کتب الائمة الاربعة وباضافتها الی الستة الاولی تکمل الکتب العشرة التی هی اصول الاسلام وعلیها مدار الدین۔(۴)

الغرض مسانید امام اعظمؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو فی الواقع محدثین کے عرف میں مسند کی ہوتی ہے جیسے مسند کی ہوتی ہے جیسے مسند ابی بکرؓ، مسند فاروق اعظمؓ۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔

---

(۱) تعجیل المنفعة: ص۴ (۲) لحظ الالحاظ: ص۱۵
(۳) ذیل طبقات الحفاظ: ص۳۶۵ (۴) الرسالة المستطرفة: ص۱۸

پس نسبت ایں مسند بحضرت امام اعظمؒ ازیں باب است کہ مثلاً
مسند ابی بکر را از مسند احمد نسبت بحضرت ابی بکر نمائیم۔(۱)

ابواب اور مسانید میں فرق:

ابواب اور مسانید میں فرق یہ ہے کہ تبویب کی صورت میں احادیث کو مضامین کی رعایت سے بابوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نماز کی جداگانہ روزہ علیحدہ، زکوۃ کی الگ حدیثیں الگ بابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ اور مسانید میں حدیث کا تعلق خواہ کسی موضوع سے ہو ہر صحابی کی ساری روایات کو بلحاظ مضمون ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ کی ساری حدیثیں مسند ابی بکر میں درج کی جاتی ہیں۔ چاہے ان حدیثوں کا کسی بھی موضوع سے تعلق ہو۔

ابواب و مسانید میں ایک یہ بھی لطیف فرق ہے۔ مصنفین ابواب کے پیش نظر وہ روایات ہوتی ہیں جن کی حیثیت روایتی طور اعتباری اور استدلالی ہو یعنی عموماً ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو مسئلہ کے لیے احتجاج یا استشہاد کے قابل ہوں۔ اس کے برعکس ارباب مسانید کا کام صرف روایات کو جمع کرنا ہوا ہے اسے لیے وہ بہ نسبت مصنفین ابواب کے میدان تصنیف میں ذرا آزاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسانید میں صحیح اور غیر صحیح روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں:

ابواب و مسانید میں فرق یہ ہے کہ مسانید کی صورت میں شرط یہ ہے کہ مصنف اس طرح عنوان قائم کرے۔ ذکر ماورد عن ابی بکر عن النبی ﷺ اس صورت میں مصنف کا فرض ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی ساری حدیثوں کی تخریج کرے چاہے وہ صحیح ہوں یا ضعیف۔ اور ابواب کا مصنف عنوان اس طرح لکھے گا۔ ذکر ماصح و ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الطھارۃ او فی الصلوۃ او غیر ذالک۔(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی ارقام فرماتے ہیں:

---

(۱) بستان المحدثین: ص ۴۳ (۲) المدخل فی اصول الحدیث: ص ۵۴

ابواب پر حدیث کی تصنیف کا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جائے جن میں احتجاج واستشہاد کی صلاحیت ہو۔ برخلاف مسانید کے کہ ان میں پیش نہاد صرف احادیث کی فراہمی ہوتا ہے۔(۱)

بہرحال یہ شرف امام اعظمؒ ہی کو حاصل ہے کہ صحابہ اور تابعین کے انداز پر ان کے مسانید ترتیب دیئے گئے ہیں یوں تو محدثین اور حفاظ حدیث بہت گزرے ہیں مگر بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کی احادیث وروایات توجہ کا ایسا مرکز رہی ہوں اور اس کثرت سے ان کی مرویات پر قلم حرکت میں آئے ہوں۔ اسی حقیقت کی طرف جناب علامہ نواب صدیق حسن خانؒ نے اشارہ کیا ہے۔

ایں مسند درحقیقت تالیف اونیست بلکہ دیگراں بعد ایشاں مرویات ایشاں راجمع نمودہ اند۔(۲)

جن محدثین وحفاظ حدیث نے امام اعظمؒ کی مرویات کو یکجا کیا اور ان کے نام سے مسانید ترتیب دیئے ہیں وہ خود اپنی جگہ اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ ان کی سندیں لکھی جاتیں۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے امام اعظمؒ کی مرویات کو جمع کرنے کا کام سنبھالا۔

انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مشہور عارف عبدالوہاب کا مسانید امام کے بارے میں یہ بیان پڑھیئے۔

مجھ پر اللہ سبحانہ کا بڑا ہی احسان ہے کہ مجھے امام اعظمؒ کے مسانید کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی۔ ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم سے تحریریں تھیں جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں' مطالعہ میں میں نے محسوس کیا کہ امام ممدوح ان تابعین کبار سے حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے بزرگ ترین عادل اور ثقہ تھے اور جو حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے مثلاً اسود' علقمہ' عطاء مجاہد اور حسن بصری وغیرہ۔ اس لیے وہ تمام حضرات جو امام ابو حنیفہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں سب کے سب عادل

(۱) تعجیل المنفعۃ: ص۳ (۲) اتحاف النبلاء المتقین: ص۱۴۳

اور برگزیدہ ہیں ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے کو کذاب یا جس پر کذب کی تہمت ہو۔
اے برادر! ان کی عدالت کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام ممدوح نے باوجود بیحد
ورع واحتیاط ان کے حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کیا ہے۔(۱)
اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:
اذ کل حدیث وجدناہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فھو صحیح۔
امام اعظمؒ کے مسانید سہ گانہ کی ہر حدیث ہمارے نزدیک صحیح ہے۔(۲)
ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسانید امام کا محدثین وحفاظ کے
یہاں کیا مقام ہے اور خود امام اعظمؒ حدیث میں کس حیثیت کے مالک ہیں؟
آیئے کچھ ان حفاظ حدیث کو بھی پڑھ لیجئے جنہوں نے امام اعظمؒ کی مرویات کو مسند
کی صورت میں مدون کیا ہے۔

1- حافظ محمد بن مخلد دوری:

ان کی کنیت ابوعبداللہ اور والد کا نام مخلد ہے تذکرۃ الحفاظ میں مخلد کی جگہ احمد غلط طبع
ہو گیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اور حافظ ذہبی نے دول الاسلام میں مخلد ہی
بتایا ہے۔ عطاء کی نسبت سے مشہور ہیں۔ حدیث میں ابوخدقہ السہمی 'الحسن بن عرفہ' یعقوب
دورقی' امام مسلم اور دوسرے محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے زیادہ صاحب
التصانیف ہیں۔ منجملہ دیگر تصانیف کے امام اعظمؒ کی مرویات کو مستقل کتابی صورت میں علیحدہ
جمع کیا ہے اور اس کا نام بھی ''جمع حدیث ابی حنیفہ'' رکھا ہے اس تالیفی کارنامہ کا تذکرہ محدث
خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:
روی عنہ محمد بن مخلد الدوری فی جمعہ حدیث ابی حنیفۃ۔(۳)
ان سے محمد بن مخلد نے اپنے مجموعہ میں حدیث ابی حنیفہ روایت کی ہے۔
یہ مشہور محدث امام دارقطنی کے استاد حدیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کی
شہرت کا بار بار اعلان کیا ہے اور لکھا ہے۔ کہ فی تاریخ بغداد لہ ترجمۃ ملحیۃ تاریخ

(۱) المیزان الکبریٰ: ج ا ص ٦٨ (۲) المیزان الکبریٰ: ج ا ص ٦٨ (۳) المیزان الکبریٰ: ج ا ص ٦٨

بغداد میں ان کا شاندار ترجمہ ہے۔(۱) حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ صرف کثیر التصانیف محدث ہی نہیں بلکہ تین چیزوں میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

كان معروفا بالفقه والصلاح والاجتهاد في الطلب ثقاهت۔

صلاحیت اور تلاش و جستجو کے لیے محنت میں مشہور تھے۔(۲)

امام ابوداؤد کے بھی بلاواسطہ شاگرد ہیں سنن ابو داؤد کے بارے میں ان کا ایک بیان حافظ عسقلانی نے تہذیب میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ

امام ابوداؤد کی ایک لاکھ حدیثوں کا مذاکرہ کرنے کے لیے جب آپ نے کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھا تو محدثین کے لیے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابل اتباع ہو گئی اور اس دور کے سب ہی محدثین نے امام موصوف کو حافظ وقت مانا ہے۔(۳)

ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور دول الاسلام میں اور حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ۳۳۱ھ میں لکھی ہے۔ ستانوے سال کی عمر پائی ہے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسناد حدیث میں اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے۔(۴)

2- حافظ ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید:

حافظ ابن عقدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور ان کے چہرے کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے:

اليه المنتهىٰ في قوة الحفظ و كثرة الحديث۔(۵)

قوت حافظہ اور حدیث کی بہتات میں بس ان پر حد ہے۔

ان کے حافظ ہونے کے بارے میں حافظ دارقطنی کا تاثر یہ تھا کہ کوفہ کے تمام شہری اس پر متفق ہیں کہ زمانہ ابن مسعودؓ سے آج تک ابن عقدہ سے زیادہ حافظ کوئی نہیں ہوا ہے۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن مخلد (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۱۶۰
(۳) تہذیب: ج ۴ ص ۱۷۲ (۴) تہذیب: ج ۴ ص ۱۷۲ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۵۵

حافظ ابن الجوزی رقمطراز ہیں۔ کہ ابن عقدہ اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان کے سامنے اکابر محدثین حافظ ابوبکر الجعابیؒ حافظ عبداللہ بن عدیؒ امام طبرانیؒ ابن المظفرؒ دارقطنی اور ابن شاہین نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔(۱) حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ امام ابوعلی الحافظ فرماتے ہیں۔ میں نے ابوالعباس سے زیادہ کوفیوں میں کوئی حافظ نہیں دیکھا ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ کچھ لوگ تو اور ہی کچھ کہتے ہیں فرمایا ابن عقدہ اس سے کہیں بالا ہیں۔ وہ امام ہیں۔ ان کا مقام یہ ہے کہ ان سے تابعین اور اتباع تابعین کے بارے میں دریافت کیا جائے ان کے متعلق کسی کو یارائے سخن نہیں ہے۔(۲) خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ زعفرانی کا بیان ہے کہ ابن عقدہ کے زمانے میں بغداد میں ابن صاعد نے ایک حدیث غلط سند سے پیش کر دی حافظ ابن عقدہ نے اس پر گرفت کی ابن صاعد کے ساتھیوں نے لیڑ مچا دیا بات حکومت تک پہنچ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عقدہ نذر زنداں ہو گئے لیکن علی بن عیسیٰ وزیر نے دونوں فریق کو اس پر راضی کر لیا کہ اس معاملہ میں کسی کو جج تسلیم کر لیا جائے فریقین کی رضامندی سے ابن ابی حاتم تجویز ہو گئے معاملہ کی پوری روداد لکھ کر ابن ابی حاتم کو بھیج دی گئی وہاں سے جو فیصلہ آیا وہ وہی تھا جو حافظ ابن عقدہ فرمار ہے تھے معاملہ رفع دفع ہوا اور رہائی ہوئی۔(۳) امام بخاری کی کتاب التاریخ کے اس قدر دلدادہ تھے فرماتے تھے کہ اگر ایک شخص تیس ہزار احادیث بھی لکھ لے پھر بھی وہ محمد بن اسماعیل کی کتاب التاریخ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔(۴) حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری اور مسلم میں زیادہ حافظ کون ہے۔ فرمایا دونوں ہی عالم ہیں پھر یہی بات بار بار دہرائی گئی فرمایا کہ امام بخاری سے شام والوں کے بارے میں غلطیاں ہوئی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتابوں سے مدد لی ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص کا ذکر ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو امام موصوف اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کے علل میں غلطی بہت ہی کم ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی ہیں۔(۵)

---

(۱) المنتظم تاریخ الملوک والامم: ج ۶ ص ۳۳۷　(۲) لسان المیزان: ج ۱ ص ۱۶۵

(۳) تاریخ بغداد و ترجمہ ابن عقدہ　(۴) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۲۸　(۵) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ص ۱۵۰

حافظ بدرالدین عینی نے تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔
ان مسند ابی حنیفة لابن عقدة یحتوی وحده علی ما یزید علی الف حدیث۔
صرف ابن عقدہ والے مسند ابی حنیفہ کی احادیث ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔(۱)
ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے دول الاسلام تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن الجوزی نے المنتظم میں ۳۳۲ھ قرار دی ہے۔

3- حافظ عبداللہ الحارثیؒ:

امام علامہ حافظ الحدیث حارثی بخاری جن کو دربار علم سے فن حدیث میں عبداللہ الاستاذ کا ممتاز خطاب ملا تھا۔ علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان' عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ وقت سے علم حاصل کیا۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں لکھا ہے۔ کان شیخاً مکثراً من الحدیث بڑے کثیر الحدیث شیخ تھے اور حافظ خلیلی فرماتے ہیں۔ یعرف بالاستاذ له معرفة بهذا الشان استاد سے مشہور ہیں اور علم الحدیث کی ان کو معرفت حاصل ہے۔ اور حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں بضمن وفیات ۳۴۰ھ ان کا ذکر شاندار لفظوں میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

فیها مات عالم وراء النهر و محدثه الامام العلامه ابو محمد عبدالله بن محمد بن یعقوب الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاد جمع مسند ابی حنیفة الامام۔(۲)

یہ کس شان کی مسند ہے؟ اس کے متعلق خوارزمی جامع المسانید میں لکھتے ہیں:

من طالع مسنده الذی جمعه للامام ابی حنیفة علم تبحره فی علم الحدیث واحاطته بمعرفة الطرق والمتون۔(۳)

جس شخص نے ان کی مسند ابی حنیفہ کا مطالعہ کیا ہے اسے ان کے علمی تبحر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱) تانیب الخطیب: ص ۱۵۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ترجمہ قاسم بن اصبغ (۳) جامع المسانید خوارزمی

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس مسند کا تذکرہ کیا ہے۔

قد اعتنی الحافظ ابو محمد الحارثی و کان بعد الثلاثمائة بحدیث ابی حنیفة فجمعه فی مجلدة ورتبه علی شیوخ ابی حنیفة۔(۱)

حافظ ابو محمد حارثی نے توجہ فرمائی اور ۳۰۰ھ کے بعد حدیث ابی حنیفہ جمع کی ہے اور ان کو شیوخ ابی حنیفہ پر ترتیب دیا ہے۔

بڑے بڑے حفاظ جیسے حافظ ابن مندہ' حافظ ابن عقدہ' حافظ ثعالبی فن حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں حافظ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کے ساتھ کشف الآثار فی مناقب ابی حنیفہ بھی ہے۔ اس دور کی علمی دلچسپیوں کے بارے میں یہ بات آج بڑی حیرت سے سنی جائے گی کہ موصوف جب اپنی مشہور تصنیف کشف الاثار املا کراتے تھے تو آپ کی مجلس املا میں چارسو مستملی ہوتے تھے۔ خیال فرمایئے کہ جب امام اعظمؒ کے مناقب کے املا میں یہ تعداد ہوتی تھی تو آپ کی مسند کے درس میں خدا جانے یہ تعداد کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی۔

امام حارثی کی اس مسند کا شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اس مسند کا تذکرہ کیا ہے کہ جمع مسند الابی حنیفة(۲)

حکیم الامت او ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے مشہور رسالہ الانتباہ میں حافظ حارثی کو اصحاب الوجوہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہاء واحناف کا مرجع تھے۔ اصحاب الوجوہ کا درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب کے درمیان ہوتا ہے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحفص صغیر سے کی تھی۔

علامہ خوارزمی ان کی مسند کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ: روایتی طور پر مجھے باقاعدہ وقت کے چار اماموں کی وساطت سے یہ مسند ملی ہے۔

---

(۱) تعجیل المنفعة: ص۴) (۲) لسان المیزان: ص ۳۴۹

- خطیب جمال الدین ابو الفضائل عبدالکریم بن عبدالصمد الانصاری۔
- شیخ صفی الدین اسماعیل بن ابراہیم۔
- شمس الدین یوسف بن عبداللہ۔
- شیخ ابوبکر بن محمد بن عمر فرغانی۔

4- حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی:

محمد بن ابراہیم نام اور ابوبکر کنیت ہے۔ ابن المقری کر کے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں محدث اصفہانی الامام الرجال الحافظ الثقہ کے القاب سے ان کا ترجمہ شروع کیا ہے بڑے پائے کے محدث ہیں چار مرتبہ مشرق و مغرب کا صرف حدیث کی خاطر سفر کیا ہے۔ اصفہانی موصل حران عسقلان کوفہ تستر مکہ قدس دمشق صیدا بیروت عکا رملہ واسط حمص مصر وغیرہ تمام ہی شہروں میں حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کی نشاندہی کی ہے ان کے سامنے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے مثلاً ابوالشیخ اصفہانی ابوبکر بن مردویہ حمزہ السہمی ابونعیم الاصفہانی وغیرہ وغیرہ۔ حافظ ابونعیم اصفہانی کی ان کے بارے میں رائے ہے۔

محدث کبیر ثقة صاحب مسانید سمع مالا یحصی کثرة۔(۱)

حافظ ذہبی نے ان کے طلب علم حدیث کی داستان کا خود ان کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں طبرانی اور ابوالشیخ مدینے میں قیام پزیر تھے تنگ حالی کے ہاتھوں لاچار تھے پورا دن گذر گیا کھانے کو کچھ نہ ملا میں عشاء کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! بھوک لگی ہوئی ہے۔ طبرانی نے مجھ سے کہا کہ بیٹھ جاؤ اب کھانا آئے گا یا موت آئے گی۔ میں اور ابوالشیخ کھڑے تھے کہ دروازے پر شیخ علوی نے دستک دی ہم نے دروازہ کھولا۔ تو ان کے ساتھ کھانے کے دو ناشتہ دان دو لڑکے لیے ہوئے آرہے تھے فرمانے لگے تم نے میری حضور انورؐ سے شکایت کی ہے۔ میں نے حضور انور کو ابھی ابھی خواب میں دیکھا ہے آپ نے مجھے کھانا پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ص ۱۷۲

حافظ ابن مقری الصاحب بن عباد کے لائبریرین رہ چکے ہیں کسی نے الصاحب سے دریافت کیا کہ آپ ادیب ہو کر ابن المقری جیسے محدث سے محبت رکھتے ہیں۔ فرمایا دو وجہ سے۔ اول اس لیے کہ ان کے میرے والد سے دوستانہ تعلقات تھے۔ دوسرے اس لیے کہ میں ایک روز سو رہا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں تو سو رہا ہے اور دروازے پر ایک اللہ کا ولی کھڑا ہے میں بیدار ہوا اور ملازم کو آواز دے کر کہا کہ دیکھو دروازے پر کون ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ابوبکر بن المقری ہیں۔ حافظ ذہبی نے ہی یہ بھی بتایا ہے۔

قد صنف مسندابی حنیفة۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے۔

وکذالک خرج المرفوع منه الحافظ ابوبکر بن المقری۔(۲)

اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی یہ مسند حارثی کی مسند سے چھوٹی ہے۔ حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ زین قاسم بن قطلو بغا نے حافظ ابن مقری کی اس مسند کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے۔(۳) ماہ شوال ۳۸۱ھ میں بعمر ۹۶ سال ان کا انتقال ہوا ہے۔(۴)

5- حافظ ابوالحسین محمد بن المظفر :

عراق، جزیرہ، مصر اور شام کے اساتذہ مشائخ سے چودہ سال کی عمر ہی میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ابن شاہین، حافظ دارقطنی، حافظ ابونعیم، حافظ مالینی اور حافظ کبرقانی جیسے اساطین وارکان علم حدیث نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں ایسا نمایاں حصہ لیا کہ حافظ ذہبی نے بھی ان کی فن کاری کا اعتراف کیا۔

جمع والف عن مطابق هذا الفن لم يتخلف۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ص ۱۷۲ (۲) تعجیل المنفعۃ: ص ۶ (۳) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۱۷

(۴) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ص ۱۷۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ: ج ۸ ص ۱۷۸

خطیب بغدادی نے ان کی صداقت اور فہم و حفظ کو سراہا ہے۔ دار قطنی نے ان سے ہزارہا حدیثیں لکھی ہیں۔ قاضی محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حافظ دار قطنی حافظ ابن المظفر کا بیحد اکرام کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں سہارے سے نہ بیٹھتے تھے۔(۱)

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حدیث کے لیے رخت سفر باندھا تو اس سفر میں حافظ ابوجعفر طحاوی سے حدیث کا سماع کیا۔(۲) ابن ابی الفوارس کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت' امانت اور حسن حافظہ ہی قابل داد نہیں بلکہ لکھا ہے کہ: انتھیٰ الیہ الحدیث و حفظہ و علمہ حدیث' حدیث کا علم' حدیث کا حفظ بس ان پر ختم ہے۔(۳) حافظہ کا عالم یہ تھا کہ حافظ ابن ابی الفوارس نے ایک بار ان سے ایک روایت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس روایت کا تعلق حدیث باغندی از ابن زید از عمرو بن عاصم سے تھے فرمایا میرے پاس نہیں۔ سائل نے عرض کیا کہ دیکھ لیجئے شاید ہو فرمایا اگر ہوتی تو مجھے یاد ہوتی۔ میرے پاس اس راوی کی صرف ایک لاکھ حدیثیں ہیں لیکن ان میں یہ سلسلہ سند نہیں ہے۔(۴)

حافظ عسقلانی نے ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔(۵) ان کی تاریخ وفات ۹ے۳ھ ہے۔ علامہ خوارزمی رقمطراز ہیں کہ اس مسند کی مجھے ان مشائخ سے اجازت ملی ہے۔ اول محی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمٰن بن الجوزی۔ دوم شیخ ابو المظفر یوسف بن علی بن حسین۔ سوم علی بن معالی۔ چہارم شیخ عبداللطیف علم حدیث اور حفظ حدیث میں اپنے دور کی ایک مثالی شخصیت تھے۔

6- حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد:

پورا نام حسین بن محمد بن خسرو بلخی ہے۔ حافظ ابن عساکر کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو محدث مکثر کہا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حافظ سمعانی نے جو تاریخ بغداد کا ذیل لکھا ہے۔ اس میں ایک مبسوط ترجمہ ہے اور بتایا ہے کہ امام موصوف مفید بغداد ہیں۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ) (۲) لسان المیزان: ج ۵ ص ۳۸۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ص ۷۸

(۴) لسان المیزان: ج ۵ ص ۳۸۴ (۵) تعجیل المنفعۃ: ص ۶

بہت سے مشائخ وقت سے حدیث کا استفادہ کیا ہے پھر مشائخ کے نام گنائے ہیں اور تفصیل کے بعد لکھا ہے:

وبالغ فی الطلب حتی سمع من طبقة دون هؤلاء و کتب الکثیر من الکتب لنفسه و لغیره و کان مفید الغرباء و جمع مسند ابی حنیفة۔

طلب وتلاش میں بڑی محنت کی ہے تا آنکہ ان سے کمتر طبقہ سے روایت کیا اور بہت سی کتابیں اپنی اور دوسروں کی لکھیں اور غرباء کے لیے مفید تھا اور مسند ابی حنیفہ جمع کیا۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے ان کے بارے میں ابن النجار کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اپنے وقت کے بغداد میں اہل عراق کے فقیہ تھے۔(۱) حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ان کی مسند امام حارثی اور حافظ ابن مقری کی مسند سے بڑی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وفی کتاب زیادات علی مافی کتابی الحارثی و ابن المقری۔(۲)

اور ان کی کتاب میں حارثی اور ابن المقری کے کتابوں کے مقابلے میں زیادتی ہے۔

حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی حسینی نے صحاح ستہ، مسند شافعی، مسند احمد، مسند ابی حنیفہ کے رجال پر جو کتاب لکھی ہے جس کا نام التذکرہ برجال العشرہ ہے اس سلسلے میں حافظ حسینی نے جس مسند کا انتخاب کیا ہے وہ بھی حافظ خسرو بلخی کی مسند ہے۔

چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

اما الذی اعتمده الحسینی علی تخریج رجاله فهو مسند ابن خسرو۔(۳)

جس مسند پر تخریج رجال پر اعتماد کیا ہے وہ مسند ابی حنیفہ ہے۔

ان کی تاریخ وفات ۵۲۲ھ ہے۔

7- حافظ ابونعیم الاصفہانی:

پورا نام احمد بن عبداللہ بن احمد الاصفہانی الصوفی ہے وقت کے مشائخ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے جن اساتذہ نے ان کو پروانۂ تحدیث مرحمت فرمایا ہے ان میں واسط، نیشاپور، شام اور بغداد کے محدثین کرام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا ہے کہ

(۱) الجواہر المضیئہ: ص ۲۱۸ (۳،۲) تعجیل المنفعۃ: ص ۶

اجازلہ مشائخ الدنیا۔(۱)

دنیا کے سارے اساتذہ نے ان کو اجازت دی ہے۔

اور اس پر لطف یہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت اگر ۳۳۶ھ ہے تو یہ اجازت نامے ان کو ۳۵۰ھ سے پہلے ہی چوبیس سال کی عمر میں مل گئے۔ جتنے اکابر سے ان کو ملاقات کا شرف حاصل ہے کسی محدث کو نہیں ہے۔ ان کے سامنے حفاظ حدیث میں سے خطیب بغدادی، ابو صالح المؤذن، ابوعلی الوحشی، ابوالفضل احمد حداد اور ان کے برادر ابوعلی الحسن الحداد المقری نے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ حافظ ابن مردویہ کہتے ہیں۔ ہر سمت سے لوگ سمٹ سمٹ کر حدیث کی خاطر ان کے پاس آتے۔ ان کے وقت میں ان سے زیادہ حافظ دنیا کے کسی گوشہ میں نہ تھا۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب حلیۃ الاولیاء کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ لم یصنف مثلہ اس جیسی پہلے کوئی تصنیف نہیں ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے اس مسند کو جو انہوں نے مسند ابی حنیفہ کے نام سے تالیف کیا ہے۔ حافظ ابوعلی الحسن المقری الحداد کی وساطت سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابوعلی اور ان کے برادر حافظ ابوالفضل کا حافظ ذہبی نے تذکرے میں حافظ ابونعیم کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابونعیم کے اس مسند ابی حنیفہ کا مقدمہ میں علامہ زاہد کوثری نے تذکرہ کیا ہے۔

8- حافظ ابن ابی العوام:

حافظ ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن ابی العوام السعدی ان کا پورا نام ہے۔ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی اور حافظ ابوجعفر طحاوی کے شاگرد ہیں۔ مصر میں عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ امام ابوحنیفہ کے مناقب میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ مسند ابی حنیفہ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے ان کی تاریخ وفات ۳۳۵ھ ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے اور دوسرے مسانید کے ساتھ اس کی بھی تخریج کی ہے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ

9- حافظ ابن عدیؒ:

پورا نام ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی المعروف بابن القطان ہے ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۵ھ میں وفات پائی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز الامام الحافظ الکبیر کہہ کر کیا ہے۔ فن جرح وتعدیل میں ان کی بڑی شہرت ہے اس فن میں ان کی کتاب الکامل فی الجرح والتعدیل اس پایہ کی کتاب ہے کہ محدث حمزہ نے ایک بار امام دارقطنی سے درخواست کی کہ آپ ضعفاء پر ایک کتاب لکھ دیجئے دارقطنی نے کہا کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کامل نہیں ہے فرمایا کہ ہے جواب دیا کہ بس اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ (۱)

جرح وقدح میں ان کے قلم کی بے باکی سے اکثر نالاں ہیں اور بہتوں کو ان کی اس باب میں بے انصافیوں کی شکایت بھی ہے۔ مولانا عبدالحی نے الرفع والتکمیل میں پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ احناف ان کے مذہبی تعصب کے نشتروں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہیں چنانچہ امام اعظمؒ اور ان کے ساتھوں پر بڑی دلیری سے جو کچھ منہ میں آیا ہے لکھ دیا ہے۔ اس کے باوجود امام اعظمؒ کے مسند کے راوی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا اولین حال یہی تھا لیکن حافظ ابو جعفر طحاوی سے شرف تلمذ کے بعد ان میں انقلاب آ گیا۔ شاید اسی کے کفارہ میں مسند ابی حنیفہ تصنیف کی۔ (۲)

حدیث میں امام نسائی اور امام یعلی موصلی کے شاگرد ہیں اور ان سے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے استفادہ کیا ہے مثلاً حافظ ابن عقدہ اور حافظ حمزہ السہمی وغیرہ۔ مشہور ملک عیسیٰ بن ابی بکر ایوبی نے حافظ ابن عدی کی مسند کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

ذکر ابن عدی صاحب کتاب الجرح والتعدیل فی مسند ابی حنیفۃ فی صدر الکتاب فی مناقب ابی حنیفۃ باسنادلہ۔ (۳)

10- حافظ ابو الحسن اشتانی:

قاضی ابو الحسن عمر بن الحسن بن علی پورا نام ہے حافظ اشتانی سے شہرت رکھتے ہیں بڑے پایہ کے جلیل القدر محدث اور حافظ حدیث تھے۔ حافظ ابو علی جو دارقطنی کے شیخ تھے ان کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۳ (۲) تانیب الخطیب: ص ۱۶۹ (۳) السہم المصیب: ص ۱۰۵

ثقاہت کا لوہا مانتے تھے انہوں نے امام اعظمؒ کی جو مسند لکھی ہے محدث خوارزمی نے اس سے جامع المسانید میں حدیثیں نقل کی ہیں۔ان کی تاریخ وفات ۴۳۹ھ ہے۔

11- حافظ ابوبکر بن عبدالباقی:

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی بن محمد الانصاری الحلبی البزاز المعروف بقاضی المرستان۔حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شیخ الاسلام ابوالقاسم اسماعیل اصفہانی کے تذکرے میں ۵۳۵ھ کی وفیات کے سلسلے میں ان کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ میں کیا ہے۔طبقات الحنابلہ میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے حافظ ابن النجار نے تاریخ بغداد کے ذیل میں ان کے حالات لکھے ہیں اور ان کے اساتذہ کے تذکرے میں بتایا ہے کہ طلب علم کی خاطر مکہ اور مصر بھی تشریف لے گئے اور مکہ میں مشہور محدث ابومعشر عبدالکریم بن عبدالصمد المقری الشافعی سے بھی حدیث کا سماع کیا ہے۔یاد رہے کہ ابومعشر عبدالکریم ان محدثین میں سے ہیں جنہوں نے امام اعظمؒ کی احادیث پر مستقل تصنیف چھوڑی ہے۔چنانچہ الکتانی رقم طراز ہیں:

جزء الاسعاذ ابی معشر عبدالکریم بن عبدالصمد المقری الشافعی صاحب التاصنیف المجاور بکمة المتوفی ۴۷۸ھ ذکر فیہ مارواہ ابو حنیفة من الصحابة۔(۱)

اور یہ رسالہ المعجم المفہرس میں حافظ عسقلانی کی مرویات میں سے ہے۔محدث خوارزمی نے جامع المسانید میں لکھا ہے کہ:

هو جمع مسند ابی حنیفة۔(۲)

اگرچہ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں حافظ ابن خسرو کے ترجمہ میں اس کے ماننے سے انکار کیا ہے لیکن ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین السخاوی ان کی مسند کو بسند ذیل روایت کرتے ہیں۔

عن الترمذی عن المیدومی عن النجیب عن ابن الجوزی عن جامع المسند قاضی المرستان۔(۳)

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ:ص۷۴ (۲) جامع المسانید:ج۲ص۲۹۳ (۳) مقدمہ نصب الرایہ

اور حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں نصر بن سیار کے تذکرے میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے۔

كتاب الاحاديث التي رواها ابو حنيفة جمع عبدالله بن محمد الانصاري لجده القاضي صاعد برواية عنه۔(۱)

ان کی تاریخ ولادت ۴۳۲ھ اور تاریخ وفات رجب ۵۲۵ھ ہے یعنی آپ دنیا سے ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائے دار بقا ہو گئے۔

12- حافظ طلحہ بن محمد:

پورا نام طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد ابو جعفر ہے۔ مشہور محدث ہیں۔ محدث خطیب بغدادی نے تاریخ میں ان کے حالات قلم بند کیے اور ان کے اساتذہ کی لمبی فہرست دی ہے حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں لکھا ہے **مشهور في زمن الدار قطني صحيح السماع**۔(۲) ابن ابی الفوارس نے ان کی تاریخ وفات ۳۸۰ھ بتائی ہے۔ لسان المیزان میں ان کی تاریخ وفات مطبع کی غلطی سے غلط طبع ہو گئی ہے۔ جامع المسانید میں ۳۸۰ھ ہے اور زمانہ دارقطنی از ۳۰۶ھ ہے۔

محدث خوارزمی فرماتے ہیں:

كان مقدم العدول والثقات الاثبات في زمانه وصنف المسند لابي حنيفة۔(۳)

حافظ تقی الدین السبکی نے ان کی سند سے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

في مسند الامام ابي حنيفة تصنيف ابي القاسم طلحة بن محمد بن جعفر الشاهد۔(۴)

13- حافظ ابن عساکر دمشقی محدث:

ابو القاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ نامور محدث اور مؤرخ ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو

---

(۱) الجواہر المضیئہ: ج ۲ ص ۱۹۵　(۲) لسان المیزان: ج ۳ ص ۲۱۲، ص ۲۱۲

(۳) جامع المسانید: ج ۲ ص ۴۸۷　(۴) شفاء السقام: ص ۵۵

الامام الحافظ الکبیر محدث الشام فخر الائمہ کے القاب سے نواز ہے۔ تیرہ سو سے زائد اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ محدث خوارزمی نے حافظ ابن النجار کے حوالہ سے ان کی علمی رحلتوں کے تذکرے میں عراق، مکہ، مدینہ، کوفہ، دمشق، خراسان، آذربائیجان، نیشاپور، سرخس، طوس، مرو، اصفہان، ہمدان، بسطام، دامغان، سمنان، رے، زنجان شمار کرائے ہیں۔ علمی سفروں کا آغاز ۵۲۰ھ میں اور اختتام ۵۲۵ھ میں بتایا ہے ان کی تصانیف میں تاریخ دمشق الاشراف اور المعجم قیمتی تصانیف ہیں۔ امام اعظم کے مسند کا ذکر ڈاکٹر کرد علی نے تاریخ دمشق کے مقدمہ میں بھی کیا ہے نیز علامہ زاہد کوثری نے تبیین کذب المفتری فیما نسب الامام الاشعری لابن عساکر کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۱ رجب ۵۷۱ھ ہے۔

14- محدث امام عیسیٰ جعفری مغربی:

یہ عیسیٰ مغربی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد الاساتذہ ہیں ۱۰۸۰ھ میں ان کی وفات ہوئی شاہ صاحبؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں: وے استاد جمہور اہل حرمین است۔ مقالید الاسانید کے نام سے ایک معجم تصنیف کیا ہے اور ساتھ ہی امام اعظم کی ایک مسند تالیف کی۔ یہ مسند جس شان کی ہے اور اس میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کے اس بیان سے ہوسکتا ہے:

مسند برائے امام ابوحنیفہ تالیف کردہ دراں جا معنعنہ متصلاً ذکر کردہ در حدیث۔

انہوں نے امام ابوحنیفہ کی ایسی مسند تالیف کی ہے جس میں اپنے سے لے کر امام صاحب تک معنعنہ متصلاً ذکر کیا ہے۔(۱)

ذرا غور فرمایئے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب دیگر محدثین کی حدیثوں کے لیے کتابوں میں آجانے کے بعد سندی اتصال باقی نہیں رہ سکا اور سب کی احادیث نے روایات مرسلہ کی حیثیت اختیار کرلی اور خود محدثین نے اسے ارسال العلماء کہہ کر

---

(۱) انسان العین: ص ۱۸۳

شرف پذیرائی بھی دے دیا۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے یہ مان کر فی الواقع حدیث کی کتابوں تک روایتی اتصال نہیں ہے بلکہ ارسال ہے لکھا ہے کہ:

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں میں آئی ہوئی ان کے مصنفین کی طرف نسبت درست ہے کیونکہ علماء کی عادت یہی ہے کہ کتاب کا حوالہ دے دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ اخرجہ البخاری۔ اپنا بخاری تک سلسلہ سند بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں:

مراسیل میں قوی تر وہ مراسیل علماء ہیں جو ان کتابوں کے سلسلے میں علماء کرتے ہیں۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف امام اعظمؒ ہی کی خصوصیت ہوئی کہ ان کی روایات میں آج تک عنعنہ متصل قائم ہے۔ اس طرح شاہ صاحب ہی کے لفظوں میں ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہوگئی جو کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلہ سند میں آج کل اتصال نہیں۔ فرماتے ہیں:

آزانجا بطلان زعم کسانیکہ گویند کہ سلسلہ حدیث امروز متصل نماندہ واضح ترمیشود۔

یہاں سے ان لوگوں کا دعویٰ بھی غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا ہے۔(۲)

سوچئے کہ اگر امام اعظمؒ سے حدیث کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو یہ حدیث کا سماع متصل امام صاحب سے لے کر شاہ صاحب تک کیسے وجود میں آگیا ہے۔

یہ وہ مشاہیر حفاظ اور محدثین ہیں جنہوں نے امام اعظمؒ کی احادیث کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظمؒ کے مسند پر قلم اٹھایا ہے۔ مشہور محقق زاہد کوثری نے تقدمہ نصب الرایہ میں اسی سلسلے میں امام دارقطنی اور حافظ ابن شاہین کا بھی نام لیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۸ (۲) انسان العین: ص ۱۸۳

وكان مع الخطيب عند ماحل دمشق مسند ابي حنيفة للدارقطني ومسند ابي حنيفة لابن شاهين۔(۱)

یہ دونوں مسندیں ان مسانید کے علاوہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محدث خوارزمی نے جن نامور محدثین کے مسانید کو جامع المسانید میں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:

- مسند امام حافظ ابوعبداللہ الحارثی المدنی
- مسند حافظ ابوالقاسم طلحہ بن محمد
- مسند امام حافظ ابوالحسین محمد بن المظفر
- مسند حافظ ابونعیم الاصفہانی
- مسند امام ابوبکر محمد بن عبدالباقی
- مسند امام ابواحمد عبداللہ بن عدی
- مسند حافظ عمر بن الحسن الاشنانی
- مسند امام ابوعبداللہ حسین بن محمد خسرو
- مسند امام ابوالقاسم عبداللہ بن ابی العوام

اصل میں مسانید تو صرف یہی ہیں ان کے علاوہ جو دوسرے مسانید کا اس مجموعے میں تذکرہ ہے مثلاً

- مسند امام حافظ محمد بن الحسن
- مسند امام حافظ قاضی ابویوسف
- مسند امام حسن بن زیاد
- مسند امام حماد بن ابی حنیفہ

دراصل یہ مسانید نہیں بلکہ کتاب الآثار کے نسخے ہیں جس کی تفصیلات آپ پڑھ چکے

(۱) تقدمہ نصب الرایہ: ص ۴۰

ہیں۔ ایسے ہی حافظ ابوبکر کلاعی کی مسند بھی جامع المسانید میں مسند ہی بنا کر داخل کر دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی مستقل مسند نہیں بلکہ کتاب الآثار ہی کا ایک نسخہ ہے جس کو وہ اپنے جد امجد محمد بن خالد سے روایت کرتے ہیں۔

اطراف حافظ ابن القیسرانی:

محدثین میں اطراف پر کتابیں لکھنے کا پرانا رواج ہے ان کے عرف میں اطراف یہ ہیں کہ متن حدیث کے ابتدائی ٹکڑے لکھ کر اس کی ساری اسانید کو یک جا کر دیا جائے۔ الکتانی رقمطراز ہیں:

ھی التی نقتصر فیھا علی ذکر طرف الحدیث الدال علی بقیه مع الجمع لاسانیده۔(۱)

جیسے حدیث کی دوسری کتابوں کے محدثین نے اطراف لکھے ہیں مثلاً اطراف صحیحین حافظ ابومسعود اور حافظ ابومحمد خلف بن محمدؒ حافظ ابونعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ایسے ہی امام اعظمؒ کی روایات پر حافظ ابن القیسرانی نے اطراف لکھے ہیں یعنی امام اعظمؒ کے مختلف مسانید سے ان کی حدیثوں کو لے کر جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب الجمع میں رجال الصحیحین جو حافظ قیسرانی کی تصنیف ہے اور حیدر آباد سے طبع ہوئے ہے اس کے آخر میں حافظ ابن القیسرانی کی تصانیف میں اطراف احادیث ابی حنیفہ کا ذکر ہے۔ موصوف بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ ابن الجوزی نے المنتظم میں ان پر بہت لے دے کی ہے لیکن سمعانی نے ان کی صفائی بھی پیش کی۔ ابن کثیر نے البدایہ میں ابن الجوزی نے المنتظم میں ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے حافظ صاحب نے لکھا ہے۔ **وھوفی نفسه صدوق لم یتھم** وہ ذاتی طور پر غیر متہم راست گو ہیں۔ حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ اسماعیل تیمی کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ میں نے سب سے بڑا حافظ ابن طاہر کو پایا ہے یحییٰ بن مندہ کہتے ہیں کہ:

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ: ص ۱۲۷ یعنی اطراف یہ ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا لکھ کر اس کی ساری سندوں کو یکجا کر دیا جائے۔

حفاظ میں یگانہ اچھے کردار والے راست گو صحیح اور غلط سے واقف اور صاحب تصانیف عالم تھے۔(۱)

ان کی تاریخ وفات ۷۰۵ھ ہے۔

مسانید امام اعظمؒ کی شرحیں:

چونکہ جامع المسانید میں امام ابوحنیفہ کی متعدد مسانید کی روایتیں موجود ہیں۔ اس لیے متاخرین میں اس کتاب کی بڑی شہرت ہوگئی بڑے بڑے اجلہ محدثین نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مشہور حافظ زین الدین قاسم التوفی ۸۷۹ھ ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت ضخیم شرح لکھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی اس کی شرح لکھی ہے اس کا نام التعلیقۃ المنیفہ علی مسند ابی حنیفہ ہے۔ متعدد محدثین نے جامع المسانید کا اختصار بھی کیا ہے۔

امام شرف الدین اسماعیل بن عیسیٰ بن دولہ المکی کے اختصار کا نام اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء بعض رجال الاسانید ہے۔

امام ابو البقا احمد بن ابی الضیاء محمد القرشی نے اس کا جو مختصر لکھا ہے اس کا نام المستند فی مختصر المسند ہے۔ ایک اور مسند کا مختصر شیخ ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل نے بھی لکھا ہے۔

علامہ حافظ الدین محمد بن الکردری نے زوائد مسند ابی حنیفہ کے نام سے ان روایات کو جو مسند ابی حنیفہ میں صحاح ستہ سے زائد ہیں جمع کیا ہے۔

امام ابوحفص زین الدین عمر بن احمد اشجاع نے بھی ایک اختصار لقط المرجان من مسند ابی حنیفۃ النعمان کے نام سے کیا ہے۔

متاخرین میں علامہ السید مرتضیٰ زبیدی محدث نے جامع المسانید سے امام اعظمؒ کی ان احادیث احکام کا انتخاب کیا کہ جن کی روایت میں مصنفین صحاح بھی امام صاحب کے شریک ہیں اس کتاب کا نام عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفہ ہے اس کی ترتیب ابواب فقہ پر ہے۔

---

(۱) لسان المیزان: ج۵ص ۲۰۸

بہرحال احادیث ابی حنیفہ کی جو خدمت کی گئی ہے یہ اس کی ایک جھلک ہے جو ناظرین کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سارا ذخیرہ آج آثار قدیمہ کی نظر ہے اللہ کرے کوئی صاحب علم بزرگ اس علمی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ وماذالک علی اللہ بعزیز۔

حدیث کا دوسرا مجموعہ مؤطا امام مالکؒ:

کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ جو اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے وہ امام دار الہجرۃ مالک بن انس کی مشہور تصنیف مؤطا ہے۔ یہ اہل مدینہ کی روایات اور فتاویٰ کا بہترین مجموعہ ہے مؤطا میں بھی کتاب الآثار کی طرح مسائل واحکام کے لیے احادیث صحیح کو نقش اول اور آثار صحابہ وتابعین کو نقش ثانی قرار دیا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے چاہے وہ مسند ہو یا مرسل۔ نیز حضرت عمرؓ کے اثر اور عبداللہ بن عمرؓ کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ وتابعین مدینہ کے فتاویٰ سے اخذ کرنا خصوصاً جبکہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو امام مالکؒ کے مذہب کا اصول ہے۔(۱)

فتح الباری کے مقدمہ میں حافظ عسقلانی لکھتے ہیں:

پھر امام مالکؒ نے مؤطا تصنیف کیا اور اہل حجاز کی حدیثوں میں سے قوی اور صحیح روایتوں کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین اور ان کے بعد والے علماء کے فتاویٰ کو بھی اس میں مدغم کر دیا۔(۲)

---

(۱) حافظ شمس الدین سخاوی کے بارے میں ازہر کے کلیہ شرعیہ کے استاد عبدالوہاب نے المقاصد الحسنہ کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظمؒ کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اس مجموعہ کا نام "التحفة المنيفه فيما وقع له من حديث ابی حنيفه" ہے۔ حافظ سخاوی ان مشہور اکابر علماء میں سے ہیں جن کے علم وعمل پر خود اہل علم کو اس قدر اعتماد ہے کہ شوکانی نے قسم کھا کر کہا ہے۔ ولقد والله العظيم لم ار من الحفاظ المتاخرين مثله۔ (البدر الطالع: ج ۲ ص ۱۸۵)

(۱) مصفّٰی: ج ۱ ص ۱۷ (۲) ہدی الساری: ص ۴

مؤطا کے بارے میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے:

ماعلی ظهر الارض کتاب بعد کتاب الله اصح من کتاب مالک۔

روئے زمین پر قرآن حکیم کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔(۱)

حافظ سیوطی نے تنویر الحوالک کے مقدمہ میں امام شافعیؒ کے اس ارشاد کو مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعد کو شافعی مکتبۂ فکر کے کچھ علماء نے امام شافعیؒ کے اس ارشاد کی یہ توجیہ کی ہے:

اما قول الشافعی فذالک قبل وجود الکتابین۔(۲)

دراصل اس توجیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں چونکہ مؤطا میں مرسل، منقطع اور بلاغات ہیں اس لیے مؤطا کا درجہ اب بخاری و مسلم کے بعد ہے لیکن حافظ مغلطائی فرماتے ہیں:

لافرق بین المؤطا و البخاری فی ذالک لوجوده ایضاً فی البخاری من التعالیق ونحوها۔

اس معاملے میں مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ بخاری میں بھی تعلیقات موجود ہیں۔(۳)

حافظ جلال الدین السیوطی نے حافظ ابن حجر کی زبانی حافظ مغلطائی کے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ:

مؤطا اور بخاری دونوں کی منقطع روایات میں فرق یہ ہے کہ مؤطا میں اس قسم کی جو روایتیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کا سماع امام مالکؒ نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور یہ ان کے خیال میں حجت ہے۔ لیکن بخاری میں اس قسم کی جو روایات ہیں۔ ان کی سندیں ان وجوہ کی بنا پر عمداً حذف کی گئی ہیں جن کی تعلیقات کے سلسلے میں تشریح کر دی گئی ہے۔(۴)

---

(۱) تزئین الممالک: ص ۴۳　(۲) تنقیح الافکار: ج ۱ ص ۴۰

(۳) تزئین الممالک: ص ۴۷　(۴) تزئین الممالک: ص ۵

اور اس موضوع پر خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں توضیح فرمائی ہے۔

کچھ ائمہ نے مؤطا کے مقابلے میں صحیح بخاری کی اصحیت ثابت کرنے میں جھلک ڈال دی ہے ان کا کہنا ہے کہ صحت اور احتیاط اور وثوق سے کام لینے میں بخاری اور مالک دونوں برابر ہیں۔ باقی بخاری میں حدیثوں کا زیادہ ہونا۔ تو اس کا نہ صحت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ یہ صحت کا لازمہ ہے۔ دراصل اس مشکل کا حل یہ ہے کہ بخاری کی اصحیت صرف شرائط صحت کی وجہ سے ہے۔ امام مالک کے خیال میں چونکہ انقطاع اسناد و منافی صحت نہیں ہے۔ اس لیے ان کی کتاب میں مراسیل منقطعات اور بلاغات آجاتے ہیں۔ اور امام بخاری انقطاع کو چونکہ ایک علت خارجہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی روایات کو موضوع کتاب سے الگ ہو کر دوسرے سلسلے میں لاتے ہیں مثلاً تراجم میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ منقطع روایات اگر چہ کچھ کے نزدیک قابل احتجاج ہیں لیکن پھر بھی روایات متصلہ زیادہ قوی ہیں بشرطیکہ دونوں کے بیان کرنے والے حفظ اور عدالت میں یکساں ہوں۔ بس یہی بخاری کی اصحیت کی وجہ ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ امام شافعی نے مؤطا کی اصحیت کا دعویٰ اپنے زمانہ میں موجود تالیفات کے مقابلے میں کیا ہے ان کے سامنے جامع سفیان ثوری اور مصنف حماد بن سلمہ جیسی کتابیں تھیں اور ان پر مؤطا کی فضیلت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔(۱)

علامہ محمد بن جعفر الکتانی نے علامۃ الشیخ صالح کے حوالہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس تقریر کا یہ جواب دیا ہے:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بلاغات مؤطا اور تعلیقات بخاری میں جو فرق بیان کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ اگر حافظ صاحب مؤطا کا بھی اسی طرح بنظر غائر مطالعہ کرتے جیسے انہوں نے صحیح بخاری کا کیا ہے تو ان کو پتہ لگ جاتا کہ واقعی ان دونوں کتابوں

(۱) ہدی الساری مقدمہ فتح الباری: ص ۸

میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ جو وہ فرماتے ہیں کہ امام مالک نے ان روایات کا اسی صورت میں سماع کیا ہے تو یہ نا قابل تسلیم ہے کیونکہ مؤطا کی ایک حدیث مثلاً یحییٰ کی روایت اگر بلاغاً ہے تو دوسرے لوگ اسی حدیث کو امام مالک سے مسنداً بھی روایت کرتے ہیں۔ اور حافظ صاحب کی یہ بات بھی قابل پذیرائی نہیں ہے۔ کہ مراسیل امام مالک اور ان کے پیروکاروں کے نزدیک حجت ہیں اس لیے خود امام شافعی اور محدثین کے یہاں بھی مرسل حجت ہے بشرطیکہ اس کی پشت پر کسی مسند کی تائید ہو۔ جیسا کہ ابن عبدالبر اور سیوطی وغیرہ نے بتایا ہے اور عراقی کا یہ کہنا کہ بلاغات مالک غیر معروف ہیں درست نہیں۔ کیونکہ ابن عبدالبر نے مؤطا کے تمام بلاغات' مراسیل اور منقطعات صرف چار کو چھوڑ کر وصل ثابت کر دیا ہے اور ان چار کو بھی موصول ثابت کرنے کے لیے ابن الصلاح نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو میرے پاس موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ محدثؒ مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں میں مقدم اور افضل سمجھتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں اس کے دلائل لکھے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ:

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب مؤطا ہے محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مؤطا کا سارا علمی ذخیرہ مالک اور ان کے ہمواؤں کے خیال میں صحیح ہے اس کا ہر مرسل اور منقطع دوسرے طرق سے متصل السند ہے اس لیے اس حیثیت سے مؤطا بالکل صحیح ہے۔ خود امام مالک کے زمانے ہی میں مؤطا کی روایات کی تخریج کے لیے ان گنت مؤطا لکھے گئے مثلاً ابن ابی ذئب' ابن عیینہ' سفیان ثوری اور معمر وغیرہ نے ان لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں جو امام مالک کے شیوخ ہیں۔ پھر مؤطا سب لوگوں کی علمی و تعلیمی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ فقہاء میں سے امام شافعی' امام محمد بن الحسن' ابن وہب اور ابن القاسم۔ محدثین میں یحییٰ بن سعید القطان' عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق۔ خلفاء و امراء میں سے ہارون رشید' امین' مامون۔ حتیٰ کہ مؤطا امام مالکؒ ہی کے زمانے میں درجہ شہرت حاصل کر

چکا ہے اور پھر ہر دور میں اس کی شہرت میں اضافہ ہی رہا ہے۔ اسی پر فقہاء امصار نے اپنے مذاہب کو قائم کیا ہے حتیٰ کہ کچھ عراقیوں میں کچھ مسائل میں اسی کو پیش نظر رکھا۔ ہمیشہ سے ہر زمانے میں علماء مؤطا کی حدیثوں کی تخریج کرتے رہے اس کے توابع اور شواہد بتاتے رہے۔(۱)

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق مصفّٰی شرح مؤطا کے مقدمہ میں مؤطا کی ترجیح کے دلائل اور وجوہ کے ساتھ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صحت کے لحاظ سے صحیحین اور مؤطا میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ بعض اور وجوہ سے بھی مؤطا کو صحیحین پر ترجیح ہے۔

(الف) امام مالکؒ کی زیادہ روایات کا مرکز و منبع اہل مدینہ ہیں۔ علم الفقہ وفتاویٰ کے لیے زمانہ خلافت راشدہ میں مرکزی شخصیت حضرت فاروق اعظمؓ کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ مدنی علمی دائرے کی اہم شخصیتیں ہیں۔ ان کے علوم کی وراثت مدینہ میں فقہائے سبعہ کو ملی ہے۔ امام مالکؒ کو براہ راست ان فقہائے سبعہ کے تلامذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ امام مالکؒ کے ان اساتذہ میں امام زہری، امام یحییٰ بن سعید انصاری، زید بن اسلم، ابو الزناد اور نافع۔ یہ کبار تابعین ہیں جن سے استفادے کا امام مالکؒ کو موقعہ ملا ہے۔ امام مسلم اور امام بخاری کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

(ب) آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ کسی رافضی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز کیوں نہ ہو حدیث کی روایت کے روادار نہ تھے حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

سئل مالک عن الرافضة فقال لا تکلمهم ولا ترو عنهم فانهم یکذبون۔
رافضیوں سے کوئی علمی گفتگو نہ کرو اور نہ ان سے روایت لو کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔(۲)

---

۱ (حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۱۳۴) ۲ (المنتقی: ص ۲۱)

برخلاف اس کے مسلم و بخاری میں ان سے روایات موجود ہیں۔ چنانچہ السیوطی نے صراحۃً لکھا ہے۔ جیسا اس پر آپ آئندہ اوراق میں تفصیلی بحث انشاء اللہ پڑھیں گے۔ یہاں خلاصہ کلام کے طور پر صاحب تعلیقات کے حوالہ سے صرف امام حاکم کا ایک بیان ہدیہ ناظرین کرتا ہوں:

مبتدعین اور اہل اہواء کی روایات اکثر محدثین کے یہاں مقبول ہیں بشرطیکہ یہ لوگ راستباز ہوں۔ امام بخاری نے عباد بن یعقوب سے حدیث روایت کی ہے حالانکہ اس کے بارے میں ابوبکر محمد بن اسحاق کی تصریح ہے کہ دین میں متہم ہے اور محمد بن زیاد اور جریری بن عثمان سے بخاری میں روایتیں آئی ہیں حالانکہ دونوں ناصبی ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے محمد بن حازم اور عبید اللہ بن موسیٰ سے حدیث لی ہے حالانکہ دونوں غالی شیعہ تھے۔(۱)

(ج) مؤطا کے نسخے تیس سے زائد ہیں لیکن ان میں سے قوی تر اور مشہور ترین جن کی روایت کا سلسلہ امام مالکؒ سے پھیلا ہے بارہ ہیں۔

السند الفالقی کتاب المؤطا بروایۃ نحو اثنی عشر من اصحاب بن مالک۔

حافظ ابن عبدالبر نے "استذکار" اور "تمہید" میں ان ہی بارہ نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ جبکہ بخاری کے تلامذہ میں سے جن بزرگوں سے سلسلہ روایت چلا وہ صرف چار ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے بستان المحدثین میں ان کی تعداد سولہ بتائی ہے۔

جن بزرگوں سے مؤطا کا روایتی سلسلہ دنیا میں پھیلا ان کے نام یہ ہیں:

۱- یحییٰ بن یحییٰ المسعودی الاندلسی ۲۰۴ھ ۲- ابوعبداللہ بن وہب بن سلمہ ۱۹۷ھ
۳- ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن القاسم ۱۹۱ھ ۴- معن بن عیسیٰ بن دینار ابو یحییٰ المدنی ۱۹۸ھ
۵- ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسلم بن قعنب ۱۲۲ھ ۶- ابومحمد عبداللہ بن یوسف الدمشقی ۲۱۸ھ
۷- یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر القرشی ابوزکریا ۲۳۱ھ ۸- سعید بن کثیر بن عفیر بن مسلم الانصاری ۲۲۶ھ
۹- احمد بن ابی بکر القاسم بن الحارث ۲۴۲ھ ۱۰- مصعب بن عبداللہ الزبیری ۲۳۶ھ

(۱) التعلیقات علی توضیح الافکار: ج ۲ ص ۲۱۶

۱۱-محمد بن الحسن الشیبانی الامام	۱۸۹ھ	۱۲-سوید بن سعید بن سہل الہروی	۲۴۰ھ
۱۳-یحییٰ بن یحییٰ بن عبدالرحمن	۲۳۶ھ	۱۴-احمد بن اسماعیل بن محمد ابوحذافہ	۲۵۹ھ
۱۵-محمد بن المبارک بن یعلیٰ القرشی	۲۱۵ھ	۱۶-سلیمان بن برد	۲۴۶ھ

الغرض مؤطا کتاب الآ ثار کے بعد احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے۔

جامع معمر بن راشد:

اسناد و روایت کے بہت بڑے امام ہیں۔ علی بن المدینی اور ابو حاتم نے ان کو اپنے دور میں علم روایت کا مرکز قرار دیا ہے ابھی سبزہ کا آغاز نہیں ہوا کہ علم حدیث کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ خود ان کا اپنا بیان ہے کہ:

مجھے قتادہ سے چودہ سال کی عمر میں استفادے کا موقعہ ملا ہے جو کچھ بھی سنتا سینہ میں نقش ہو جاتا تھا۔(۱)

امام احمد کا بیان ہے کہ جب بھی ہم نے معمر سے کسی کا مقابلہ کیا تو معمر کو طلب علم حدیث میں پیشتر و پایا۔ معمر اپنے زمانے میں علم کے بڑے جویا تھے۔ ابن جریج کہتے تھے معمر سے استفادہ کرو کیونکہ اپنے زمانے میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ معمر بن راشد بھی امام مالکؒ کے معاصر ہیں اور دوسری صدی کے بڑے پائے کے مؤلفین میں سے ہیں۔ نواب صدیق حسن خانؒ نے اس دور کے مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

سفیان بن عیینہ' مالک بن انس نے مدینہ منورہ میں' عبداللہ بن وہب نے مصر میں اور معمر و عبدالرزاق نے تصنیف کا کام کیا۔(۲)

حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:

اسی عہد میں علمائے اسلام نے حدیث' فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی چنانچہ مکہ میں ابن جریج نے مدینہ میں مالک نے شام میں اوزاعی نے بصرہ میں ابی عروبہ نے یمن میں معمر نے کوفہ میں سفیان ثوری نے تصانیف کیں۔(۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب: ج ۱۰ ص ۲۴۴ (۲) الحطہ: ص ۱۵ (۳) تاریخ الخلفاء

امام ذہبی سے حافظ سخاوی نقل کرتے ہیں کہ:

یمن میں حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فروکش ہوئے یمن سے بہت سے تابعین ائمہ ہوئے۔ اس میں تابعین میں علماء کی ایک جماعت ہوئی ہے امام منبہ کے دونوں صاحبزادے وہب بن منبہ اور ہمام بن منبہ ہوئے طاؤس اور ان کے صاحبزادے ہوئے بعد ازیں معمر بن راشد اور ان کے اصحاب ہوئے پھر عبدالرزاق اور ان کے ساتھی ہوئے۔(۱)

حافظ سیوطی فرماتے ہیں:

مکہ میں تصنیف کا کام ابن جریج نے مدینہ میں مالک اور محمد بن اسحاق نے بصرہ میں ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری نے شام میں اوزاعی نے واسط میں ہشیم نے اور یمن میں معمر بن راشد نے کیا ہے۔(۲)

حافظ ابن الجوزی نے تلقیح فہوم اہل الاثر میں جہاں مصنفین متقدمین کا تذکرہ کیا ہے وہاں دوسرے مصنفین کے ساتھ معمر بن راشد کا بھی نام لیا ہے۔

معمر بن راشد نے ۵۸ سال کی عمر میں ۱۵۳ھ میں وفات پائی ہے ان کے شیوخ و اساتذہ میں ثابت البنانی، قتادہ، زہری، عاصم الاحول، ایوب السختیانی، الجعد، زید بن اسلم، صالح بن کیسان، عبداللہ بن طاؤس، جعفر بن برقان، الحکم بن ابان، اشعث بن عبداللہ، اسماعیل بن امیہ، ہمام بن منبہ، ہشام بن عروہ، محمد بن المنکدر اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ تابعین کے نام ملتے ہیں۔

معمر بن راشد نے علمی استفادہ یمن میں ہمام بن منبہ سے کیا ہے۔ ہمام کو حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان سے حدیثیں سنی ہیں جو تقریباً ایک سو چالیس ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۴۰ (۲) تدریب الراوی: ص ۴۰

معمر کو ان سے استفادے کا موقعہ ہمام کی کبر سنی کے زمانے میں ملا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے معمر کو سنانی شروع کیں تو تھک گئے معمر نے ان سے رسالہ لے لیا اور بقیہ خود پڑھ کر سنایا۔(۱)

یہ لکھی ہوئی مرویات ابو ہریرہؓ حدیث کا وہی رسالہ ہے جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہمام سے اس رسالہ کے راوی معمر بن راشد ہیں۔ الذہبی لکھتے ہیں:

همام عن ابی هريرة نسخة مشهورة رواها عنه معمر۔

معمر نے نہ صرف یہ کہ ہمام کی ان حدیثوں کو بعینہ محفوظ رکھا بلکہ الجامع نامی ایک کتاب خود بھی تصنیف کی ہے۔

ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں لکھا ہے:

ثم كتاب معمر بن راشد باليمن فيه سنن۔

دوسرے مقام پر الکتانی لکھتے ہیں:

جامع معمر بن راشد الازدی مولد هم البصری نزيل اليمن المتوفی ۱۵۳ھ۔(۲)

جیسا کہ نام بتا رہا ہے اس میں آپ نے وہ تمام احادیث یکجا کی ہیں جو آپ نے مختلف اساتذہ سے سنی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اہل علم کو شکر گذار ہونا چاہیے کہ انہوں نے جامع معمر کا نسخہ ترکی سے بڑی تگ و دو اور تحقیق و جستجو کے بعد نکالا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

علم کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب اب تک محفوظ ہے اور حال ہی ترکی سے دستیاب ہو گئی ہے اس کا ایک نسخہ جامعہ انقرہ کے شعبہ تاریخ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ناقص و دریدہ لیکن بہت قدیم ہے یعنی ۳۴۴ھ میں اندلس کے شہر طلیطلہ میں لکھا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ کامل ہے اور استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے اور ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے اس کتاب پر استنبول یونیورسٹی کے نوجوان فاضل استاد ڈاکٹر فواد نے ''ترکیات مجموعہ سی'' نامی رسالے کی بارھویں جلد میں صفحہ ۱۱۵ تا صفحہ ۱۴۴ پر ایک

(۱) تہذیب التہذیب: ج ۱۱ ص ۶۷ (۲) الرسالۃ المستطرفۃ: ص ۹

دلچسپ مقالہ بھی لکھا ہے لیکن ترکی زبان میں ہے اس کا عنوان یہ ہے "حدیث مصنفا تنک مبدئی و معمر بن راشدک جامعی۔" یہ کتاب راوی وار نہیں بلکہ موضوع وار مرتب ہوئی ہے سرسری مطالعہ پر اس میں ہمام بن منبہ کا بھی آٹھ دس بار ذکر آیا ہے لیکن معمر کی روایت کو بھی خود ہی سے متعلق ہونے کی وجہ سے کتاب الجامع میں مکرر نقل نہیں کیا۔ البتہ ہمام کے رسالہ کی حدیثیں ہمام کے علاوہ کسی اور راوی سے ملیں تو اس جدید سند کے ساتھ ان کو الجامع میں ضرور ذکر کیا ہے۔ اس طرح ایک ہی حدیث چند در چند ماخذوں سے معلوم ہونے کی وجہ سے معتبر سے معتبر ہو جاتی ہے جامع معمر دو سو صفحات سے کچھ زائد پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کی اشاعت کی جلدی ہی نوبت آ جائے۔(۱)

مشہور امام یحییٰ بن معین زہریات میں ابن عیینہ صالح بن کیسان کے مقابلے میں معمر کو بہت زیادہ سراہتے تھے۔(۲)

امام معمر کو امام اعظم ابوحنیفہ سے عقیدت تھی اور آپ امام اعظم کی جلالت علمی کے بہت گن گاتے تھے چنانچہ حافظ عبدالقادر لکھتے ہیں:

امام اسفرائنی نے امام علی بن المدینی حافظ ابوالحسن کے حوالہ سے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور حدیث فلحنین کے ناقد ہیں لکھا ہے کہ ابن المدینی کہتے ہیں کہ حسن بصری کے بعد فقہ میں حسن معرفت ابوحنیفہ جیسی میرے علم میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔(۳)

جامع سفیان الثوری:

امام سفیان ثوری کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ فقہ میں ان کا اور امام اعظم کا عموماً ایک مذہب ہے امام ترمذی اپنی سنن میں اکثر امام سفیان ثوری کا مذہب نقل کرتے ہیں جو اکثر امام ابوحنیفہ کے موافق ہوتا ہے۔

---

(۱) مقدمہ صحیفہ ہمام بن منبہ: ص ۵۵ (۲) تہذیب التہذیب: ج ۱۱ ص ٦٧

(۳) الجواہر المضیئہ: ج ۲۲۴' تاریخ بغداد ج: ۱۳ ص ۳۳۹

امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

سفیان الثوری اکثر متابعة لابی حنیفة منی۔(۱)

امام زفرؒ جب بصرہ تشریف لائے اور ان کے سامنے جامع سفیان لائی گئی تو اسے مطالعہ کے بعد امام زفرؒ کا تاثر یہ تھا:

هذا کلامنا ینسب الی غیرنا

یہ بات تو ہماری ہے، لیکن منسوب اوروں سے ہے

امام زفرؒ نے جامع سفیان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس کے فقہی مسائل سے متعلق ہے۔ بعض ان فقہی مسائل کو جو ائمہ کے مابین اختلافی ہیں اور جن میں اختلاف محض افضلیت اور اولویت کا ہے ان کا اہمیت دیتے تھے اور اتنی اہمیت کہ ان کو اہل السنت ہونے کا معیار قرار دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو حافظ ذہبی نے لالکائی کی السنۃ کے حوالے سے لکھا ہے:

شعیب بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے عرض کیا کہ السنۃ کے موضوع پر کوئی بات ایسی بتایئے جو میرے لیے نفع بخش ہو اور ایسی پختہ ہو کہ جناب الٰہی میں اگر آپ کے حوالہ سے کہوں تو بچ جاؤں اور آپ کی گرفت ہو جائے فرمایا کہو بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے اللہ ہی اس کا مبدا اور معاد ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے وہ کافر ہے اور ایمان قول و عمل اور نیت کا نام ہے بڑھتا اور گھٹتا ہے اور شیخین کو مقدم رکھو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ شعیب! صرف اتنی بات سے فائدہ نہ ہوگا جب تک تم مسح علی الخفین کو نہ مانو گے اور جب تک نماز میں بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلے میں افضل نہ جانو گے اور جب تک تقدیر پر ایمان نہ لاؤ گے اور جب تک ہر نیک و بد کے پیچھے نماز نہ پڑھو گے اور جب تک جہاد کو قیامت تک ضروری اور ہر ظالم و عادل حکومت کے تحت نہ رہو

---

(۱) الجواہر المضیۃ: ج ۲

شعیب نے دریافت کیا کہ سب نمازیں ان لوگوں کی امامت میں پڑھنی ضروری ہیں فرمایا جمعہ اور عیدین تو ہر ایک کی امامت میں پڑھ لو ان کے علاوہ میں تمہیں اختیار ہے صرف اس کے پیچھے پڑھو جسے تم جانتے ہو کہ اہل السنت سے ہے۔ جب تم خدا کی جناب میں جاؤ اور تم سے دریافت کیا جائے تو کہہ دینا خداوندا مجھ سے یہ بات سفیان ثوری نے کہی ہے۔(۱)

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام صاحب کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے جو امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں۔ امام سفیان ثوری نے اپنی جامع کی تصنیف میں زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے خود علی بن مسہر کا بیان ہے کہ:

امام سفیان میرے پاس عشاء کی نماز کے بعد آئے اور میرے سے امام اعظمؒ کی کتابیں عاریۃً لے گئے۔(۲)

امام سفیان کی جامع ایک زمانے میں محدثین کے یہاں بڑی مقبول اور متداول رہی ہے امام بخاری نے جب علم حدیث کی تحصیل شروع کی تو سب سے پہلے جن کتابوں کی طرف توجہ کی وہ سفیان ثوری کی جامع اور عبداللہ بن المبارک اور وکیع بن الجراح کی تصانیف تھی۔ امام بخاری نے جامع ثوری کا سماع اپنے وطن ہی میں امام ابو حفص کبیر سے کیا تھا۔ خطیب بغدادی قمطراز ہیں:

محمد بن اسماعیل البخاری فرماتے ہیں کہ ایک حرف کتاب میں جو میرے یہاں نہ تھا میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے وہی بتایا میں نے ان سے پھر پوچھا انہوں نے پھر وہی بتایا آخر میں نے تیسری بار مراجعت کی تو ذرا چپ ہو رہے اور دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اسماعیل کا لڑکا محمد ہے فرمایا اس نے صحیح بتایا ہے یاد رکھو یہ لڑکا ایک روز مرد میدان ہوگا۔(۳)

حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جامع سفیان اور موطا میں کون سی کتاب زیادہ اچھی ہے فرمایا کہ کتاب مالکؒ۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ص۱۹۳ (۲) کردری ص۲۱۶ (۳) تاریخ بغداد: ج۲ص۱۱ (۴) تزئین الممالک: ص۴۳

لیکن امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں جامع سفیان سب سے اچھی ہے۔(۱)

اس دور کی اور کتابیں:

اس دور میں ان کے علاوہ دوسرے ارباب علم نے میدان علم میں داد تحقیق دی ہے۔ مؤرخین نے اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف علوم وفنون میں اتنا علمی سرمایہ امت کے لیے وراثت میں چھوڑا ہے کہ امت ان کے اس احسان عظیم سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

علمائے کبار نے سنن کی تدوین، فقہ کی تالیف اور زبان وادب پر کتابیں لکھی ہیں۔ ہارون رشید کے زمانے میں اس کی بہتات ہوئی اور بکثرت تصانیف مدون ہوگئیں۔(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

امام مالکؒ نے حدیث اہل حجاز اقوال صحابہ وفتاویٰ تابعین پر مشتمل مؤطا۔ ابن جریج نے مکہ میں امام اوزاعی نے شام میں اور سفیان ثوری نے کوفہ میں حماد بن سلمہ نے بصرہ میں کتابیں لکھی ہیں۔(۳)

حافظ سیوطی تاریخ الخلفاء میں ۱۴۰ھ کے حوادث میں حافظ ذہبی کی اعلام سے نقل کرتے ہیں:

قال الذهبي شرع علماء الاسلام في هذا العصر في تدوين الحديث والفقه والتفسير فصنف ابن جريج بمكة و مالك المؤطا بالمدينة والاوزاعي بالشام و ابن ابي عروبه وحماد بن سلمه وغيرهما بالبصرة ومعمر باليمن و سفيان الثوري بالكوفة و صنف ابن اسحاق المغازي و صنف ابو حنيفة الفقه والراى ثم بعد يسير صنف هشيم والليث وابن لهيعة ثم ابن المبارك وابو يوسف و ابن وهب وكثر تدوين العلم و تبويبه و دونت كتب العربية واللغة والتاريخ و ايام الناس۔

---

(۱) رسالہ ابی داؤد: ص ۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۵۱ (۳) الہدی الساری: ص ۵

علمائے اسلام نے اس زمانے میں حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، آداب عربیہ، لغت اور تاریخ کی تدوین شروع کی۔ (۱)

مؤرخین نے اس اجمال کی کچھ شرح فرمائی ہے:

کتاب السنن ابن جریج:

یہ کتاب محدثین کے یہاں سنن ابی الولید کے نام سے مشہور ہے۔ الکتانی نے اس نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

نیز سنن کی کتابوں میں سے سنن ابی الولید ہے۔ لوگ ان کو ابو خالد بھی کہتے ہیں ان کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے کہا جاتا ہے کہ اولین مصنف ہیں ان کی وفات ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ میں ہوئی۔ (۲)

حافظ ذہبی نے ان کا چہرہ لکھتے ہوئے تذکرۃ الحفاظ میں بتایا ہے کہ صاحب التصانیف۔ احد الاعلام اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس ایک کتاب تھی خالد بن نزار کہتے ہیں کہ ۱۵۰ھ میں میں ابن جریج کی کتابیں لے کر ان کی خدمت میں بالمشافہ قرأت کے لیے حاضر ہوا مگر افسوس کہ ان کی وفات ہو چکی تھی۔ (۳) ابن الندیم نے ان کی کتاب السنن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

له من الكتب كتاب السنن و يحوى مثل ما يحوى عليه كتب السنن۔

ان کی کتابوں میں کتاب السنن ہے اس کے مضامین بھی سنن جیسے ہیں۔ (۴)

امام حسن بن زیاد کو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ کبیر میں خود امام حسن کی زبانی نقل کیا ہے۔

میں نے ابن جریج سے بارہ ہزار حدیثیں وہ لکھی ہیں جن کی فقہاء کو ضرورت ہوتی ہے۔ (۴)

ابن جریج کے اس بیان سے جو حافظ ذہبی نے روح بن عبادہ سے نقل کیا ہے اندازہ ہوتا

---

(۱) تذکرۃ الخلفاء: ص ۲۶۳ (۲) الرسالۃ المستطرفۃ: ص ۳۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۶۰

(۴) الفہرست لابن الندیم: ص ۳۲۰ (۵) الامتاع: ص ۵۰

ہے کہ موصوف نے امام اعظمؒ سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ:
روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ جب ان کو امام اعظم کی وفات کی خبر ملی تو ان کے تعزیتی کلمات یہ تھے: واللہ لقد ذھب علم کثیر بخدا دنیا سے بہت بڑا علم کوچ کر گیا۔(۱)

کتاب الفرائض لابن مقسم ۱۸۶ھ:

مغیرہ بن مقسم کوفہ کے نامور محدثین سے ہیں۔ امام شعبہ جیسے رئیس المحدثین کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ حماد سے زیادہ حافظ ہیں۔ امام احمد ان کو ذکی' حافظ اور صاحب سنت فرماتے تھے۔ رواۃ صحاح ستہ میں سے مشہور امام حدیث وفقہ ہیں۔ ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ افقہ کسی کو نہیں دیکھا اس لیے ان ہی کی خدمت میں رہ پڑا۔ خود فرماتے تھے کہ جو چیز میرے کان نے سن لی کبھی بھولا نہیں ہوں۔ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو امام اعظمؒ کا شاگرد بتایا ہے۔ جریر بن عبدالحمید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا مقسم مسائل میں گفتگو کرتے تھے۔ اور جب کسی مسئلہ پر ان سے کوئی اختلاف کرتا تو فرمادیتے کہ امام ابوحنیفہ یہی فرماتے ہیں۔(۲)

اللہ اکبر! علم ابی حنیفہ! کتنی جلالت قدر ہے کہ اختلاف کے وقت ان کو بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے ابن الندیم نے لکھا ہے کہ:

لہ من الکتب کتاب الفرائض۔(۳)

کتاب السنن لزائدۃ بن قدامہ:

زائدۃ بن قدامہ کوفہ کے مشہور محدث ہیں امام ذہبی نے ان کو امام شعبہ کا ہمسر بتایا ہے۔ ان کی علمی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ترمذی میں امام احمد کا یہ بیان پڑھیے۔

ابو اسحاق کی حدیث کے سوا جب تم زائدۃ اور زہیر سے کوئی حدیث سن لو تو اسے دوسرے سے سننے کی فکر ہی نہ کرو۔(۴)

---

(۱) مناقب للذہبی: ص ۱۸' تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۸ (۲) الجواہر المضیئہ: ج ۲ ص ۱۷۸
(۳) فہرست لابن الندیم: ص ۳۲۰ (۴) تذکرۃ الحفاظ

علامہ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن، کتاب القراءات، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا پتہ دیا ہے۔(۱)

حافظ ذہبی نے زائدہ بن قدامہ کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبدالقادر نے الجواہر المضیۂ میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب السنن یحییٰ بن زکریا ۱۸۴ھ:

ان کو بھی حافظ ذہبی نے کان اماما صاحب التصانیف، لکھا ہے اور ابن الندیم نے ان کی تالیفات میں کتاب السنن کا تذکرہ کیا ہے۔(۲)

ان کی کنیت ابو سعید اور نام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہمدانی ہے۔ حافظ حدیث، ثقہ، فقیہ، متدین، متورع اور ان اکابر اہل علم وفضل میں سے تھے جنہوں نے فقہ وحدیث پر نمایاں کام کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام ابوالحسن علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ امام سفیان ثوری کے بعد کوفہ میں آپ سے زیادہ ثبت کوئی نہ تھا۔ خطیب بغدادی رقمطراز ہیں کہ آپ نے پورے سال تک روزانہ ایک قرآن حکیم ختم کیا۔ بغداد میں ایک مدت دراز تک درس حدیث دیتے رہے آپ کے تلامذہ میں امام احمد، ابن معین، قتیبہ اور ابوبکر بن ابی شیبہ ہیں۔ امام ابن المدینی کہتے ہیں کہ علم یحییٰ پر ان کے زمانے میں ختم تھا۔(۳)

یحییٰ بن زکریا امام اعظم کے صرف ان تلامذہ میں سے نہیں جنہوں نے امام اعظمؒ کی نگرانی میں تدوین کتب کا کام کیا ہے بلکہ ان دس اشخاص میں سے ہیں جن کا شمار تلامذہ متقدمین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حافظ ابوجعفر طحاوی نے بسند متصل اسد بن الفرات سے روایت کی ہے:

کان اصحاب ابی حنیفة الذین دونو الکتب اربعین رجلا و کان فی العشرة المتقدمین ابو یوسف وزفر وداؤد الطائی واسد بن عمرو یوسف بن خالد السمتی ویحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔

امام اعظم کے وہ اصحاب جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا وہ چالیس تھے اور ان میں جو درجہ قیادت رکھتے تھے وہ دس تھے۔

---

(۱) فہرست: ص ۳۲۰ (۲) فہرست: ص ۳۲۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۴۶

بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یحییٰ بن زکریا ہی اس مجلس تدوین پورے تیس سال تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ابن فرات ہی فرماتے ہیں۔

وھو الذی کان یکتبھا لھم ثلاثین سنۃ۔(۱)

کتاب السنن وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ:

ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے۔(۲) الکتانی نے بھی اس سنن کا مصنف وکیع کے نام سے تعارف کرایا ہے۔(۳) حافظ ذہبی نے ان کی تصانیف کے بارے میں امام احمد کا یہ اعتباری ارشاد نقل کیا ہے کہ:

علیکم بمصنفات وکیع۔(۴)

اور ان کے چہرہ امام ذہبی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے الامام الحافظ۔ الثبت' محدث العراق' احد الائمۃ الاعلام۔ وکیع بن الجراح اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ ورواۃ میں ہیں فقہ وحدیث کے امام' عابد' زاہد' اکابر اتباع تابعین' امام شافعیؒ وامام احمدؒ کے شیخ ابوسفیان کنیت تھی امام اعظم سے فقہ میں درجہ تخصیص حاصل کیا اور حدیث میں امام اعظمؒ، امام ابو یوسف' امام زفر' ابن جریج' سفیان ثوری' سفیان بن عیینہ' اوزاعی' اعمش وغیرہ ان کے اساتذہ ہیں اور عبداللہ بن السبارک' امام احمد' یحییٰ بن معین' علی بن مدینی' اسحاق بن راھویہ' احمد بن منیع اور یحییٰ بن اکثم جیسے کبار محدثین آپ کے تلامذہ ہیں۔ یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں کہ میں سفر وحضر میں آپ کی رفاقت میں رہا آپ ہمیشہ روزہ رکھتے ہر رات قرآن حکیم ختم کرتے تھے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کوئی نہیں دیکھا۔(۵) امام اعظمؒ کی خدمت میں کافی عرصہ رہے ہیں اور علم کا بہت بڑا حصہ ان سے حاصل کیا ہے امام اعظمؒ کی مجلس تدوین فقہ کے رکن بھی ہیں۔ الصمیری نے لکھا ہے کہ فتویٰ میں امام ابوحنیفہ ہی کی رائے کو اپناتے تھے۔(۶) عبداللہ بن السبارک کا بیان ہے کہ امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے اور امام اعظمؒ سے بہت زیادہ حدیثوں کا سماع کیا ہے۔(۷)

---

(۱) الجواہر المضیۂ: ج۲ ص۲۱۱ (۲) الفہرست: ص۳۲۰ (۳) الرسالۃ المستطرفۃ: ص۳۲
(۴) تذکرۃ الحفاظ۔ ج۱ ص۳۰۶ (۵) تذکرۃ الحفاظ: ج۱ ص۲۸۲ (۶) الجواہر المضیۂ: ج۲ ص۲۰۸
(۷) جامع بیان العلم: ج۲ ص۱۴۹

کتاب السنن سعید بن ابی عروبہ ۱۶۵ھ:

امام ذہبی نے ان کو بصرہ میں اولین مصنف بتایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

اول من صنف الابواب بالبصرۃ۔(۱)

علامہ ابن الندیم نے ان ہی ابواب کو ان کی تصانیف میں کتاب السنن لکھا ہے۔

(۲) حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کے یہاں امام اعظم کا کیا علمی مقام تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> سعید بن ابی عروبہ سے ایک بار ایک مسئلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ کا تعلق طلاق سے تھا جواب دیا اور فرمایا ہکذا قال ابو حنیفۃ امام ابوحنیفہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعد ازیں ارشاد فرمایا کہ امام ابوحنیفہ تمام عراق کے عالم ہیں۔(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ سعید امام اعظمؒ کے علوم سے کیسے استفادہ کرتے تھے اور یہ کہ امام اعظمؒ کی شخصیت صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل سعید بن ابی عروبہ کی زبانی جو دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ امام اعظمؒ کے درس میں شریک ہو کر ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> میں کوفہ آیا تو امام اعظمؒ کے درس میں حاضری دیتا تھا ایک روز امام اعظمؒ نے حضرت عثمانؓ کے ذکر پر رحمہ اللہ فرمایا۔ میں چونک گیا عرض کا کہ آپ پر بھی اللہ رحم کرے میں نے تو اس بستی میں آپ کے سوا حضرت عثمانؓ کے لیے دعائے رحمت کرنے والا نہیں دیکھا یہیں سے مجھے امام اعظمؒ کا مقام فضل معلوم ہو گیا۔(۴)

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ سعید بن ابی عروبہ نے امام اعظمؒ سے کس قدر علمی استفادہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ کو بھی ان کا رفیق تصنیف بتا کر پیش کیا ہے۔

ھو اول من صنف مع سعید۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۶۷ (۲) فہرست: ۳۳۶ (۳) الانتقاء: ص ۱۳۰

(۴) الانتقاء: ص ۱۳۰ (۵) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۳۳۱

ابن الندیم نے بھی حماد کے مؤلفات میں کتاب السنن کا نام لیا ہے غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے چونکہ کام دونوں نے ایک جگہ کیا ہے اس لیے ایک ہی کتاب دونوں کی طرف منسوب ہے۔

کتاب التفسیر ہشیم بن بشیر ۱۸۳ھ:

امام بخاری نے ان کو بھی امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

روی عنه عباد بن العوام و ابن المبارک وهشيم۔

ان کی تصانیف میں علامہ ابن الندیم نے مندرجہ ذیل تین کتابیں بتائی ہیں:

کتاب السنن' کتاب التفسیر اور کتاب القراءات۔(۱)

امام حماد بن زید نے فرمایا کہ میں نے محدثین میں ان سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں دیکھا۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ ہشیم امام اعظمؒ کے تلامذہ حدیث میں ہیں۔ عبدالرحمن بن مہدی فرماتے تھے کہ ہشیم سفیان ثوری سے بھی زیادہ حافظ تھے۔ ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین ہیں۔

کتاب الزہد عبداللہ بن المبارک:

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ میں ان کو صاحب التصانیف النافعہ لکھا ہے علامہ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب الزہد' کتاب السنن' کتاب التفسیر' کتاب التاریخ اور کتاب البر والصلہ۔(۲)

مشہور محدث امام یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ جب مجھے دقیق اور مشکل مسائل سے سابقہ پڑتا ہے تو تلاش وجستجو میں اگر ابن المبارک کی کتابوں میں یہ نہ ملیں تو مجھ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ یحییٰ بن معین نے ان کی کتابوں میں مندرج احادیث کی تعداد بھی بتائی ہے فرماتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں مندرج حدیثوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔(۳)

---

(۱) الفہرست: ص۳۲۱　　(۲) الفہرست: ص۳۳۱　　(۳) تاریخ بغداد: ج۱۰ص۱۶۴

یہاں یہ بتانا بیجا نہ ہوگا کہ ابن الندیم نے عبداللہ بن المبارک کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وہ اشعار بھی درج کیے جو انہوں نے امام اعظمؒ کی مدح میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لقد زان البلاد ومن علیها　　امام المسلمین ابا حنیفه
باثار وفقه فی حدیث　　کایات الزبور علی الصحیفه
فما فی المشرقین له نظیر　　ولا بالمغربین ولا بکوفه
رایت العائبین له سفاها　　خلاف الحق مع حجج ضعیفه

حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ ایک بار عبداللہ بن المبارک کے کچھ تلامذہ ایک مجلس میں جمع تھے باہم گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آؤ کہ ابن المبارک کی خوبیاں شمار کریں۔ سب کا فیصلہ یہ تھا کہ عبداللہ میں علم' فقہ' ادب' نحو' لغت' زہد' شعر' فصاحت' پارسائی' انصاف' شب بیداری' سلامت رائے' تقلیل کلام اور ساتھیوں سے قلت اختلاف جیسی ساری خوبیاں جمع تھیں۔(۱) خطیب بغدادی نے عباس بن مصعب کا بھی ایسا ہی تاثر لکھا ہے۔

باوجود ان مناقب ومآثر کے عبداللہ بن المبارک امام اعظمؒ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے تھے۔ فرماتے ہیں اگر اللہ سبحانہ میری ابوحنیفہ اور سفیان ثوری سے مدد نہ فرماتے تو میں بھی عام لوگوں کی طرح ہوتا اور ان کا اقرار ہے۔

تعلمت الفقه الذی عندی من ابی حنیفة۔

امام اعظمؒ کے تلمذ پر فخر کرتے ان کی مدح فرماتے تھے۔(۲)

سیرت ومغازی:

ان کے علاوہ بھی دوسرے محدثین نے حدیث کے موضوع پر کتابیں مدون کی ہیں اور ساتھ ہی دوسرے موضوعات پر بھی علمی سرمایہ شہود پر آیا مثلاً سیرت وتاریخ' فقہ وشرائع' ادب وشعر پر اس دور میں کتابیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) الجواہر المضیۂ: ج۱ص۲۸۱　　(۲) تاریخ بغداد: ج۱۳ص۳۶۵

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے عروۃ بن الزبیر نے قلم اٹھایا بعد ازیں ابان بن عثمان ۱۰۵ھ نے کام کیا۔ ابان کی علمی تحقیقات کو ان کے شاگرد عبدالرحمٰن بن المغیرہ نے سیرۃ الرسول کے نام سے یکجا کیا اور محمد بن شہاب الزہری' موسیٰ بن عقبہ نے ان کے بعد مغازی لکھے ہیں۔ بالآخر محمد بن اسحاق نے ان سب کو سیرۃ الرسول کا نام رکھ کر یکجا کیا ہے۔(۱)

الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن الندیم نے الفہرست میں ان کا جستہ جستہ تذکرہ کیا ہے۔

فقہ و شرائع:

اس موضوع کی تفصیلات ہم یہاں نہیں پیش کر سکتے۔ اس پر سیر حاصل مباحث کے لیے آپ کو ہماری دوسری کتاب "امام اعظمؒ اور علم الشرائع" کا انتظار کرنا چاہیے لیکن ہم یہاں تاریخی ربط قائم رکھنے کے لیے چند اشارات کریں گے۔

علمی حیثیت سے کتاب وسنت اگر دلائل ہیں تو فقہ ان دلائل سے پیدا شدہ نتائج کا نام ہے یا جیسا کہ الخطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ قرآن وسنت اگر اساس اور بنیاد ہیں تو فقہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے یا جیسا حکیم الامت نے بتایا ہے کہ قرآن وسنت اگر سیپی ہیں تو فقہ کی حیثیت اسی سیپی کے اندر موتی کی ہے۔

زمانہ نبوت میں خود ذات نبوت فقہ و فتاویٰ کے مرکز تھی آپ کے بعد اکابر صحابہ جو شریعت کے رازوں اور احکام اسلامی کے محرم تھے فقہ و فتاویٰ میں آپ کے جانشین تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابن القیم نے امام مزنی سے نقل کیا ہے۔

فقہاء زمانہ نبوت سے آج تک فقہ میں اور تمام احکام میں قیاس سے کام لیتے رہے ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں' حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن حزم نے احکام الاحکام میں فقہ کی تاریخ پر جامع تبصرہ کیا ہے۔

---

(۱) تاریخ الاسلام السیاسی: ج ۱ ص ۳۹۶

مشہور جرمن مؤرخ بروکلمان نے اقرار کیا ہے:

اسلام کا دامن جزیرہ عرب سے باہر پھیلا تو علماء نے زندگی کے اس مرحلے پر ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے اجتہاد شروع کیا۔ اس طرح اسلام میں فقہ کا ظہور ہوا۔ یعنی اس عقلی تصرف و عمل نے جو معاشرے میں مختلف فیصلے معلوم کیے ان کا نام فقہ و تشریع ہو گیا۔(۱)

گولڈزیہر کی رائے ہے:

فقہ و اجتہاد پر اسلام کے شروع ہی سے کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس دور کی علمی حیثیت کچھ نمایاں نہ تھی۔

ان تصریحات سے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ فقہ و شرائع کا تاریخی رشتہ ذات نبوت اور صحابہ سے وابستہ ہے بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر فلیپ حتی نے کہا ہے کہ فقہ اسلامی کا دستور ضابطہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یہ کہہ کر بتایا تھا کہ:

اے معاذ! پیش پا افتادہ معاملات کو حل کیسے کرو گے؟ بولے کہ قرآن سے حضورؐ نے دریافت فرمایا اگر قرآن میں تمہیں معاملہ کا حل نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ بولے کہ حضور آپ کی سنت سے۔ حضورؐ نے پھر پوچھا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ بولے کہ اجتہاد کروں گا۔ حضورؐ نے یہ سن کر فرمایا الحمدللہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضاہ۔(۲)

یہ درست ہے کہ جیسے سارے صحابہ حفاظ حدیث نہ تھے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں سے حدیث نبوت کو نقل کرنے والے صحابہ مرد و زن کی تعداد کے بارے میں امام حاکم نے للمدخل میں لکھا ہے کہ:

فلروی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الصحابۃ اربعۃ الآف رجل و امراۃ۔(۳)

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ نے احادیث روایت کی ہیں۔ ایسے ہی سارے صحابہ فقہاء بھی نہ تھے بلکہ ان کی تعداد جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اعلام میں بتائی ہے۔

(۱) تاریخ الادب العربی: ج ۳ ص ۲۲۲ (۲) تاریخ العرب: ج ۲ ص ۳۸۳ (۳) المدخل: ص ۷

والذی حفظت عنهم الفتویٰ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائة ونيف وثلاثون نفساً مابين رجل و امرأة۔(۱)

یعنی صرف ایک سو تیس مرد و زن سے کچھ زائد ہے اور یہ تعداد بھی ایک جگہ نہیں بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت عمرؓ کی کوششوں کے صدقہ مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی اسی بنا پر زمانہ صحابہ ہی میں مختلف شہروں میں فقہ کے ایک سے زیادہ علمی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ ان شہروں میں مشہور ترین شہر یہ ہیں: مدینہ' کوفہ' دمشق' مکہ ... مدینہ کے فقہاء کا حافظ ابن حزم نے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مدینے میں صحابہ کے فقہاء میں سعید بن المسیب ہیں۔ ان کا ازدواجی تعلق ابو ہریرہؓ کی صاحبزادی سے ہوا۔ انہوں نے ابو ہریرہؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ سے علمی استفادہ کیا۔ دوسرے عروۃ بن الزبیر بن العوام تیسرے القاسم بن محمد۔ یہ دونوں حضرت عائشہؓ کے تلامذہ خاص میں سے ہیں۔ چوتھے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود۔ یہ ابن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں۔ پانچویں خارجہ بن زید۔ انہوں نے اپنے والد زید بن ثابتؓ سے علمی استفادہ کیا۔ چھٹے ابوبکر بن عبد الرحمٰن۔ ساتویں سلیمان بن یسار۔ یہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے خاص شاگرد ہیں۔ یہی لوگ فقہاء سبعہ کے نام سے مدینہ میں مشہور ہیں۔(۲)

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے فقہ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مدینہ کی فقہی اکادمی کا اس طرح تعارف کرایا ہے۔

علم الفقہ اور فتاویٰ کا دار و مدار خلفائے راشدین کے زمانے میں حضرت فاروق اعظمؓ کی ذات گرامی تھی۔ پھر فقہائے صحابہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ اس دائرہ علمیہ کے مرکز تھے۔ صحابہ کے بعد اس عمل جلیل کی ذمہ داری کا بار فقہائے سبعہ کے کاندھوں پر تھا ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۱۲ (۲) احکام الاحکام: ج ۲ ص ۵۱۷

دائرہ علمیہ میں کام کیا جیسے امام زہری' یحییٰ بن سعید الانصاری' زین بن اسلم وغیرہ۔ ان سب کی علمی وراثت امام مالک کو ملی انہوں نے ان کی حدیثوں اور فتاویٰ کو سینوں سے نکال کر صحیفوں میں جمع و مدون کر دیا۔(۱)

مدینہ کی طرح کوفہ میں بھی فقہ کا دائرہ علمیہ زمانہ صحابہ ہی سے کام کر رہا تھا۔ عہد مرتضیٰ سے لے کر بغداد کی تعمیر تک وسعت اور کثرت فقہ و حدیث میں تمام بلاد اسلامیہ کوفہ ممتاز تھا۔ علامہ نووی نے اسے دار الفضل و الفضلاء' مجد الدین فیروز آبادی نے قبۃ الاسلام لکھا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

اہل کوفہ نے حضرت علیؓ کے آنے سے پہلے سعد بن ابی وقاصؓ عبداللہ بن مسعودؓ عمار بن یاسر اور ابو موسیٰ اشعری سے علم حاصل کیا تھا۔ نیز کوفہ والوں نے قرآن کا عبداللہ بن مسعود سے استفادہ کیا ہے یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی علم حاصل کرتے تھے۔(۲)

کوفہ کا یہ دائرہ علمیہ صحابہ کے بعد جن حضرات پر مشتمل تھا حافظ ابن القیم اور حافظ ابن حزم نے ان کے نام لکھے ہیں:

علقمہ بن قیس النخعی ○ اسود بن یزید النخعی ○ عمرو بن شراحیل الہمدانی ○ مسروق بن الاجدع الہمدانی ○ عبیدۃ السلمانی ○ شریح بن الحارث القاضی ○ سلیمان بن ربیعہ الباہلی ○ زید بن صوحان ○ سوید بن غفلہ ○ الحارث بن قیس الجعفی ○ عبدالرحمٰن بن یزید النخعی ○ عبداللہ بن عتبہ بن مسعود القاضی ○ خیثمہ بن عبدالرحمٰن ○ سلمۃ بن صہیب ○ مالک بن عامر ○ عبداللہ بن سخبرہ زر بن حبیش ○ خلاس بن عمرو ○ عمرو بن میمون الاودی ○ ہمام بن الحارث ○ الحارث بن سوید ○ یزید بن معاویہ النخعی ○ الربیع بن خثیم ○ عتبہ بن فرقد ○ صلۃ بن زفر ○ شریک بن حنبل ○ ابو وائل شقیق بن سلمہ ○ عبید بن نضلہ۔

یہ نام لکھنے کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے ان سب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

---

(۱) مسوی: ص ۲۸ (۲) منہاج السنہ: ج ۴ ص ۱۴۲

ھؤلاء اصحاب علی و ابن مسعود

اوران میں اکثر کے بارے میں یہ بھی دعوئی کیا ہے کہ:

اکثر ھم اخذ عن عمرو عائشۃ و علی

ان کے بعد کوفہ ہی کے فقہاء میں ابراہیم نخعی ○ امام شعبی ○ سعید بن جبیر ○ القاسم بن عبدالرحمن ○ ابوبکر بن بن ابی موسیٰ ○ محارب بن دثار ○ حکم بن عتبہ اور جبلہ بن تجم کا ذکر کے بتایا ہے کہ کوفہ میں فقہ و افتاء میں ان کی جانشینی کا شرف۔

حماد بن ابی سلیمان ○ سلیمان بن المعتمر ○ سلیمان بن الاعمش ○ مسعر بن کدام کو حاصل ہے۔ اور پھر حماد و سلیمان کی وراثت علمی اس شہر میں ابن ابی لیلیٰ ○ عبداللہ بن شرمہ ○ سعد بن اشوع ○ قاضی شریک ○ القاسم بن معن ○ سفیان ثوری اور ابوحنیفہ اور الحسن بن صالح کو ملی ہے اور امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے اور سفیان ثوری کے جانشین یہ ہیں:

حفص بن غیاث ○ وکیع بن الجراح ○ قاضی ابو یوسف ○ زفر بن الہذیل ○ حماد بن ابی حنیفہ ○ الحسن بن زیاد ○ محمد بن الحسن عافیہ ○ اسد بن عمرو ○ نوح بن دراج اور امام ثوری کے ساتھی اشجعی معاذ بن عمران ○ یحییٰ بن آدم۔ (۱)

یہ گویا کوفہ میں علماء کوفہ کا وہ فقہی نسب نامہ ہے جو حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے درج کیا ہے۔ شاید اسی نسبی جلالت قدر کی وجہ سے امام اعظمؒ نے برسر دربار عباسی حکومت کے سربراہ ابو جعفر منصور کے اس پوچھنے پر کہ اے ابوحنیفہ تم نے کن لوگوں سے علم حاصل کیا ہے؟ امام اعظم نے سربراہ مملکت کو جواب دیا تھا کہ میرا علمی نسب نامہ یہ ہے کہ بحوالہ حماد از ابراہیم میں فاروق اعظمؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے علمی چشموں سے سیراب ہوا ہوں۔ امام اعظمؒ کا یہ جواب سن کر ابو جعفر نے کیا کہا۔ یہی سنانا چاہتا ہوں۔ بولا واہ واہ تم نے تو ابوحنیفہ اپنا علمی رشتہ الطیبین' الطاہرین اور السبارکین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہوا ہے۔ (۲)

اس کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے دوسرے شہروں کے مدارس فقہ کا

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۲۵ تا ۲۶، احکام الاحکام: ص ۱۷۱ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۴

بھی تذکرہ کیا ہے لیکن ہم نے مدینہ اور کوفہ کو خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان دونوں شہروں کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار امام مالکؒ سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کی زبان سے نکل گیا کہ شام والے تو آپ سے اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ:

متی کان ھذا الشان بالشام؟ انما ھذا الشان وقف علی اھل المدینة والکوفة۔(۱)

یہ شان شام والوں کی کب سے ہوئی ہے؟ یہ شان تو صرف مدینہ اور کوفہ والوں کی ہے۔

ان دونوں شہروں کے فقہاء سبعہ مدینہ اور فقہاء کوفہ کو اصحاب ابن مسعودؓ کے دور کا کوئی قلمی سرمایہ ہماری معلومات میں نہیں ہے اور بروکلمان کی یہ بات درست ہے:

ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس کی مدد سے ہم اس دور میں فقہ کی کتابی خدمت کا پتہ لگا سکیں۔(۲)

لیکن موصوف نے ابن سعد کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ:

فقہائے سبعہ میں سے عروہ نے فقہ و تشریع کے موضوع پر قلمی کام کیا ہے۔(۳)

عروہ کے صاحبزادے ہشام کا بیان ہے کہ:

میرے والد کی حرہ والے دن فقہ کی کتابیں نذر آتش ہو گئیں۔ ہشام افسوس سے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس یہ کتابیں ہوتیں تو مجھے اپنا مال اور اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہوتیں۔(۴)

علامہ ابن الندیم نے عبدالرحمٰن بن ابی الزناد ۱۷۴ھ کے بارے میں پتہ دیا ہے کہ انہوں نے رائ الفقہاء السبعہ کے نام سے کتاب لکھی ہے لیکن یہ دور تصنیف ہے۔ حافظ ذہبی

---

(۱) جامع بیان العلم: ج ۲ ص ۱۵۸ (۳،۲) تاریخ الادب العربی: ج ۲ ص ۲۳۲

(۴) طبقات ابن سعد: ج ۱ ص ۱۷۹، جامع بیان العلم: ج ۱ ص ۷۵ واضح رہے کہ ہم نے کتاب میں جامع کی روایت لی ہے۔ یہ زیادہ واضح اور صاف ہے۔

نے تذکرۃ الحفاظ اور حافظ عسقلانی نے تہذیب میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ کتاب ہی ان پر امام مالکؒ کی گرفت کا باعث بنی ہے لیکن عبدالرحمٰن کے اس کارنامے کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ مختلف نہیں ہے جو ابوبکر محمد بن موسیٰ نے عبداللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کر کے انجام دی ہے یہ اس دور کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بعد کا ہے۔

فقہ وشرائع میں امام اعظمؒ کی تصانیف:

دور میں فقہ وشرائع پر جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں سب سے پہلے کام امام اعظمؒ نے کیا ہے۔ ڈاکٹر فلپ حتی نے علم حدیث میں امام اعظمؒ کے بارے میں یہ بتانے کے بعد کہ:

كان من ابرز الذين تخرجوا على الشعبى الامام ابو حنيفة المشهور۔(۱)

امام شعبی کے تلامذہ میں سے مشہور امام ابوحنیفہ ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں تک فقہ وشرائع کی تاریخ کا تعلق ہے اس کی اساس و بنیاد قائم کرنے کا سہرا امام اعظمؒ ابوحنیفہ کے سر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

الامام ابو حنيفة المتوفى ۱۵۰ھ الذى وضع الاساس لاول مدارس الشرع الاربع فى الاسلام۔

ابوحنیفہ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے فقہ وشریعت کی اسلام میں اولین اساس رکھی ہے۔(۲)

فقہ کے موضوع پر ابوحنیفہ کے نام سے اگرچہ کوئی تالیف نہیں ہے اور اس سے کچھ کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ فی الواقع اس موضوع پر امام اعظمؒ کا کوئی سرمایہ علمی نہیں ہے لیکن دراصل امام اعظمؒ کے مذاق تالیف پر غور نہ کرنے کی وجہ سے دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ تالیف میں امام اعظمؒ کا مذاق کیا تھا تو وہ یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ ان کا طریقہ املائی تھا۔ زبانی بولتے تلامذہ لکھتے۔ امام محمد کے نام سے جو کتابیں ہیں ان کی اصل امام اعظمؒ ہی کا سرمایہ علمی ہے۔

---

(۱) تاریخ العرب: ج ا ص ۳۱۱ (۲) تاریخ العرب: ج ا ص ۳۱۶

فقہ کے موضوع پر امام کی قدیم ترین کتاب کتاب السیر ہے آپ نے اسے اپنے تلامذہ الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن، ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو، حفص بن غیاث، عافیہ بن یزید وغیرہ کو املا کرائی۔ امام اعظمؒ کی یہ کتاب جب امام عبدالرحمن الاوزاعی کے مطالعہ میں آئی تو امام اوزاعی نے اس کا جواب لکھا۔ قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب کا رد لکھا جو ''الرد علی سیر الاوزاعی'' کے نام سے مشہور ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں قاضی ابو یوسف کی کتاب ''الرد علی سیر الاوزاعی'' کو روایت کیا ہے۔(۱)

امام اعظمؒ نے فقہ میں اختلاف الصحابہ کے نام سے بھی کتاب تالیف کی ہے۔ امام اعظمؒ کی اس تاسیس کے بعد ان کے شاگردوں نے اس میدان میں جو علمی خدمت انجام دی ہے وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔

ان میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، کتاب الامالی، الرد علی سیر الاوزاعی مشہور ہیں۔

امام محمد کی تصانیف میں السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر، کتاب الرد علی اہل المدینہ، الجامع الصغیر، زیادات، مبسوط مشہور ہیں۔

امام حسن بن زیاد کے بارے میں علامہ ابن الندیم نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہیں مثلاً کتاب آداب القاضی، کتاب الخصال، کتاب معانی الایمان، کتاب المتعلقات، کتاب الفرائض، کتاب الخراج۔(۲)

ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں ابن الندیم نے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے کتاب الفرائض لکھی ہے نیز محمد بن عبدالرحمن جو ابن ابی ذئب کے نام سے مشہور ہیں ان کی فقہی تالیفات میں بھی کتاب السنن کا ذکر آیا ہے۔

الغرض اس دور میں تصنیف وتالیف کے کام میں کافی ترقی ہوئی اور بہت سے علماء نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں مدون کیں۔

---

(۱) کتاب الام (۲) الفہرست: ص ۳۰۲

دور صحابہ ۱۰۲ھ سے ۲۰۰ھ تک حدیث:

یہ تو آپ پہلے سن آئے ہیں کہ علم حدیث کے نام سے جو علمی ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ حسب تصریح امام حاکم۔

قد روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الصحابۃ اربعۃ الاف رجل و امراۃ۔(۱)

یعنی صرف چار ہزار مردوزن صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ جن تابعین نے صحابہ کرام سے یہ علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۸۴	کوفہ	۴۱۳
مکہ	۱۳۱	بصرہ	۱۶۴

شائد کوفہ اور مدینہ میں ائمہ تابعین کی اس کثرت تعداد پر آپ حیران ہوں لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ان دو شہروں کو ہی فقہ و حدیث میں مرکزیت حاصل تھی۔ آپ پیچھے امام مالکؒ کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ علم کی دنیا میں صرف ان ہی دو شہروں کو یہ حق حاصل ہے کہ علمی مباحث میں ان کا ذکر کیا جائے۔ علامہ یاقوت حموی نے سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ:

خذوا القرات عن اھل المدینۃ وخذوا الحلال و الحرام عن اھل الکوفۃ۔(۲)

قرأت مدینہ والوں سے اور حلال و حرام کی باتیں کوفہ والوں سے لو۔

یہی دو شہر ہیں جہاں کے اتفاق کو کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جیسے اہل مدینہ کے اتفاقی مسائل کا تذکرہ امام مالکؒ مؤطا میں اس طرح کرتے ہیں: **السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا**۔ ایسے ہی اہل کوفہ کے اجماعی مسائل کو بتانے کے لیے ایسے موقع پر امام محمدؒ یہ فرماتے ہیں:

---

(۱) المدخل: ص ۷ (۲) معجم البلدان: ج ۴ ص ۶۴

ھو قول ابی حنیفۃ والعامۃ من فقھائنا۔اور اگر مدینہ والوں کو کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو امام مالکؒ فرماتے ہیں: ھذا احسن ماسمعت۔۔اور امام محمدؒ اہل کوفہ کے اختلاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرماتے ہیں: ھو احب الینا۔الغرض مدینہ اور کوفہ میں ائمہ تابعین کی یہ کثرت کوئی حیرت والی بات نہیں ہے۔ان ائمہ تابعین کے حالات کتابوں میں پڑھئے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ ان لوگوں نے صحابہ کے زمانے کا بہت بڑا حصہ پایا ہے ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنھوں نے صحابہ کے گھروں اور صحابیات کی گود میں پرورش پائی ہے۔

مدینہ میں تابعین میں حدیث و آثار کا سرچشمہ اگر سعید بن المسیب' عروۃ بن الزبیر اور قاسم بن محمد ہیں تو کوفہ میں مسروق' علقمہ اور اسود بن یزید نخعی ہیں۔

سعید کو حضرت ابو ہریرہؓ جیسے راوی کبیر کے داماد ہونے کا شرف حاصل ہے عروہ حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور قاسم ان کے بھتیجے ہیں اور ان دونوں کی حضرت عائشہؓ نے ہی پرورش کی ہے۔کوفہ کے مسروق بن الاجدع حضرت عائشہؓ کے متبنّیٰ اور لے پالک ہیں۔علقمہ کی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے علمی تربیت فرمائی ہے اور ان کو براہ راست فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰ، ابو الدرداءؓ اور عثمان غنیؓ سے استفادے کا موقعہ ملا ہے۔اسود بھی علقمہ کے بھائی اور ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔یہ ایک نمونہ ہے۔ورنہ سارا گلستان ہی سدا بہار ہے۔ان تابعین کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے صحابہ سے مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات' خلفائے راشدین کے عدالتی فیصلوں اور فتاویٰ کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی ہے۔احادیث کا اکثر و بیشتر ذخیرہ ان ہی تابعین کی وساطت سے ان کے تلامذہ کے ذریعے امت کو وراثت میں ملا ہے یہ ان ہی کے تلامذہ ہیں جنھوں نے اپنے ان اساتذہ کے علوم کو سینوں سے صحیفوں میں منتقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ جن کی تفصیل ہم اوپر دے چکے ہیں ذرا ایک نظر اس نقشہ پر بھی ڈال لیجئے تا کہ اس دور کی تالیفات کا پورا اندازہ ہو سکے۔یہ نقشہ ہم نے الکتانی کی کتاب الرسالۃ المستطرفہ سے تیار کیا ہے۔ہم یہاں صرف مصنفین کے اسمائے گرامی پیش کرتے ہیں:

١٥٠ھ	امام اعظم ابوحنیفہ	کتاب الآثار
١٧٩ھ	امام مالک بن انس	موطا
١٥١ھ	عبدالملک بن عبدالعزیز	کتاب السنن
١٩٦ھ	وکیع بن الجراح	کتاب السنن
١٦٧ھ	حماد بن سلمہ	کتاب السنن
١٦١ھ	سفیان الثوری	جامع
١٩٨ھ	سفیان بن عیینہ	جامع
١٥٣ھ	معمر بن راشد	جامع
١٨٩ھ	محمد بن الحسن الشیبانی	کتاب الآثار
١٨٢ھ	عبداللہ بن المبارک	کتاب الجہاد
١٨٢ھ	قاضی ابو یوسف	کتاب الذکر والدعاء
١٥٣ھ	محمد بن اسحاق	کتاب السیرت
١٤١ھ	موسیٰ بن عقبہ	المغازی
١٨٧ھ	المعتمر بن سلیمان	المغازی

ان کے علاوہ ابن الندیم نے جن مؤلفین کی نشاندہی کی ہے ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔

١٥٩ھ	محمد بن عبدالرحمن ابن ابی ذئب	کتاب السنن
١٧٠ھ	عبدالرحمن بن زید بن اسلم	کتاب الناسخ والمنسوخ
١٧٦ھ	عبدالملک بن محمد بن ابی بکر الانصاری	کتاب المغازی
١٩٥ھ	محمد بن الفضل بن غزوان	کتاب السنن
١١٦ھ	اسماعیل بن علیہ	کتاب التفسیر
١٥٩ھ	عبدالرحمن الاوزاعی	کتاب السنن

۱۹۴ھ	الولید بن مسلم القرشی	کتاب السنن
۱۹۵ھ	اسحاق الازرق	کتاب القرأت
۱۶۳ھ	ابراہیم بن طہمان	کتاب السنن کتاب التفسیر

الغرض اس دوسری صدی میں علم حدیث میں بکثرت تصانیف مدون ہو کر عالم اسلامی میں پھیل چکی تھیں اور امام اعظمؒ، امام مالکؒ کے تلامذہ نے تمام عالم اسلامی کو فقہ و حدیث سے معمور کر دیا تھا۔ اسی صدی میں فقہ حنفی اور مالک کی تدوین ان احادیث و آثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جن پر فقہاء صحابہ و تابعین اور ارباب فتویٰ کا عمل درآمد چلا آرہا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

اور جو شخص کہ ان مذاہب کے اصول پر مطلع ہے وہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کرے گا۔ کہ ان مذاہب کی اصل فاروق اعظمؓ کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان مذاہب میں ایک امر مشترک ہے اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہاء صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ ہیں۔ اور کبار تابعین فقہاء سبعہ اور صغار تابعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالکؒ کے مذہب کی بنیاد ہے اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اکثر حالات میں اعتماد اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب روایت کرتے اور مانتے ہوں اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابوحنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے۔

مصنفین اور تلامذہ امام اعظمؒ:

آپ اس صدی میں علم حدیث پر مصنفین کے حالات رجال کی کتابوں میں پڑھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں بیشتر امام اعظمؒ کے تلامذہ ہیں یا پھر وہ ہیں جو امام اعظمؒ کے

(۱) قرۃ العین: ص ۱۷۱

علمی جلال سے بیحد متاثر ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں امام اعظمؒ کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ہر جگہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے کتاب التعلیم کے حوالہ سے امام اعظمؒ کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے اور امام حافظ الدین محمد بن محمد الکردری نے امام اعظمؒ کے خاص تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد من روی عنه الحدیث و الفقه۔ کا عنوان قائم کر کے ان کا شہروار تذکرہ کیا ہے۔ ان شہروں کو آپ دیئے ہوئے نقشہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

امام طحاوی نے ان چار ہزار میں سے چالیس کو مدونین اور مصنفین کتب میں شمار کیا ہے حافظ عبدالقادر نے اسد بن عمرو کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

كان من اصحاب ابى حنيفة اللذين دونوا الكتب اربعين رجلاً۔(۱)

اصحاب ابوحنیفہ میں جو ارباب تصنیف ہیں ان کی تعداد چالیس ہے۔

اسد بن عمرو کا بھی شمار ان چالیس میں ہے ان کے بارے میں حافظ ابونعیم کی تصریح ہے کہ:

اول من كتب كتب ابى حنيفة اسد بن عمرو ۔(۲) حافظ ابوجعفر طحاوی نے چالیس کی جو تعداد متصل اسد بن الفرات (۳) کے حوالہ سے بتائی ہے ان میں سے قاضی ابو یوسف[۱]، امام محمد،[۲] امام زفر،[۳] وکیع بن الجراح،[۴] یحیٰی بن زکریا[۵] اور [۶] عبداللہ بن المبارک کے بارے میں تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ ارباب تصنیف ہیں۔ باقی کے حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ آپ کو امام اعظمؒ اور علم الشرائع میں ملے گا۔ یہ اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے سر دست صرف ان کے اسمائے گرامی پیش کرتا ہوں:

---

(۱) الجواہر المضیئۃ: ج ۱ ص ۱۴۰ (۲) العبر: ج ۲ ص ۴۳۰

(۳) یہ بزرگ قیروان کے مشہور قاضی ہیں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے دوران درس پوچھتے بہت زیادہ تھے امام مالک نے ان کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا کوفہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد سے استفادہ کیا۔ علامہ ابو اسحاق الشیر ازی نے طبقات الفقہاء میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ موصوف مصر تشریف لے گئے اور مالکی مذہب کے ترجمان عبداللہ بن وہب کی خدمت میں حاضر ہوئے ﴿باقی صفحہ ۵۰۳ پر﴾

[۷] امام داؤد بن نصیر الطائی ۱۶۰ھ [۸] امام حفص بن غیاث ۱۹۴ھ [۹] امام یوسف بن خالد التیمی ۱۸۰ھ [۱۰] امام عافیہ بن یزید ۱۸۰ھ [۱۱] امام حبان بن علی ۱۷۰ھ [۱۲] امام مندل بن علی ۱۶۸ھ [۱۳] امام علی بن مسہر ۱۸۰ھ [۱۴] امام القاسم بن معن ۱۷۵ھ امام [۱۵] اسد بن عمرو ۱۹۹ھ [۱۶] امام فضل بن موسیٰ السینانی ۱۹۰ھ [۱۷] امام علی بن ظبیان ۱۹۲ھ [۱۸] امام ہشام بن یوسف ۱۹۷ھ [۱۹] امام یحییٰ بن سعید القطان ۱۹۸ھ [۲۰] امام شعیب بن اسحاق دمشقی ۱۹۸ھ [۲۱] امام حفص بن عبدالرحمٰن بلخی ۱۹۹ھ [۲۲] امام حکم بن عبداللہ بلخی ۱۹۹ھ [۲۳] امام خالد بن سلیمان بلخی ۱۹۹ھ [۲۴] امام عبدالحمید بن عبدالرحمٰن ۲۰۲ھ [۲۵] امام ابو عاصم ضحاک بن مخلد ۲۱۲ھ [۲۶] امام مکی بن ابراہیم ۲۱۵ھ امام حماد بن دلیل ــــھ [۲۸] امام عبداللہ بن ادریس ــــھ [۲۹] امام فضیل بن عیاض ۱۸۷ھ [۳۰] امام ہشیم بن بشیر ۱۸۳ھ [۳۱] امام نوح بن دراج الجامع ۱۸۳ھ [۳۲] امام زہیر بن معاویہ ۱۷۵ھ [۳۳] امام شریک بن عبداللہ قاضی ــــھ [۳۴] امام نضر بن عبدالکریم ۱۶۹ھ [۳۵] امام مالک بن مغول ۱۵۹ھ [۳۶] امام جریر بن خازم ۱۷۰ھ [۳۷] امام جریر بن عبدالحمید ۱۷۰ھ [۳۸] امام الحسن بن زیاد ۲۰۴ھ [۳۹] امام حماد بن ابی حنیفہ ۱۷۶ھ [۴۰] امام ابو عصمہ نوح بن مریم ۱۷۳ھ۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں علم حدیث کی کتابی خدمت کی گئی ہے۔ اور اس خدمت کا فرض امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے تلامذہ نے انجام دیا ہے۔ تیسری صدی میں آنے والے محدثین بخاری و مسلم دیگر ارباب سنن اور مسانید نے ان ہی سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

﴿بقیہ صفحہ ۵۰۲﴾ اور عرض کیا کہ ھذہ کتب ابی حنیفۃ یہ امام اعظمؒ کی کتابیں ہیں مجھے کچھ سوالات کے جوابات مذہب مالک کے مطابق درکار ہیں۔ ابن وہب طرح دے گئے وہاں سے ابن القاسم کے پاس آئے اور پھر قیروان واپس آ گئے۔ لکھا ہے کہ قیروان میں ابو حنیفہ کی کتابوں کے صدقے ہی ان کو علمی جلال ملا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی ایک نقل ابن القاسم کی درخواست پر موصوف نے ابن القاسم کو بھی دے۔ (الانتقاء: ص ۵۰)

تیسری صدی میں علم حدیث:

کتاب الآثار سے پہلے پہلی صدی میں جس قدر صحیفے اور مجموعے تیار ہوئے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے تفسیر' سیرت' مناقب' احکام' معازی سب قسم کی حدیثوں کو یکجا کرنے اور سمیٹنے کی کوشش کی اور اس کوشش کا اولین سہرا یقیناً ان کے سر ہے۔ امام شعبی نے بے شک حسب تصریح حافظ سیوطی بعض مضامین کی حدیثوں کو ایک ہی باب کے تحت لکھا تھا لیکن یہ کوشش بالکل ابتدائی تھی۔ اس لیے احادیث کو کتابوں اور بابوں پر پوری طرح مرتب کرنے کا کام ابھی باقی تھا جسے امام اعظم نے کتاب الآثار تصنیف کر کے نہایت خوش اسلوبی سے مکمل فرمایا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ترتیب وتبویب کی ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ نیز دوسری صدی تک حدیث وفقہ یک جا تھے اور احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور فتاویٰ سے بھی استدلال کیا جاتا تھا۔ مسند ومرسل اور صحیح وحسن کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ چنانچہ اسی اساس پر دوسری صدی میں ساری کتابیں مرتب ہو کر منصۂ صحافت پر آئیں۔

علم حدیث میں کثرت طرق:

تیسری صدی میں علم حدیث کو فنی ترقی ہوئی اور اس فن کے ایک سے زیادہ شعبے رونما ہو گئے۔ محدثین نے طلب حدیث میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں میں پہنچ کر تاریخ سنت کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا ایک ایک حدیث کے لیے ایک سے زیادہ سندیں تلاش کیں تاآنکہ فن کے لحاظ سے وہ حافظ حدیث فن حدیث میں یتیم شمار ہونے لگا جسے ایک حدیث کم از کم سو سندوں سے معلوم نہ ہو۔ چنانچہ ابو اسحاق جوہری جو امام مسلم اور دوسرے محدثین صحاح کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

کل حدیث لا یکون عندی من مائة طرق فانا فیه یتیم۔

حدیث اگر میرے پاس سو طریقوں سے نہ ہو تو میں حدیث میں یتیم ہوں۔(۱)

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے الروض الباسم میں بعض حفاظ حدیث کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ واقع میں ابو بکر صدیق کی حدیثیں تو پچاس سے زیادہ نہیں ہیں مگر حفاظ حدیث

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۹

کے پاس ابوبکر کی حدیثوں پر مشتمل ضخیم کتاب دیکھ کر ان سے دریافت کیا گیا کہ ابوبکر کی حدیثیں تو زیادہ سے زیادہ پچاس ہیں مگر یہ کتاب مسند ابی بکر کے نام سے کیسی ہے انہوں نے فرمایا کہ ایک حدیث مجھے کم از کم سو طریقوں سے دستیاب نہ ہو تو اپنے آپ کو حدیث میں یتیم سمجھتا ہوں۔ دوسری صدی کے مؤلفین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تبع تابعین کے شاگرد تھے بدیں وجہ ان کے یہاں کثرت طرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور امام اعظمؒ نے زمانہ صحابہ پایہ ہے اس لیے ان کی ذات کے بارے میں طرق واسانید کی بہتات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کثرت طرق کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسری صدی میں یک ایک شخص حفظ حدیث میں ترقی کے آخری مقام پر پہنچ گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مسند کو سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے اما ابوزرعہ رازی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کو ایک کروڑ حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میں نے ایک کروڑ حدیثیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث زبانی یاد ہیں۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ میں نے صحیح تین لاکھ حدیثوں سے لکھی ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں اور سنن اسی کا انتخاب ہے۔ امام نے مدخل میں لکھا ہے کہ ایک ایک حافظ پانچ لاکھ حدیثیں یاد رکھتا تھا۔ ابوبکر محمد بن عمر رازی کہتے ہیں کہ حافظ ابوزرعہ رازی کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔(۱)

محدثین وحفاظ کے مراتب:

کثرت طرق کی وجہ سے علم حدیث میں حدیث کے فن کاروں کے مراتب قائم ہوئے مسند، شیخ، حافظ، محدث، حجۃ اور حاکم کی اصطلاحیں رونما ہو گئیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے منظومہ علم الاثر میں، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں اس پر بحث فرمائی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین میں یہ مراتب نہ تھے ان کے یہاں محدث اور حافظ کو ایک ہی معنے میں بولتے تھے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۱۲

قد کان السلف یطلقون المحدث و الحافظ لمعنی ۔(۱)

سلف کے نزدیک محدث اور حافظ کے ایک ہی معنے تھے۔

تیسری صدی میں المحدیث' صاحب حدیث یا محدث اس وقت تک کسی کو نہ کہا جاتا جب تک بیس ہزار حدیثیں قلم بند نہ کرے چنانچہ حافظ ابوسعد اسحاقی نے حافظ ابوزرعہ الرازی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

جو شخص بیس ہزار احادیث نہیں لکھتا اس کا شمار اہل حدیث میں نہیں ہو سکتا۔

جب کہ تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے صرف حفظ حدیث ہی کافی تھا چنانچہ ہشیم بن بشیر امام احمدؒ کے استاد فرماتے ہیں: جو شخص حفظ حدیث نہیں کرتا وہ ہرگز محدث نہیں ہے۔(۲)

بلآخر ترقی کر کے تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے اہل حق سے ہونے کی گرفت بھی ڈھیلی کر دی گئی اور اہل حدیث صرف فن کاروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔حتیٰ کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے اعلان کر دیا کہ:

ھؤلاء ھم اھل الحدیث من ای ملھب کانوا و کذالک اھل العربیۃ واھل اللغۃ فان اھل کل فن ھم اھل المعرفۃ فیہ۔

خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں المحدیث ہیں جیسے اہل لغت اور اہل عربیت اہل فن وہ ہی کہلاتے ہیں جو اس میں فنکار ہوں۔(۳)

جب کہ دوسری صدی کے مؤلفین احادیث لینے میں تدین کو پیش نظر رکھتے تھے۔

امام مسلم نے مقدمہ میں سید التابعین' امام ابن سیرینؒ کے بارے میں بتایا ہے کہ:

یہ علم دین ہے یہ دیکھو کہ لے کس سے رہے ہو اپنا دین۔

امام بیہقی نے ابراہیم نخعی کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

ہمارے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی سے حدیث لینی ہوتی تو اس کے اخلاق دیکھتے' اس کی نماز دیکھتے' اس کے احوال کی چھان بین کرتے پھر اس سے حدیث لیتے۔(۴)

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۸　(۲) تدریب

(۳) الروض الباسم: ص ۱۲۲　(۴) التعلیق علی توضیح الافکار: ج ۲ ص ۱۱۵

حدیث میں مؤلفات کا توسع:

علم حدیث کی اسی پہنائی اور وسعت کا تصنیف و تالیف پر بھی تیسری صدی میں اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں جوامع اور سنن کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بے شمار انواع و اقسام منصۂ صحافت پر آ گئیں مثلاً:

مسانید' مصنفات' صحاح' مستخرجات' اجزاء' معاجم' طبقات' موضوعات' مشکلات' العلل' العوالی' الاطراف' الزوائد' تخریجات' الافراد' الغرائب وغیرہ وغیرہ۔

دوسری صدی کے مؤلفین چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین کے فیض یافتہ تھے اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت پیش آئی تھی لیکن تیسری صدی میں اسنادی وسائط پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اس لیے تیسری صدی میں محدثین کو اس سلسلے میں ایک نئے زیادہ فتون سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جمع روایات' تنقید احادیث اور اصول روایت کے سلسلے میں بہت سی ایسی نئی چیزیں پیدا ہو گئیں جن کی بناء پر اس دور کے مصنفین کو حدیث کی تدوین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کرنی پڑی اور تصنیف و تالیف میں یہ گوناگوں انواع و اقسام رونما ہوئے۔

علم حدیث میں مسانید کی تالیف:

سب سے پہلے تیسری صدی کے مؤلفین نے حدیث کو آثار صحابہ سے علیحدہ کر کے مسند حدیثیں جمع کیں۔ ہر راوی کی تمام پریشان اور غیر مرتب روایات کو یکجا کیا اور اس طرح مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تیسری صدی کے مشاہیر محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

تا آنکہ کچھ ائمہ کی یہ رائے ہوئی کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل طور پر علیحدہ کیا جائے اور یہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوا چنانچہ عبید اللہ بن موسیٰ کوفی' مسدد بن مسرہد بصری' اسد بن موسیٰ اموری اور نعیم بن حماد خزاعی نے ایک ایک مسند تصنیف کی۔ دوسرے ائمہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے اور حفاظ حدیث میں

مشکل ہی سے کوئی امام ہوگا کہ جس نے اپنی احادیث کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور عثمان بن ابی شیبہؒ اور ان جیسے دیگر اکابر نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور بعض محدثین نے جیسے ابوبکر بن ابی شیبہ ابواب و مسانید دونوں عنوانوں پر کتابیں لکھیں۔(۱)

امام حاکم المدخل میں رقمطراز ہیں:

یہ مسانید جو اسلام میں تصنیف ہوئے ہیں صحابہ کی مرویات ہیں ان کا سلسلہ سند معتبر اور مجروح ہر قسم کے راویوں پر مشتمل ہے مثلاً مسند عبید اللہ بن موسیٰ اور مسند ابی داؤد طیالسی۔ یہ دونوں پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے مسانید لکھی ہیں ان دونوں کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، زہیر بن حرب اور عبید اللہ بن عمر قواریری نے مسانید ترتیب دیئے۔ بعد ازیں کثرت سے تراجم رجال پر مسانید مرتب ہوئے اور ان سب کے جمع کرنے میں صحیح وسقیم کے امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔(۲)

علامہ محمد بن اسماعیل یمانی نے مسند کی یہ تعریف کی ہے کہ:

ان یذکر فیہ ماورد عن ذالک الصحابی جمیعہ فیجمع الضعیف وغیرہ۔(۳)

الکتانی نے جو مسند کی تعریف فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے:

وہ کتابیں جن کا موضوع صرف یہ ہے کہ ہر صحابی کی حدیثوں کو الگ الگ بیان کیا جائے چاہے یہ صحیح ہوں یا ضعیف، ان کی ترتیب اسماء صحابہ میں حروف ہجاء کے مطابق ہوتی ہے۔(۴)

گویا مصنفین مسانید کا پیش نہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے تمام منتشر ذخیرے کو یکجا کر دیا جائے اور ایک صحابی کی جس قدر روایتیں مل سکتی ہیں ان کو سمیٹ دیا جائے اور چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر راوی کی ہر روایت صحیح سند سے منقول ہو اس لیے جس سند سے اور جس طریقے سے بھی وہ روایت مصنف کو پہنچی وہ اسے باسند درج کر دیتا ہے۔ بدیں وجہ صرف

---

(۱) الہدی الساری مقدمہ فتح الباری: ص ۵)
(۲) مدخل: ص ۴
(۳) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۲۲۶)
(۴) الرسالۃ المستطرفۃ: ص ۵۴

صحیح روایات کی یکجائی ان کے موضوع سے خارج اور ان کی شرط تصنیف کے منافی ہے کیونکہ ان کی شرط تو صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک صحابی کے نام سے تمام کچا پکا' صحیح اور غیر صحیح 'قوی وغیر قوی' قابل قبول اور نا قابل قبول سرمایہ ہر طرف سے تلاش اور جستجو کے بعد فراہم کر دیا جائے تا کہ کوئی روایت مدون ہونے سے رہ نہ جائے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

وشرط اهلها ان يفردوا حديث كل صحابي علىحدة من غير نظر الى الابواب و يستقصون جميع حديث ذالك الصحابي كله سواء من يحتج به ام لا فالقصد هم حصر جميع ماروى عنه۔(۱)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اہل مسانید کے پیش نظر ہر قسم کے سرمایہ کی فراہمی ہوتی ہے شاید آپ خلش محسوس کریں کہ اس فراہمی سے ان بزرگوں کا مقصد کیا تھا وہ ایسا کیوں کر رہے تھے؟

دراصل ان بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ سارا ذخیرہ یکجا ہو کر آ جائے گا تو اہل فن اصول تنقید اور قواعد روایت کے مطابق ان تمام روایات کی جانچ پڑتال کر کے ہر روایت کے بارے میں رائے قائم کر سکیں اور ساتھ ہی ایک ایک حدیث کے لیے طرق واسانید کا بیش بہا ذخیرہ جمع ہو کر حدیث کے روایتی اسنادی استحکام کا ذریعہ ہو جائے۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

هذه المسانيد الكبار التي يذكر فيها طرق الاحاديث۔(۲)

ان مسانید سے حدیث کے طرق اور اسانید کا علم ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث اگر متعدد صحیح طرق سے آئی ہے تو وہ روایتی نقطہ نظر سے قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے اور اگر ضعیف طرق و اسانید سے بھی آئے تو یہ ضعیف طرق صحیح حدیث کے لیے توابع اور شواہد کا کام دیتے ہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں:

مالها من المتابعات والشواهد۔

اس دور میں اگر مسانید بہت لکھے گئے ہیں مگر ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مؤلفین کا ذکر کرتے ہیں:

---

(۱) تنقیح الانظار: ج اص ۲۲۸ (۲) تنقیح الانظار: ج اص ۲۳۰

۲۰۴ھ	مسند امام ابی داؤد طیالسی	۲۲۳ھ	مسند مسدد بن مسرہد
۲۱۳ھ	مسند عبید اللہ بن موسیٰ کوفی	۲۲۶ھ	مسند ابی جعفر عبد اللہ بن محمد
۲۲۸ھ	مسند یحییٰ بن عبد الحمید حمانی کوفی	۲۲۷ھ	مسند ابی جعفر محمد بن عبد اللہ کوفی
۲۳۹ھ	مسند ابی اسحاق ابراہیم بن سعید	۲۵۲ھ	مسند ابی یعقوب التنوخی
۲۵۱ھ	مسند ابی الحسن علی بن الحسن	۲۴۲ھ	مسند ابی الحسن محمد بن مسلم
۲۹۴ھ	مسند ابی زرعہ رازی	۲۶۷ھ	مسند ابی یاسر عمار بن رجاء
۲۶۵ھ	مسند ابی بکر احمد بن منصور	۲۸۰ھ	مسند ابی سعید عثمان بن سعید
۲۸۶ھ	مسند ابی الحسن علی بن عبد العزیز	۲۹۰ھ	مسند ابی عبد الرحمٰن نعیم بن الطوسی
۲۳۸ھ	مسند ابی یعقوب اسحاق بن ابراہیم	۲۴۳ھ	مسند ابی جعفر احمد بن منیع
۲۸۲ھ	مسند ابی الحارث بن محمد	۲۳۹ھ	مسند ابی الحسن عثمان بن محمد
۲۴۳ھ	مسند ابی عبد اللہ محمد بن یحییٰ	۲۴۹ھ	مسند عبد بن حمید
۲۱۹ھ	مسند ابی بکر عبد اللہ بن الزبیر	۲۱۲ھ	مسند محمد بن یوسف الفریابی
۲۵۸ھ	مسند احمد بن سنان	۲۲۶ھ	مسند الحسین بن داؤد التمیمی
۲۹۲ھ	مسند ابی بکر احمد بن عمرو المصری	۲۷۶ھ	مسند احمد بن حازم
۲۷۲ھ	مسند احمد بن مہدی الاصفہانی	۲۵۱ھ	مسند اسحاق بن منصور نیشاپوری
۲۷۳ھ	مسند محمد بن ابراہیم بن مسلم	۲۵۲ھ	مسند یعقوب بن ابراہیم الاواتی
۲۷۷ھ	مسند محمد بن الحسن ابی عبد اللہ	۲۶۲ھ	مسند یعقوب بن شیبہ بصری
۲۸۸ھ	مسند ابراہیم بن اسماعیل	۲۸۹ھ	مسند الحسین بن محمد نیشاپوری
۲۹۲ھ	مسند احمد بن علی المروزی	۲۹۵ھ	مسند ابراہیم بن معقل نسفی
۲۴۱ھ	مسند احمد بن حنبل	۲۷۶ھ	مسند بقی بن مخلد

مسانید میں اولیت:

ان تمام مسانید میں تاریخی طور پر اگر چہ اولیت کا مرتبہ جیسا کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ:

اول من صنف المسانيد على تراجم الرجال في الاسلام عبدالله بن موسىٰ العبسي وابو داؤد الطيالسي۔(۱)

عبید اللہ بن موسیٰ کوفی کے مسند کو اولیت حاصل ہے کیونکہ مسند طیالسی درحقیقت ابوداؤد طیالسی کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے جامع خراسان کے کچھ محدثین ہیں سامیر یمانی فرماتے ہیں کہ اس کی حیثیت مسند شافعی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ علامہ بنانی کہتے ہیں کہ مسند طیالسی کو جن بزرگوں نے اولی مسند قرار دیا ہے ان کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ مصنفین مسانید میں زمانی لحاظ سے ابوداؤد کا زمانہ سب سے پہلے ہے اور یہ مسند ابوداؤد کی تصنیف ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ:

انه ليس من تصنيف ابي داؤد انما جمعه بعض الحفاظ الخراسانيين۔(۲)

یعنی یہ امام ابو داؤد کی تصنیف نہیں بلکہ بعض خراسانی محدثین نے بعد میں یہ کام انجام دیا ہے۔ اور عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں محدثین کی تصریح کہ مسند خود ان کا تصنیف کردہ ہے۔ عبید اللہ پر تشیع کی تہمت ہے۔ ابو داؤد نے ان کو شیعہ لکھا ہے۔ الذہبی نے العابد میں کبار علماء الشیعہ سے ان کا چہرہ شروع کیا ہے مگر یاد رہے کہ اس دور میں شیعہ ہونے کا مفہوم آج کے مطابق نہ تھا۔ اس دور میں شیعہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہوتا تھا کہ حضرت علی کو باقی صحابہ پر مقدم کیا جائے چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ:

التشيع و هو تقديم علي على الصحابة رضي الله عنهم اجمعين۔(۳)

اور شیعہ محترق یا غالی ہونے کا مطلب دوسری صدی میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ بتایا ہے کہ:

الشيعي الغالي في زمان السلف و عرفهم هو من تكلم في عثمان والزبير و طلحة وطائفة ممن حارب علياً و تعرض بسبهم۔(۴)

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ: ص۵۲
(۲) توضیح الافکار: ص۳۲۹
(۳) تدریب الراوی: ص۲۱۹
(۴) لسان المیزان: ج۱ص۱۰

اس لیے عبید اللہ بن موسیٰ کا تشیع بھی اس دور میں اس نوع کا تھا۔ ان کو امام اعظمؒ سے استفادے کا بھی موقع ملا ہے۔ چنانچہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو دوسرے محدثین کے ساتھ امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔(۱)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر تبویب حدیث اور تدوین شرائع میں اولیت کا سہرا امام اعظمؒ کے سر ہے ایسے ہی مسانید کی اولیت کا شرف بھی بواسطہ عبید اللہ بن موسیٰ امام اعظمؒ کو ہی حاصل ہے۔ عبید اللہ بن موسیٰ ایک طرف اگر امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے ہیں تو دوسری طرف امام بخاری رحمہ اللہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں عبید اللہ بن موسیٰ کو امام بخاری کے اساتذہ کے پانچ طبقوں میں سے اولین طبقہ میں شمار کیا ہے اس طبقے میں امام بخاری کے اساتذہ یہ ہیں: محمد بن عبداللہ انصاری، مکی بن ابراہیمؒ ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابو نعیمؒ خلاد بن یحییٰ، علی بن عیاش اور عصام بن خالد ...... اور لکھا ہے: شیوخ هؤلاء کلهم من التابعین ان کے اساتذہ تابعین ہیں۔(۲)

مسند امام احمد بن حنبلؒ کی عظمت:

اگر چہ تاریخی لحاظ سے اقدمیت عبید اللہ بن موسیٰ کو حاصل ہے لیکن اس صدی کے تمام مسانید میں جو شرف اور بلندی مسند امام احمد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں امام موصوف نے جمع و ترتیب کا کام ۱۸۰ھ میں شروع کیا تھا چنانچہ المنہج میں ہے:

۱۸۰ھ میں مسند کا کام شروع ہوا تھا۔(ص:۲۱)

اس کی تالیف کا پس منظر خود امام نے یہ بتایا ہے کہ اگر علماء میں کبھی کسی حدیث میں اختلاف ہو تو یہ کتاب یعنی مسند احمد اس روایت کے استناد و عدم استناد میں دستاویز کا کام دے سکے چنانچہ امام ممدوح کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کا بیان ہے:

میں نے اپنے والد احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے کیوں منع کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے آپ نے جواب میں فرمایا: یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے جب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۵۹ (۲) الہدی الساری: ص ۵۶۵

کے سلسلے میں لوگوں میں کوئی اختلاف رونما ہوگا وہ اس کی طرف رجوع کریں گے۔(۱)

اور آپ کے برادرزادے حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ:

ہم سے امام احمد نے فرمایا کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ روایتوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تم اس کتاب کی طرف رجوع کرو اگر اس میں وہ روایت مل جائے تو فبہا ورنہ وہ حجت نہیں۔(۲)

اگرچہ مسند کی تالیف کا کام ۱۸۰ھ میں شروع ہوا ہے لیکن امام موصوف اس کی جمع و ترتیب کا کام ساری زندگی کرتے رہے اور یہ کام کچھ اس قدر انہماک کے ساتھ کیا کہ اس کی تبویب، تنظیم اور ترتیب کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ان کے پیش نظر صرف جمع و تدوین تھی اس کی خاطر انہوں نے پوری زندگی کے شب و روز صرف کر دیئے۔ مسودات کی صورت میں اوراق متفرقہ کا یہ مجموعہ ان کے پاس موجود تھا اور ابھی تشنۂ تکمیل تھا کہ امام ممدوح کو سفر آخرت پیش آ گیا۔ حافظ ابوالخیر شمس الدین جزری المصعد الاحمد فی ختم مسند الامام احمد میں فرماتے ہیں:

امام احمد نے مسند کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا اسے ورقوں میں الگ الگ لکھا پھر اسے جدا جدا اجزاء میں تقسیم کیا تا آنکہ اس نے ایک مسودے کی صورت اختیار کر لی۔ بعد ازیں تکمیل سے پہلے ہی پیام موت آ گیا۔ انہوں نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تنقیح و تہذیب پوری ہوتی آپ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور مسودہ جوں کا توں رہا۔ پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد نے روایات کے مشابہ اور مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیئے۔(۳)

---

(۱) خصائص المسند از حافظ مدینی: ص ۸ (۲) مناقب احمد از ابن الجوزی: ص ۱۹۱

(۳) مقدمہ مسند

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند احمد صرف امام کی محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کے اضافے بھی ہیں۔ اگرچہ جو کچھ اضافہ ہے اس کا اکثر حصہ عبداللہ بن احمد نے امام احمد ہی سے سنا ہے لیکن یہ وہ حصہ ہے جسے مسند کا املا کراتے وقت امام احمد املا نہیں کرا سکے۔ امام عبداللہ بن احمد کی جلالت شان کا اندازہ کرنا ہو تو طبقات میں ابن یعلیٰ کی یہ شہادت پڑھیے:

صالح اپنے والد امام احمد سے بہت کم لکھتے ہیں لیکن عبداللہ نے اپنے والد سے اتنی زیادہ روایت کی ہے کہ دنیا میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا انہوں نے مسند، تفسیر، ناسخ و منسوخ، تاریخ حدیث، آیات کتاب اللہ کی تقدیم و تاخیر، جوابات قرآن اور مناسک کبیر و صغیر کا علم حاصل کیا اس کے علاوہ دوسری مصنفات اور حدیث شیوخ کا مطالعہ کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکابر شیوخ عبداللہ کی معرفت رجال اور معرفت علل کو مانتے ہیں عبداللہ طلب حدیث میں ہمیشہ سرگرم رہے غرض سلف سے خلف تک عبداللہ کے علم و فضل اور جلالت شان کا سب کو یکساں اقرار ہے۔(۱)

مسند کا موجودہ نسخہ امام موصوف کے صاحبزادے عبداللہ ہی کا ترتیب دادہ ہے اس میں انہوں نے اپنے والد کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو ایک خاص طریق پر یکجا کیا ہے۔ عبداللہ کے بعد کچھ محدثین نے اس ترتیب کو بدلنے کی خواہش کی ہے۔ عبداللہ کی ترتیب پر حافظ ذہبی تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اگر امام عبداللہ مسند کو صحیح مرتب کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ شاید اللہ سبحانہ اپنے کسی بندے کو توفیق دے کہ وہ اس کی خدمت کرے اس پر عنوان قائم کرے اور اس کے رجال پر بحث کرے اس کی وضع و ہیئت بدل دے اس مجموعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا کثیر حصہ موجود ہے اور بہت کم ایسا ہے کہ صحیح حدیث تو ہو لیکن اس مجموعہ میں نہ ہو۔ البتہ حسان کا استیعاب اس میں نہیں ہے گو اکثر یہ بھی موجود ہیں۔ باقی غریب اور ضعیف روایات تو ان کی مشہور روایتیں اس میں موجود

(۱) طبقات الحنابلہ: ص ۱۳۲

ہیں۔ ہاں ان حدیثوں کا بڑا حصہ چھوڑ دیا ہے جو سنن اربعہ اور معجم طبرانی وغیرہ میں موجود ہے۔(۱)

باوجودیکہ اس میں جیسا کہ حافظ شمس الدین الحسینی نے "التذکرہ برجال العشرہ" میں تصریح کی ہے چالیس ہزار حدیثیں آ گئی ہیں پھر بھی احادیث صحیحہ کی بہت بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

امام احمد سے اس کتاب میں بہت سی صحیح حدیثیں چھوٹ گئی ہیں باوجودیکہ کوئی اور مسند کثرت احادیث اور حسن ادا میں اس کے ہم پلہ نہیں ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جماعت صحابہ میں دوسو کے قریب ایسے حضرات کی روایتیں اس میں موجود نہیں کہ جن سے صحیحین میں احادیث آئی ہیں۔(۲)

کیا مسند میں موضوع احادیث بھی ہیں؟

یہ سوال بھی ارباب تحقیق کے یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر محدثین اور محققین نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ عراقی کو اس پر اصرار ہے کہ مسند میں بہت سی حدیثیں ضعیف ہیں اور موضوع بھی ہیں لیکن موضوع کم ہیں۔ حافظ عراقی نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں ان حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جن کے بارے میں اہل فن کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں موضوع ہیں۔ چنانچہ حافظ ابوموسیٰ المدینی نے ان میں سے بعض روایات کا خصائص المسند میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد فی الذب عن مسند احمد میں ان احادیث پر پیدا شدہ اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ مسند میں کوئی حدیث موضوع نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اسے تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسند میں کچھ حدیثیں ضعیف ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ امام احمد کی روایت کردہ کوئی حدیث مسند میں موضوع بھی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مسند میں روایت کی شرط انہوں نے یہ رکھی ہے کہ کسی ایسے راوی سے روایت نہیں لیں

---

(۱) مقدمۃ المسند: ص ۴۰ (۲) اختصار علوم الحدیث: ص ۷

جو دروغ گوئی میں ان کے یہاں معروف ہو وہاں ان کے صاحبزادے عبداللہ نے مسند میں کچھ اضافے کیے ہیں بعد ازیں عبداللہ کے شاگرد ابوبکر قطیعی نے بہت سی موضوع حدیثیں زیادہ کر دی ہیں۔ حقیقت حال سے ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ موضوع حدیثیں بھی امام احمد ہی کی روایت کردہ ہیں حالانکہ یہ خیال سراپا غلط ہے۔(۱)

علامہ ابن الجوزی نے ان لوگوں کی بڑی شدومد سے تردید کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مسند:

مسند میں تین یا چار حدیثوں کے سوا کوئی بے اصل یا موضوع نہیں ہے۔(۲)

علامہ ابن الجوزی نے ان لوگوں کی بڑی شدومد سے تردید کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مسند میں کوئی حدیث ضعیف نہیں ہے۔ پروفیسر محمد ابوزہرہ نے اپنی مشہور کتاب ''احمد بن حنبل'' میں ابن الجوزی کی کتاب صید الخاطر سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں فرماتے ہیں:

مجھ سے بعض اصحاب حدیث نے دریافت کیا کہ مسند میں کچھ حدیثیں ایسی ہیں جو صحیح نہیں ہیں میں نے کہا کہ وہاں میری یہ بات ان لوگوں پر گراں گذری جو مذہب حنبلی سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان لوگوں کی حرکت کو اس پر محمول کیا کہ یہ گروہ عوام ہے اور ان کی بات نا قابل التفات ہے۔ اسی دوران میں ان لوگوں نے فتوے لکھے میں ان کی اس حرکت پر بیحد حیران ہوا اور دل میں کہا کہ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اہل علم بھی عوام جیسی باتیں کرتے ہیں اور یہ بات صرف اس لیے ہے کہ انہوں نے حدیث کا نام تو سن لیا مگر ان کو صحیح اور سقیم کی پرکھ نہیں ہے۔

بہرحال اس موضوع پر علماء کی آراء مختلف ہیں اور یہ بات ہمیشہ سے بحث ونظر کا مرکز رہی ہے کہ مسند میں کوئی روایت موضوع موجود ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کا وہ فیصلہ پسند ہے جو انہوں نے اسی سے متعلق اپنی کتاب ''التوسل والوسیلہ'' میں درج کیا ہے۔

---

(۱) منہاج السنہ: ج ۴ص ۲۷ (۲) تعجیل المنفعۃ

اگر موضوع سے مراد یہ ہے کہ کسی کذاب راوی کی حدیث مسند میں ہے تو یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور اگر مقصود یہ ہے کہ حضور کی کوئی بات کسی ایسے راوی کی راہ سے آئی ہے جو غلط گو یا حافظہ کی کمی کا شکار ہے تو یہ بالکل درست ہے مسند اور سنن میں ایسی حدیثیں موجود ہیں۔(۱)

کچھ ہو لیکن مسند احمد کی خصوصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسند احمد دوسرے تمام مسانید سے زیادہ صحیح ہے۔ جیسا کہ حافظ نور الدین ہیثمی نے نہایۃ المقصد فی زوائد المسند میں تصریح کی ہے:

مسند احمد اصح صحیحاً من غیرہ

مسند احمد دوسرے مسندوں سے زیادہ صحیح ہے

اگرچہ مسند بقی بن مخلد مسند احمد سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کی رائے ہے کہ:

ومن اوسعها مسند بقی بن مخلد (۲)

مسانید میں سب سے وسیع مسند بقی بن مخلد ہے

اور اس کی وسعتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس میں تیرہ سو صحابہ سے زیادہ اکابر کی روایات کا ذخیرہ ہے۔(۳) اور اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ اولاً کتاب کو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور پھر ہر صحابی کی روایات کو بترتیب فقہی یکجا کیا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب مسند اور مصنف دونوں کا کام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مسند احمد جیسی اسے مقبولیت نہیں ہے بہرحال مسند احمد اس دور کے تمام مسانید میں اعلیٰ' اشرف اور احادیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے...... خیر یہ بات تو ایک ضمنی تھی کہ تیسری صدی میں سنن اور جوامع کے ساتھ مسانید بھی منصۂ صحافت پر آ گئے۔

آپ ان تمام مسانید کے مصنفین' ان کی تاریخ وفات' ان کے اوطان کو دیکھئے آپ

---

(۱) التوسل والوسیلہ (۲) توضیح الافکار: ص ۲۲۹

(۳) التعلیقات الاحمد محمد شاکر علیٰ اختصار علوم الحدیث: ص ۱۸۶

خود محسوس کریں گے کہ اس وقت کے تمام عالم اسلامی کے سارے شہروں میں حدیث کا چرچا عام ہو چکا ہے اور کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں حدیث نبوی نہ پہنچی ہو۔ ۲۹۵ھ میں اس صدی کا آخری مسند ہے۔ اس وقت کی اسلامی فتوحات کے نقشہ کو سامنے رکھ کر بتایئے۔ کون سی جگہ ہے جہاں ارشادات نبوت کو اپنایا نہ گیا ہو۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب امام اعظمؒ کے تلامذہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ:

روی عنه من المحدثین والفقهاء عدة لا یحصون۔

اگر آپ تاریخ میں ان اکابر ارباب مسانید کے علمی نسب ناموں کو تلاش کریں گے تو آپ کو ان کے علمی رشتے امام اعظمؒ سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ عبیداللہ بن موسیٰ کے بارے میں آپ سن چکے ہیں۔

امام احمد بن حنبل جو رئیس المحدثین ہیں۔ ان کے بارے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں ان کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست دی ہے اور ان میں امام ہشیم بن بشیر' امام جریر بن عبدالحمید' امام عبداد بن العوام' یحییٰ بن ابی زائدہ' قاضی ابو یوسف' وکیع بن الجراح' یزید بن ہارون اور عبدالرزاق کا نام نمایاں طور پر لیا ہے اور ان سب کے متعلق امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شہادت دی ہے کہ یہ سب کے سب امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ امام وکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ کوفہ میں اس جیسا نوجوان کوئی نہیں آیا۔ یہی بات امام اعظمؒ کے دوسرے شاگرد حفص بن غیاث نے بھی کہی ہے۔ امام اعظمؒ کی مجلس تدوین کے رکن رکین اور تلمیذ یحییٰ القطان بھی امام احمد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ امام ذہبی نے ان کا اقرار بھی اس قسم کا نقل کیا ہے۔ الغرض ان ارباب مسانید میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہر ایک کا شجرہ علمی امام اعظمؒ سے ملتا ہے۔

علم حدیث میں مصنفات:

اس صدی میں مسانید کے ساتھ مصنفات بھی منصۂ صحافت پر آ گئے۔

مصنف سے مراد اصلاح محدثین میں وہ کتابیں ہیں جن میں احکام اور ان سے متعلق باتیں بترتیب فقہی یک جا ہوں۔ مصنف اور جامع میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جوامع وہ

کتابیں ہیں۔ جب میں عقائد' احکام رقاق' کھانے پینے' سفر' مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب تفسیر' تاریخ کے فتن اور مناقب کی روایات ہوں۔لیکن مصنف جس صرف وہ احادیث فقہ و احکام ہوتی ہیں جن کا تعلق شہری زندگی میں فقہ اور قانون سے ہے۔دوسری صدی میں سنن سے مصنف کا کام لیا جاتا تھا مگر تیسری صدی میں سنن کے ہی لیے مصنف کا نام وجود میں آ گیا۔ اگرچہ بعد کو سنن میں خصوص اور مصنف میں کچھ عموم سا آ گیا۔

تیسری صدی میں مصنف کے نام سے جو کتابیں وجود میں آئی ہیں وہ اگرچہ ہیں تو بہت مگر الکتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں دو کا ذکر کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاق ۲۱۱ھ:

یہ المصنف نامی ایک ضخیم تالیف دو جلدوں میں ہے اس کی ترتیب فقہی ہے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ یہ دور تابعین میں بھی ہے اور باتفاق محدثین اس کے مصنف کو تابعین سے شرف تلمذ حاصل ہے اس لیے اس میں اکثر احادیث ثلاثی ہیں یعنی ایسے نبوی ارشادات جو ان کو صرف تین ہی واسطوں سے معلوم ہوئے ہیں چنانچہ اتحاف النبلاء المتقین میں ہے:

اکثرش ثلاثی است۔(۱)

کتاب کے آخر میں شمائل نبوی ہیں اور شمائل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں پر ختم کیا گیا ہے۔اور آخری حدیث یہ ہے:

حدثنا معمر عن ثابت عن انس قال کان شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ انصاف اذنیہ۔(۲)

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان کتابوں میں ہے جو اسلام کے علمی سرمایہ میں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔اس کتاب کے مصنف عبدالرزاق بن ہمام الیمانی ہیں اور اس دور کی پیداوار ہیں جس کے بارے میں تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس دور والوں میں اتباع تابعین کو شرف قبول حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے:

---

(۱) اتحاف النبلاء: ص ۱۵۳ (۲) اتحاف: ۱۵۳)

ثم اتفقوا ان اخر من کان من اتباع التابعین ممن یقبل قوله عاش الیٰ حدود ۲۲۰ھ ثم ظهرت البدع۔(۱)

اس پر اتفاق ہے کہ اتباع تابعین سے آخری شخص جس کی بات قبول کی جاتی ہے ۲۰۰ھ تک زندہ رہا ہے بعدازیں بدعتوں کا ظہور ہوگیا۔

امام عبدالرزاق ہی صحیفہ ہمام بن منبہ کے اپنے استاد معمر بن راشد سے راوی ہیں۔ امام عبدالرزاق کے تلامذہ میں رئیس المحدثین امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ ہمام کا یہ صحیفہ بجنسہ آج بھی امام احمد کے مسند میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ ہمام اس صحیفے کے مصنف نہیں بلکہ اپنے استاد حضرت ابوہریرہؓ سے راوی ہیں اور ہمام سے اس کے راوی معمر اور معمر سے اس کے راوی ان کے شاگرد امام عبدالرزاق ہیں۔

امام عبدالرزاق نے صرف معمر بن راشد ہی سے کسب فیض نہیں کیا بلکہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ عبدالرزاق نے حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظمؒ کے سامنے بھی زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ عقود الجمان میں ہے کہ امام اعظمؒ کی خدمت میں زیادہ رہے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل احمد بن منصور مادی کا یہ بیان قلم بند کیا ہے کہ:

میں نے امام عبدالرزاق سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ بردبار کوئی نہیں دیکھا میں نے ان کو مسجد حرام میں ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ لوگوں کا ان کے اردگرد حلقہ ہوتا تھا سوالات کی بوچھاڑ ہوتی تھی ایک شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا آپ اس کو جواب دیتے آگے سے کوئی اعتراض کرتا کہ اس مسئلہ میں حسن بصری یوں فرماتے ہیں۔ ابوحنیفہ کہتے کہ حسن بصری سے غلطی ہوئی ہے عبداللہ بن مسعودؓ یہی فرماتے ہیں۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے اصل مسئلہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوحنیفہؒ میں ہم آہنگی ہے۔ بلکہ اصحاب عبداللہ کی بھی ان کو تائید حاصل ہوتی۔(۲)

---

(۱) فتح الباری: ج ۷ ص ۴ (۲) الانتقاء: ص ۱۳۵

ان کے مصنف کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنا ہو تو امام بخاری کی تاریخ کبیر میں یہ رائے پڑھئے کہ ان کی کتابیں حدیثیں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ امام بخاری نے صحیح میں ان سے بکثرت حدیثیں لی ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ سب سے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے یہ ان کے مصنف ہی سے امام بخاری کا استفادہ ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی کاوشوں سے معلوم ہوا ہے کہ مصنف عبدالرزاق کے مخطوط استنبول اور صنعاء میں کامل اور حیدر آباد دکن' ٹونک' حیدر آباد سندھ اور مدینہ منورہ میں ناقص ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اہل علم کو یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ:

عثمانیہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف اسے آج کل ایڈٹ کر رہے ہیں اور جنوبی افریقہ کے عالم اور علم دوست تاجر مولانا محمد موسیٰ اس کی اشاعت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔(۱)

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۳۵ھ:

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان چند بے مثال کتابوں میں ہے جو اسلام کا کارنامہ فخر خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی ابن ابی شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صاحب المصنف الذی لم یصنف احد مثله قط لا قبله و لا بعده۔

اس مصنف کے مصنف ہیں کہ اس جیسی کتاب نہ پہلے اور نہ بعد میں لکھی گئی ہے۔(۲)

حافظ ابن حزم نے اس کتاب کو عظمت کے لحاظ سے مؤطا امام مالک سے بھی مقدم رکھا ہے۔ چنانچہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کی جانب منسوب کر کے حدیث کی کتابوں کے جو ترتیبی مدارج لکھے ہیں اس میں انہوں نے مؤطا کو حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ کو درجہ ثانیہ کی کتابوں میں ظاہر کیا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق کو بھی اس کا ہم پلہ بتایا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں درجات کی اس تعیین میں ان کے پیش نظر صحت نہیں ہے بلکہ احادیث مرفوعہ کی زیادتی ہے چنانچہ درجہ اولی کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ خود فرماتے ہیں:

(۱) مقدمہ صحیفہ ہمام: ص ۵۶ (۲) البدایہ والنہایہ: ج ۱۰ ص ۳۱۵

هذا الكتب التي الورت لكلام رسول الله صلى الله عليه وسلم صرفا۔(۱)

ورنہ ظاہر ہے کہ از روئے صحت صحیحین' مسند طیالسی اور مسند ابن حنبل کو ایک صنف میں کون لا سکتا ہے۔اور معلوم ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں حدیث نبوی کے پہلو بہ پہلو صحابہ وتابعین کے اقوال وفتاوی کا ذخیرہ ہے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کے متعلق یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو سلف امت میں تلقی بالقبول کا درجہ ملا ہے یا نہیں اور دور صحابہ وتابعین میں اس پر عمل تھا کہ نہیں اور یہ اس کتاب کی وہ خاص فادی حیثیت ہے کہ جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہاء ومحدثین میں برابر متداول چلی آئی ہے۔صاحب کشف الظنون نے اس کا تعارف ہی اس حیثیت سے کرایا ہے وہ فرماتے ہیں:

هو كتاب كبير جد اجمع فيه فتاوى التابعين و اقوال الصحابة واحاديث الرسول صلى الله عليه وسلم على طريقة المحدثين بالاسانيد مرتبا على الكتب والا بواب۔

یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں فتاوی تابعین' اقوال صحابہ اور احادیث نبوت کو بطرز محدثین بالاسانید جمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے تمام ابواب سے نظر ہٹا کر مصنف نے اس میں صرف احادیث احکام کو لیا ہے یعنی جن سے فقہ کا کوئی مسئلہ نکلتا ہے اور اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں فقہی مذہب کے ساتھ کوئی ترجیح سلوک نہیں کیا گیا بلکہ اہل حجاز' اہل عراق دونوں مدرسوں کی جس قدر روایات مصنف کو ملی ہیں ان سب کو نہایت غیر جانبداری کے ساتھ یک جا کر دیا ہے اس لیے قدماء کی کتابوں میں یہ کتاب احادیث احکام پر جامع ترین ہے۔مشہور علامہ زاہد کوثری نے لحظ الالحاظ کی تعلیق میں مصنف کے بارے میں یہ بات بڑی ہی قیمتی فرمائی ہے:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۳ ص ۲۴۸

المصنف احرج مایکون الفقیہ الیہ من الکتب الجامعة للمسانید والمراسیل وفتاوی الصحابة والتابعین رتبہ علی الابواب لیقف المطالع علی مواطن الاتفاق والاختلاف بسہولة۔

مسانید' مراسیل اور فتاوی صحابہ و تابعین پر مشتمل جو کتابیں ہیں ان کتابوں میں ایک فقیہ کو سب سے زیادہ ضرورت جس کتاب کی ہے وہ صرف مصنف ابن شیبہ ہے۔(۱)

اور صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ چونکہ کوفہ میں لکھی گئی ہے اس لیے اس میں فقہاء عراق کے مذہب کو بھو کر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے تا آنکہ مصنف نے اس کتاب میں اپنے خیال کے مطابق ایک مستقل باب امام ابوحنیفہ کے رد میں بھی لکھا ہے اس کا عنوان یہ ہے:

ھذا ماخالف بہ ابو حنیفة الاثر الذی جاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس میں ایک سو پچیس مسائل لکھے ہیں اور اس پر حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ اجتہادی مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے اور ہر فریق کو دوسرے کے مسائل پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ اگر فن میں آزادانہ تنقید کے حق پر قدغن قائم کر دیا جائے تو فن کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ زمانہ سلف میں اکثر ائمہ نے ایک دوسرے کے مسائل پر اپنے علم کے مطابق تنقید کی ہے۔ تنقید تلمذ اور تادب کے منافی نہیں ہے۔ امام لیث بن سعد نے امام مالک کے ستر مسئلے ایسے شمار کیے ہیں جو سب کے سب ماجاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق امام مالک کو یادداشت روانہ کی۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے ان سے بسند متصل نقل کیا ہے کہ:

احصیت علی مالک بن انس سبعین مسئلة کلھا مخالفة لسنة النبی صلی اللہ علیہ وسلم مما قال مالک فیھا برایہ۔(۲)

میں نے مالک کے ستر مسئلے شمار کیے ہیں جو حضورؐ کی سنت کے خلاف ہیں اور جو امام مالک نے محض رائے سے لکھے ہیں۔

---

(۱) تعلیق لحظ الالحاظ: ص ۱۵۸ ۔ (۲) جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۲ ص ۱۴۸

امام مالک کے نام لیث بن سعد کا وہ خط پڑھیئے جو حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین کی تیسری جلد میں پورا نقل کر دیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ سلف میں تنقید کا معیار کتنا بلند تھا۔ لیکن بات کو پورے واشگاف انداز میں پیش کرتے اور دامان ادب و احترام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ میں یہاں اس خط کے چند اقتباسات ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

اس موضوع پر کہ عمل اہل مدینہ حجت ہے آپ نے جو قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: والسابقون الاولون من المهاجرين الخ۔ تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ ان سابقین اولین کی اکثریت جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر مدینہ چھوڑ کر دوسرے مقامات پر گئی۔ فوج میں داخل ہو کر یہ لوگ مختلف شہروں میں پہنچے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ انہوں نے لوگوں کے روبرو کتاب و سنت کو بلاکم وکاست پیش کیا اور اس میں سے کوئی بات راز بنا کر نہیں رکھی ہے ہر فوج اور لشکر میں ایسا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا تھا جو دانائے کتاب و سنت تھا اور ضرورت پڑنے پر ان مسائل میں اجتہاد کرتا تھا جو قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں ان کے سامنے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ تھے جن کو مسلمانوں نے مقام قیادت دیا تھا یہ ہر سہ بزرگ مسلمان فوجیوں سے بے خبر نہ تھے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی دین قائم کرنے کی خاطر اور کتاب و سنت میں اختلاف سے بچانے کے لیے فوجیوں سے لگاتار خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے تھے ہر ایسی بات جس کا قرآن کی تفسیر سے سنت کی تشریح اور ان کے فیصلوں سے تعلق ہوتا وہ ان فوجیوں کو بتاتے اور سکھلاتے۔ لہذا اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش آ جائے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے مصر شام اور عراق میں زمانہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ میں عمل کیا ہو اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہ دنیا سے رحلت فرمائے دار بقا ہو گئے ہوں تو بعد میں آج کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ عمل کا کوئی ایسا پیمانہ بنائے جس کی دین کی زندگی میں ان بزرگوں سے عملی تائید نہ ہو۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

آپ کو بارش والی رات میں دو نمازوں کے جمع کرنے پر میری گرفت معلوم ہوئی یقیناً میں نے اس پر گرفت کی ہے۔ شام میں بہ نسبت مدینہ کے بارش زیادہ ہوتی ہے مگر یہاں آنے والے صحابہ میں کبھی کسی نے یہ کام نہیں کیا دراں حالیکہ ان میں ابوعبیدہؓ، خالد بن الولیدؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، عمرو بن العاصؓ اور معاذ بن جبلؓ جیسے اجلہ صحابہ تھے۔ حمص میں ستر بدری تھے۔ عراق میں عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن الیمانؓ، عمران بن الحصینؓ، علی مرتضیٰؓ اور ان کے بے شمار رفقاء تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے مغرب اور عشاء کو جمع نہیں کیا ہے۔

یہ نمونہ ہے اس دور میں ان بزرگوں کی آزادانہ تنقید کا جس سے استنباط واجتہاد کے فن میں بالغ و بہار آئی ہے اور اس درجہ اوج کمال پر پہنچ گیا کہ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل وہ شریعت کی روشنی میں تلاش کر لیتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یگانے تو یگانے بیگانے بھی بول پڑے کہ:

دور تابعین میں فقہاء اس کے جویا رہتے تھے کہ دنیوی مسائل ہوں یا دینی اعمال و اقوال نبوت میں نبوت کا منشاء معلوم ہو اور منشاء نبوت معلوم کرنے کا ان کے پاس صحابہ کی زندگی کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ صحابہ سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو حضور انورؐ کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے اعمال دیکھے اور کانوں سے ارشادات سنے۔ اس دور میں جو شخص اس روشنی سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا اس کے فقہی نتائج زیادہ وسیع تھے۔ (۱)

یہ تو خیر ایک معاصر پر تنقید تھی خود امام شافعی جن کو امام مالک سے شرف تلمذ بھی ہے انہوں نے بھی امام مالک کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیث کے خلاف ہیں یہ کتاب آج بھی کتاب الام میں اختلاف مالک والشافعی کے نام سے موجود ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں لکھتے ہیں کہ مؤطا میں ستر سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں کہ جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا۔ (۲) اور

---

(۱) العقیدۃ والشریعۃ نقلا تاریخ الفقہ الاسلامی: ص ۳۶ (۲) تدریب الراوی: ص ۴۲

بعض مغاربہ نے ایک مستقل کتاب میں ان مسائل کو جمع بھی کر دیا ہے کہ جن میں امام مالک کا عمل مؤطا کی احادیث کے صریحاً خلاف ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

قد جمع بعض المغاربة كتابا فيما خالف فيه المالكية نصوص المؤطا۔(۱)

محمد بن عبداللہ بن الحکم مالکی نے جو مصر کے مشہور فقیہ اور محدث تھے اور امام شافعیؒ کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں امام شافعیؒ کے رد میں کتاب لکھی ہے جس کا نام الرد علی الشافعی و ماخالف فیہ الکتاب والسنۃ ہے۔(۲)

امام ابوحنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی نے تنقید کی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اس کا نام الرد علی سیر الاوزاعی ہے۔ امام شافعیؒ کتاب الام میں اس کتاب کے راوی ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں جو امام ابوحنیفہ پر ایک خاص باب میں تنقید کی تھی علماء نے اس پر بھی بھر پور تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان مسائل میں ابوحنیفہ کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔ جن علماء نے ابن ابی شیبہ پر اس موضوع میں تنقید کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

- حافظ عبدالقادر قرشی:- ان کی کتاب کا نام الدرر المنیفہ فی الرد علی ابن ابی شیبہ فیما اورده علی ابی حنیفہ ہے۔
- حافظ زین الدین قاسم:- ان کی کتاب کا نام الاجوبۃ المنیفہ عن اعتراضات ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔(۳)
- علامہ زاہد کوثری:- ان کی کتاب کا نام النکت الطریفہ فی التحدث عن رد ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔

صاحب کشف الظنون ملا کاتب چلپی نے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا نام الرد علی من رد علی ابی حنیفہ ہے۔

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں رقم طراز ہیں۔ کہ خود انہوں نے بھی

---

(۱) تعجیل المنفعۃ: ص ۱۴ (۲) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ج ۱ ص ۲۲۳ (۳) تعلیق لحظ الالحاظ: ص ۱۵۸

ابن ابی شیبہ کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھنی شروع کی تھی اور دس حدیثوں تک جواب بھی لکھ لیا تھا مگر بعد کو قلم روک لیا۔

لیکن اس تنقید وتبصرہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ:

- ان ائمہ میں باہم اکرام نہیں ہے اوران کی ناقدانہ تحریروں کا منشاء ان کی باہم رنجش ہے۔
- معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ ائمہ حدیث کی مخالفت کرتے تھے۔

اگران باتوں میں سے ایک بات بھی ہوتی تو ان کی امت میں امامت کون مانتا؟ بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں ان میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جوروایت ایک کے نزدیک قابل قبول ہو وہ حتماً سب کے نزدیک قابل پذیرائی ہو۔ کیونکہ حدیث کی صحت کا مسئلہ منصوص نہیں بلکہ خود اجتہادی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کے علم کے مطابق اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو یا پھر اس کے ذہن میں اس کا محمل اور مصداق اور ہو۔ اس موقعہ پر حافظ ابن عبدالبرکیسی پتے کی بات فرما گئے ہیں:

علماء امت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ ایک حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مانتے ہوئے بلاوجہ رد کردے۔ یا تو وہ اس حدیث کے نسخے کا دعوی کرتا ہے یا اجماع کی تائید کا اعلان کرتا یا اس کا کوئی ایسا محمل تجویز کرتا ہے جس کا اس کے اصول پر ماننا ضروری ہے یا پھر حدیث کی روایتی حیثیت کو وہ مشکوک سمجھتا ہے۔ اگران باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے اور پھر وہ حدیث کورد کرتا ہے تو اس کا امام ہونا تو درکنار اس کی تو عدالت بھی مخدوش ہوجاتی ہے۔

بہرحال مصنف بہت اونچے درجے کی کتاب ہے اس کے مصنف امام ابوبکر بن ابی شیبہ ~~۲۳۵~~ھ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے اساتذہ میں حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق شریک القاضی، سفیان و بن عینیہ، عبداللہ بن المبارک اور جریر بن عبدالحمید ہیں اور حافظ ابن حجر نے ان کے ساتھ ہشیم بن بشیر اور ابوبکر بن عیاش، ابواسامہ، ابومعاویہ وکیع بن الجراح، محمد بن فضیل اور یزید بن ہارون کا اضافہ فرمایا ہے۔ حافظ ذہبی نے سفیان بن عینیہ کو چھوڑ کر سب ہی کو امام اعظمؒ کے تلامذہ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری نے ابن ابی شیبہ سے تیس حدیثیں اور امام

مسلم نے ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس حدیثیں روایت کی ہیں۔

آپ اس سے امام اعظمؒ کی جلالت قدر کا اندازہ لگایئے یہ ادنیٰ سے ادنیٰ مثال ہے کہ تمام دودمان علم حدیث اسی گھر کا خوشہ چین ہے۔

تیسری صدی میں صحاح کی تدوین:

صحاح سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام کیا ہے۔ الکتانی لکھتے ہیں:

کتب التزم اهلها الصحة فيها۔

تیسری صدی میں صحاح کے نام سے جو کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں وہ چھ ہیں:

صحیح امام بخاری ۲۵۶ھ۔ صحیح امام مسلم ۲۶۱ھ۔ جامع ترمذی ۲۷۹ھ۔ سنن ابی داؤد ۲۷۵ھ۔ سنن ابن ماجہ ۲۷۳ھ سنن نسائی ۳۰۳ھ۔ چونکہ صحاح کے نام سے یہ چھ کتابیں مشہور ہیں اس لیے ہم نے ان ہی کو صحاح ستہ لکھا ہے ورنہ حافظ ابن مندہ نے مخرجین صحاح میں صرف امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو شمار کیا ہے۔ اور بجائے ستہ کے صحاح اربعہ کہا ہے۔ بعد کو حافظ ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کر کے تصریح کی ہے کہ ان پانچ کی صحت پر مشرق اور مغرب کے علماء کا اتفاق ہے۔ لیکن حافظ عراقی نے ان لوگوں پر بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے جو ترمذی، ابوداؤد جیسی کتابوں پر صحیح بولتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ومن عليها اطلق الصحيحا فقد اتى تساهلا صريحا۔[1]

حافظ ابن الصلاح اور علامہ نووی نے قابل اعتماد کتابوں کے سلسلے میں صرف پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات کا ذکر کیا ہے اور امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حافظ سخاوی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

---

1 (الفیہ العراقی: ص ۱۴)

ابن ماجہ ان مقاصد سے خالی ہے جن پر مصنفین کتب خمسہ نے توجہ دی ہے اور جن پر تدبر وغور سے محدث کو مشق ہوتی ہے خاص طور پر جبکہ اس میں نہایت ضعیف بلکہ منکر حدیثیں بھی موجود ہیں۔(۱)

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابن ماجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ابو عبداللہ بن ماجہ کی کتاب بہترین ہے کاش اس میں تھوڑی احادیث واہیہ نہ ہوتیں۔

اور خود امام ابن ماجہ کی زبانی حافظ ابوزرعہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے:

میں نے اس کتاب کو حافظ ابوزرعہ کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا تو فرمایا کہ میرے خیال میں اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو یہ جوامع یا ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گے پھر فرمایا شاید اس میں تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہو۔(۲)

حافظ ذہبی نے حافظ ابوزرعہ کی رائے کو تذکرہ میں اگرچہ بلا تبصرہ نقل کیا ہے لیکن سیر اعلام النبلاء کے حوالہ سے علامہ یمانی لکھتے ہیں کہ:

ابوزرعہ کا یہ بیان کہ شاید اس میں تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں جن کی سند ضعیف ہو اگر صحیح ہے تو ان کی مراد ان تیس حدیثوں سے نہایت گری ہوئی اور ساقط قسم کی روایتیں ہیں ورنہ نا قابل احتجاج روایات کا تو اس میں ایک ذخیرہ ہے۔ شاید ان کی تعداد ہزار کے قریب ہو۔(۳)

غالباً ان ہی تیس کو حافظ ذہبی نے تاریخ میں سنن ابن ماجہ کے ذکر میں قلیل سے تعبیر کیا ہے فرماتے ہیں:

انما غض من رتبه سننه ما فيها من المناكير و قليل من الموضوعات۔

---

(۱) فتح المغیث: ص ۴۷۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۱۸۹

(۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۱۸۹

سنن ابن ماجہ کو اپنے مرتبہ میں کمتر بنانے والی منکر روایات اور تھوڑی سی احادیث موضوعہ ہیں۔(۱)

اور یہی وہ تیس حدیثیں ہیں جن کو مشہور محدث ابن الجوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے یا دیگر محدثین نے ان میں سے بعض کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے۔

یہ سب گفتگو اس مفروضہ پر ہے جب کہ روایتی طور پر حافظ ابو زرعہ کا یہ بیان ثابت ہو جائے حافظ سیوطی حافظ ابو زرعہ کے اس بیان کو تاریخی طور پر صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ابن طاہر نے ابو زرعہ سے جو یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو دیکھ کر فرمایا کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی نہیں جن میں ضعف ہو۔ یہ حکایت درست نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے اور اگر یہ روایت محفوظ ہے تو شاید انہوں نے انتہائی ساقط روایت کو مراد لیا ہے یا پھر کتاب کا صرف ایک ہی حصہ دیکھا ہے جس میں ان کو اسی قدر مل سکا اور یہ واقعہ ہے کہ ابو زرعہ نے اس کی بہت سی حدیثوں کے متعلق باطل یا ساقط یا منکر ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو ابن ابی حاتم کی علل میں ہیں۔(۲)

لیکن اس کے باوجود متاخرین نے سنن ابی ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کر لیا اور بقول شاہ عبدالحق اس کتاب کو شامل کر کے ان کتابوں کو اصول ستہ' کتب ستہ' صحاح ستہ' بولا جانے لگا۔

ابن ماجہ' سنن دارمی یا مؤطا کا صحاح ستہ میں شمار:

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو کتب خمسہ کے بالمقابل جگہ دی وہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ ہیں۔ جنہوں نے شروط الائمۃ الستۃ کے نام سے کتاب تصنیف کی اور اس میں ائمہ خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کی شرط پر بحث کی ہے اور ایک دوسری کتاب میں ان کتب ستہ کے اطراف کو جمع کیا۔ بعد کو تمام مصنفین نے ان کی رائے سے اتفاق کیا حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۲۱۳ (۲) زہر الربی

لمتابعه اصحاب الاطراف والرجال۔(۱)

حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث رزین بن معاویہ عبدری مالکی ۵۲۵ھ نے اپنی کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کی جگہ موطا امام مالک کو رکھا ہے۔ حافظ عبدالغنی مقدسی ۶۰۰ھ نے الاکمال فی اسماء الرجال میں کتب خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کے رجال کو یک جا مرتب کیا ہے۔(۲)

اس بنا پر بعد کے علماء میں یہ بحث پیدا ہوگئی کہ صحاح میں کتب خمسہ کے سوا چھٹی کتاب موطا ہے یا ابن ماجہ؟

علامہ ابن الاثیر نے اپنی مشہور کتاب جامع الاصول میں محدث رزین ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اور اسی لیے اس کتاب میں ابن ماجہ کے حوالہ سے کوئی روایت درج نہیں ہے۔ اسی طرح حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی کی تصریح ہے کہ:

جو کچھ بتایا گیا ہے ان سب میں اول وہ کتابیں ہیں کہ جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے۔ جو تصنیف میں اور مرتبہ میں ان سے کم نہیں ہے۔(۳)

اور علامہ عبدالغنی نابلسی اپنی مشہور کتاب ذخائر المواریث فی الدلالۃ علیٰ مواضع الحدیث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

صحاح میں چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے اہل مشرق کے نزدیک تو ابن ماجہ ہے وار اہل مغرب کے نزدیک موطا ہے۔(۴)

غالب المتاخرین علیٰ انه سادس الستة۔

حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں بہت سی زائد حدیثوں کی وجہ سے افادیت پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ صحت اور قوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ تو کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کچھ علماء کی رائے

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۳۰ (۲) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ: ص ۱۱۰

(۳) تدریب الراوی: ص ۵۶ (۴) ذخائر المواریث

رائے میں ابن ماجہ کی جگہ سنن دارمی کو صحاح میں چھٹی کتاب ہونے کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے کچھ لوگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ:

بجائے سنن ابن ماجہ کے مناسب یہ ہے کہ دارمی کی کتاب کو چھٹی قرار دیا جائے کیونکہ اس میں ضعیف راوی کم اور منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں۔ اور اگرچہ اس میں احادیث مرسلہ وموقوفہ موجود ہیں تاہم وہ سنن ابن ماجہ سے زیادہ بہتر ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کی ہم نوائی کی ہے۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں:

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے بلکہ اس کو اگر کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی بہ نسبت یہ زیادہ اچھا ہے کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔(۲)

لیکن اس تصریح کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل السیانی لکھتے ہیں:

صحاح خمسہ کے ساتھ موطا بھی ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ابن الاثیر نے کہا اور کچھ لوگوں نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو رکھا ہے اس کے پیش نظر حافظ ابو الحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور علامہ خزرجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے۔(۳)

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تیسری صدی میں یہ چھ کتابیں صحاح کے نام سے منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ آیئے اب سرراہے خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے ان کتابوں کے بارے میں محدثین کی کچھ آراء بھی پڑھ لیجیے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم:

مسانید کے ذریعے جب حدیث کا تمام ذخیرہ یکجا ہوگا اور احادیث کے سمٹنے کا کام

---

(۱) فتح المغیث: ص ۳۳ (۲) تدریب الراوی: ص ۵۷ (۳) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۵۵

پورا ہو گیا تو اس دور کے محدثین نے اس ذخیرے سے انتخاب و اختصار کے لیے قدم اٹھایا اور صحاح کی تدوین عمل میں آئی۔ حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی نے ابراہیم بن معقل نسفی کے حوالہ سے خود امام بخاری کی زبانی بتایا ہے کہ:

میں ایک روز اسحاق بن راہویہ کے پاس تھا وہاں ہمارے احباب میں سے کسی نے کہا کہ کاش تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر مشتمل کوئی مختصر تیار کرتے یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے حدیث کا ایک مختصر جمع کرنا شروع کر دیا۔(۱)

صرف اختصار ہی نہیں بلکہ اس میں صحیح احادیث کے انتخاب کا بھی پورا اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب الجامع میں صرف وہی حدیثیں درج کی ہیں جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔(۲)

امام مسلم نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور احادیث کی صحت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں جمع کیں کہ جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اجماع تھا چنانچہ ان کا بیان ہے۔

لیس کل شئی عندی صحیح وضعۃ ھھنا انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ۔(۳)

حافظ ابن الصلاح، حافظ جلال الدین السیوطی اور علامہ الجزائری نے تصریح کی ہے

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۱ (۲) مقدمہ فتح الباری: ص ۵ (۳) صحیح مسلم میں جس موقعہ پر امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ بات فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجیے۔ امام مسلم نے باب التشہد میں اپنے مشائخ سعید بن منصور، قتیبہ بن سعید، ابو کامل محمد بن عبدالملک کے حوالہ سے یہ سند ابوعوانہ از یونس بن جبیر از حطان بن عبداللہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک طویل حدیث پیش فرمائی ہے اور پھر اسی حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ مجھے یہ حدیث ان تین طریقوں سے بھی ملی ہے۔ اول ابوبکر از ابواسامہ از سعید بن ابی عروبہ۔ دوم ابوغسان المسمعی از معاذ بن ہشام از ہشام۔ سوم اسحاق بن ابراہیم از جریر از سلیمان۔ ان تینوں طریقوں کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ کل ھؤلاء عن قتادۃ۔ ﴿باقی صفحہ ۵۳۴﴾

کہ امام مسلم کی مراد ما اجمعوا علیہ سے یہ ائمہ حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام یحییٰ بن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ اور امام سعید بن منصور خراسانی۔(۱) حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ساتھ امام علی بن المدینی کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔(۲) اور حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم صحیح کہہ دیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر اور حقیقت میں بالکل یقینی ہے۔(۳)

﴿بقیہ صفحہ ۵۳۳﴾ یعنی یہ سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا ہے۔ لیکن ان تینوں طریقوں میں سلیمان قتادہ کے حوالہ سے اس حدیث میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اذا قرا فانصتوا اور پوری روایت اسی طرح ہے کہ امام مسلم فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے بیان وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر نے بتلایا وہ سلیمان تیمی سے روایت کرتے ہیں۔ قتادہ سے قتادہ یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بتلایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھلایا اور کہ نماز سے پہلے صفوں کو سیدھا کرلو پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے جب وہ تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ (صحیح مسلم جلد اول ص ۱۷۴) اس موقعہ پر امام مسلم سے ان کے ایک شاگرد ابو بکر نامی نے دریافت کیا کہ سلیمان کی روایت میں یہ اضافہ ہے۔ امام مسلم نے جواب دیا کہ سلیمان حفظ وضبط میں کامل ہیں پھر ابو بکر نے پوچھا کہ اچھا یہ تو ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے لیکن آپ کا حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اذا قرأ فانصتوا آیا ہے۔ امام مسلم نے جواب میں فرمایا کہ ھو عندی صحیح وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگر وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو اسے آپ نے اپنی کتاب میں یہاں کیوں درج نہیں فرمائی۔ جواب میں وہ بات ارشاد فرمائی جو ہم نے کتاب میں درج کی ہے لیس کل شئی عندی الخ یعنی میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے اپنی صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے صرف وہ روایات درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بالسند موجود ہے امام مسلم کے نزدیک ہی نہیں بلکہ ان سب محدثین کے نزدیک صحیح ہے جن کے اتفاق کو امام مسلم اپنی صحیح میں اپناتے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ص ۸، تدریب الراوی: ص ۳۸، توجیہ النظر: ص ۱۳۹ (۲) مقدمہ فتح الباری: ص ۳۰۲

(۳) غایۃ المامول: ص ۶)۔ اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس زیادتی والی حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

امام مسلم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ جب کتاب مکمل ہو گئی تو حافظ ابو زرعہ رازی کی خدمت میں لیجا کر پیش کی جو اس دور میں علل احادیث اور فن جرح و تعدیل کے مسلم امام تھے اور جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا اسے کتاب سے خارج کر دیا (۱)۔ بلآخر پوری پندرہ سالہ محنتوں اور عرق ریزیوں کے بعد احادیث صحیحہ کا یہ مجموعہ عوام کے سامنے آیا۔ اس کے بارے میں خود امام مسلم کا یہ دعویٰ ہے:

میں نے تین لاکھ احادیث سے یہ کتاب تالیف کی ہے اگر تمام روئے زمین کے باشندے دو سو سال تک بھی حدیث کی کتابت کا کام کریں گے پھر بھی ان کا مدار اور سہارا یہی کتاب رہے گی۔ میں نے جو کچھ درج کیا ہے وہ دلیل کی پی تلی ترازو پر رکھ کر کیا ہے اور جو درج نہیں کیا وہ بھی کسی دلیل ہی کے سہارے نہیں کیا ہے۔ (۲)

حافظ مسلمہ بن قاسم قرطبی نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

لم یضع فی الاسلام احد مثله　(اسلام میں اس جیسی تصنیف کوئی نہیں ہے)

اہل علم ان دونوں کو صحیحین اور ان کے مصنفوں کو شیخین کہتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صحیحین کا مقام:

امام بخاری کی صحیح اور امام مسلم کی صحیح کی صحت میں تو اہل علم میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں لیکن یہ بات ہمیشہ سے علماء میں بحث و نظر کا موضوع رہی ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں صحت کا معیار کیا ہے۔

امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ صحیح صرف یہ دونوں کتابیں ہیں اور ائمہ نے ان کو شرف قبول سے نواز ہے اور امام بخاری کی صحیح بمقابلہ امام مسلم کی صحیح کے زیادہ صحیح ہے اور اس میں زیادہ فائدے ہیں۔ (۳)

---

(۱) الحطہ میں مکی بن عبدان کے حوالہ سے امام مسلم کا یہ بیان بحوالہ خطیب بغدادی نقل کیا ہے دیکھو ص ۹۸۔ (۲) مقدمہ صحیح مسلم　(۳) الحطہ: ص ۱۵

حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

وہ صفات جن پر صحت کا مدار ہے بخاری میں مسلم سے زیادہ ہیں۔

اور بخاری کی شرطیں مسلم کی شرطوں سے زیادہ قوت والی اور زیادہ سخت ہیں۔(۱)

اس پر تفصیلی گفتگو آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ ان دونوں میں زیادہ صحیح کون سی ہے اور اس موضوع پر مختلف علماء کے کیا خیالات ہیں۔

الغرض اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحت کے لحاظ سے تمام کتابوں سے اونچی ہیں۔ چنانچہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

قد اتفق الکل علیٰ انھما اصح الکتب

ان دونوں کے اصح الکتب ہونے پر اتفاق ہے

صحیحین میں صحت کا معیار:

یہاں پہنچ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعویٰ اتفاق کی کہ یہ دونوں کتابیں تمام حدیث کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں بنیاد کیا ہے؟ آخر وہ معیار کیا ہے جس کی وجہ سے از روئے صحت ان کو دوسری تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہوئی ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تین باتیں ہیں:

- ایک یہ کہ ان کتابوں کی سب سے برتر ہونے کی وجہ خود ان بزرگوں کا التزام صحت ہے۔
- دوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کی وجہ ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں۔
- سوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کا دارومدار دراصل اس پر ہے کہ ان دونوں کتابوں کو پوری امت کی جانب سے شرف قبول حاصل ہے۔

بات اگرچہ طویل ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اس سلسلے میں کچھ مفید باتیں پیش کریں۔

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۴۰

التزام صحت اور اس کا مطلب:

التزام صحت کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان دونوں کتابوں کو مؤلفین کا اعلان ہے کہ ان کی حدیثیں صحیح ہیں۔ ہم نے اپنی کتابوں میں صحیح حدیثیں درج کی ہیں۔ تو یہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں کی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔ اور یقیناً مدعیان صحت کا یہی مقصود ہے چنانچہ امام یمانی لکھتے ہیں:

فالا ولیٰ عندی فی الاستدلال علی تقدم الصحیحین اخبار مؤلفیهما بان احادیثهما صحیحة۔

میرے نزدیک صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے مؤلفین نے بتا دیا ہے کہ ان کی احادیث صحیح ہیں۔(۱)

اور احادیث کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ:

رواة هذه الاحادیث عدول ضابطون ولا شذوذ فیها ولا علة۔(۲)

بلاشبہ اگر ان کتابوں کو مؤلفین کے اس دعوے پر ان کتابوں کی اصحیت کا مدار ہے تو یہ شرف یقیناً ان کتابوں کو حاصل ہے۔

بخاری و مسلم کی شرطیں:

اگر ان کتابوں کی اصحیت کی علت ان کتابوں کے مؤلفین کی پیش کردہ شرائط ہیں تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی شرائط کو نہ تو کہیں بیان کیا ہے اور نہ ہی اس موضوع پر ان سے کوئی علمی سرمایہ منقول ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ متاخرین نے خود ہی چند شرطیں ان کی کتابوں کو دیکھ کر مقرر کر لی ہیں۔ بعد ازیں دوسری کتابوں میں آمدہ حدیثوں کو اپنی بنائی ہوئی شرطوں پر قول تول دیکھنے لگے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں:

اعلم ان البخاری لم یوجد عنده تصریح بشرط معین وانما اخذ ذالک من تسمیة الکتاب والاستقراء من تصرفه۔(۳)

(۱،۲) توضیح الافکار: ج ا ص ۹۵ (۳) توجیہ النظر: ص ۸۸

علامہ امیر محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اعلم انه لم ينقل عن الشيخين شرط شرطاه وعيناه انما تتبع العلماء الباحثون عن اساليبهما طريقتهما حتى تحصل لهم ماظنوه شروطالها۔

شیخین سے ایسی کوئی شرط منقول نہیں ہے صرف علماء نے ان کے اسلوب وطریق سے تلاش کر کے اپنے خیال کے مطابق شرطیں بنالی ہیں۔(۱)

حتیٰ کہ امام نووی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

علی شرط الشیخین کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے رجال سند ان شیخین کی کتابوں میں آئے ہوئے رجال پر مشتمل ہوں کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں اور کوئی شرط نہیں ہے(۲)۔

اور چونکہ مسئلہ شرائط پر ان بزرگوں سے خود کوئی تصریحی بیان منقول نہیں ہے بلکہ بعد میں آنے والوں کی تلاش وجستجو کی رہین منت ہیں اس لیے ان شرائط کی تعیین وتقدیر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

اختلفوا فيه لاختلاف افهامهم

آیئے اس موضوع پر مختلف علماء کی قیمتی آراء معلوم کر لیجئے۔ محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں:

شرط البخاری و مسلم ان یخرجا الحدیث الجمع علی ثقه نقلته الی الصحابی۔

بخاری ومسلم کی شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ان راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ جن کی ثقاہت اتفاقی ہو۔(۳)

---

(۱) توضیح الافکار ج ا ص ۱۰۰

(۲) تدریب الراوی: ص ۶۷ (۳) شروط الائمہ الخمسہ: ص ۱۰

لیکن راویوں کی ثقاہت پر اتفاق کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ حافظ زین الدین کو ابن طاہر کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابن طاہر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ امام نسائی نے ایسے بہت راویوں کی تضعیف کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے بلکہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے ایک قدم اور بڑھا کر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:

صرف نسائی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں ایک سے زیادہ دوسرے ائمہ جرح و تعدیل امام نسائی کے ہم زبان ہیں۔

اگرچہ علامہ وزیر نے یہ کہہ کر کہ:

لکنه تضعیف مطلق غیر مبین السبب

حافظ عراقی کی بات کو بے وزن بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مشہور محدث امیر یمانی نے بات کو واضح کر کے پیش کیا اور حافظ ابراہیم کی تردید کر دی۔ چنانچہ امیر موصوف فرماتے ہیں:

صحیحین کے راویوں میں سے جن پر جرح ہوئی ہے ان میں ہر ایک پر جرح مطلق ہی نہیں ہوئی بلکہ ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جن پر بھرپور اور مکمل جرح کی گئی ہے کچھ ایسے ہیں جن کو مرجیہ کہا گیا ہے مثلاً ایوب بن عائذ بخاری و مسلم کے راویوں میں ہیں ابوداؤد اور نسائی نے ان کو مرجیہ قرار دیا ہے۔ کچھ کو ناصبی بتایا گیا ہے جیسے ثور بن یزید بخاری کے راویوں میں سے ہیں جریر بن عثمان بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ فارس مشہور ناقد رجال نے بتایا ہے کہ یہ حضرت علیؓ سے بغض رکھتے تھے۔ خالد قطوانی بھی بخاری کے راویوں میں سے ہیں مگر ابن سعد کی رائے میں غالی شیعہ تھے۔(۱)

علامہ حازمی نے اس موضوع پر شروط الائمۃ الخمسہ کے نام سے کتاب لکھی ہے اور اس میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی کی شرائط پر تبصرہ کیا ہے۔

حافظ جلال الدین السیوطی نے اس کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ:

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۱۰۲

شرط بخاری یہ ہے کہ ایسی حدیث روایت کی جائے جس کی سند متصل ہو جس کے راویوں میں صرف ثقاہت اور اتقان ہی نہیں بلکہ انہوں نے جن سے وہ حدیث لی ہے ان کے ملازم صحبت بھی ہوں اور صحبت بھی طویل ہو لیکن امام بخاری کبھی ان لوگوں کی روایت بھی لے آتے ہیں جو ملازم صحبت نہ ہوں اور امام مسلم کی شرط یہ ہے کہ روایت طبقہ ثانیہ کی ہو اور کبھی کبھار ان سے بھی روایت لیتے ہیں۔ جو ملازم نہ ہوں لیکن ان پر قدرے جرح بھی ہو گئی ہو۔(۱)

لیکن علامہ یمانی نے امام بخاری کے متعلق یہ کہہ کر حازمی کی بیان کردہ داستان کو مخدوش بتا دیا ہے کہ:

ھذا لا یوافق مانقل عن البخاری من انہ یشترط القاء ولو مرۃ۔

حازمی کی بات کا امام بخاری کی یہ تصریح ساتھ نہیں دیتی ہے کہ روایت میں راوی کے لیے ملاقات شرط ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔

اور ایسے ہی امام مسلم کی طرف منسوب شرط کو بھی انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:

ان مسلما لا یشترط القاء اصلاً کما صرح بہ فی مقدمہ صحیحہ۔

امام مسلم ملاقات کو قطعاً شرط قرار نہیں دیتے ہیں۔

امام حاکم نے مدخل میں بخاری و مسلم کی یہ شرط بتائی ہے کہ:

ایسی حدیث جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور صحابی روایت کرے اور اس صحابی سے دو تابعی ثقہ روایت کریں۔ پھر ان سے ایسا کوئی شخص جو حفظ و اتقان میں مشہور ہو اور اس کے طبقہ رابعہ میں روایت کرنے والے ایک سے زیادہ راوی ہوں بعد ازیں بخاری و مسلم کے وہ شیوخ جو حفظ و عدالت میں مشہور ہوں روایت کریں۔ یہ درجہ اول کی روایات ہیں۔(۲)

یہ شرط اگرچہ بے حد وزنی اور پرشوکت ہے لیکن علامہ ابن طاہر مقدسی نے اسے یہ کہہ کر بے جان بتا دیا ہے کہ:

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۶۷ (۲) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۶۴

ان الشیخین لم یشترطا هذا الشروط ولا نقل عن واحد انه قال ذالک والحاکم قدر هذا التقدیر وشرط لهما هذا الشرط علیٰ ماظن۔

شیخین نے نہ یہ شرط لگائی اور نہ ان میں سے کسی سے یہ منقول ہے حاکم نے خود ہی اپنے گمان سے عمارت سازی کر لی ہے۔(۱)

اور امام حازمی نے حافظ ابو حاتم بن حبان البستی سے اس پر جو تنقید نقل کی ہے وہ کافی سخت اور سنگین ہے۔ فرماتے ہیں:

احادیث سب اخبار آحاد ہیں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔ جو دو عادل کی روایت کی قید سے آئی ہو اور پھر ہر ایک دو ہی سے روایت کر کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہو۔ جب یہ صورت ناممکن اور غلط ہے تو ثابت ہو گیا کہ احادیث اخبار آحاد ہیں۔ اور جو شخص اس قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے وہ تو دراصل اس راہ سے لوگوں کو ترک سنن کی دعوت دے رہا ہے کیونکہ سنن تو ساری ہی اخبار آحاد ہیں۔(۲)

امام حازمی نے ابو حاتم کی اس تنقید کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے اور پھر خود بھی امام حاکم کے اس خیال کی اپنے انداز پر بھرپور تردید کی ہے۔ بہرحال یہ شرائط چاہے ابن طاہر نے بتائی ہوں یا حاکم اور حازمی نے متاخرین کی بتائی ہوئی ہیں ورنہ شیخین سے اس سلسلہ میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

انماهو تظن وتخمین من العلماء

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کی کتابوں کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اصحیت کا دارومدار شروط پر نہیں ہے۔

تلقی امت بالقبول اور صحیحین:

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں صحیحین کی اصحیت کو ثابت کرنے کے وجوہ ودلائل جو بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیحین کو تلقی امت بالقبول کا

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۱۴ (۲) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۴۴

شرف حاصل ہے صحیحین کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی حافظ ابن الصلاح کی قائم کردہ ہے انہوں نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ:

لاتفاق الامة علی تلقی ما اتفقنا علیه بالقبول۔(۱)

صحیحین کے بارے میں یہ موقف ایسا ہے کہ اسے وجہ ترجیح ہونا چاہیے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر رقمطراز ہیں:

والوجه فی هذا عندا اهل الحدیث هو تلقی الامة بالقبول ولاشک انه وجه ترجیح۔

محدثین کے نزدیک اس کی علت تلقی امت بالقبول ہے اور یہ واقعی وجہ ترجیح ہے۔(۲)

اگرچہ امام نووی نے اس مسئلہ پر حافظ ابن الصلاح کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کر لیا اور بتایا کہ تلقی امت بالقبول کسی چیز کی صحت میں برتر ہونے کی نہیں بلکہ وجوب عمل کی دلیل ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

تلقی امت بالقبول کا فائدہ وجوب عمل ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ حدیثیں جو بخاری و مسلم سے باہر ہیں اگر ان کی اسانید صحیح ہوں تو ان پر ہی عمل واجب ہے اور مفید ظن ہیں یہی صحیحین کی پوزیشن ہے۔(۳)

امیر یمانی نے حافظ ابن الصلاح کے موقف پر دو سوال قائم کر کے صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا۔

- تلقی امت بالقبول میں کیا امت کا ایک ایک فرد خاص و عام مراد ہے؟
- کیا تلقی امت سے یہ مراد ہے کہ پوری امت جانتی ہے کہ یہ کتابیں ان بزرگوں کی تصنیف ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ امت کے ایک ایک فرد نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کو اپنا لیا ہے۔ لیجئے پوری بات ان کی زبانی سن لیجئے:

جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحیحین کو تلقی امت بالقبول حاصل ہے اسے اس دعویٰ کو ثابت

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ص ۴۲ (۲) تنقیح الانظار: ج ۱ ص ۹۳ (۳) توجیہ النظر: ص ۱۲۶

کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اس دعویٰ پر دو سوال ہوتے ہیں ایک یہ کہ امت سے کیا مراد ہے سب کے سب ہر خاص و عام یا صرف مجتہدین۔ ظاہر ہے کہ سب تو مراد نہیں ہیں یقیناً مجتہدین ہی مراد ہوں گے۔ اگر دعویٰ یہ ہے کہ امت کے تمام مجتہدین میں سے ایک ایک فرد نے عمل کی دنیا میں اپنا لیا ہے تو یہ خود محتاج دلیل ہے اور معلوم ہے کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں۔ بے دلیل لانا ایسا ہے جیسا کہ اجماع کے دعویٰ پر۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اجماع مدعی کاذب ہے اور اگر زمانہ احمد میں صحیحین کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یہ جھوٹ ہے تو پھر صحیحین کے لیے ان کی تالیف اور تشہیر کے بعد اس قسم کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ علماء میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کو صحیحین کا پتہ بھی نہ ہوگا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود تلقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ لوگ مانتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں ان دونوں بزرگوں کا تالیفی کارنامہ ہیں۔ صرف اتنی بات تو کسی کتاب کی صحت کی ضمانت کے لیے کافی نہیں ہے یا یہ تمام امت نے ان کتابوں کی تمام حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث کے بارے میں یہ مان لیا ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس دعویٰ کی صداقت سب احادیث کے بارے میں ناقابل تسلیم ہے۔(۱)

صرف یہی نہیں بلکہ امام نووی کی ہمنوائی اور حافظ ابن الصلاح کی مخالفت میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے۔

صحیحین کے بارے میں تلقی الامت بالقبول درست ہے۔ لیکن یہ صحیحین کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ابوداؤد ترمذی اور نسائی کو بھی یہ مقام حاصل ہے مگر اس کے باوجود ان کتابوں کی اصحیت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اگر امت سے پوری امت مراد ہے تو اس سے زیادہ کوئی غلط بات نہیں ہے کیونکہ ان کتابوں کی تحسین بخاری اور ائمہ مذاہب کے بعد منصۂ شہود پر آئی ہے اور اگر امت سے ساری امت نہیں بلکہ

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۹۴

وہ حضرات مراد ہیں جو ان کتابوں کے مؤلفین کے بعد ہوئے ہیں تو یہ ساری امت نہیں ہے اور کچھ لوگوں کی تلقی مفید مدعا نہیں ہے۔(۱)

غالباً محمد بن اسماعیل یمانی کے اعتراض سے گلو خلاصی کے لیے متاخرین میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تلقی الامۃ بالقبول میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تلقی الائمہ بالقبول کا عنوان اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں فرماتے ہیں:

وتلقاهما الائمة بالقبول۔(۲)

اور اتحاف النبلاء المتقین میں لکھتے ہیں:

ائمہ دین تلقی کردہ اند ایں ہر دو را بقبول۔(۳)

اور مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں ان سے بے پروا ہو کر لکھ دیا ہے کہ:

صحیحین کو ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں ہے بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو گیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ مولانا نے اس دعویٰ پر کسی دلیل سے بحث نہیں فرمائی ہے اور محققین کو سب مدعیان تلقی سے یہی شکایت ہے کہ وہ نہ تو دعویٰ کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور نہ ان کے پاس دلائل کا سرمایہ ہے۔ عقیدت کیشی کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے مگر سوال عقیدت کا نہیں ہے بلکہ علم ونظر اور تحقیق کا ہے۔

بہر حال یہ بحث متاخرین محدثین کے یہاں طویل الذیل ہے اصلی بات وہی ہے جو اس سلسلے میں امیر یمانی نے توضیح الافکار میں فرما دی ہے کہ:

فالاولیٰ عندی فی الاستدلال علیٰ تقدم الصحیحین هو اخبار مؤلفيهما بان احاديثهما صحيحة۔(۴)

صحیح یہی ہے کہ صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ ان کے مؤلفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کتابوں کی احادیث صحیح ہیں۔

---

(۱) توجیہ النظر: ص ۱۳۱　(۲) الحطہ: ص ۸۲

(۳) اتحاف النبلاء: ص ۴۸　(۴) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۹۵

اور اس بات کا مطلب کہ ان دونوں کتابوں کی احادیث صحیح ہیں یہ بھی علامہ یمانی کی زبانی ہی سن لیجئے:

امام بخاری کا یہ کہنا کہ یہ احادیث صحیح ہیں اس کہنے کے مترادف ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عادل اور ضابط ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی شذوذ اور کوئی علت نہیں ہے۔

اگر واقعہ یہی ہے کہ ان کتابوں کی صحت میں بالا ہونے کی وجہ صرف اتنی بات ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عدالت وضبط کی صفات سے موصوف اور ان کی بیان کردہ روایات شذوذ اور علت کے داغ سے پاک ہیں اور اس کے علاوہ ان بزرگوں کی نہ قائم کردہ کوئی شرط ہے اور نہ اس کی وجہ تلقی بالقبول ہے تو پھر اصحیت کو ان کتابوں میں محدود کرنا اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ اس بناء پر کسی کتاب کو اصح کہنا کہ اس کے لکھنے والے بڑے بزرگ ہیں کوئی علمی اور تحقیقی بات نہیں ہے۔ اس لیے حافظ ابن الہمام کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

یہ خواہ مخواہ کی اُپج اور تقلید محض ہے کیونکہ اصحیت کا دارومدار تو صرف اس پر ہے کہ صحیحین کے راوی ان شرائط کے تحت ہیں جو ان کے مؤلفین کے پیش نظر ہیں۔ بالفرض اگر یہی شرطیں ان کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہوں اور اس کے راوی اسی معیار پر پورے اترتے ہوں تو پھر صحیحین کی حدیثوں کو اصح کہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔(۱)

اور صرف یہ حافظ ابن الہمام کا ہی خیال نہیں ہے بلکہ اس میں اور بھی حافظ ابن الہمام کے ہمنوا ہیں۔ حافظ ابن الہمام کے شاگرد علامہ ابن امیر الحاج نے یہاں عجیب نکتہ لکھ دیا کہ:

بخاری اور مسلم کا اصحیت میں مقابلہ بخاری اور مسلم کے بعد آنے والوں سے ہے۔ ان مجتہدین کی کتابوں سے ہرگز نہیں ہے جو امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے گزر چکے ہیں۔(۲)

ہے بھی یہ انصاف کی بات ورنہ بڑی ہی بے انصافی ہوگی کہ سلف مجتہدین کا مقابلہ بعد کے ان محدثین سے کیا جائے جو فضل وکمال، علم واجتہاد اور تحقیق وتنقید میں ان کے برابر نہ

(۱) فتح القدیر: ج۱ص ۳۱۷، التحریر: ج۳ص ۳۰ (۲) التقریر والتحبیر، ج۳ص ۳۰

تھے۔ شاید یہی چیز ہے۔ جس نے حکیم الامت شاہ ولی اللہ کو کتب حدیث میں مؤطا کی اصحیت کے اعلان پر مجبور کر دیا۔ نواب علامہ صدیق حسن خاںؒ فرماتے ہیں:

نزد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ومن قال بقولہ اصح کتب در حدیث وفقہ مؤطا است پستر بخاری پستر مسلم۔(۱)

شاہ صاحب نے اس کے ترجیحی دلائل اور وجوہ نہایت شرح وبسط سے اپنی مشہور کتاب مصفّیٰ میں بیان فرمائے ہیں۔ اسی ضمن میں علامہ زاہد کوثری کا ایک بیان بڑا ہی معنے خیز ہے۔ جو انہوں نے شروط الائمۃ الخمسہ کی تعلیقات میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخین ہوں یا اصحاب سنن سب کے سب حفاظ حدیث باہم معاصر ہیں اور تدوین فقہ اسلامی کے بعد منصہ شہود پر آئے ہیں اور حدیث کے ایک خاص حصہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا ہے ان سے پہلے ائمہ مجتہدین کے سامنے حدیث کی ساری انواع مرفوع' موقوف' مرسل اور صحابہ وتابعین کا وافر ذخیرہ تھا۔ کیونکہ نظر اجتہاد میں حدیث کی تمام انواع ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس دور کی جوامع اور مصنفات اس کی شاہد ہیں ان کی حدیث کی ساری قسمیں مذکور ہیں جن کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے اور ان جوامع کے مؤلفین ارباب صحاح ستہ سے پہلے ائمہ مجتہدین کے تلامذہ ہیں یا تلامذہ کے تلامذہ ہیں۔(۲)

بہرحال امام بخاری کی کتاب جس کا پورا نام خود امام بخاری کا تجویز کردہ ''الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ'' ہے اپنے دور کی ایک بہترین جامع تصنیف ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امام موصوف نے جہاں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں۔ انہوں نے فقہ کا بے شمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثار صحابہ اور احادیث مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط ظاہر ہو جائے پھر ہر باب میں ان احکام کے مناسب

---

(۱) مسک الختام: ج ۱ ص ۱۸ (۲) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۲

مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تا کہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمالاً نظر آ جائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھ کر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے اسی کے ساتھ قرآن اور حدیث کا ربط بھی معلوم ہو جائے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرین فقہ اور منکرین حدیث دونوں کا جواب بن جائے۔ فقہ کو برا کہنے والے احادیث سے مسائل کے استنباط کا طریقہ سیکھ لیں اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کا ماخذ معلوم کر لیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں:

کل ابواب الفقه لیس منها الا وله اصل فی القران تعلمه والحمدلله حاشا القراض۔(۱)

فقہ کے تمام موضوعات کی قرض کے علاوہ قرآن میں اصل موجود ہے۔

اس لحاظ سے گویا امام بخاری کی صحیح ان تمام علوم وفنون کا مجموعہ بن کر آئی جو اس دور تک اسلاف کی محنتوں سے منصۂ وجود پر آ گئے تھے۔ چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدثؒ فرماتے ہیں:

معلوم ہونا چاہیے کہ امام بخاری دو سو سال بعد رونما ہوئے اور ان سے پیشتر علماء علوم دینیہ میں مختلف فنون کی کتابیں تصنیف کر چکے تھے چنانچہ امام مالکؒ سفیان ثوری نے فقہ میں اور ابن جریج نے تفسیر میں' ابو عبید نے غرب قرآن میں اور محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیرت میں' عبداللہ بن المبارک نے زاہد ومواعظ میں' کسائی نے بدء الخلق میں اور یحییٰ بن معین نے صحابہ وتابعین کے حالات میں نیز متعدد علماء نے فن رویا' ادب' طب' شمائل' اصول حدیث' اصول فقہ اور رد مبتدعین پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ امام بخاری نے ان تمام مدونہ ومروجہ علوم کا ایک حصہ کہ جس کو انہوں نے بصراحت یا بدلالت ان حدیثوں میں پایا جو امام بخاری کی شرط پر تھیں اپنی کتاب میں درج کر دیا۔(۲)

حافظ ابوبکر بن موسیٰ حازمی فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) الموافقات: ج ۳ ص ۳۱۷ (۲) مکتوبات شاہ ولی اللہ: ص ۱۷۰

امام بخاری کا پیش نہاد صرف یہ تھا کہ حدیث کا ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ تمام احادیث کا استیعاب ان کا مقصود نہ تھا ان کی شرط صرف یہ تھی کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہیں ان کو درج کریں کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں صرف حدیثیں روایت کی ہیں۔(۱)

امام بخاری سے اس کتاب کو اگرچہ نو ہزار لوگوں نے سنا ہے لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا وہ چار بزرگ ہیں:

(۱) ابراہیم بن معقل (۲) حماد بن شاکر (۳) محمد بن یوسف الفربری (۴) ابوطلحہ منصور بن محمد لبزوری۔ ان چار میں پہلے دو بزرگ ابراہیم اور حماد مشہور حنفی عالم ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے شروع میں اپنا سلسلہ سند ان حضرات تک بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ومن طریق ابراهیم بن معقل بن الحجاج النسفی وکان من الحفاظ وله تصانیف۔ ومن طریق حماد بن شاکر النسوی۔(۲)

ان چاروں میں ابراہیم اور حماد کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ان کو امام بخاری سے جامع کی روایت کا سب سے پہلے موقعہ ملا ہے کیونکہ ابراہیم اور حماد کی وفات بالترتیب ۲۹۴ھ اور ۳۱۱ھ میں ہوئی جب فربری اور ابوطلحہ کی وفات ۳۲۰ھ اور ۳۲۹ھ میں ہوئی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ دونوں حنفی بزرگ امام بخاری کی کتاب کو ان سے روایت نہ کرتے تو جامع کی روایت کی ضمانت تن تنہا فربری پر رہ جاتی اور اس طرح روایتی نقطہ نظر سے صورت حال بڑی نازک ہو جاتی۔ علامہ کوثری نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

هذا البخاری لولا ابراهیم بن معقل النسفی و حماد بن شاکر الحنفیان لکا دینفرد الفربری عنه فی جمیع الصحیح سماعاً۔(۳)

بالفاظ دیگر ۳۱۱ھ تک امام بخاری کی صحیح کا روایتی مرکز صرف احناف ہی تھے۔ بہر حال

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص۴۳ (۲) فتح الباری: ج۱ ص۱ (۳) شروط الائمۃ الخمسہ: ص۴۳

امام بخاری کی کتاب جیسا کہ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ کتب الاسلام میں افضل اور اسنادی نقطہ نظر سے لوگوں کے لیے علم کا بہترین سرمایہ ہے۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موازنہ:

اس پر تو جیسا کہ آپ سن آئے ہیں سب ہی کا اتفاق ہے کہ صحیحین اپنے زمانے اور اپنے بعد کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

لاریب فی تقدیم الشیخین علی الأمۃ عصرھما ومن بعدھما فی معرفۃ الصحیح والعلل۔(۱)

اگر کچھ اختلاف ہے تو اس تقدیم کی علت اور بنیاد میں ہے کچھ کی رائے میں ان زبرگوں کا ان کتابوں میں التزام صحت اور کچھ کے خیال میں اس کی علت ان بزرگوں کو قائم کردہ شرطیں ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کی علت تلقی الامت بالقبول ہے۔ ان پر علماء کے مختلف خیالات آپ سن چکے ہیں۔ اصل بات سب کے یہاں تقریبا متفق علیہ کے صحیحین کا پایہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں بلند ہے۔ اس پر اتفاق کے بعد البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ دونوں میں سے از روئے صحت خالص محدثانہ نقطہ نظر سے کس کا مقام اونچا ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی اور عام علماء صحیح بخاری کو اصح قرار دیتے ہیں اور امام نووی نے صحت کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر اس کی تصویب کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحت کی عمارت جن دو مثبت اور دو منفی ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے وہ بتمامہ بخاری میں موجود ہیں۔ یعنی راویوں کی عدالت' اتصال سند کے ساتھ عدم شذوذ اور عدم علت قادحہ۔ عدالت وضبط کے لحاظ سے بخاری کا مقام مسلم سے اونچا ہے۔ اتصال کے پیش نظر بھی بخاری کو برتری حاصل ہے کیونکہ بخاری کے نزدیک صرف معاصرت کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ شاذ نہ ہونے اور علت نہ ہونے کی بنیاد پر بھی بخاری کا پلڑا بھاری ہے کیونکہ نقد و جرح میں بخاری کی روایات بہ نسبت روایات مسلم کے کم ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی اس کی ہمنوائی کی ہے

---

(۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ: ص ۸۱

اور اس کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مغاربہ کی رائے بجائے بخاری کے مسلم کے حق میں ہے اور ان مغاربہ میں حافظ ابن حزمؒ حافظ ابوعلی الحسین ابوعلی نیشاپوری وغیرہ داخل ہیں۔ چنانچہ شیخ ابومحمد القاسم بن القاسم تجیبی نے اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صحیح مسلم کو امام بخاری کی کتاب پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور مشہور مالکی محدث قاضی عیاض نے الالماع میں ابومروان طبنی سے نقل کیا ہے کہ میرے کچھ شیوخ صحیح مسلم کو ترجیح دیتے تھے۔(۱)

علامہ زرکشی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صرف کچھ کا نہیں بلکہ اکثر مغاربہ کا ہے چنانچہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

لایخفی ان ماقاله الزرکشی ان دائرة الخلاف اوسع والذاهبون الیٰ ترجیح مسلم اکثر ممن ذکر۔

بعض علماء نے مغاربہ کے اس میلان کی وجوہ بھی قلم بند کی ہیں۔ چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ:

امام ابوعلی نیشاپوری نے صحیح مسلم کو بخاری پر جو فوقیت دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب خاص اپنے شہر میں اپنے اساتذہ کی موجودگی میں لکھی وہ بیان وتحریر اور الفاظ میں بے حد محتاط تھے۔ برخلاف امام بخاری کے کہ وہ اکثر احادیث کو صرف حافظ کی مدد سے لکھتے اور راویوں کے الفاظ میں امتیاز نہ کرتے اسی وجہ سے آپ کو شک ہو جاتا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر ان کو شام میں پہنچ کر قلم بند کیا ہے۔(۲)

حافظ عسقلانی نے مغاربہ کے اس تاثر کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

میری رائے میں اس کا تعلق صحیح مسلم کی اصحیت سے نہیں بلکہ اس کی وجوہ کچھ اور ہیں ایک وجہ وہ ہے جو حافظ ابن حزم نے بتائی ہے کہ اس میں خطبہ کے بعد حدیث کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاری روایت بالمعنے کے قائل ہیں۔

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۴۵ (۲) توجیہ النظر: ص ۱۲۱

نیز وہ ایک حدیث کو ٹکڑے کر کے پیش کرنے کو درست سمجھتے ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ کتاب ایک جگہ قیام کی حالت میں نہیں بلکہ سفر میں لکھی ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر لکھنے کی نوبت خراسان میں آئی ہے اس وجہ سے بسا اوقات حدیثیں صرف حافظہ کے بھروسہ پر قلم بند کرتے اس لیے روایت باللفظ نہ ہوتی تھی بلکہ روایت تصرف کر کے اس کے مدلول و مدعا کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے تھے لیکن امام مسلم نے اپنی کتاب قیام کی حالت میں اپنے اساتذہ کے سامنے لکھی ہے وہ الفاظ میں بیحد محتاط اور روایت باللفظ کے پابند تھے۔(۱)

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام بخاری کی حمایت میں امام بخاری کے حامیوں کا لب ولہجہ ناگوار حد تک پہنچ گیا چاہیے تو یہ تھا کہ ان مغاربہ کی تنقیدات کا علمی اور تحقیقی جواب دیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ امام مسلم اور امام ابو علی نیشاپوری تک پر نہایت رکیک الزام لگائے اور ایسی زبان استعمال کی جو علمی زبان نہیں ہے اور نہ میدان تحقیق میں محققین کے شایان شان ہے۔ چنانچہ حافظ ابوسعید العلائی کو جب امام مسلم کی برتری کے بارے میں امام ابو علی کے تاثرات معلوم ہوئے تو فرمایا کہ:

امام ابو علی نیشاپوری کو صحیح کا پتہ ہی نہیں ہے۔(۲)

اور مشہور حاکم کبیر ابو احمد نے اس معاملہ میں حد کر دی۔ حافظ ابن حجر ان سے ناقل ہیں۔

اللہ محمد بن اسماعیل پر رحمتیں برسائے انہوں نے اصول پر تالیف کی اور لوگوں کے لیے بیان کیا ہے اور جس نے بھی آپ کے بعد کوئی کام کیا ہے وہ آپ ہی کی کتاب کے ذریعے کیا ہے جیسے امام مسلم انہوں نے امام بخاری کی کتاب کے زیادہ حصے کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا اور اس میں ایسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا کہ امام بخاری کا نام تک نہیں لیا۔

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۴۷ (۲) توجیہ النظر: ص ۱۴۲

حافظ ابن حجر نے صرف حاکم کبیر کی بات کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر حافظ دارقطنی کا وہ جارحانہ بیان بھی نقل کیا ہے جو امام مسلم کی جلالت شان کے سراسر خلاف ہے۔ لکھتے ہیں:

دارقطنی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاری نہ ہوتے تو امام مسلم کا نام تک نہ ہوتا۔

اس پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ:

امام مسلم نے امام بخاری کی کتاب لی ہے اور اسی کا مستخرج بنا کر اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ کر دیا ہے۔(۱)

انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ۔ امام مسلم کا حدیث میں جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ دارقطنی کی محض بدگمانی ہے جو سراسر واقعات کے خلاف ہے۔ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ امام بخاری کو حدیث کی معلومات جن اساتذہ سے حاصل ہوئی تھیں وہ ہی اساتذہ قریب قریب امام مسلم کے بھی تھے اور حدیث و روایت کا جو مجموعہ امام بخاری کے پیش نظر تھا وہ ہی کم و بیش امام مسلم کے بھی سامنے تھے۔ امام یحییٰ بن معینؒ امام احمد بن حنبلؒ امام علی بن المدینیؒ امام عبداللہ بن المبارکؒ امام اعظمؒ امام محمدؒ امام ابو یوسف کی جس قدر تصانیف امام بخاری کی نظر سے گذری ہیں۔ امام مسلم کی نظر سے بھی گذری تھیں۔ پھر یہ کہنا کس قدر بے انصافی ہے کہ امام مسلم جیسے امام کبیر نے جو کچھ اس فن میں لکھا وہ امام بخاری سے لے کر نقل کر ڈالا اور اس پر معاذ اللہ ان کی بددیانتی کا عالم یہ تھا کہ امام بخاری کا نام بھی نہیں لیا۔

حدیث میں امام مسلم کا بیان:

امام مسلم کا حدیث میں جو درجہ ہے اس کا اندازہ حافظ عصر ابوالعباس بن عقدہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے۔ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری و مسلم میں حدیث میں مقام کس کا اونچا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ دونوں عالم ہیں۔ سائل کہتا ہے کہ میں نے بار بار ان سے یہی سوال کیا تو فرمایا کہ:

---

(۱) مقدمہ فتح الباری

امام بخاری سے اہل شام کے بارے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتابیں لے کر مطالعہ کیا تھا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص مذکور ہوتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو یہ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کو علل میں غلطی بہت ہی کم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی تھیں اور مقطوع و مرسل روایات نہیں لکھی ہیں۔(۱)

یہی بات متاخرین محدثین میں سے جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے ذرا اور وضاحت سے پیش فرمائی ہے:

امام مسلم نے اپنی صحیح میں علم حدیث کے عجائبات کا خزانہ فراہم کیا ہے خصوصاً احادیث کی سندوں اور متون میں ایک بے مثال علمی نمونہ ہے اسی بنا پر صحیح حدیث کو ضعیف حدیث سے ممتاز کرنے میں امام بخاری کی کتاب کے مقابلے میں امام مسلم کی کتاب کو شرف تقدیم ہے۔ امام بخاری اہل شام کے بارے میں غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک شخص کو ایک جگہ کنیت سے اور دوسری جگہ نام سے ذکر کرتے ہیں اور اس طرح ایک ہی شخص کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی روایات اکثر اہل شام سے بطور مناولہ ہوتی ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ کسی مقام پر ایسی غلطی کا شکار نہیں ہوتے۔ صحیح بخاری کی حدیثوں میں تقدیم و تاخیر حذف و اسقاط کی وجہ سے متون احادیث میں پیچیدگی آجاتی ہے لیکن یہ بات صحیح مسلم میں نہیں ہے کیونکہ امام مسلم الفاظ حدیث کو بغیر کسی ترمیم کے اور رجال حدیث کو اس طرح لاتے ہیں کہ کبھی کوئی تحریف نہیں ہوتی ہے۔(۲)

صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے لیکن اس کی روایت کا سلسلہ جس بزرگ کے دم سے قائم رہا ہے وہ مشہور فقیہ حنفی شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد نیشاپوری ۳۰۸ھ ہیں۔ چنانچہ امام نووی مقدمہ شرح مسلم میں رقمطراز ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ترجمہ امام مسلم (۲) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ: ص ۱۴۴

اسناد متصل کے ساتھ امام مسلم سے اس کی مسلسل روایات کا سلسلہ ان شہروں اور اس زمانے میں صرف ابواسحاق ابراہیم بن محمد کی ذات سے وابستہ ہے۔

سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام:

امام نسائی نے اپنی سنن میں امام بخاری اور امام مسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور صرف صحیح روایات ہی کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب بخاری اور مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے اور اس کے ساتھ حسن ترتیب اور جودت تالیف کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے زہرالربی میں حافظ ابوعبداللہ بن رشید سے نقل کیا ہے کہ:

علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں یہ کتاب ان سب میں بلحاظ تالیف انوکھی اور باعتبار ترتیب بہترین اور مثالی ہے بخاری اور مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے نیز علل احادیث کا بھی ایک معتدبہ حصہ اس میں آ گیا ہے۔(۱)

حافظ ابوعلی النیشاپوری، حافظ ابن عدی، حافظ دارقطنی، حافظ عبدالغنی اور امام حاکم نے اس کتاب کی صحت کو سراہا ہے بلکہ حافظ ابن مندہ نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ:

الذین خرجوا الصحیح اربعۃ البخاری و مسلم و ابوداؤد و النسائی۔

یعنی جن چار نے صحیح احادیث کو روایت کیا ہے ان میں ایک امام نسائی بھی ہیں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:

ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے سعد بن علی الزنجانی سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ ثقہ ہے۔ عرض کیا کہ امام نسائی نے اس کی تضعیف کی ہے بولے کہ برخوردار! رجال کے بارے میں امام نسائی کی امام بخاری اور امام مسلم سے زیادہ کڑی شرطیں ہیں۔

لیکن حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کو اس دعویٰ کی صحت میں تامل ہے وجہ یہ ہے کہ حافظ

---

(۱) مقدمہ زہرالربی علی المجتبیٰ از سیوطی

ابن مندہ نے لکھا ہے کہ امام نسائی کی شرط یہ ہے کہ اس شخص سے حدیث روایت کریں گے جس کے ترک پر اجماع نہ ہوا ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اجماع سے اجماع عام مراد نہیں ہے بلکہ طبقات ناقدین میں سے ایک خاص طبقہ کا اجماع مراد ہے۔ حافظ سخاوی کے اس بیان سے جو انہوں نے اس موضوع پر الاعلان بالتوبیخ میں لکھا ہے۔ اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کی حدیث اس وقت تک نہ چھوڑی جائے گی جب تک اس راوی کے ترک پر سب کا ایکا نہ ہو جائے۔ امام نسائی کا مقصود یہ ہے کہ ناقدین میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ متشددین اور متوسطین۔ متشددین میں امام شعبہ اور سفیان ثوری ہیں۔ متعدلین میں یحییٰ القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی ہیں۔ تیسرے طبقے میں یحییٰ بن معین اور امام احمد ہیں۔ چوتھے طبقے میں ابو حاتم اور بخاری ہیں۔ امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک سب کا اس کے چھوڑنے پر اتفاق نہ ہو جائے یعنی اگر ایک راوی کو عبدالرحمٰن بن مہدی ثقہ بتاتے ہیں مگر یحییٰ القطان اس کی تضعیف کرتے ہیں تو اسے نہ چھوڑا جائے گا کیونکہ راویوں کے بارے میں یحییٰ کا تشدد معلوم ہے۔(۱)

اگرچہ صاحب تنقیح الانظار نے امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی کی اس بات:

> یاہنی ان لابی عبدالرحمن فی الرجال شرطاً اشد من شرط البخاری و مسلم۔

کی صحت سے انکار کیا ہے وراس کی ایک وجہ تو حافظ ابن مندہ کی بالا روایت کو قرار دیا ہے اور دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ اس روایت کو حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی نے ذکر نہیں کیا ہے اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے لیکن حافظ ذہبی نے تاریخ میں تصریح کی ہے کہ امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی نے جو کچھ کہا ہے صحیح ہے اور حافظ ذہبی کے علاوہ خود حافظ ابوالفضل بن طاہر مقدسی نے شروط الائمہ میں بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدین

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۶۸

فن کے نزدیک جلالت علمی کے لحاظ سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بھی اونچا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں:

فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم حدیث میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر مقدم کیا ہے۔(۱)

اور حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

یہ مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری اور امام ابوزرعہ کے ہم عصر ہیں۔

بہرحال امام نسائی بڑی جلالت قدر کے مالک ہیں ان کی کتاب سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب دراصل امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر النسائی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب کا اختصار ہے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ ان کے شاگرد حافظ ابوبکر بن السنی کے قلم کا رہین منت ہے اس کا نام المجتبیٰ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اختصر السنن وسماه المجتبى۔(۲)

کچھ کا خیال ہے کہ مجتبیٰ خود امام نسائی کی ہی تصنیف ہے۔ اس خیال کی تائید میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام نسائی نے جب سنن تصنیف فرمائی تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا۔ امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ اس میں جو کچھ ہے سب کچھ صحیح ہے امام نسائی نے جواب دیا نہیں اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لیے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے۔ تب امام نسائی نے اس کے لیے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی۔ اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن الاثیر نے جامع الاصول میں کیا ہے لیکن یہ کہانی محققین کے خیال میں صحیح نہیں ہے امیر یمانی نے حافظ ذہبی کی سیر الاعلام النبلاء کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

ان هذه الرواية لم تصح بل المجتبیٰ اختصار ابن السنی تلميذ النسائي۔(۳)

---

(۱) توضیح الافکار: ج ا ص ۲۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن السنی (۳) توضیح الافکار: ج ا ص ۲۲۱

امام نسائی کے اساتذہ میں بزرگ ترین ہستی مشہور محدث امام اسحاق بن راویہ کی ہے۔ امام اسحاق نے حدیث میں امام عبداللہ بن المبارک' جریر بن عبدالحمید' فضل بن عیاض کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہو گئے کہ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یہ تینوں امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اور امام نسائی سے جن لوگوں کو شرف تلمذ حاصل ہے ان میں حافظ ابو بشیر الدولابی اور حافظ ابو جعفر الطحاوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حافظ ابو بشیر الدولابی محمد بن احمد حدیث کے مشہور حافظ اور فن جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ طلب حدیث میں حسب تصریح حافظ ذہبی حرمین' عراق' مصر اور شام کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ: حدث عن اشیاخ فیھم کثرۃ بکثرت شیوخ سے حدیث بیان کی ہے۔(۱) امام بخاری سے بھی تلمذ حاصل ہے چنانچہ امام بخاری سے ان کی کتاب الضعفاء الصغیر کے راوی بھی ہیں۔ حافظ ابن یونس لکھتے ہیں:

کان الدولابی من اھل الصنعۃ حسن التصنیف۔

حافظ مسلمہ بن قاسم فرماتے ہیں:

کان مقدماً فی العلم والروایۃ و معرفۃ الاخبار۔

دولابی علم و روایت اور معرفت اخبار میں پیش پیش ہیں۔

اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

جالس العلماء و تفقہ لابی حنیفۃ۔

علماء کی ہم نشینی اختیار کی اور ابو حنیفہ کا فقہ حاصل کیا۔

فن حدیث میں جن اکابر حفاظ نے آپ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے۔ ان میں ابن عدی' طبرانی اور ابن المقری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنن ابی داؤد کا صحاح میں مقام:

امام ابو داؤد نے خود اپنی کتاب کا ایک خط میں تفصیلی تعارف کرایا ہے یہ خط اہل مکہ

---

(۱) المنتظم لابن الجوزی

کے خط کا جواب ہے۔جس میں انہوں نے کتاب السنن کی حدیثوں کے متعلق امام موصوف سے دریافت کیا تھا۔ظاہر ہے کہ اس موضوع پر امام موصوف کے بیان کو جو اہمیت ہے وہ کسی اور کے بیان کی نہیں ہو سکتی۔ہم یہاں اس رسالہ کا اقتباس نواب صدیق حسن خان کی کتاب الحطہ سے نقل کرتے ہیں۔

آپ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ کتاب السنن میں جو حدیثیں آئی ہیں کیا وہ میرے علم کے مطابق صحیح ترین ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔لیکن ایسی حدیثیں جو دو صحیح طریقوں سے مروی ہوں اور ان میں ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہو اور دوسری کا حفظ میں بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں کبھی پہلی کو لکھ دیتا ہوں اور بعض دفعہ میں نے ایک طویل حدیث کو مختصراً ذکر کیا ہے۔کیونکہ اگر میں اس کو پوری نقل کرتا تو بعض سامعین کو پتہ بھی نہ چلتا اور اس میں جو فقہ کا مسئلہ تھا وہ سمجھ میں نہ آتا۔اس بنا پر میں نے اختصار کیا اور جب کسی باب میں میں نے کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دہرایا ہے تو اس لیے کہ اس میں کوئی بات زیادہ تھی اور کبھی اس میں دوسری احادیث کی بہ نسبت ایک لفظ زیادہ ہوتا ہے۔اور جو حدیثیں میں نے اپنی کتاب السنن میں درج کی ہیں ان میں اکثر مشہور ہیں جو ہر اس شخص کے پاس موجود ہیں جس نے تھوڑا بہت حدیث کو لکھا ہے لیکن ان میں تمیز کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔(۱)

سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔مشہور محدث ابو یحییٰ ذکریا ساجی کے الفاظ ہیں:

کتاب اللہ عزوجل اصل الاسلام و کتاب السنن لابی داؤد عھد الاسلام۔(۲)

حافظ حمیدی کا بیان ہے کہ ایک روز حافظ ابن حزم کی مجلس میں صحیحین اور ان کی رفعت شان کا تذکرہ ہوا۔تو حافظ ابن حزم نے بتایا کہ حافظ سعید بن سکن کے پاس ایک محدثین

---

(۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ (۲) شروط الائمۃ الستہ: ص ۱۷

کی جماعت آئی اور انہوں نے کہا کہ علم حدیث میں کتابیں بہت زیادہ ہیں اگر شیخ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں اور بتائیں کہ ہم کون سی کتابوں کو اپنائیں تو بس ہم ان ہی پر اکتفا کرلیں۔ حافظ ابن سکن یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور گھر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کتابوں کے چار گٹھے اوپر نیچے رکھ کر لائے اور فرمایا:

ھذہ قواعد الاسلام کتاب مسلم' کتاب البخاری و کتاب ابی دائود و کتاب النسائی۔(۱)

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ جس حدیث پر امام ابو داؤد کلام نہ کریں وہ ان کے نزدیک صحیح ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ خود امام ابو داؤد کی تصریح یہ ہے کہ میں نے کتاب السنن میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو میرے علم میں ہر موضوع پر سب سے زیادہ صحیح ہیں اس سے حافظ ابن الصلاح اور امام نووی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن حدیثوں پر ابو داؤد نے کوئی کلام نہیں کیا ہے وہ قابل عمل ہیں اور ان کا مقام صحیح نہیں بلکہ حسن ہے۔ لیکن حافظ ابن رشید نے لکھا ہے کہ ابو داؤد کے کلام نہ کرنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ بہرحال محدثین کے یہاں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ وہ حدیثیں جن پر ابو داؤد نے کلام نہیں کیا صحیح ہیں یا حسن؟ علامہ یمانی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی:

فالصواب انه یحتمل الثلاثة الحسن والصحة و الوھن غیر الشدید لا کماقاله ابن الصلاح و لا کما قال ابن رشید۔

ٹھیک یہ ہے کہ تین باتوں کا احتمال ہے کہ صحیح ہوں' حسن ہوں یا پھر ضعیف لیکن کم درجے کی۔ نہ ابن الصلاح کے خیال کے مطابق اور نہ ابن رشید کی رائے کے موافق۔(۲)

علامہ خطابی نے سنن ابو داؤد کا تعارف کراتے ہوئے معالم السنن میں لکھا ہے کہ:
امام ابو داؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں ایسی عمدہ کوئی

---

(۱) شروط الائمۃ الستۃ: ص ۱۶ (۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۲۰۱

کتاب نہیں ہے اس نے سب کی جانب سے سند قبولیت حاصل کر لی ہے چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام فرقوں کی جانب سے اور فقہاء کے سارے طبقوں میں باوجود اختلاف کے حکم مانی جاتی ہے۔ سب لوگ اسی گھاٹ آتے ہیں اور یہیں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی پر اہل مصر۔ اہل عراق' بلاد مغرب اور روئے زمین کے بہت سے شہروں کے رہنے والوں کو اعتماد ہے۔ البتہ خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسماعیل' مسلم بن الحجاج اور ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو جمع صحیح میں ان دونوں حضرات کے قدم بقدم چلے ہیں اور جنھوں نے جانچ پڑتال میں ان کی شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ابو داؤد کی کتاب ترتیب کے اعتبار سے بہت اچھی اور بلحاظ فقاہت بہت اونچی ہے۔(۱)

فقاہت میں بہت اونچی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر مصنفین صحاح کے مقابلے میں امام ابو داؤد پر ذوق فقہی زیادہ غالب ہے۔ چنانچہ تمام ارباب صحاح میں صرف امام ابو داؤد ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جن کو علامہ ابو اسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے۔ اور امام موصوف نے اسی فقہی ذوق کی بنا پر اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام پر اکتفا فرمایا ہے۔ اگرچہ اس پابندی کی وجہ سے ان کی یہ کتاب احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہو گئی ہے لیکن احادیث فقہ کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے چنانچہ حافظ ابو جعفر غرناطی کے حوالے سے حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں:

لابی داؤد فی حصر احادیث الاحکام واستیعابها مالیس لغیره۔(۲)

احادیث احکام کے بیان میں جو مقام داؤد کا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہے۔

امام ابو داؤد کے اساتذہ بخاری اور مسلم کے ہی اساتذہ ہیں۔

اخذ الحدیث عن مشائخ البخاری و مسلم کاحمد بن حنبل۔

ابو داؤد نے بخاری و مسلم کے اساتذہ مثلاً امام احمد سے کسب فیض کیا ہے۔

---

(۱) معالم السنن: ج ۱ ص ۶ (۲) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ: ص ۱۲۵

ان اساتذہ میں امام احمد کی شخصیت اس صدی کے محدثین میں پدر بزرگوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید تیسری صدی کے محدثین میں کوئی ہو جس کا علمی نسب نامہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام موصوف سے نہ ملتا ہو بلکہ امام ذہبی نے امام احمد کے تمام تلامذہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت بتائی ہے:

کان یشبہ باحمد بن حنبل فی ھدیہ ودلہ وسمتہ۔(۱)

یہ خصوصیت امام ابوداؤد کو امام احمد کے دوسرے شاگردوں سے ممتاز کرتی ہے اور حدیث میں امام احمد کو جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں ہشیم بن بشیر' امام جریر بن عبدالحمید' امام ابوبکر بن عیاش' عباد بن العوام' وکیع بن الجراح' ابن نمیر' عبداللہ بن المبارک' یزید بن ہارون' عبدالرزاق بن ہمام اور یحییٰ بن ابی زائدہ وہ گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کو حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوداؤد امام اعظم کی مساعی جلیلہ کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے تھے حافظ ابن عبدالبر بسند متصل الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء میں ان سے ناقل ہیں۔

حدثنا عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن بن یحیی قال اخبرنا ابوبکر محمد بن بکر بن عبدالرزاق التمار المعروف بابن واسۃ قال سمعت ابا داؤد یقول رحم اللہ مالکاً کان اماماً رحم اللہ الشافعی کان اماماً رحم اللہ اباحنیفۃ کان اماماً۔(۲)

ابوداؤد کہتے ہیں اللہ مالک پر رحمت فرمائے امام تھے اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ بھی امام تھے۔

سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ:

امام ترمذی کی کتاب السنن ابوداؤد اور امام بخاری دونوں کے طریقوں کی جامع ہے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۱۵۳ (۲) الانتقاء: ص ۳۲

اس کی اس جامعیت کا کچھ اندازہ حافظ ابوبکر بن العربی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ جو عارضۃ الاحوذی میں ہے۔

اس کتاب میں حسب ذیل چودہ علوم ہیں۔ احادیث کی اس طرح تدوین جو عمل سے قریب تر کر دیتی ہے۔ بیان اسناد' تصحیح' تضعیف' تعدد طرق' جرح رواۃ اور تعدیل' راویوں کے نام اور کنیت کا بیان' وصل و انقطاع کا ذکر' معمول بہ اور متروک العمل روایات کی توضیح' احادیث کے رد و قبول کا معیار' اس موضوع پر علماء کے اختلاف کا ذکر' احادیث کی توجیہ و تاویل کے بارے میں اختلاف افکار کا بیان..... یہ وہ علوم ہیں کہ ان میں سے ہر علم اپنی جگہ مستقل ہے۔(۱)

حافظ جلال الدین السیوطی نے قوت المغتذی میں حافظ ابو جعفر بن الزبیر غرناطی سے ترمذی کی خالص محدثانہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

وللترمذی فی فنون الصناعة الحدیثیة مالم یشارکه غیره۔(۲)

فن حدیث میں امام ترمذی کی وہ شان ہے جس میں امام ترمذی کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

دراصل یہ امام ترمذی ہی کی خصوصیت ہے کہ ایک طرف انہوں نے اپنی کتاب میں احادیث احکام میں سے صرف ان احادیث کو لیا ہے کہ جن پر فقہاء کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف اس کو صرف احکام ہی کے لیے خاص نہیں کیا بلکہ امام بخاری کی طرح سب احادیث کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ علوم حدیث کی ایک سے زیادہ انواع کو کتاب میں اس طرح درج کیا ہے۔ کہ وہ علم حدیث کا ایک چمنستان بن گیا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:

جامع ترمذی حدیث کی تمام کتابوں میں بعض وجوہ سے سب سے اچھی ہے اول بلحاظ ترتیب۔ دوم فقہاء کے مذاہب کا تذکرہ۔ سوم حدیث کی بلحاظ اسناد قسمیں صحیح' حسن' ضعیف وغیرہ۔ چہارم راویوں کے نام' لقب اور کنیت وغیرہ اور ان وجوہ کے علاوہ اور بھی علم رجال سے متعلق فوائد ہیں۔(۳)

---

(۱) عارضۃ الاحوذی: ص ۴۴ (۲) مقدمہ ترمذی (۳) بستان المحدثین: ص ۱۰۹

صحیح کے ساتھ حسن اور غریب کی اصطلاح:

اب تک محدثین حدیث کی تقسیم صحیح اور ضعیف میں محصور کرتے تھے امام ترمذی بقول حافظ ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح اور ضعیف کے درمیان حسن کی اصطلاح قائم کی ہے اور حسن کی تعریف بھی خود امام ترمذی نے کتاب العلل میں یہ بتائی ہے:

ہر ایسی حدیث جس کی سند میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور حدیث شاذ بھی نہ ہو اور ساتھ ہی کئی طریقوں سے اسے روایت کیا گیا ہو۔

لیکن اس تعریف کی بنیاد پر یہاں اس سوال کو محدثین کے یہاں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اگر امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی یہی تعریف ہے اور حسن خود صحیح کی قسم نہیں بلکہ قسم ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ صحیح کی دو قسمیں ہیں صحیح حسن اور غریب۔ تو اس صورت میں ایک ہی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ: هذا حديث حسن صحيح یا هذا حديث حسن صحيح غريب۔ ظاہر ہے کہ حدیث کی تقسیم اگر فرق مراتب بتانے کے لیے ہوتی ہے تو ایک حدیث میں ایک ہی وقت میں اعلیٰ اور ادنیٰ مراتب کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے؟ علماء نے اس کے ایک سے زیادہ جوابات دیئے ہیں۔

کچھ کہتے ہیں کہ اگر ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہو تو امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ یہ حدیث ایک سند سے صحیح اور دوسری سے حسن ہے۔

لیکن جب امام ترمذی ایک حدیث کے بارے میں یہ کہہ کر لانعرفه الامن هذا الوجه پھر یہ فیصلہ فرمادیں کہ: هذا حديث حسن صحيح تو یہ معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ جواب سوال کو حل نہیں کرتا ہے۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ حسن صحیح ایک جگہ کہہ کر امام ترمذی متن اور سند دونوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے حملۂ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث بلحاظ متن حسن اور بلحاظ سند صحیح ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اسے بھی محل نظر قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اپنی جو رائے حافظ صاحب نے لکھی ہے وہ بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں کہ:

حسن اور صحیح دونوں ملے جلے ہیں اور حسن صحیح کا مقام امام ترمذی کی نظر میں حسن سے بالا اور صحیح سے کمتر ہوتا ہے اس لیے حکم کے لحاظ سے صرف صحیح اس حدیث سے زیادہ قوت والی ہے جسے حسن صحیح کہہ دیں۔(۱)

لیکن حافظ عراقی نے حافظ ابن کثیر کی رائے کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:

والذی ظهر له تحکم لا دلیل علیه وهو بعید من فهم معنی کلام الترمذی۔(۲)

ابن کثیر کی رائے ایک اُپج ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ترمذی کا کلام اس کا ساتھ دیتا ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی وہ رائے بہت پسند آئی ہے جو جناب علامہ احمد محمد شاکر نے الباعث الحثیث میں ان سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

دراصل امام ترمذی کی نظر میں حسن ذرا صحیح سے عام ہے ایک حدیث کبھی حسن ہوتے ہوئے صحیح ہوتی ہے اور کبھی صحیح نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف حسن ہی ہوتی ہے کیونکہ حسن کے معنے ان کے نزدیک مقبول اور معمول بہ کے ہوتے ہیں۔ اسی کے لیے امام مالک کے یہاں علیه العمل ببلدنا کی تعبیر ہے۔ ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی ہو اور اس کی پشت پر صحابہ وتابعین کی عملی تائید نہ ہو وہ امام ترمذی کی زبان میں صرف صحیح کہلاتی ہے اور ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی ہو اور اسے عملی تائید بھی حاصل ہو وہ حسن صحیح کہلاتی ہے اور جو سند کے لحاظ سے قوی نہ ہو مگر اسے عملی تائید حاصل ہو اس کو صرف حسن کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر امام ترمذی نے حسن صحیح نیز حسن اور صحیح کی تعبیرات یہ بتانے کے لیے اختیار کی ہیں کہ کتاب میں لوگوں کے سامنے احادیث اور احادیث پر خیر القرون صحابہ وتابعین کا عمل یکجا ہو کر سامنے آ جائے اس لیے امام ترمذی ان تمام حدیثوں کو جن کی پشت پر صحابہ وتابعین کی عملی تائید ہو حسن کہتے ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا وجہ صحت سے گری ہوئی ہوں۔ اور اگر احادیث کو عملی تائید حاصل نہ ہو تو اسے امام ترمذی حسن نہیں کہتے چاہے وہ صحیح ہوں۔(۳)

---

(۱) اختصار علوم الحدیث: ص ۴۳　(۲) شرح المقدمہ: ص ۴۷　(۳) الباعث الحثیث: ص ۴۳

ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال:

یہاں اس سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ:

امام ترمذی ایک حدیث کی تضعیف بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے حالانکہ یہ بات محدثین کے مقررہ اصول وقواعد کے سرتاسر خلاف ہے کیونکہ احکام میں محدثین حدیث صحیح اور حسن کے علاوہ کسی بھی حدیث کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ترمذی میں ایسے ایک سے زیادہ مقامات ہیں جہاں حدیث کے بارے میں ایک طرف امام ترمذی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں ترمذی میں باب الجمع بین الصلاتین میں یہ حدیث لائے ہیں:

حدثنا ابو سلمة یحییٰ بن خلف البصری ناالمعتمر بن سلیمان عن ابیه عن حنش عن عکرمه عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من جمع بین الصلاتین من غیر عذر فقد اتی باباً من ابواب الکبائر۔

جس نے بغیر عذر کے دو نمازوں کو یکجا کیا ہے۔ اس نے بڑے گناہوں میں سے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔

اور اس کے بعد اسی حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے:

قال ابو عیسیٰ حنش هذا هو ابوعلی الرحبی وهو حسین بن قیس وهو ضعیف عند اهل الحدیث ضعفه احمد وغیره۔

حنش کی کنیت ابوعلی اور نام حسین بن قیس ہے اور یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے امام احمد نے اس کی تضعیف کی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

والعمل علیٰ هذا عنداهل العلم ان لا یجمع بین الصلاتین الا فی السفر او بعرفة۔(۱)

---

(۱) سنن ترمذی: ج۱ص۲۶

اس قسم کے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس طرز عمل سے ایک بے حد اہم اور کارآمد محدثانہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں۔ کہ حدیث اگرچہ ہم کو روایتی اور اسنادی طرز پر کمزور طریقہ سے پہنچی ہے لیکن اسے اہل علم کی تائید حاصل ہے۔ اور اہل علم کا کسی حدیث کو اپنا لینا بھی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے چاہے روایت کی دنیا میں اسے قابل اعتماد اسناد کی قوت حاصل نہ ہو۔ یہی بات حافظ جلال الدین السیوطی نے امام ترمذی کے اس طرز اور انداز سخن سے سمجھی ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب حدیث بالا اور اس کے متعلقہ نوٹ پر رقمطراز ہیں:

اشار بذالک الیٰ ان الحدیث اعتضد بقول اهل العلم وقد صرح غیر واحد من اهل العلم بان من دلیل صحة الحدیث قول اهل العلم به وان لم یکن له اسناد یعتمد علی مثله۔(۱)

امام ترمذی نے یہ بات بتائی ہے کہ حدیث میں اہل علم کے قول سے قوت آ گئی اور اس کی بے شمار علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں کی صحت میں برتری کا دارومدار ابن الصلاح اور دوسرے متاخرین محدثین کے نزدیک ان کے التزام صحت اور شرائط پر نہیں بلکہ اس شہرت اور قبول پر ہے جو امت کی جانب سے ان دونوں کتابوں کو حاصل ہے تو پھر یہ ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ شہرت اور قبول میں بذات خود صحت کی ضمانت ہے چنانچہ ایک سے زیادہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ حافظ سیوطی تدریب الراوی میں رقمطراز ہیں کہ:

یحکم للحدیث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول و ان لم یکن له اسناد صحیح۔

حدیث کو صحیح قرار دیا جاتا ہے جب اسے لوگ شرف قبول عطا کر دیں چاہے اس کی کوئی صحیح سند نہ ہو۔(۲)

---

(۱) تعقبات علی الموضوعات: ص ۱۲ (۲) تدریب الراوی: ص ۲۴

حافظ ابن عبد البر نے التمہید میں حضرت جابرؓ کی اس مرفوع حدیث پر کہ:

الدینار اربعة و عشرون قیراطاً

لکھا ہے کہ علماء کی جماعت کا اسے اپنا لینا اور رائے عامہ کا اس پر مجتمع ہونا اس حدیث کو سند سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الافصاح علیٰ نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے کہ:

حدیث کے مقبول ہونے کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ علماء اس حدیث کے مدلول پر متفق ہو جائیں کیونکہ وہ قابل ہوتی ہے تا آنکہ اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے ائمہ اصول میں سے ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

جب کسی ضعیف حدیث کو امت شرف قبول عطا فرما دے اس پر عمل کیا جائے گا تا آنکہ اسے حدیث متواتر کا ایسا مقام حاصل ہو جائے گا جس سے قطعی الثبوت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔(۱)

بعینہ یہی سوال علامہ عصر محدث شیخ حسین بن محسن یمانی سے بھی کیا گیا ہے انہوں نے اس سوال کا جواب مفصل دیا ہے اور یہ معجم طبرانی صغیر کے آخر میں التحفۃ المرضیہ فی حل بعض المشکلات الحدیثیہ کے نام سے ملحق ہے اور تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے جواب کا لب لباب یہی ہے کہ ضعیف حدیث وہ ہے۔

حیث لم یکن فی سندہ کذاب

بہرحال امام ترمذی نے یہ بات سمجھائی ہے کہ حدیث مقبول وہ ہے جسے اہل علم کی تائید حاصل ہو اور وہ قابل عمل ہے چاہے وہ ہم تک پہنچنے میں کمزور وسائل کا شکار ہو گئی ہو۔ اس لحاظ سے امام ترمذی کی کتاب کو دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

امام ترمذی نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے ان میں امام بخاری' قتیبہ بن سعید' محمد بن غیلان' احمد بن منیع' محمد بن المثنیٰ' ہناد اور ابو زرعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں

---

(۱) فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث ص ۱۲۰

اور یہ سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ امام اعظمؒ کے تلامذہ سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔ امام بخاری کے متعلق تو آپ سن آئے ہیں کہ قتیبہ بن سعید کے اساتذہ میں امام مالک کے ساتھ لیث بن سعد اور شریک کا ذکر کیا ہے اور لیث بن سعد اور شریک سے امام اعظمؒ کا جو رشتہ ہے وہ تاریخ میں کوئی چھپی بات نہیں ہے۔ احمد بن منیع ' ہشیم ' عباد بن عوام اور عبداللہ کے واسطہ سے امام اعظم سے ملتے ہیں اور خود امام اعظم سے ملتے ہیں اور خود امام ترمذی کے تلامذہ میں سرفہرست جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں حماد بن شاکر اور عبد بن محمد بھی ہیں۔ دونوں نسفی ہیں۔ اول الذکر ان چار میں سے ایک ہیں جن سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا ہے یہ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔ محمود بن غیلان کو بیک واسطہ امام اعظمؒ سے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب العلل میں امام اعظمؒ سے جو روایت کی ہے کہ:

حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحییٰ الحمانی قال سمعت ابا حنیفہ یقول مارایت احدا اکذب من جابر الجعفی ولا افضل من عطاء بن ابی رباح ۔(۱)

تو اس سے بھی ان کا امام اعظمؒ سے بواسطہ ابو یحییٰ تلمذ ثابت ہے۔ ابو یحییٰ کے بارے میں حافظ ذہبی نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں۔

صحاح ستہ میں ابن ماجہ کا مقام:

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب حسن ترتیب میں ممتاز ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:

فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار و اختصار آنچہ کتاب دارد' ہیچ یک از کتب ندارد۔

فی الواقع اپنی حسن ترتیب اور احادیث کے بغیر تکرار بیان کرنے اور اختصار میں اس کتاب کی کوئی کتاب بھی ہمسر نہیں ہے۔

---

(۱) بستان المحدثین: ص ۱۱۲

اور اس کتاب کی یہی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر حافظ ابوزرعہ رازی کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے:

میرا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ گئی تو یہ جوامع یا ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گی۔(۱)

ابن الاثیر نے کتاب کی اس افادی حیثیت کو ان لفظوں میں سراہا ہے۔

كتابه كتاب مفيد قوى النفع فى الفقه۔

صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کا پایہ کتب خمسہ جیسا نہیں ہے۔ کتب خمسہ کے بارے میں اگرچہ آپ حافظ ابوطاہر مقدسی کا یہ بیان سن چکے ہیں:

قد اتفق على صحتها علماء الشرق والغرب۔(۲)

لیکن حافظ عراقی کو ابوطاہر سے اس میں اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں:

جو شخص کتب سنن کو صحیح کہتا ہے جیسے ابوطاہر نے کتب خمسہ کی صحت پر اتفاق کا اعلان کیا ہے اور جیسے حاکم کی ترمذی کی کتاب کو الجامع الصحیح کہتا ہے اور ایسے ہی خطیب۔ یہ تساہل ہے۔(۳)

اور حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ:

ابن ماجہ حافظ، صدوق اور واسع العلم ہے لیکن ان کی سنن کا درجہ کمتر ہونے کی وجہ اس کتاب میں مناکیر اور قدرے موضوعات ہیں۔

حافظ سیوطی نے ابن رشید سے نقل کیا ہے:

ابن ماجہ میں تفردات ہیں اور ایسے لوگوں کی روایات پر مشتمل ہیں جن پر کذب کی اور احادیث کی چوری کی تہمت ہے۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

امام ذہبی نے ابن ماجہ میں کچھ احادیث کے موضوعہ ہونے کا جو پتہ دیا ہے اس سے

---

(۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ: ص ۱۱۰ (۲) انتصار علوم الحدیث (۳) شرح الالفیہ: ص ۱۰۴

ان کی مراد یہ ہے کہ احادیث باطلہ کم ہیں ورنہ جہاں تک احادیث ضعیفہ کا مسئلہ ہے وہ تو ابن ماجہ میں کم از کم ایک ہزار حدیثیں ہیں۔(۱)

اسی بنا پر حافظ ابوالحجاج المزی کا فیصلہ یہ ہے کہ:

ان الغالب فیما تفرد به الضعف۔(۲)

ابن ماجہ کے تفردات میں زیادہ تر ضعف ہے

لیکن اس کے باوجود علمائے متاخرین نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ شمار کیا ہے کیونکہ ضعیف روایتوں کا ہونا ابن ماجہ کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں کم ہیں اور ابن ماجہ میں زیادہ ہیں۔ اور ان سب کتابوں کو باوجود ضعیف روایات ہونے کے صحاح ستہ تغلیبا کہا جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے۔ جناب علامہ فاضل نواب صدیق حسن خانؒ مسک الختام میں فرماتے ہیں:

ان چھ کتابوں کو اصول ستہ، صحاح ستہ، کتب ستہ اور امہات ستہ کہتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات میں فرمایا ہے کہ چھ کتابیں جو اسلام میں مشہور ہیں یہ ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔ اور کچھ کی رائے میں بجائے ابن ماجہ مؤطا ہے اور صاحب جامع الاصول نے مؤطا ہی کو اختیار کیا ہے اور ان کتابوں میں حدیث (۳) کی قسمیں صحیح، حسن اور ضعیف سب موجود ہیں اور ان کو صحاح کہنا محض تغلیبا ہے۔

مؤلفین صحاح کے نقطۂ نظر کا اختلاف:

اگرچہ ایک ہی موضوع پر ان بزرگوں کا یہ تصنیفی کارنامہ ہے ان کے شیوخ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان کے سامنے تالیفی سرمایہ بھی ایک ہی تھا۔ اس کے باوجود ان بزرگوں نے جدا جدا میدان تصنیف میں جو دار تحقیق دی ہے۔ اس میں ان کا ایک خاص نصب العین، خاص مطمع نظر اور خاص پیش نہاد ہے ایک ہی موضوع پر ایک ہی قسم کی حدیثوں کو الگ الگ پیش کرنے میں ایک گہری معنویت ہے۔

---

(۱) زہر الربی: ص ۴ (۲) توضیح الافکار (۳) مسک الختام: ج ۱ ص ۱۷

امام بخاری کا نقطۂ نظر:

امام بخاریؒ کا مطمع نظر اپنی صحیح میں احادیث صحیحہ کا استیعاب نہیں ہے کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں:

لم اخرج فی ھذا الکتاب الا صحیحا وما ترکت من الصحیح اکثر۔
میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث روایت کی ہیں اور زیادہ صحیح احادیث میں نے چھوڑ دی ہیں۔(۱)

امام حازمی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ امام بخاری کا مقصود احادیث صحیحہ کا ایک اختصار تیار کرنا ہے احادیث صحیحہ کا استیعاب ان کے پیش نظر نہیں ہے۔

علامہ زاہد کوثری نے امام بخاری کا مطمع نظر وضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ:

صحیح میں امام بخاری کی غرض صرف یہ ہے کہ احادیث صحیحہ متصل کی تخریج کی جائے اور اس کے ساتھ ان احادیث سے فقہ' سیرت اور تفسیر کے مسائل کا استنباط کیا جائے۔ اور استشہاد میں صحابہ' تابعین اور فقہاء' کی آراء سے مدد لی جائے اسی بنا پر وہ متون احادیث میں تقطیع بھی کرتے ہیں۔(۲)

علامہ نواب صدیق خاں نے بھی امام بخاری کا یہی مطمع نظر بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

امام بخاری نے صحت احدیث کے ساتھ فقہی فوائد اور حکیمانہ نکتوں کے استنباط کا بھی التزام کیا ہے۔(۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

امام بخاری نے محسوس کیا کہ ان کی صحیح فقہی فائدوں اور حکیمانہ نکتوں سے مالا مال ہو۔ آپ نے اپنی سمجھ کے مطابق متون احادیث سے بہت سے نت نئے معانی نکالے ہیں اور ان ہی معانی کی مناسبت سے احادیث کو ایک سے زیادہ بابوں میں

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۰ (۲) التعلیقات علی الحازمی: ص ۵۰ (۳) الحطہ: ص ۸۳

الگ الگ کر کے پیش کیا ہے۔(۱)

اور امام نووی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری کا مقصد صرف احادیث کا تعارف نہیں ہے بلکہ کتاب میں ان کا اصلی پیش نہاد یہ ہے کہ احادیث سے احکام استنباط کیے جائیں اور زندگی کے مختلف مسائل کے لیے ان سے استدلال کیا جائے اسی وجہ سے بہت سے ابواب اسناد سے خالی ہیں۔(۲)

بہر حال امام بخاری کا مطمع نظر صحیح میں صرف احادیث صحیحہ کا انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں۔

امام مسلم کا مطمع نظر:

امام مسلم کا بھی اپنی صحیح میں یہ مقصد نہیں کہ ساری صحیح حدیثوں کا کتاب میں استیعاب کیا جائے بلکہ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ان حدیثوں کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح طرق کی فراہمی کی جائے اور صرف صحیح حدیثوں کو یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ خود امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس بات کی توضیح کر دی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں:

جمع فیہ طرقہ التی ارتضاھا فاختار ذکرھا و اورد فیھا اسانیدہ المتعددۃ و الفاظہ المختلفۃ۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک حدیث کے اپنی پسند کے سارے طریقوں کو یکجا کر کے ذکر کر دیا ہے اور اس کو متعدد سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے۔(۳)

علامہ زاہد کوثری نے اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے:

امام مسلم کا مقصد صرف صحیح حدیثوں کو پیش کرنا ہے ان کے پیش نظر احادیث سے مسائل کا استنباط نہیں ہے وہ ایک حدیث کے سارے طرق کو ایک ہی جگہ صرف اس

---

(۱) الہدی الساری: ٦ (۲) مقدمہ فتح الباری: ص ۱۲ (۳) الحطہ: ص ۹۹

لیے سمیٹ دیتے ہیں تا کہ دیکھنے والے کے سامنے متون کا اختلاف اور اسانید کی نیرنگی بہترین شکل میں نمایاں ہو کر آ جائے۔(۱)

بہر حال امام مسلم کا پیش نہاد صرف حدیث کی اسنادی اور روایتی حیثیت کو نکھار کر پیش کرنا ہے۔

امام ابوداؤد کا تالیف میں مقصد:

امام ابوداؤد کا مطمع نظر اپنی سنن میں صرف ان احادیث کو یکجا کرنا ہے جن سے فقہاء نے استدلال کیا ہے اور جن پر فقہاء کے مذاہب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کے میدان میں صرف ابوداؤد کافی ہے۔

حافظ ابوبکر الخطیب فرماتے ہیں کہ:

ابوداؤد کی سنن علم دین میں بے مثال کتاب ہے اسے فقہاء اور محدثین کے یہاں یکساں مقبولیت کا شرف حاصل ہے۔ عراقیوں، مصریوں اور اہل مغرب کا اسے اعتماد ہے۔ ابوداؤد سے پہلے بے شک علماء نے جوامع اور مسانید تالیف کیے ہیں اور ان میں سنن، اخبار، قصص، مواعظ اور ادب کا علمی خزانہ تھا لیکن سنن کو خالصاً کسی نے بھی ایسا پیش نہیں کیا جیسا کہ ابوداؤد نے۔(۲)

امام خطابی ابوداؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی کتاب میں اصول علم، امہات السنن اور احکام فقہ پر مشتمل حدیث کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کی مثال نہیں ہے۔(۳)

حافظ ابن القیم الجوزی فرماتے ہیں کہ:

کتاب ابوداؤد کا اسلام میں ایک خاص مقام ہے اس کی حیثیت مسلمانوں میں ایک جج کی اور نزاع وجدال میں ایک قاضی کی ہے کیونکہ اس میں فقہ کی احادیث کا بھر

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۴۹ (۲) الحطہ: ص ۱۰۶ (۳) معالم السنن: ج ۱ ص ۱۳

پور سرمایہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ حسن ترتیب اور حسن نظم میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجروحین اور ضعفاء کی حدیثوں کو خوب نکھار دیا ہے۔(۱)

امام ابوعیسیٰ ترمذی کا پیش نہاد:

امام ترمذی کا پیش نہاد جامع ترمذی میں یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو یکجا کیا جائے یعنی ابواب کے ذریعے استنباط مسائل کا نمونہ بخاری کے طرز پر ہو اور احادیث صحیحہ کے انتخاب میں امام مسلم کی ترجمانی کی جائے اور اس کے ساتھ ابوداؤد کے قدم بقدم چل کر صحابہؓ تابعین اور فقہاء کے مذاہب کو پوری وضاحت سے بیان کیا جائے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ طرق حدیث میں ایک کا تفصیلی اور باقی کا اجمالی خاکہ پیش کر کے حدیث کا محدثین کے یہاں جو مقام ہے اسے معین کر دیا جائے۔ گویا امام ترمذی کی کتاب ایک معجون مرکب ہے جس میں تینوں کتابوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

علامہ زاہد کوثری فرماتے ہیں:

امام ترمذی کا مطمع نظر بخاری اور مسلم کے دو طریقوں کو ایک جگہ پیش کرنا ہے گویا امام ترمذی کو شیخین کا یہ طریق بیان و ابہام میں بھایا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ ابوداؤد کے طریقے کو بھی اپناتے ہیں اور اس پر ان کی جانب سے یہ اضافہ بھی ہے کہ صحابہؓ تابعین اور فقہاء امصار کے مذاہب کو بیان کرتے ہیں۔ طرق حدیث میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے ایک کو بیان کر کے باقی کی طرف اشارہ فرما دیتے ہیں اور ہر حدیث کے بارے میں بتاتے ہیں کہ صحیح ہے یا حسن اور یا منکر۔ ضعف کی وجہ بتاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ حدیث مستفیض ہے یا غریب۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس پر کچھ فقہاء نے عمل نہ کیا ہو۔ سوائے ان دو حدیثوں کے: **فان شرب فی الرابعة فاقتلوه** اور **جمع بین الظهر والعصر بالمدينة من غير خوف ولا سفر**۔(۲)

---

(۱) تہذیب السنن: ج ۱ ص ۸ (۲) التعلیقات علی شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۰

امام نسائی کا کتاب کی تالیف میں مسلک:

اس کتاب میں امام نسائی کا مسلک یہ ہے کہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو انوکھے انداز میں پیش کر کے بیان علل میں خاص طریق پیش کیا جائے۔ شاید اسی بنا پر مغرب کے بعض محدثین صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی رقم طراز ہیں کہ:

بعض مغاربہ نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو بخاری پر فضیلت ہے۔(۱)

اور اسی لیے ناقدین فن کے نزدیک جلالت علمی کے اعتبار سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بھی بڑھا ہوا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے۔(۲)

حافظ ابوعبداللہ بن رشید نے امام نسائی کا اس کتاب میں مسلک یہ بتایا ہے کہ:

یہ کتاب علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں فضیلت کے لحاظ سے انوکھی اور بلحاظ ترتیب بہترین ہے اور یہ بخاری اور مسلم دونوں کے طریق کی جامع ہے نیز علل حدیث کا بھی ایک حصہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔(۳)

امام ابن ماجہ کا مطمع نظر:

امام ابن ماجہ کا مطمع نظر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسائل فقہیہ پر مشتمل چند در چند متنوع عنوانوں کے ساتھ بغیر تکرار کے ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے سامنے آ جائے۔

شاہ عبدالعزیز بستان المحدثین میں فرماتے ہیں:

فی الواقع ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کی پیش کش اور اختصار کا نمونہ جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی۔

---

(۱) فتح المغیث: ص ۱۲　(۲) ہدی الساری: ص ۸　(۳) زہر الربی از سیوطی: ص ۸

صحاح ستہ کی علمی خدمت:

چونکہ علماء نے ان چھ کتابوں کی مختلف طریقوں سے علمی خدمت کی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے اسی سلسلے کی دو اہم کڑیاں پیش کریں۔ ان کا نام مستخرجات اور اطراف ہے۔

مستخرجات صحیحین اور استخراج کے فوائد:

محدثین کی اصطلاحی زبان میں استخراج جیسا کہ حافظ عراقی اور حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے لکھا ہے کہ:

ان یاتی المصنف الی الکتاب فیخرج احادیثہ باسانید لنفسہ من غیر طریق صاحب الکتاب۔

مصنف کوئی حدیث کی کتاب لے اور اس میں مندرج حدیثوں کو اپنی سندوں سے روایت کرے اور یہ صاحب کتاب سے الگ ہو۔

اس میں شرط یہ ہے کہ مستخرج خود صاحب کتاب سے کوئی حدیث روایت نہ کرے بلکہ صحیح سند کے ساتھ اوروں سے روایت کرے۔ چنانچہ صاحب تنقیح الانظار فرماتے ہیں:

شرط المستخرج لا یروی حدیث البخاری و مسلم عنھما بل یروی حدیثھما عن غیرھما۔(۱)

محدثین نے استخراج کے فوائد پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ چند فوائد یہ ہیں:

- اس کے ذریعے حدیث میں زیادۃ الفاظ کوئی تشریح یا کسی محذوف کی تعیین ہو جاتی ہے۔
- کبھی مستخرج کی حدیث کی سند اصل سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔
- کثرت طرق کی وجہ سے حدیث میں قوت آجاتی ہے اور احادیث میں باہم تعارض کے وقت یہ قوت ترجیح میں بہت مفید کام کرتی ہے۔ یعنی تعارض کے وقت اس حدیث کو راجح

(۱) تنقیح الانظار: ج اص ا ۷

قرار دیا جاتا ہے جس کے طرق زیادہ ہوں اور کثرت طرق معلوم کرنے کا ذریعہ محدثین کے یہاں استخراج ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ استخراج کے ان کے علاوہ اور بھی بہت فائدے ہیں:

(اول) مخرجین کی عدالت بھی اس سے صاف اور منقح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

(دوم) کسی بھی روایت میں سماع کی تصریح مل جائے تو عنعنہ کے ذریعے پیدا شدہ ایہام تدلیس کا شبہ دور ہو جاتا ہے۔

(سوم) احادیث میں ایک بڑا اور اہم مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو آخر عمر میں اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاف حافظہ کی خرابی' بیماری یا کسی اور افتادہ کی وجہ سے ہو جاتا ہے اصل کتاب میں آمدہ روایت کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ قبل از اختلاف ہے۔ یا بعد از اختلاف۔ استخراج یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ روایت کس دور سے متعلق ہے۔

(چہارم) اصل کتاب کے متن یا سند کے بارے میں ابہام ہوتا ہے۔ استخراج میں تصریح آ جاتی ہے اور اس طرح چہرۂ ابہام بے نقاب ہو جاتا ہے۔

(پنجم) کبھی اصل کتاب کی حدیث میں راوی کے الفاظ خاص ہوتے ہیں باقی روایتوں کو صاحب کتاب مثلہ یا نحوہ کہہ کر آگے چل دیتا ہے۔ استخراج کے ذریعے اس میں امتیاز ہو جاتا ہے۔

(ششم) احادیث کی سند یا متن میں گاہ گاہ راوی کی جانب سے ادراج ہوتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ استخراج کے ذریعے ادراج منقح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

(ہفتم) حدیث بظاہر مرفوع ہوتی ہے لیکن واقعہ میں وہ موقوف ہوتی ہے۔ استخراج اس معاملے میں قاضی کا کام کرتا ہے۔(۲)

امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں یعنی صحیحین کے جو مستخرجات لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

---

(۱) تنقیح الافکار: ج ۱ ص ۷۱　(۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۷۳

- مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن ابراہیم الاسماعیلی الجرجانی ا۳۷ھ
- مستخرج حافظ ابو احمد محمد بن ابی حامد الغطریفی ۳۷۷ھ
- مستخرج حافظ ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن ابی ذہل ۳۷۸ھ
- مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن موسیٰ مردویہ الاصبہانی ۴۱۶ھ
- مستخرج حافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی ۳۱۶ھ
- مستخرج حافظ محمد بن محمد النیشاپوری ۳۸۰ھ
- مستخرج حافظ ابو الفضل احمد بن سلمہ البزار ۲۸۶ھ
- مستخرج حافظ ابو نعیم الاصبہانی ۴۳۰ھ

احادیث صحیحین کے طرق واسانید کی تعداد:

سارے مستخرجات کا یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے کہ اس سلسلے میں محدثین نے کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ حافظ زین الدین عراقی' حافظ ابن الصلاح اور حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق صحیح بخاری میں آمدہ حدیثوں کی تعداد تکرار کو چھوڑ کر صرف چار ہزار ہے۔ اور امام نووی اور حافظ ابن کثیر کی رائے کے مطابق صحیح مسلم میں حدیثوں کی تعداد بھی چار ہزار ہے۔ لیکن استخراج کی وجہ سے ان چار ہزار حدیثوں کو جن جن طریقوں سے روایت کیا گیا ہے اور حدیثوں کی یہ تعداد جن اسانید کے ذریعے آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی تعداد صرف چار ہزار نہیں بلکہ پچیس ہزار چار سو اسی ہے۔ چنانچہ محمد بن اسماعیل الیمانی رقم طراز ہیں:

صحیحین کے سارے طرق اور اسانید کی تعداد کے بارے میں حافظ ابن حجر نے حافظ جوزقی کی المتفق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کا استخراج کیا ہے۔ تمام طرق اسانید کی مجموعی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ہوئی ہے۔(۱)

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ص ۶۱

اللہ اکبر! صرف چار ہزار ارشادات نبوت امت کو پچیس ہزار چار سو اسی طریقوں اور اسانید سے ملے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے بڑے انبوہ نے ان ارشادات کے یاد کرنے میں کوئی کوتاہی کی ہوگی۔ نظر کو بلند کیجئے اور ان لوگوں کی محنتوں اور عرق ریزیوں کی داد دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔ حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لیے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بداہۃً علم کا فائدہ دے سکے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد مقرر نہیں ہے اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں اور ان کے بارے میں ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر ان کے لالچ یا خوف کو کوئی دخل ہے۔ پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں۔ وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے۔ تو ہمیں ان کی سچائی کا بدیہی طور پر یقین آ جائے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے حالات سے روزمرہ کی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے کسی کی موت، ولادت، نکاح، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔(۱)

بہر حال صحیحین کے طرق واسانید کی یہ تعداد بتا رہی ہے کہ احادیث صحیحین صحیح ہیں اور یہ صرف صحیحین کی خصوصیت نہیں بلکہ دوسری کتابوں کے بھی مستخرج لکھے گئے ہیں۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں:

مستخرج صحیحین ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ محمد بن عبدالملک نے سنن ابی داؤد کا، ابوعلی الطوسی نے ترمذی شریف کا اور ابونعیم نے ابن خزیمہ کی کتاب کا مستخرج لکھا ہے۔(۲)

صحیحین اور دوسری کتابوں کے اطراف:

محدثین کی زبان میں مسانید اور اطراف دونوں میں مرکزی توجہ روایت کنندہ صحابی پر ہوتی ہے یعنی ہر صحابہ کی مرویات کو بلا لحاظ مضمون یکجا کیا جاتا ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے

(۱) توجیہ النظر (۲) تدریب الراوی: ص۸۲

کہ مسانید میں پوری حدیث بیان کرتے ہیں مگر اطراف میں صرف حدیث کا کوئی مشہور حصہ بیان کر کے شیخین اور سنن کے تمام مشترک اور مخصوص طرق کا ذکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حدیث کے شروع سرے کو اتنا بیان کرکے کہ جس سے باقی حدیث کی یاد دہانی ہو جائے اس کی تمام اسانید کو بالاستیعاب بیان کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا پتہ دے دیا جاتا ہے کہ جن میں یہ حدیث مروی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے حفاظ حدیث نے داد تحقیق دی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جن بزرگ نے صحیحین پر اطراف لکھے ہیں وہ حافظ ابو مسعود دمشقی ۴۰۱ھ ہیں۔ ان کے بعد حافظ ابو محمد خلف بن محمد ۴۰۱ھ، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر نے بھی یہ علمی خدمت انجام دی ہے۔

صحیحین کے علاوہ کتب خمسہ کے اطراف حافظ احمد بن ثابت ازوی نے بھی لکھے اور کتب ستہ کے اطراف لکھنے والے یہ بزرگ ہیں:

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ، حافظ ابو الحجاج جمال الدین المزی ۷۴۲ھ، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی الحسینی الدمشقی، حافظ ابو القاسم بن عساکر، حافظ سراج الدین ابو ابو حفص عمر بن نور الدین علی بن احمد الانصاری المعروف بابن الملقن ....

اس کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابوں کے اطراف لکھے گئے ہیں۔ حافظ ابن طاہر نے امام اعظم کی احادیث پر اطراف لکھے ہیں جس کا نام اطراف احادیث ابی حنیفہ ہے۔

دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین حدیث:

ہم نے بالا رادہ تیسری صدی کے محدثین میں ارباب صحاح کے تالیفی کارناموں پر ذرا کچھ تفصیلی تبصرہ کیا ہے کیونکہ اس صدی میں فن حدیث کے ارتقاء کا یہ وہ نقطہ کمال ہے جہاں پہنچ کر علم حدیث ایک فن کی حیثیت سے ہر قسم کی قوت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا اور اس فن کا ایک ایک شعبہ محدثین کی محنتوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس صدی کے محدثین اور ارباب روایت نے حدیث کی خاطر خشکی اور تری کو چھان مارا اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں جا کر تمام منتشر اور پراگندہ روایتوں کو جمع کیا اور اس طرح مسانید وجود میں آ گئے۔ صحت سند کی چھان بین کی گئی۔ اسماء الرجال کی

تدوین ہوئی، جرح و تعدیل نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی تا آنکہ صحاح جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کے بازار میں آ گئیں۔

چونکہ تیسری صدی میں اسنادی وسائط کا دامن زیادہ سے زیادہ وسیع ہو گیا حتیٰ کہ جو حدیث دوسری صدی میں صرف دو واسطوں سے معلوم ہوتی تھی وہ تیسری صدی میں چھ اور سات واسطوں کی محتاج ہو گئی۔ اس دور کے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف توجہ کرنی پڑی اور اسماء الرجال کا عظیم الشان فن مدون ہوا۔

ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا ایک واقعہ اور حقیقت کا اقرار ہے کہ:

نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت ہم آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ (ترجمان السنہ: ص ۱۷۰)

محدثین نے اس کام کے لیے بڑے جتن کیے اور پاپڑ بیلے ہیں۔ ہر ہر راوی کے پورے پورے حالات معلوم کیے۔ اس کے نتیجے میں ہر روایت کے بارے میں اسناد کے لیے بلحاظ قوت و ضعف صحت و بطلان اور اتصال و انقطاع نئی نئی بحثیں پیدا ہو گئیں اور حدیث کے فن میں نت نئی اصطلاحات منصۂ شہود پر آ گئیں۔

بنا بریں تیسری صدی کے محدثین کی راہ علم حدیث کے سلسلے میں دوسری صدی کے محدثین سے کچھ ممتاز ہو گئی کیونکہ دوسری صدی کے محدثین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار اتباع تابعین کے تلامذہ تھے اور اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت تھی لیکن تیسری صدی میں روایت میں اسنادی وسائط پہلے سے کئی گناہ زیادہ ہو گئے تھے اس لیے تیسری صدی کے محدثین کو نئے حالات اور جدید تقاضوں کے تحت اپنی شاہراہ بنانی پڑی۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں میں اس کا نمایاں طور پر ظہور ہوا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اس پر قدرے تفصیل سے بحث کریں تاکہ ناظرین کے سامنے خالص روایتی نقطہ نظر سے دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین فرق نمایاں ہو کر آ جائے اور ان اختلافی حدود کی نشاندہی ہو جائے جس کی بنا پر علم حدیث کو یہ حالات درپیش آئے ہیں۔ سب سے پہلے اس

موقعہ پر نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا وہ بیان پیش کر دیں جس سے ان دونوں صدیوں کے محدثین کے طرز عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ شاہ صاحب تیسری صدی کے مؤلفین کا چہرہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

غرض احادیث کی تدوین اور ان کو رسالوں اور کتابوں میں لکھنے کا رواج تمام اسلامی شہروں میں اس قدر عام ہو گیا کہ محدثین میں شاید ہی ایسے حضرات تھے جن کے پاس حدیث کا کوئی مجموعہ رسالہ یا کتاب نہ ہو۔ ہر شخص ان میں سے حدیث دربغل کا مصداق تھا۔ بڑے بڑے علماء نے حدیث کی خاطر حجاز' شام' عراق' مصر' یمن اور خراسان کی خاک چھان ماری۔ کتابیں جمع کیں نسخے تلاش کیے۔ احادیث غریبہ اور نوادر و آثار کو بہت محنت سے فراہم کیا اور ان کی توجہ سے وہ احادیث منصۂ شہود پر آ گئیں جو پہلے نہ تھیں اور ان کو وہ بات اس علم میں نصیب ہوئی جو پہلے کسی کو نصیب نہ تھی اور احادیث کی سندیں اس کثرت سے وجود میں آ ئیں کہ بہت سی حدیثوں کی سینکڑوں سندیں معلوم ہو گئیں۔ اسانید کی کثرت نے بہت سی مستور اسانید سے پردہ ہٹا دیا ہر حدیث کی غرابت اور شہرت کا پتہ لگ گیا۔ متابعات اور شواہد وجود پذیر ہو گئے وہ احادیث سامنے آ ئیں جن سے پہلے ارباب فتویٰ باخبر نہ تھے اور باخبر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی حدیثوں کو خاص خاص شہر والے ہی روایت کرتے ہیں۔ مثلاً شام والے' عراق والے یا پھر خاص گھرانے کے آدمی روایت کرتے ہیں جیسے بریدہ کی کتاب اور عمرو بن شعیب کا رسالہ۔ یا پھر مثلاً کوئی روایت بیان کرنے والا صحابی غیر مشہور ہے اور اس سے چند حضرات کے سوا کسی نے روایت نہیں سنی ہے۔ تیسری صدی کے محدثین سے پہلے لوگ اسماء الرجال اور مراتب عدالت کے بارے میں صرف اپنے مشاہدے اور قرائن پر اعتماد کرتے تھے لیکن محدثین نے اسی کو موضوع بنا کر خوب چھان بین کی اور بحث و تدوین کے ذریعے اسے مستقل فن بنا دیا اس کے نتیجے میں حدیث کا اتصال و انقطاع واضح ہو گیا۔ (۱)

---

(۱) الانصاف: ص ۳۳ تا ص ۳۵

آیئے شاہ صاحبؒ ہی کی زبانی دوسری صدی کے محدثین کا بھی حال سن لیجئے۔ وہ انصاف اور حجۃ اللہ میں رقمطراز ہیں کہ:

اس طبقہ کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا جائے چاہے وہ مرسل ہو یا مسند۔ نیز صحابہ وتابعین کے اقوال سے استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنا لیا تھا یا پھر حکم منصوص سے ان کا استنباط تھا یا اپنی آراء سے ان کا اجتہاد تھا۔ اور ہر صورت میں صحابہ وتابعین اپنے طرز عمل کے اعتبار سے بعد میں آنے والوں سے کہیں بہتر تھے اور کہیں زیادہ صائب الرائے تھے۔ نیز زمانے کے لحاظ سے سب سے مقدم اور علم کے اعتبار سے سب سے بڑھ چڑھ کر تھے لہٰذا سوائے اس صورت کے کہ ان میں باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کے قول کے صریح خلاف ہو۔ ہر حال میں ان کے اقوال پر عمل کرنا لازم ہے اور جس صورت میں کسی بھی مسئلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مختلف ہوں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ کسی حدیث کے نسخ کے قائل ہوتے یا اس کو ظاہری معنے سے پھیر دیتے یا اس کے بارے میں کوئی تصریح نہ کرتے لیکن ترک حدیث یا اس پر عمل نہ کرنے میں متفق ہوتے تو ان کے نزدیک یہ بات حدیث کے معلل ہونے یا منسوخ ہونے اور یا پھر مؤول ہونے کی علامت ہوتی.......... بہر حال ان سب صورتوں میں اس طبقہ کے علماء نے صحابہ کا اتباع کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے کتے کے برتن میں منہ ڈالنے والی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ **جاء الحدیث ولا ادری ماحقیقته؟** حدیث تو ہے مگر مجھے اس حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ امام مالکؒ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر فقہاء کو عمل کرتے نہیں دیکھا ہے۔ اور جب صحابہ وتابعین کے مذاہب میں بھی اختلاف ہوتا تو ہر عالم کے نزدیک اپنے ہی اہل شہر اور اپنے

اساتذہ کا مذہب مختار سمجھا جاتا۔ کیونکہ وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح اقوال سے باخبر ہوتا
اور جو اصول ان اقوال کے مناسب ہوتے ان کو محفوظ رکھتا۔(۱)

اسی روشنی میں دوسری صدی کے مؤلفین نے اپنے مسائل کی تدوین کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہی بات قرۃ العین میں پورے زور سے کھول کر سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

اور جو شخص ان مذاہب کے اصول سے واقفیت رکھتا ہے اس بارے میں شک نہیں کر سکتا کہ ان مذاہب کی اصل و اساس فاروق اعظمؓ کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان ایک مشترک چیز ہے۔ اس کے بعد مدینہ والوں میں فقہاء صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرؓ اور عائشہؓ ہیں اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سبعہ اور صغار تابعین میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالکؒ کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ پر اعتماد اکثر حالات میں اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے فیصلوں پر کچھ حالات میں بشرطیکہ حضرت علیؓ کے ان فیصلوں کو نقل کرنے والے عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب ہوں اور اس کے بعد امام ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابو حنیفہؒ کے مذاہب کی بنیاد ہے۔(۲)

آپ نے شاہ صاحبؒ کی زبان سے دوسری اور تیسری صدی کے علماء محدثین میں فرق و امتیاز اور خطوط اختلاف پڑھ لیے ہیں۔ یقیناً آپ اس موازنہ سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین ایک سے زیادہ مسائل علم حدیث کی حدود کے اندر رونما ہو گئے تھے۔ حدیث کی صحت' تعلیل حدیث' جرح و تعدیل رواۃ' حدیث کے رد و قبول' تحمل و سماع حدیث' شہرت و غرابت حدیث' وجوہ ترجیح اور مختلف احادیث میں مفاہمت' شرح حدیث اور خود حدیث کے آئینی اور قانونی مقام جیسے اہم مسائل میں تیسری صدی کے مؤلفین نے اپنی راہ بالکل نئی بنالی۔

---

(۱) الانصاف (۲) قرۃ العین: ص ۱۷۱' ص ۱۷۲

دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار:

اصول میں حدیث صحیح کی یہ تعریف کی گئی ہے:

الصحیح ما اتصل سندہ بنقل عدل ضابط عن مثلہ من غیر شذوذ ولا علۃ قادحۃ۔(۱)

حدیث صحیح کی یہ تعریف حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی نے کی ہے۔
اگرچہ اس تعریف سے امام خطابی صاحب معالم السنن کو اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ: **مااتصل سندہ و عدلت نقلتہ**
اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامہ محدثین کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے:

سند میں اتصال ہو، راویوں میں عدالت اور ضبط ہو اور حدیث شاذ اور معلل نہ ہو۔

اور امام خطابی راویوں کی عدالت اور سند کے اتصال کے علاوہ کوئی شرط نہیں بتاتے۔ یہ تیسری صدی کے محدثین کا فیصلہ ہے اور اسے ہی حافظ ابن الصلاح نے محدثین کا اتفاقی موقف قرار دیا ہے۔ اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور دو منفی مثبت یعنی اتصال سند، عدالت اور ضبط اور منفی یعنی شاذ نہ ہونا اور معلل نہ ہونا امیر یمانی فرماتے ہیں کہ محدثین کے یہاں صحیح کی تعریف میں یہ پانچوں چیزیں بنیادی ہیں۔

ان پانچوں میں سے اتصال کی قید تیسری صدی کے محدثین نے اس لیے اضافہ کی ہے کہ ان کے زمانے میں اسنادی وسائط زیادہ ہو گئے تھے ان واسطوں میں باہم کڑیاں معلوم کرنا اور پھر ان میں باہم اتصال کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ امام بخاری نے اتصال کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ دو راویوں کا صرف معاصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک بار ہی ہو۔ مگر معاصرت کے ساتھ ملاقات ہو تو پھر وہ معنعنہ سے روایت کو قبول کر لیتے ہیں ورنہ وہ اتصال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنے اس نظریہ کی توضیح تاریخ میں کی ہے اور صحیح میں ان کا اسی پر عمل ہے۔

---

(۱) تنقیح الانظار ص ۱۴

قد اظہر البخاری ہذا المذہب فی التاریخ وجری علیہ فی الصحیح۔(۱)

لیکن امام مسلم نے اتصال کے معاملے کو اس قدر سنگین نہیں بنایا بلکہ وہ اس سنگینی پر امام بخاری پر برہم بھی نظر آتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر دونوں میں معاصرت ہو تو پھر ملاقات کی شرط بے سود ہے معاصر دوسرے معاصر سے اگر روایت معنعنہ سے پیش کرے تو اسے اتصال پر محمول کیا جائے گا اور اس پر صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک بصیرت افروز نوٹ لکھا ہے:

ان بزرگوں نے اتصال کو اتنی اہمیت اس لیے دی ہے کہ اسانید کے سلسلہ میں وسائط کی بہتات کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ایک ایک راوی کے بارے میں ان کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی کہ جس سے وہ روایت لیتا ہے وہ اس کا معاصر ہے یا نہیں ہے۔ معاصر ہے تو اس سے اس کی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں۔ اور اگر ملا ہے تو اس نے یہ خاص حدیث اس سے سنی ہے یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ دے دیا ہے ایسے بہت سی امور کی پابجائی میں محدثین کو جان کی بازی لگانی پڑی ہے۔ لیکن دوسری صدی کے مؤلفین کو چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار اتباع تابعین سے شرف تلمذ تھا اس لیے ان کو نہ اسناد کے بارے میں تحقیقات کی زیادہ ضرورت پیش آئی اور نہ ان کے یہاں اتصال کو اس قدر اہمیت تھی۔ ان کے یہاں مسند و مرسل کی کوئی تفریق نہ تھی مرسل بھی مسند کی طرح حجت تھی۔

حدیث مرسل محدثین کی اصطلاح میں وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو واسطہ ہے اس کو بیان کیے بغیر قال رسول اللہ کہے جیسا کہ عام طور پر مکحول دمشقی، ابراہیم، سعید بن المسیب اور حسن بصری اور دیگر تابعین کے معمول تھا۔ پھر اگر راوی نے دو راویوں کے درمیان جو شخص واسطہ ہے اسے چھوڑ دیا جیسے ایک شخص حضرت ابوہریرہؓ کا ہم عصر نہ ہونے کے باوجود کہے قال ابوھریرۃ تو اسکی روایت محدثین کی زبان میں منقطع کہلاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ واسطے حذف کر دیئے تو اسے معضل کہتے ہیں اور فقہاء و اصولیین کے یہاں ان سب کو مراسل کہتے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ فتح الباری

حدیث مرسل اور دوسری صدی کے ائمہ حدیث:

حدیث مرسل کے بارے میں تیسری صدی میں ارباب روایت نے اپنا موقف دوسری صدی کے مؤلفین سے اتصال کی خاطر الگ بنا لیا ورنہ تیسری صدی سے پہلے اسنادی وسائط ہونے کی وجہ سے سب ہی حدیث مرسل کو دین میں مسند کی طرح حجت مانتے تھے اور مسائل وفتاوی کی بنیاد اسی پر قائم تھی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول پر متفق تھے ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی بھی امام سے دوسری صدی کے اختتام تک اس کا انکار ثابت نہیں ہے۔(۱)

علامہ یمانی نے حافظ ابن جریر کا یہ فیصلہ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ بلقینی سے نقل کیا ہے۔ امام ابوداؤد نے اپنے اس خط میں جو اہل مکہ کے نام لکھا ہے مرسل حدیث کے بارے میں اقرار کیا ہے کہ:

باقی رہیں احادیث مرسلہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو گذشتہ علماء مثلاً سفیان ثوری' امام مالک' امام اوزاعی سب ہی قابل استدلال سمجھتے تھے تا آنکہ امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر لب کشائی فرمائی اور امام احمد نے بھی اس موضوع پر ان کا اتباع کیا۔(۲)

بلکہ حافظ ابن جریر تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ کہنا کہ مرسل حجت نہیں ہے:

بدعة حدثت بعد المائتین۔ (تیسری صدی کی بدعت ہے)

واقعہ یہ ہے کہ دوسری صدی کے بزرگوں کو غلبۂ عدالت کی وجہ سے اپنے زمانے کے بزرگوں پر ایسا ہی اعتماد تھا۔ جیسا اس زمانے میں ابن حجر اور دارقطنی کو بخاری ومسلم پر ہے۔ کیونکہ اس دور میں عدالت غالب تھی چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

ولاشک ان الغالب علی حملة العلم النبوی فی ذالک الزمان العدالة۔

بے شک اس زمانے میں اہل علم میں عدالت غالب تھی۔

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۲۹۱ (۲) تعلیقات علی شروط الائمة الخمسة: ص ۴۵

یہ حقیقت ہے کہ ایک متدین' متقی اور پرہیزگار شخص سے امید بھی یہی کی جا سکتی ہے کہ اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے اطمینان کے بعد ہی اٹھایا ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا دراصل اللہ سبحانہ' کی طرف منسوب کرنا ہے۔ جس کے دین و ایمان' سیرت و کردار پر بھروسہ کیا جاتا ہو کیا اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ قصداً اللہ کے دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کر دیں گے جسے وہ جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت درست نہیں ہے یقیناً ایک حیثیت سے یہ افتراء علی اللہ اور قول علی اللہ بغیر علم ہے اور قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اسے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً ان سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے۔ اسی بناء پر ان بزرگوں کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں:

مراسیل الصحابة والتابعین والمة الحدیث مقبولة۔(۱)

سوچا جائے کہ ائمہ حدیث کے مراسیل آج بھی ہمارے یہاں کیا اسی بنا پر مقبول نہیں ہیں؟ ائمہ حدیث کی جو کتابیں آج رائج ہیں کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اصول حدیث کے مقررہ اصول کے مطابق ان کا اتصال ثابت ہے؟ اب ان کتابوں کی مرویات کو ان کتابوں کے مؤلفین تک جن اسانید تک پہنچاتے ہیں اور جن رجال کے ذریعے ہم تک پہنچ رہی ہیں کیا ان کی عدالت' ثقاہت' امانت' حفظ و ضبط کی ہم نے اسی طرح چھان بین کی ہے جس طرح امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اساتذہ سے لے کر صحابہ تک کی ہے۔ ان کتابوں کی مرویات کو ان کی طرف منسوب کرنے کی ہمارے پاس اس کے سوا دلیل ہی کیا ہے کہ:

والدلیل علی ذالک ان العلماء مازالوا ینسبون فی مصنفاتھم الاحادیث الی من اخرجھا۔

اس بات کی اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمیشہ سے علماء اپنی تصانیف میں حدیثوں کو ان محدثین کی طرف نسبت کرتے رہے ہیں۔(۲)

(۲،۱) الروض الباسم ص ۱۷

اس لیے جیسا کہ ہمیں ان ائمہ حدیث کی بیان کردہ حدیثوں پر باوجود اتصال نہ ہونے کے اعتماد ہے ایسا ہی امام مالک کو سعید بن المسیب کے اور امام ابوحنیفہ کو امام شعبی اور ابراہیم نخعی کے روایت کردہ ارشادات پر اعتماد تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

ابراہیم نخعی نے ایک موقعہ پر جب کہ انہوں نے یہ حدیث روایت کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور ان سے کہا گیا تھا کہ کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہی نہیں۔ کہا کہ کیوں نہیں؟ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ قال عبداللہ اور قال علقمۃ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اسی طرح شعبی۔ جس وقت ان سے ایک حدیث کی بابت سوال کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص تک اس کو نقل کیا جائے کیونکہ اگر روایت میں کمی وبیشی ہوگی تو وہ بعد کے شخص پر ہی رہے گی۔ (۱)

بہرحال دوسری صدی کے مؤلفین کے یہاں حدیث کے صحیح ہونے کے لیے مسند ہونا ضروری نہ تھا بلکہ وہ مرسل اور منقطع سب کو یکساں دین میں حجت قرار دیتے تھے۔

اگرچہ مرسل کا انکار تیسری صدی کے محدثین نے اسنادی وسائط میں زیادتی کی وجہ سے اپنے خیال میں احتیاط کی بنا پر کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو متعدد مسائل میں جہاں مرسل کے علاوہ اور کوئی روایت مسند ان کے علم میں نہ تھی اگلے ائمہ سے اختلاف کرنا پڑا۔ متاخرین میں دارقطنی اور بیہقی بڑے نامور محدث گذرے لیکن ان دونوں کا حال یہ ہے کہ سند پر سند اور روایت پر روایت ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ضعیف ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اسے مرسل ثابت کریں یا موقوف کہہ دیں۔

یہ نہ بھول جایئے مصنفین صحاح میں سے اگرچہ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں لیکن یہ تمام ارباب صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں:

---

(۱) الانصاف

فاذالم یکن مسند ضد المرسل ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج به ولیس هو مثل المعضل فی القوة۔

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل سے احتجاج کیا جائے گا اور وہ قوت میں معضل کی طرح نہ ہوگی۔(۱)

مراسیل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علمائے کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب القرأت میں لکھتے ہیں کہ مراسیل صحابہ حجت ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مراسیل صحابہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حجت ہیں۔ اور ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علمائے کرام کے نزدیک مرسل صحابی حجت ہے۔(۲)

اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ:

صحابہ کرام کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں۔(۳)

کبار تابعین کے بارے میں امام بیہقی نے تصریح کی ہے کہ:

مراسیل کبار تابعین بھی مراسیل صحابہ کی طرح حجت ہیں جبکہ ان کے راویوں میں عدالت اور شہرت ہو اور کمزور و مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب ہو۔(۴)

اس موقعہ پر حافظ ابو سعید صلاح الدین العلائی نے جامع التحصیل لاحکام المراسیل میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے:

جن لوگوں نے احادیث میں عنعنہ سے کام لیا ہے اور ان پر تدلیس کا شبہ ہے۔ وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ کچھ تو اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس زمرہ میں شمار ہی نہیں ہو سکتے مثلاً یحیٰی بن سعید، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ۔ کچھ ایسے ہیں جن

---

(۱) رسالہ ابی داؤد (۲) شرح مہذب: ج ۴ ص ۶۸۲ (۳) نیل الاوطار: ج ۱ ص ۳۶۱

(۴) کتاب القرأۃ: ص ۱۴۳۔ واضح رہے کہ ان تصریحات کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کسی نہ کسی انداز میں سب مانتے ہیں کہ مراسیل دین میں حجت ہیں اختلاف تفصیلات میں ہے نفس مسئلہ میں نہیں ہے۔

کی تدلیس کو ائمہ نے برداشت کیا ہے اور ان کی روایت لی ہے چاہے انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور ایسا صرف ان کی جلالت شان اور امامت کی وجہ سے ہے مثلاً امام زہری' امام اعمش' ابراہیم نخعی' حکم بن عتیبہ' جریج' الثوری' ابن' شریک اور ہثیم بن بشیر۔ ان کی روایات صحیحین میں موجود ہیں۔(۱)

موسیٰ بن عقبہ کی صحیح بخاری میں روایت موجود ہے لیکن اسماعیل نے تصریح کی ہے کہ ان کا امام زہری سے سماع ثابت نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ابان بن عثمان کی بحوالہ عثمان بن عفان روایت موجود ہے حالانکہ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ابان نے عثمان سے نہیں سنا ہے اس انقطاع کے باوجود ان روایات کا کتابوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں بھی مرسلات کو شرف حاصل ہے۔

اس موقعہ پر ہمیں حافظ ابن رجب حنبلی کی وہ بات پسند آئی ہے جو مشہور علامہ زاہد کوثری نے ان سے نقل کی ہے اور جس کے ذریعے انہوں نے مرسلات کے موضوع پر دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

دونوں کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے محدثین کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے محدثانہ اور روایتی نقطۂ نظر سے انقطاع اور عدم اتصال کی بنا پر اگر کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور وہ مرسل ہے تو وہ درجہ صحت میں آجائے اور فقہاء یعنی دوسری صدی کے محدثین کی نظر اس کی اسناد پر نہیں بلکہ ان معنے پر ہوتی ہے جو حدیث مرسل میں بیان ہو رہے ہیں اور اس کی پشت پر ایسے قرائن موجود ہیں جو ان معنے کی صحت کی دلیل ہیں۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ محدثین کی نظر اسناد پر ہوتی ہے اور دوسری صدی کے محدثین کے پیش نظر صرف معنی ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایسے دور میں ہیں۔ جس میں اسناد کی تحقیق کی چنداں ضرورت ہی نہیں ہے۔

---

(۱) جامع التحصیل لاحکام المراسیل بحوالہ شروط: ص ۴۲

(۲) تعلیقات علی شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۴۵

افراد وغرائب اور تیسری صدی کے محدثین:

چونکہ تیسری صدی کے محدثین نے اتصال کو صحت حدیث کا معیار بنالیا تھا اس لیے انہوں نے ہر نادر نوشتے اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگایا۔ مختلف اسلامی شہروں کے افراد و غرائب فراہم اور تمام پریشان اور غیر متداول روایات جمع کر لیں اور طرق و اسانید کی ذریعے تمام علوم اسلامی جواب تک خاص خاص سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے یکجا ہو گئے۔ دوسری صدی کے مؤلفین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے جو اہل علم میں متداول تھیں۔ قاضی ابو یوسف نے ایسے موقعہ کے لیے یہ جچا تلا معیار پیش فرمایا تھا کہ:

الرواية تزداد كثرة ويخرج منها مالا يعرف ولا يعرفه اهل الفقه ولا يوافق الكتاب ولا السنة فاياك وشاذ الحديث وعليك بما عليه الجماعة من الحديث وما يعرفه الفقهاء وما يوافق الكتاب والسنة۔

روایات میں بلحاظ کثر اضافہ ہوگا اور غیر معروف حدیثیں منصۂ شہود پر آئیں گی۔ جن کو نہ اہل فقہ جانتے ہیں اور جو نہ کتاب وسنت کے موافق ہیں۔ تم حدیث شاذ سے بچ کر رہنا اور صرف اس حدیث کو اپنانا جو جماعت پیش کرے جسے فقہاء جانتے ہوں، جو قرآن وسنت کے موافق ہو۔(۱)

لیکن تیسری صدی کے محدثین میں یہ انداز بدل گیا اور اس کے نتیجے میں افراد و غرائب کے جمع ہو جانے پر ایسی روایات سامنے آئیں کہ جن پر صحابہ، تابعین اور فقہاء مجتہدین کا عمل نہ تھا اور جو فقہاء میں متداول اور معروف نہ تھیں .... تیسری صدی میں جن محدثین پر روایتی نقطہ نظر کا غلبہ تھا ان کو ان افراد وغرائب کی صحت پر اصرار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل میں چون و چرا کرنا دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت ہے لیکن دوسری صدی کے محدثین ایسی روایات کو شواذ کہتے تھے تیسری صدی کے محدثین صحت سند پر زور دیتے تھے۔ اس وجہ سے تیسری صدی کے ارباب روایت نے ایسی تمام

---

(۱) الرد علی سیر الاوزاعی: ص ۳۱

روایات کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں دوسری صدی کے مجتہدین سے بالکل جداگانہ رائے قائم کر لی اور صحابہ وتابعین کے جو فتاویٰ ان روایات کے خلاف تھے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نحن رجال هم رجال یعنی جس طرح ان کو اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں ہم یہاں آپ کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

ابوداؤد وترمذی کی حدیث قلتین:

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے کہ:

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الماء وما ینوبه من الدواب والسباع فقال صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث۔(۱)

صرف ابوداؤد میں ہی نہیں بلکہ ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ یہ حدیث خواہ کتنے ہی متعدد طرق سے آئی ہو اور خواہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ حدیث دوسری صدی میں غیر معروف تھی۔ اسے اہل علم وفتویٰ میں سے کوئی بھی قابل نہ سمجھتا تھا اور اس بنا پر قاضی ابو یوسف کی زبان میں شاذ تھی۔

حافظ ابن القیم نے تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن اس ساری بحث میں سب سے زیادہ لطیف پہلو وہ ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کے شذوذ کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث حلال وحرام' پاک وناپاک کے بارے میں فیصلہ کن ہے اور پانیوں کے مسئلہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو زکوۃ کے سلسلہ میں مختلف نصاب ہائے زکوۃ کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ حدیث صحابہ میں مشہور نہیں ہوئی اور گوشہ گمنامی میں پڑی رہی۔ حالانکہ امت کو اس کی نصاب زکوۃ سے بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ زکوۃ تو ہر کس وناکس پر فرض نہیں ہوتی مگر پانی تو ہر وضو اور غسل میں اسلامی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے اس لیے ضروری تھا کہ یہ حدیث

---

(۱) ابوداؤد: ص ۵۶

ایسے ہی ذرائع سے ہمارے پاس پہنچتی جن ذرائع سے پیشاب کی نجاست، اس کے غسل کا وجوب اور نماز کی عدد رکعات نقل ہو کر آئی ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنے والے صرف ایک حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ اور حضرت عبداللہؓ سے روایت کرنے والے صرف عبیداللہ اور عبداللہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دوسرے تلامذہ نافع، سالمؒ ایوب اور سعید بن جبیر کہاں گئے اور اہل مدینہ اور ان کے علماء اس حدیث سے کیوں بے خبر رہے حالانکہ وہ اس حدیث کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے کیونکہ پانی کی ان کے یہاں قلت تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو یہ حدیث معلوم ہو اور ان کے اصحاب اور ان کے شہر میں جو اہل علم تھے ان کو خبر نہ ہو اور وہ اس کو روایت نہ کریں۔ لہٰذا اگر یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ کے پاس ہوتی تو ابن عمرؓ کے اصحاب اسے روایت کرتے اور اہل مدینہ کا یہ مسلک ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اس حدیث کا شذوذ اور کیا ہوگا؟ اور چونکہ اس کا قائل کوئی نہیں ہے اس لیے اس موضوع پر حضرت عمرؓ کے پاس حدیث کا ہونا ثابت نہیں ہے۔ یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے۔(۱)

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدثؒ نے بھی اس حدیث کے متروک العمل اور شاذ ہونے پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اس کی مثال حدیث قلتین ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے اور ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے۔ سب کا دارومدار ولید بن کثیر عن محمد بن جعفر بن الزبیر عن عبداللہ یا محمد بن عباد بن جعفر عن عبیداللہ بن عبداللہ ہے۔ دونوں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ عبداللہ اور عبیداللہ کی ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ان علماء میں سے نہیں جن پر فتویٰ کا دارومدار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔ اس بنا پر یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانے میں اور نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ احناف میں سے کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔(۲)

---

(۱) تہذیب السنن: ج ۱ ص ۶۲، مصری مطبع انصار السنۃ المحمدیہ (۲) الانصاف: ص ۲۹

دیکھ لیجئے کے شاہ صاحب نے اس روایت کے دونوں مرکز عبیداللہ اور عبداللہ کے بارے میں یہ کہہ کر

وان کانامن الثقات لکنهما لیس ممن وسد الیهم الفتویٰ وعول علیهم الناس۔

لفظ بلفظ اور حرف بحرف وہی بات کہہ دی جو ہم نے بتائی ہے کہ یہ راویت اہل علم اور ارباب فتویٰ میں متداول نہ تھی اور یہی بات قاضی ابو یوسف نے مایعرفه الفقهاء کے ذریعے سمجھائی تھی۔

صرف حدیث قلتین ہی پر موقوف نہیں ہے اور بھی اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابوداؤد کی حدیث تامین:

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے:

عن وائل بن حجر قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قرء ولا الضالین قال امین ورفع بها صوته۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین کہتے تو اونچی آواز سے آمین کہتے۔

حافظ ابن القیم نے اس حدیث پر نوٹ لکھا ہے وہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

حدیث وائل کو شعبہ اور سفیان دونوں نے روایت کیا ہے۔ سفیان کی روایت میں رفع بها صوته ہے۔ اس حدیث میں چار چیزیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ شعبہ اور سفیان کا رفع اور خفض میں اختلاف ہے۔ دوم یہ کہ دونوں حجر کی شخصیت میں مختلف ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں کہ ابو العنبس حجر کی کنیت ہے اور سفیان کہتے ہیں کہ نام ہی حجر بن عنبس ہے۔ سوم یہ کہ حجر کا حال معلوم نہیں ہے۔ چہارم یہ کہ ثوری اور شعبہ مختلف ہیں سفیان اسے حجر عن وائل کی روایت بتاتے ہیں اور شعبہ اسے حجر عن علقمہ عن وائل کی روایت بتاتے ہیں۔ اگر چہ امام دارقطنی نے ثوری کی روایت کی تصحیح کی ہے لیکن یہ محل نظر ہے اور اسی بنا پر امام ترمذی نے روایت کی تصحیح نہیں کی۔ (۱)

(۱) تہذیب السنن شرح ابی داؤد: ج ا ص ۴۳۹

اس روایت کے تفرد اور غرابت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے تمام رواۃ چاہے سفیان ہوں یا شعبہ سلمۃ بن کہیل ہوں یا علقمہ بن وائل یا پھر عبدالجبار بن وائل۔ سب کوفہ کے رہنے والے ہیں حتیٰ کہ امام دار قطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

هذه سنة تفردبها اهل الكوفة۔(۱)

اور اس پر طرہ یہ کہ تمام اہل کوفہ میں کوئی بھی آمین بالجہر کا قائل نہیں ہے چنانچہ قاضی شوکانی رقمطراز ہیں:

كذاروى عن ابى حنيفة والكوفيين۔(۲)

صحیحین کی حدیث خیار مجلس:

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صاحب منتقی الاخبار نے شیخین کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے:

عن ابن عمر عن النبى صلى الله عليه وسلم قال المتبانيعان بالخيار مالم يتفرقا۔(۳)

خود شیخین نے اسے متعدد پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کاروباری زندگی میں اگر دو آدمیوں میں کوئی سودا ہو جائے اور بات چیت ختم ہو جائے تو جب تک دونوں سودا کرنے والے ایک جگہ بیٹھے ہیں سودا توڑا جا سکتا ہے اور دونوں میں ہر ایک کو ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

فانه حديث صحيح روى بطرق كثيرة وعمل به ابن عمر و ابوهريرة من الصحابة ولم يظهر على الفقهاء السبعة ومعاصر يهم فلم يكونوا يقولون به فراى مالك و ابو حنيفة هذا علة قادحة فى الحديث۔

یہ حدیث صحیح ہے متعدد طریقوں سے مروی ہے اس پر صحابہ میں ابن عمر اور ابو ہریرہ نے عمل کیا ہے لیکن یہ حدیث فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین کے دور میں ظاہر نہیں

---

(۱) سنن دار قطنی: ص ۱۲۷ (۲) نیل الاوطار: ج ۱۸۶ (۳) نیل الاوطار: ج ۵ ص ۱۵۷

ہوئی اس لیے فقہاء سبعہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے فقہاء سبعہ کے عمل نہ کرنے کو اس حدیث کی صحت میں علت قادحہ سمجھا ہے۔(۱)

حافظ ابو بکر الخطیب نے یہ حدیث نقل کر کے امام مالک کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ مدینہ والوں کا عمل اس کے خلاف تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

رواه مالک ولم یعمل به وزعم انه رایٰ اهل المدینة علی العمل بخلافه۔

اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے لیکن اس پر اس لیے عمل نہیں کیا ہے کہ ان کے خیال میں یہ حدیث عمل اہل مدینہ کے خلاف ہے۔

یاد رہے کہ اس کی جو سند خطیب نے بتائی ہے وہ سند زریں ہے جسے علماء نے اجل الاسانید قرار دیا ہے یعنی مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر .... اس سے معلوم ہوا کہ خود نافع کا بھی امام مالک کے زمانے میں اس پر عمل نہ تھا۔ اسی لیے خطیب نے لکھا ہے کہ

فلم یکن ترکه العمل به قد حاً لنا فع۔(۲)

نافع کا اس پر عمل نہ کرنا حدیث میں قادح نہیں ہے۔

چنانچہ امام محمد نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

وبهذا ناخذ۔(۳)

اور امام محمد ہی نے اس کی تفسیر بتائی ہے کہ:

تفسیره عندنا علیٰ ما بلغنا عن ابراهیم النخعی انه قال المتبایعان بالخیار مالم یتفرقا قال مالم یتفرقا عن منطق البیع اذا قال البائع قد بعتک فله ان یرجع مالم یقل الاخر قد اشتریت فاذا قال المشتری قد اشتریت بکذا او کذ فله ان یرجع مالم یقل البائع قد بعت۔

---

(۱) الانصاف۔ ص۳۰ (۲) الکفایہ فی علوم الروایۃ۔ ص۱۱۴ (۳) موطا امام محمد۔ ص۳۰۱

اس ارشاد کا مطلب ہمارے نزدیک جیسا کہ ہمیں ابراہیم نخعی سے معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ اس میں تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے۔ جب بائع کہہ دے کہ میں نے بیچ دیا تو بائع کو رجوع کا حق اس وقت تک ہے جب تک خریدار یہ نہ کہے کہ میں نے خرید لیا اور اگر مشتری کہہ دے کہ میں نے خرید لیا تو اسے رجوع کا اس وقت تک حق ہے کہ جب تک بیچنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے بیچ دیا۔(۱)

یہی معنے سمجھانے کے لیے امام اعظمؒ نے وہ تعبیر اختیار کی ہے جو حافظ ابن عبدالبر نے سفیان بن عیینہ کے حوالے سے پیش کی ہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ:

میں نے امام ابوحنیفہ کے سامنے یہ حدیث پیش کی کہ البیعان بالخیار مالم یتفرقا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر سودا کرنے والے دونوں شخص کشتی میں سفر کر رہے ہوں تو ان میں افتراق کب ہوگا!

ایک ہی بات میں حدیث کی روح سمجھا دی اور بتا دیا کہ تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے۔ اگرچہ سفیان بن عیینہ نے امام اعظم کی اس بات کو گوارا نہ کیا اور کہہ دیا:

کان ابو حنیفة یضرب لحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم الامثال فیردہ۔

ابوحنیفہ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لیے مثالیں بیان کرتے تھے۔

یہ سفیان بن عیینہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے اس سے پہلے حفاظ حدیث نے فقہاء پر اسی قسم کی پھبتی کی ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ایک واقعہ آتا ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباس کا مکالمہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

توضؤا مما غیرت النار

حضرت ابوہریرہؓ کی زبان سے حضور انورؐ کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ:

---

(۱) مؤطا امام محمد: ص ۳۴۲

الوضاء من الحمیم

حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ بات سنی تو فرمایا:

یاابن اخی اذا سمعت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیثاً فلا تضرب لہ الامثال۔

اے میرے برادر زادے! جب تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنے تو اس کے لیے مثالیں نہ بنا۔(۱)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث خیار مجلس بھی اپنے اس مطلب کے لحاظ سے افراد و غرائب میں سے ہے اسی طرح وہ تمام روایات جن پر عہد صحابہ و تابعین میں ارباب فتویٰ کا عمل نہ تھا۔ ان سب روایات کے بارے میں دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر بالکل جدا جدا تھا۔ تیسری صدی کے محدثین ان کو صرف اسنادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اتصال و عدالت کے ذریعے ان روایات کو صحیح گردانتے تھے لیکن دوسری صدی کے محدثین فقہاء ان کو ماعلیہ الجماعۃ اور تعامل و توارث اور السنۃ کی روشنی میں جانچتے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ آگے آرہا ہے۔

امام اعظمؒ اور حدیث کی صحت:

محدثین کی زبان سے تو آپ صحیح حدیث کی تعریف پڑھ چکے ہیں۔ ان کے یہاں حدیث صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ راویوں میں عدالت و ضبط ہو سند میں اتصال ہو اور حدیث شاذ اور معلل نہ ہو۔ حدیث کی صحت میں ان پانچ کی حیثیت اساس اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ امیر یمانی ان پانچوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

فھذہ الخمسۃ ھی المعتبرۃ فی حقیقۃ الصحیح عند المحدثین۔

یہی پانچ چیزیں محدثین کے نزدیک صحیح کی حقیقت میں معتبر ہیں۔(۲)

---

(۱) سنن ابن ماجہ باب الوضوء مما غیرت النار (۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۱۷۰

لیکن امام اعظم ابو حنیفہ محدثین کی بیان کردہ شرطوں کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ضبط کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ضبط صدر کو راوی کے لیے اتنا ضروری قرار دیتے ہیں کہ راوی کے لیے حدیث کے بیان کرنے میں یہ بنیادی شرط بتاتے ہیں کہ حدیث کی روایت صرف وہ شخص کرے جو حدیث کے سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک حدیث کا حافظ ہو چنانچہ ابو جعفر طحاوی نے امام اعظم کے بارے میں بسند متصل لکھا ہے کہ:

قال ابو حنيفة لا ينبغي للرجل ان يحدث من الحديث الا بما حفظه من يوم سمعه الى يوم يحدث به۔

ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حدیث بیان کرے مگر صرف وہ شخص بیان کرے جو سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک حدیث کا حافظ ہو۔(۱)

سید الحفاظ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ امام اعظمؒ کا اپنا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا یہ بیان لکھا ہے:

امام ابو حنیفہ صرف وہ حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کے وہ حافظ ہیں اور جن کے وہ حافظ نہیں وہ بیان ہی نہیں کرتے۔(۲)

امام نووی نے تقریب میں اس کو مشددین کا مسلک قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فمن المشددين من قال لا حجة الا فيما رواه من حفظه وتذكره روى عن مالك وابي حنيفة۔

کوئی حدیث اس وقت تک حجت اور دلیل نہیں ہو سکتی جب تک راوی اپنی یاد اور حافظہ سے روایت نہ کرے۔(۳)

اور حافظ سیوطی نے امام اعظم کا روایت حدیث میں یہ ضابطہ بیان کرنے کے بعد دوسرے محدثین سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس میں شدت محسوس کی ہے اور لکھا ہے کہ:

---

(۱) الجواہر المضیئہ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۴۱۹ (۳) تقریب: ص ۳۰۷

هذا مذهب شديد وقد استقر العمل على خلاف فلعل الرواة في الصحيحين من لم يوصف بالحفظ لايبلغون النصف۔

یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے محدثین کا اس کے خلاف عمل ہے کیونکہ اگر اس معیار کے پیش نظر صحیحین کا جائزہ لیا جائے تو نصف راوی ایسے ملیں گے جو حافظہ کی شرط پر پورے نہ اتریں گے۔(۱)

امیر یمانی نے توضیح الافکار میں' حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں یہی بات بتائی ہے۔ابن الصلاح کے الفاظ یہ ہیں:

من مذاهب التشديد مذهب من قال لا حجة الافيما رواه الراوی من حفظه و تذكره وذالک مروی عن مالک و ابی حنيفة۔(۲)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ راوی کا ضبط اس درجہ قوی ہو کہ سننے کے بعد سے بیان کرنے کے وقت تک اسے برابر یاد رہے۔اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔

بعد کے محدثین نے حفظ کی جگہ کتابت کو کافی سمجھ لیا اس لیے ان کے خیال میں اگر راوی کو حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ بھی یاد نہ ہوں تاہم وہ قلم بند صورت میں اس کے پاس موجود ہو تو اس کو روایت کر سکتا ہے۔ چنانچہ محدث خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

ابوزکریا یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے قلم سے لکھی ہوئی حدیث پائے مگر وہ اس کو زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے؟ کہنے لگے کہ ابوحنیفہ تو یہ کہتے ہیں کہ جس حدیث کا انسان حافظ نہ ہو اسے بیان نہ کرے لیکن ہم یوں کہتے ہیں کہ اپنی کتاب میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہوا پائے اسے بیان کر دے چاہے وہ اس روایت کا حافظ ہو یا نہ ہو۔(۳)

بہرحال امام اعظمؒ نے ضبط صدر کو دوسرے محدثین سے الگ ہو کر بیحد اہمیت دی ہے اور اس کو حدیث کی صحت' عدالت' اتصال کے ساتھ بنیادی شرط قرار دیا مگر بعد کو محدثین نے

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۳۰۶ (۲) مقدمہ ابن الصلاح: ص ۸۳ (۳) الکفایہ فی علوم الروایہ: ص ۲۳۱

نے یہ سختی برداشت نہ کی۔ جس قدر زمانہ گذرتا گیا حفظ کی جگہ کتابت رائج ہوتی گئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حافظ حدیث کی روایت کو غیر حافظ کی روایت پر ترجیح ہے۔ کیونکہ حافظ نہ ہونے کی حالت میں احتمال ہے کہ کوئی خط کسی خط ملا کر نوشتہ میں گڑ بڑ کر دے۔ بہر حال امام اعظمؒ نے حدیث کے صحیح ہونے کے لیے جو شرط لگائی وہ اگرچہ تیسری صدی کے محدثین کے یہاں ایک تشدید کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ فخر الاسلام بزدوی ضبط کی دقیق تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ بات کو ایسے طریق پر سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے۔ پھر اس کے معنے مراد کو سمجھا جائے۔ امکانی کوشش سے اسے یاد کیا جائے پھر اس کی حدود کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور اسے دوسرے تک پہنچاتے وقت تک اس کے مذاکرات کا اہتمام کرنا چاہیے مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے۔(۱)

یہ تصریحات فن حدیث میں امام اعظم کی عظمت شان اور جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں غالباً جو لوگ امام اعظم کو حدیث میں متشددین میں شمار کرتے رہے ہیں ان کے پیش نظر امام اعظم کی یہی شرائط ہیں۔ جیسے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:

شدد فی شروط الراویة والتحمل وضعف روایة الحدیث الیقینی اذا عارضها الفعل النفسی۔

امام صاحب نے روایت کی شرطوں اور اس کے تحمل میں سختی کی اور اگر حدیث فعل نفس کے معارض ہو تو اس کی تضعیف کی ہے۔(۲)

لیکن جسے سختی کہا جا رہا ہے اسی کا نام احتیاط ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دین کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتی جائے۔ امام اعظم کی اس احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے چنانچہ حافظ ابو محمد عبداللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑا امام ہیں نقل کرتے ہیں:

---

(۱) اصول فخر الاسلام: ج ۲ ص ۱۶۷ بر کشف الاسرار (۲) المطہ: ص ۳۴

اخبرنا القاسم بن عباد سمعت یوسف الصفار یقول سمعت وکیعاً یقول

لقد وجد الورع عن ابی حنیفة فی الحدیث مالم یوجد عن غیرہ۔

جیسی احتیاط حدیث میں امام ابوحنیفہ نے کی ہے کسی دوسرے نے نہیں کی۔(۱)

اسی طرح علی بن الجعد سے جو حدیث کے بہت بڑا امام اور حافظ ہیں اور امام بخاری اور ابوداؤد کے استاد ہیں یہ بیان منقول ہے کہ:

امام ابوحنیفہ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے۔(۲)

اور یہ امام اعظم کی احتیاط ہی کا نتیجہ ہے کہ امام وکیع بن الجراح جیسا شخص جو حدیث میں امام احمدؒ امام ابن المدینیؒ امام یحییٰ بن معین اور امام عبداللہ بن المبارک کا استاد ہے امام اعظم کی ساری حدیثیں نوک زبان کرتا ہے اور جسے سید الحفاظ یحییٰ بن معین حفاظ حدیث میں سب سے اونچا بتلاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں۔

میرے علم میں وکیع سے اونچا کوئی نہیں ہے وکیع امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو امام ابوحنیفہؒ کی ساری حدیثیں یاد تھیں اور انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے حدیثیں سنی تھیں۔(۳)

امام اعظمؒ اور رد و قبول روایت:

محدثین نے روایت کے رد و قبول کے لیے جو شرطیں لکھی ہیں اور جن روایات کو قابل استدلال قرار دیا ہے ان کے نقل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ بالغ، عاقل ہونے کے ساتھ عدالت اور ضبط کی صفات سے موصوف ہوں۔ حافظ ابن الصلاح نے جماہیر ائمہ حدیث کا فیصلہ یہی بتایا ہے۔ اور حافظ ابن کثیر نے اس میں تیقظ کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ:

اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی مخدوش ہو جائے تو روایت مردود ہو جائے گی۔(۴)

امام نووی نے تقریب میں اور حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اسی کی توثیق کی

(۱) المناقب للموفق: ج ۱ ص ۱۹۷ (۲) جامع المسانید: ج ۲ ص ۳۰۸

(۳) جامع بیان العلم: ج ۱ ص ۸۲، تاریخ بغداد: ج ۳ (۴) اختصار علوم الحدیث: ص ۹۲

ہے لیکن امام اعظمؒ نے کسی بھی روایت کی قبولیت کے لیے ان شرطوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ اگر روایت کا تعلق اسلام کی عام عملی زندگی سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا نقل کرنے والا ایک نہ ہو بلکہ صحابی سے اس کو نقل کرنے والی ایک جماعت ہو اور جماعت بھی نیک اور پارسا لوگوں کی ہو۔ چنانچہ امام ربانی عبدالوہاب الشعرانی رقمطراز ہیں:

قد كان الامام ابو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان يرويه عن ذالك الصحابي جمع اتقياء عن مثلهم وهكذا۔

جو حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام ابوحنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی آئے۔(۱)

امام شعرانی نے حدیث کی قبولیت کے لیے امام اعظمؒ ابوحنیفہ کی جس شرط کا ذکر کیا ہے وہ بصراحت خود امام اعظمؒ سے منقول ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی سند سے امام اعظمؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان حدیثوں سے کہ جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات کے ذریعے شائع ہوئی ہیں۔ پھر اگر یہاں بھی نہ ملے تو آپ کے اصحاب سے جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب بات ابراہیمؒ شعبیؒ، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح پر آ پڑتی ہے تو جس طرح ان حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔(۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظمؒ اس حدیث کو قبول فرماتے تھے جس کے پہلے طبقہ میں اگرچہ راوی ایک ہو مگر اس کے بعد وہ مختلف طبقوں میں پھیلی ہو اور اسے ایسے لوگوں نے نقل کیا ہو جو اتقیاء اور پارسا ہوں۔ طبقہ اولیٰ سے صحابہ اور طبقہ ثانیہ سے تابعین مراد ہیں۔

بعد کو محدثین غرائب وافراد نوادر و آثار جمع ہو جانے پر اس کی پابندی نہ کر سکے بلکہ یہ امر واقعہ ہے کہ امام حاکم نے جب صحیح حدیث کی دس قسمیں قرار دیتے ہوئے پہلی قسم کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ:

---

(۱) المیزان الکبریٰ: ج ا ص ۶۲ (۲) مناقب ابی حنیفہ امام ذہبی: ص ۲۰

ان اختیار البخاری و مسلم اخراج الحدیث عن عدلین عن عدلین
الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
بخاری و مسلم کا مسلک یہ ہے کہ وہ حدیث کو دو عادل راویوں سے روایت کرتے ہیں اور پھر وہ دو اپنے سے اوپر دو سے تا آنکہ یہ سلسلہ اسی طرح دو دو ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔(۱)

تو محدثین نے امام حاکم کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ حافظ ابن حبان نے امام حاکم کے اس اعلان کو حدیث کے خلاف سازش قرار دیا اور بتایا کہ:

احادیث سب کی سب اخبار آحاد ہیں جو شخص روایت حدیث میں اس قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے دراصل وہ ترک حدیث کی اسکیم بناتا ہے کیونکہ حدیثیں اخبار آحاد کے ذریعے ہی آتی ہیں۔(۲)

امام ابو بکر محمد بن موسیٰ حازمی نے امام حاکم کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور لکھا کہ

لیس کذالک لانہما خرجا فی کتابیہما احادیث جماعۃ من الصحابۃ لیس لہم الا راوٍ واحد واحادیث لاتعرف الامن جھۃ واحدۃ۔

یہ واقعات کے خلاف ہے کیونکہ امام بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ایسی جماعت سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی روایات میں صحابہ سے صرف ایک ہی راوی ہے اور ایسی حدیثیں بھی جو ایک ہی طریق سے مروی ہیں۔(۳)

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی نے بھی امام حاکم کے اس دعویٰ کی واشگاف لفظوں میں تردید کی ہے اور فرمایا:

شیخین نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ان سے یہ شرط منقول ہے۔ بخدا یہ بہترین شرط ہوتی اگر اس کا صحیحین میں کوئی نام و نشان ہوتا۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ یہ قانون ان کتابوں میں قدم قدم پر پارہ پارہ ہے۔

اور پھر خود امام حاکم کی تردید کے بعد یہ تجویز پیش فرمائی کہ امام بخاری و مسلم کا موقف

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۲۲ (۲،۳) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۲۳

ان کتابوں میں صرف یہ ہے کہ۔

دو ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جس کے راویوں کی ثقاہت اتفاقی ہو۔(۱)

لیکن حافظ زید الدین عراقی نے حافظ ابن طاہر کی اس تجویز کو یہ کہہ کر بے جان کر دیا کہ:

قبول روایت میں امام بخاری و مسلم کا یہ موقف نہیں ہے۔ کیونکہ امام نسائی نے ایسے راویوں پر جرح کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے۔(۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین اپنے دور میں امام اعظم کی عائد کردہ شرائط کی حدیث کے ردو قبول میں پابندی نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام اعظمؒ کے اس بیان کی روشنی مین اگر سنت اصل ثانی ہے تو قرآن اصل اول۔ لیکن سنت کے موضوع پر حدیث اس وقت قبول کی جاسکتی ہے جب وہ بالکل موثق اور مصادر مختلفہ سے ثابت ہو کر آئی ہو اور اس کا صدق و ضبط اور نقل ہر لحاظ سے پایہ تصدیق کو پہنچ چکا ہو۔ آپ صرف ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو اس معیار پر صحیح ہیں۔ اور جن کی ثقات کے ذریعے اشاعت ہوئی ہے۔ امام سفیان ثوری نے بھی حدیث کے متعلق امام اعظم کا یہی موقف بتایا ہے کہ:

یاخذ بما صح عنده من الاحاديث التي كان يحملها الثقات و بالاخر من فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہوں۔ نیز جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے یہ اس کو لیتے ہیں۔(۳)

اس لحاظ سے سے امام اعظمؒ کی حدیثوں کا بیشتر حصہ مشہور ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ دور ہے جس میں شہرت کو اعتباری حیثیت حاصل ہے ورنہ اس کے بعد اگر کوئی حدیث شہرت پذیر ہوئی ہے تو آئینی اور قانونی لحاظ سے وہ شہرت نہیں جس سے حدیث کو قوت حاصل ہو سکے۔ علامہ عبدالعزیز بخاری رقمطراز ہیں:

---

(۱) شروط الائمۃ الستہ: ص ۲ (۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۱۰۱ (۳) مناقب ابی حنیفہ ذہبی: ص ۲۰

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہوگا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت معتبر نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اکثر اخبار آحاد مشہور ہو گئی ہیں۔ حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے ہیں۔(۱)

شاید آپ کو اس پر حیرت ہو مگر اس میں حیرت کو کون سی بات ہے؟ شہرت کا دارومدار تو اسنادی وسائط پر ہے اگر اسنادی وسائط کم سے کم تر ہوں اور مؤلف کی ذات کا خود ان زمانوں سے تعلق ہو جن میں شہرت کو معتبر قرار دیا گیا ہے تو پھر اس میں حیرت کو کون سی بات ہے۔ آپ اس نظر سے کتاب الآثار کا مطالعہ کریں آپ کو زیادہ حدیثیں اس میں تین واسطوں سے ملیں گی اور یہ واسطے بھی معمولی نہیں بلکہ اجلہ ائمہ اور فقہاء مجتہدین پر مشتمل ہیں۔ یہی حدیثیں تیسری صدی میں اسنادی وسائط کے زیادہ ہونے کی وجہ سے آحاد بن گئی ہیں۔ امام اعظم ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں جو زمانہ نبوت سے قریب تر ہے اس لیے آپ نے حدیث کے راویوں کی عدالت کا فیصلہ صدیاں گزرنے پر کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ مشاہد کے ذریعے کیا ہے اس لیے احادیث کے بارے میں آپ کی رائے حتمی ہے۔ اسی بنا پر امام شعبہ نے امام اعظم سے تحدیث کی درخواست کی تھی۔ امام شعبہ کو سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث اور امام احمد حدیث میں امۃ وحدہ کہتے ہیں۔ امام اعظم کے نام امام شعبہ کا یہ خط آج تک تاریخ کے لیے سرمایہ زینت بنا ہوا ہے۔ خط کا انکشاف کرنے والا بھی کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ سید الحفاظ یحییٰ بن معین ہیں۔(۲) خط کا مضمون یحییٰ بن معین نے یہ بتایا ہے کہ امام شعبہ نے امام اعظمؒ کو صرف لکھا نہیں بلکہ ان سے حدیث بیان کرنے کی اپیل کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ امام اعظمؒ کے علم پر ان کی ثقاہت' عدالت' امانت اور ان کی حدیث میں فنکاری پر امام شعبہ کو کتنا بڑا اعتماد ہے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ کیا فرما رہے ہیں؟ فرما رہے ہیں: ان یحدث کہ حدیث بیان کریں۔ تحدیث کی بات صرف اس شخص سے کہی جا سکتی ہے۔ جس کی فن آشنائی پر کلی اعتماد ہو۔ کیونکہ یہ علم حدیث کا ایک شہسوار کبھی کسی ایسے شخص کو یہ بات نہیں کہہ سکتا جو اس کا اہل نہ ہو۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ علم الحدیث میں امام صاحب کے نادرۃ الوجود ہونے کی کیا یہ دلیل نہیں ہے کہ امام فن حدیث آپ

(۱) کشف الاسرار: ج ۲ ص ۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۱۷۰

سے حدیث بیان کرنے کی اپیل کر رہے ہیں۔ اسی بنا پر امام یحییٰ بن معین سے جب حدیث میں امام اعظمؒ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو یہ فرما کر کہ:

ثقة ما سمعت احد اضعفه۔ (میں نے تو کسی سے بھی ان کی تضعیف نہیں سنی)

امام شعبہ کا مذکورہ بالا خط بطور شہادت پیش کر دیا اور فرمایا کہ شعبة شعبة تو شعبہ ہی ہیں۔(۱) یعنی جن کی علم حدیث میں جلالت شان اور عظمت قدر پر امام شعبہ کو اعتماد ہو وہاں تو کسی کے لیے یارائے سخن نہیں ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

قد کان الحافظ المشهور بعناية فی هذا الشان

امام ابوحنیفہ علم حدیث میں مشہور حافظ حدیث تھے۔(۲)

بہر حال امام اعظم نے صحت حدیث کے لیے ایک بہت اونچا معیار قائم کیا تھا۔ ان کے شروط روایت کے لیے معیار تحقیق کی حد تک بمقابلہ محدثین زیادہ سخت تسلیم کیے گئے ہیں جیسا کہ آپ مقدمہ ابن خلدون اور المیزان الکبریٰ کے حوالہ سے پڑھ چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اپنی شروط میں تیسری صدی کے محدثین کی نسبت متشدد تھے۔

امام اعظمؒ اور اہل ہوئی سے روایت:

روایت کے رد و قبول سے متعلق اس پر تو دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا اتفاق ہے کہ قبول روایت کے لیے اسلام اور عدالت شرط ہے اور شرط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کافر کی حالت کفر میں اور فاسق کی حالت فسق میں روایت مردود ہے۔ اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوتے ہوئے اپنے مخصوص نظریات کے حامل ہیں جن کے نتیجے میں جمہور امت کی شاہراہ سے ہٹ کر انہوں نے اپنی راہ الگ بنالی مثلاً خوارج، روافض، نواصب، معتزلہ اور مرجۂ وغیرہ۔ کیا ان کی روایات کو ان کے مخصوص نظریات کے باوجود شرف قبول عطا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ موضوع علم حدیث کے مہمات مباحث میں سے ہے اس لیے علماء نے اپنے مختلف عہدوں میں جی بھر کر اس پر داد تحقیق دی ہے۔ چنانچہ حافظ ابو بکر الخطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

---

(۱) الانتقاء: ص ۱۲۷ (۲) الروض الباسم: ج ۱ ص ۱۶۶

علماء میں اہل ہوئی سے روایت لینے کے موضوع پر ایک سے زیادہ مدارس فکر ہیں۔
سلف میں سے ایک جماعت اسے درست خیال نہیں کرتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کافر اور فاسق بالتاویل کی پوزیشن بھی کافر معاند اور فاسق عابد کی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کی روایت نا قابل قبول ہو اور کچھ کی رائے میں اہل اہواء کی روایت کو قبول کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ جھوٹ کو جائز نہ سمجھتے ہوں۔ فقہاء میں سے یہ امام شافعی کی رائے ہے۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ اہل اہواء میں سے ان کی رائے قبول کر لی جائے جو ہوئی و بدعت کے داعی نہ ہوں۔ دعاۃ کی روایت قابل احتجاج نہیں ہے یہ امام احمد کی رائے ہے۔ مؤرخین اور متکلمین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سب اہل اہواء کی روایات قابل قبول ہیں چاہے وہ اپنے نظریات کی وجہ سے کفر ہی کے میدان میں ہوں۔ (۱)

روایت وتحدیث میں تمام اہل اہواء میں روافض کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس اہمیت کی بنیادی وجہ ان کے وہ نظریات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ امت کے جمہور سے الگ ہوئے ہیں۔ صحابہ کے بارے میں ان کا موقف علم کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور تقیہ کا عقیدہ بھی ان کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر امام اعظمؒ کا فیصلہ عبداللہ بن المبارک نے یہ بتایا ہے:

امام اعظمؒ سے ابوعصمہ نے دریافت کیا کہ اہل اہواء سے روایت کے بارے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ سب اہل اہواء سے روایت لے سکتے ہو بشرطیکہ وہ عادل ہوں لیکن شیعہ سے روایت نہ لینا۔ کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تذلیل پر ہے۔ (۲)

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بھی دوسری اور تیسری صدی کے اختلافی مسائل میں سے ہے اسی لیے حضرت امام مالک بھی اس مسئلہ میں امام اعظم کے ہم زبان ہیں وہ فرماتے ہیں کہ روافض سے روایت نہ کرو۔ مشہور محدث یزید بن ہارون کہتے ہیں ہر صاحب بدعت کی اگر داعی

---

(۱) الکفایہ فی علوم الراویہ: ص ۱۲۴ (۲) الکفایہ فی علوم الراویہ: ص ۱۳۶

نہ ہو تو روایت لے لی جائے لیکن روافض سے روایت نہ لی جائے۔ شریک بن عبداللہ کی رائے ہے کہ جس سے تم ملو علم لے لو لیکن روافض سے علم نہ لو۔ عبداللہ بن مبارک نے عمرو بن ثابت کا نام لے کر بتایا ہے کہ اس سے حدیث نہ لو کیونکہ یہ سلف کو برا کہتا تھا۔(۱) یہ دوسری صدی کے محدثین کے افکار ہیں۔ تیسری صدی میں ان افکار کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں اور رافضیوں کے بارے میں محدثین نے اپنا موقف بدل دیا۔ امام شافعی نے عام روافض کو اس پابندی سے نکال کر خاص خطاب تک اسے محدود کر دیا۔ اور فرمایا کہ ان سے روایت نہ لینی چاہیے۔ اس کے بعد محدثین کی عام رائے تمام اہل اہواء کے بارے میں بلا استثناء شیعہ قائم ہوگئی کہ:

نقبل غیر الدعاۃ من اھل الاھواء فاما الدعاۃ فلا نقبل اخبار ھم۔(۲)

ان میں جو داعی نہ ہوں ان سے روایت لی جائے داعی کی روایت نہ لی جائے۔

اسی کو محدثین کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے اس پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اعدل الاقوال قرار دیا ہے اور اس کے خلاف سوچنے کو بھی بارگاہ محدثین میں گستاخانہ جرأت بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

والقول بالمنع مطلقا مباعد لشائع عن ائمۃ الحدیث۔(۳)

مطلقاً اسے روکنا اس راہ سے دور ہٹانا ہے جو ائمہ حدیث سے مشہور ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ طے کیا گیا ہے اور جسے اعدل الاقوال کہا گیا ہے کیا واقعات اور حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ خود بخاری و مسلم نے دعاۃ سے روایات لی ہیں چنانچہ حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے دعاۃ اہل اہواء کی روایات لی ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن سے شیخین نے روایات لی ہیں اور نوبت باینجا رسید کہ کہنے والوں نے کہہ دیا:

کتاب مسلم ملان من رواۃ الشیعۃ۔(۴)

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۲۱۸
(۲) توضیح الافکار: ج ۲ ص ۱۰۴
(۳) اختصار علوم الحدیث: ص ۹۹
(۴) تدریب الراوی: ص ۱۲۸

اور حافظ ابن الصلاح کو اس نظریہ کو روافض سے روایت نہ لینی چاہیے یہ کہہ کر مرجوح قرار دینا پڑا کہ فان کتبھم طافحۃ بالروایۃ عنھم محدثین کی کتابیں ان کی روایات سے اٹی پڑی ہیں۔ امام ذہبی نے بدعت کی تقسیم کے ذریعے محدثین کی صفائی پیش فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

بدعت کی دو قسمیں ہیں صغریٰ جیسے تشیع زیادہ یا کم مثلاً وہ حضرات جنہوں نے حضرت علیؓ سے نبرد آزما ہونے والوں کے بارے میں لب کشائی کی ہے یہ طبقہ تابعین میں بہت ہے اور ایسے ہی اتباع تابعین میں اگر ان کی روایات کو تشیع کی بنا پر رد کر دیا جائے تو حدیث کا بیشتر حصہ ختم ہو جائے گا۔ اور بدعت کبریٰ جیسے رفض کامل اور اس میں غلو مثلاً ابوبکر و عمر کے دامان احترام کو ہاتھ لگانا اور لوگوں میں اس کا پروپیگنڈا کرنا۔ یہ قسم بلاشبہ ناقابل احتجاج ہے۔ مجھے اس قسم کے لوگوں میں کوئی بھی صادق مامون نظر نہیں آتا۔ بلکہ جھوٹ ان کا فیشن اور تقیہ و نفاق ان کا شیوہ ہے۔ (۱)

اگرچہ امام ذہبی نے بقول حافظ سیوطی ایک دوسرے موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

اس موضوع پر لوگ مختلف الخیال ہیں کچھ کی رائے میں شیعہ سے روایت قطعاً منع ہے اور کچھ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ جو شخص ان کی حدیث کو جانتا ہو اس کے لیے جائز ہے اور دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے۔ (۲)

بعد ازیں حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سیوطی نے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما کر محدثین کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری مساعی صرف اس لیے بروئے کار آئی ہیں کہ محدثین سے جو طے شدہ پالیسی کے خلاف عمل ہوا ہے اس کا مداوی ہو جائے لیکن ان مساعی اور کوششوں کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ کتابوں کی مدد سے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما رہے ہیں۔ اور دوسری صدی کے محدثین مشاہدے اور واقعات کے زور سے بتا رہے ہیں کہ:

فان اصل عقیدتھم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۱،۲) تدریب الراوی: ص ۲۱۸

اور عبداللہ بن المبارک نے آپ بھی سنائی ہے کہ فانه كان ليسب السلف اور یہی صورت حال امام مالک کی ہے۔

اس آخری دور میں شام کے مشہور فاضل نے محدثین کی اس موضوع پر صفائی کرتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے کہ محدثین نے جن اہل اہواء سے روایات لی ہیں وہ مبتدعین نہیں ہیں بلکہ مبدعین ہیں۔ یعنی ہیں تو وہ اہل السنت مگر یار لوگوں نے ان کو بدعتی مشہور کر دیا ہے۔ میری مراد علامہ جمال الدین قاسمی ہیں۔ انہوں نے خاص اس موضوع پر الجرح والتعدیل کے نام سے کتابچہ لکھا ہے جو مصر میں ۱۳۳۰ھ میں مطبع المنار نے شائع کیا ہے۔ اور اس آخری دور میں مشہور محدث فاضل علامہ احمد محمد شاکر جن کی حدیث میں علمی خدمت اہل علم کے لیے سامان رشک ہے الباعث الحثیث میں یہ کہہ کر معاملہ ہی صاف کر دیا ہے کہ کسی بھی مکتب فکر سے کوئی راوی تعلق رکھتا ہو روایت میں تو صرف راوی کی صداقت و امانت کا اعتبار ہوگا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

العبرة فی الروایة بصدق الراوی وامانته و الثقة بدینه و خلقه۔

روایت میں تو صرف راوی کی صداقت' امانت' دین اور ثقاہت اور اخلاق کا اعتبار ہوگا۔(۱)

غور فرمایئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر:

الا الشیعة فان اصل عقیدتهم تضلیل اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم۔

دینی ثقاہت اور اخلاقی امانت کو چیلنج کیا تھا۔ ان مساعی کے باوجود اس کا حل اب تک کوئی نہ بتا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ خواہ کچھ کہا جائے مگر واقعات کی دنیا میں تحقیق کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ ابوحنیفہ کے ساتھ ہے۔

لیکن امام اعظمؒ کا یہ فیصلہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کے تشیع کی عمارت اصحاب نبوت کی تضلیل کی اساس پر قائم ہے اس تصریح کی ضرورت بھی حضرت امام کو اس لیے پیش آئی کہ ان کے گرد و پیش میں ایسا طبقہ موجود تھا جیسا کہ عبداللہ بن المبارک کی تصریح سے معلوم

(۱) الباعث الحثیث: ص ۱۰۰

ہو چکا ہے۔ اور اس طبقہ کے علاوہ اس دور میں ایسا بھی طبقہ تھا جو صرف حضرت علیؓ کے لیے صحابہ میں برتری کا نظریہ رکھتا تھا جیسا کہ حافظ سیوطی نے تدریب میں بتایا ہے اور ایسا طبقہ تھا جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے سیاسی جھمیلوں میں حضرت علیؓ کا طرف دار تھا جیسا کہ ذہبی نے تصریح کی ہے ان طبقوں کی روایت سے امام ابوحنیفہ نے نہیں روکا ہے۔ امام اعظمؒ نے جس دکھتی رگ پر انگشت رکھ کر بتایا ہے وہ یہ اور صرف یہ ہے کہ:

اصل عقیدتهم تضليل اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم۔

اور بس۔ اس عقیدے کا حامل طبقہ یقیناً امام اعظمؒ کے زمانے میں موجود ہے۔ ان میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے دوسری صدی کے محدثین کو حضرت علیؓ کی بہت سی حدیثوں سے دست بردار ہونا پڑا حالانکہ حضرت علیؓ کے علم ان سے محبت اور ان سے عقیدت کا برابر تقاضا یہی رہا کہ ان کے بارے میں جو کچھ بھی سنا جائے اس کی تصدیق کی جائے لیکن یہاں حضرت علیؓ کی عقیدت و محبت کا رسول کی عقیدت و محبت اور اس کی حدیث کی عظمت سے مقابلہ تھا اس کا تقاضا یہ اور صرف یہ تھا کہ اس کی جانب کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ ایمان کو بچانے کے لیے احتیاط کی راہ یہی تھی کہ چھان بین کی جائے۔

حافظ ابن القیم لکھتے ہیں:

قاتل الله الشيعة فانهم افسدوا كثيرًا من علمه بالكذب عليه ولهذا تجد اصحاب الحديث من الصحيح لا يعتمدون من حديثه الا ما كان من طريق اهل بيته واصحاب عبدالله بن مسعود۔

اللہ شیعوں کا برا کرے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے علم کا بڑا حصہ ان پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے اس لیے صحیح حدیث کے متلاشی بجز حضرت علیؓ کے گھر والوں اور عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کی وساطت سے آئی ہوئی حضرت علیؓ کی حدیثوں پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔(۱)

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۱۶

اسی دور میں مشہور محدث حماد بن سلمہ نے یہ انکشاف کیا کہ:

اخبرنی شیخ من الرافضة انهم کانوا یجتمعون علی وضع الاحادیث۔

مجھے رافضیوں کے ایک سربراہ نے بتایا ہے کہ وہ حدیثیں بنانے کے لیے باقاعدہ اجتماعات کرتے تھے۔(۱)

اور آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حافظ زیلعی نے نماز میں جہر بسملہ کے موضوع پر خالص محدثانہ نقطہ نظر سے تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے موضوع پر جس قدر روایات آئی ہیں ان کا سرچشمہ ہی شیعہ ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وغالب احادیث الجهر تجد فی رواتها من هو منسوب الی التشیع۔(۲)

بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کی زیادہ روایات شیعہ راویوں کی وساطت سے آتی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کے جہر پر اخبار آحاد کا زیادہ ذخیرہ وضعی اور بناوٹی ہے اور بناوٹی ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان الشیعة تری الجهر و هم اکذب الطوائف فوضعوا فی ذالک احادیث۔

کیونکہ نماز میں بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کے قائل ہیں اور شیعہ گروہوں میں سب سے زیادہ دروغ گو ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر حدیثیں بنالی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ امام اعظم کے اس دوررس فکر کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس میں تھوڑا سا تسامح بہت بڑی بلا کا سامان ہے۔

جرح وتعدیل رواۃ حدیث اور امام اعظمؒ:

علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلے میں ۵۲ قسم کے علوم کی نشاندہی کی ہے۔ ان ہی علوم کے برتنے پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق واسانیدٗ ان کے راویوں کی راست گفتاری اور ان پر جرح وتعدیل کی داستان پڑھے گا اس کو حدیث کی عظمت کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ کوئی شخص مطالعہ کی محنت سے پہلو تہی کر کے خواہ مخواہ انکار کر ڈالے۔

---

(۱) الباعث الحثیث: ص ۸۴ (۲) نصب الرایہ: ج ۱ ص ۱۸۲

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صراف کی سی ہے بسا اوقات روپیہ کی شکل وصورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا لیکن صراف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے۔ یہ کھوٹ بتا دینے کا علم فن حدیث میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی کی مدد سے علماء نے صحیح احادیث کو غلط سے اور قوی کو ضعیف سے چھانٹ کر علیحدہ کیا اور اس سلسلے میں علماء نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اسی کا نام علم جرح وتعدیل ہے۔ اسے ہی علم میزان رجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر راویوں کی امانت' ثقاہت' عدالت اور قوت ضبط کو بتایا جائے تو یہ علم التعدیل ہے اور اگر اس کے برعکس ان کے کذب' غفلت یا نسیان وغیرہ سے بحث کی جائے تو یہ علم الجرح ہے۔ امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

وهما فی الاصل نوعان کل نوع منهما علم براسه۔

اصل میں یہ دو قسمیں ہیں ان میں سے ہر قسم مستقل علم ہے۔(۱)

علم حدیث کے طفیل میں یہ عظیم الشان علم وجود میں آیا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ میں اس طرح کے تنقیدی علم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس فن کی ابتدا کیوں ہوئی؟ حافظ سیوطی الکافی فی تاریخ السخاوی میں رقم طراز ہیں کہ:

چونکہ حدیث نبوی صدر اول میں سفینوں سے نہیں بلکہ لوگوں کے سینوں سے لی جاتی تھی اس لیے احادیث کی حفاظت اور ان کو غلط سے بچانے اور مقبول میں تمیز کی خاطر جرح کو جائز کیا گیا۔(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

لوگوں نے یہ علم صحابہ سے لیا اس کے یاد کرنے اور اس کے پہنچانے میں اوقات لگائے اور جانیں کھپائیں لیکن صحابہ کے بعد ہر دور میں ایسے لوگ اس میں داخل ہو گئے جن میں اس کی صلاحیت وقابلیت نہ تھی۔ انہوں نے نقل وروایات میں غلطیاں کیں اور کچھ نے عمداً خلاف واقعہ نقل میں دست اندازی کی۔ اس راہ سے حدیث

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۵۲ (۲) الرفع والتکمیل: ص ۱۴

ایک بڑی آفت سے دو چار ہو گئی۔ اللہ سبحانہ نے اس وقت ایسے ارباب فکر میدان میں رونما کیے جنہوں نے حدیث نبوت کی چھان بین اور اس کی مدافعت کا کام کیا۔ خیر خواہی کے جذبہ سے راویوں پر کلام کیا۔(۱)

حافظ سخاوی نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

پہلی صدی ہجری جو صحابہ و کبار تابعین کے دور میں گذری اس دور میں حارث اور مختار کذاب جیسے اکا دکا شخص کو چھوڑ کسی ضعیف الروایۃ شخص کا تقریباً وجود نہ تھا۔ پہلی صدی گذر کر جب دوسری صدی آئی تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھتے اور اپنے کوزۂ ذہن میں اس کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی۔ چنانچہ آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ موقوف کو مرفوعاً نقل کر جاتے ہیں۔ کثرت سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں جیسے ابو ہارون عبدی وغیرہ۔ پھر جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب قریب۔ تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق و تضعیف کے لیے زبان کھولی چنانچہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ مارایت اکذب من جابر الجعفی میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا۔ اور امام اعمش نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری کی توثیق کی۔ اور شعبہ کے رجال کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا۔ یہ بڑے محتاط تھے اور بجز ثقہ کے تقریباً کسی سے روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالک کا بھی یہی حال تھا۔ اور اس دور کے ان لوگوں میں سے کہ جب وہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ دیں تو ان کی بات مان لی جاتی ہے معمر، ہشام دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجشون، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ ہیں۔ پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ ابن المبارک، ہشیم، ابو اسحاق فزاری، معافی بن عمران، بشر بن المفضل اور ابن عیینہ وغیرہ کا ہے۔ پھر ان ہی کو ہم زبان ایک طبقہ ابن علیہ،

---

(۱) الرفع والتکمیل: ص ۱۴

ابن وہب اور وکیع جیسے حضرات کا ہے۔ بعد کو ان ہی کے دور میں دو ایسے شخص جو حدیث کے حافظ اور اس فن میں حجت گزرے ہیں تنقید رجال کے لیے اٹھے یہ یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی ہیں۔(۱)

علامہ جزائری نے بھی اس پر تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے(۲) اور حافظ شمس الدین السخاوی نے الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ میں علم الجرح والتعدیل کی ایک مؤرخانہ دستاویز ترتیب دی ہے۔ اس تاریخی ترتیب میں جن ائمہ جرح وتعدیل کا تذکرہ کیا ہے ان کے تعارف کے لیے حافظ موصوف نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

اما المتکلمون فی الرجال فخلق من نجوم الھدی ومصابیح الدجی المستضاء بھم۔

ان اکابر میں جن کو نجوم الہدی اور مصابیح الظلم کہا ہے سب سے پہلے مقدمہ ابن عدی کے حوالہ سے اس فن کی امامت کے سلسلے میں صحابہ میں سے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، ابن عباسؓ، عبداللہ بن سلامؓ، عبادۃ بن الصامتؓ اور عائشہ صدیقہؓ کا نام لیا ہے۔ پھر اکابر تابعین میں امام شعبیؒ، امام ابن سیرینؒ، سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے بعد لکھا:

فلما کان عند آخر ھم عصر التابعین و ھو حدود الخمسین ومائۃ تکلم فی التوثیق والتجریح طائفۃ من الائمۃ فقال ابو حنیفۃ ما رأیت اکذب من جابر وضعف الاعمش جماعۃ ووثق آخرین ونظر فی الرجال شعبۃ۔(۳)

اور اس کے بعد ان سب کا تذکرہ کیا ہے جو آپ فتح المغیث کے حوالہ سے پہلے پڑھ چکے ہیں اور یہ بھی اضافہ فرمایا کہ:

پھر یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کے بعد امام شافعیؒ، یزید بن ہارونؒ، ابوداؤد الطیالسیؒ، عبدالرزاقؒ، الفریابیؒ، ابو عاصم النبیل وغیرہ ہوئے ہیں اور ان کے بعد حمیدیؒ، القعنبیؒ، ابوعبید یحییٰ اور ابوالولید الطیالسی نے اس میں کام کیا ہے۔(۴)

---

(۱) لسان المیزان: ج ۱ص ۳ (۲) توجیہ النظر: ص ۱۱۴ (۳،۴) الاعلان بالتوبیخ: ص ۱۶۳، ص ۶۴

اس تاریخی دستاویز میں حافظ سخاوی نے صرف یہ نہیں بتایا ہے کہ آخر عصر تابعین میں جرح و تعدیل کے فن میں امامت کا مقام امام اعظمؒ کو حاصل ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی ذات گرامی تابعی ہونے کی حیثیت میں توثیق و تجریح کے میدان میں صرف تعارفی نہیں بلکہ ایک عظیم الشان استدلالی شخصیت ہے اور ائمہ جرح و تعدیل میں ان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی کی یہ تصریح ہے:

تكلم فى التوثيق و التجريح طائفة من الائمة فقال ابو حنيفة۔

راویوں کی توثیق و جرح پر ائمہ کی ایک جماعت نے لب کشائی کی چنانچہ ابو حنیفہ نے فرمایا:

اسی بنا پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں جرح و تعدیل پر امام اعظمؒ کے ان دو فقروں کو بالاسناد کتاب العلل میں روایت کیا ہے۔

حدثنا محمود بن غيلان قال حدثنا ابو يحيىٰ الحمانى قال سمعت ابا حنيفة يقول مارايت احدا اكذب من جابر الجعفى و لا افضل من عطاء۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا اور عطاء سے زیادہ فاضل کوئی نہیں دیکھا۔(۱)

اس روایت کا تعلق راویوں کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام نے اسے سند کے طور پر پیش کیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک امام اعظمؒ کا شمار ان ائمہ میں ہے جن کی بات جرح و تعدیل کے موضوع پر سند ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے منہ سے نکلے ہوئے تعدیل میں عطاء کے متعلق اور جرح میں جابر جعفی کے متعلق دو فقرے علم حدیث میں دو اہم فنوں کی بنیادی اینٹ ہیں۔ پہلا فقرہ یعنی لم اراہت افضل من عطاء بن ابی رباح علم التعدیل کی اور دوسرا فقرہ یعنی لم اراہت اکذب من جابر الجعفی علم الجرح کی۔ اور تعدیل بھی معمولی رواۃ کی نہیں بلکہ امام فن کی فرمائی ہے۔ اور صرف امام ترمذی نے نہیں بلکہ امام بیہقی نے بھی امام ابو حنیفہ کی اس موضوع پر استدلالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب المدخل میں بسند متصل عبد الحمید الحمانی کے حوالہ سے لکھا ہے:

---

(۱) جامع ترمذی

سمعت اباسعد الصنعانی وقام الی ابی حنیفة فقال یا ابا حنیفة ماتقول فی الاخذعن الثوری فقال اکتب عنه فانه ثقة ماخلا احادیث ابی اسحاق عن الحارث و حدیث جابر الجعفی۔

میں نے ابو سعید کو امام ابو حنیفہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کی سفیان ثوری سے روایت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا ان سے حدیثیں لکھو کیونکہ وہ ثقہ ہیں لیکن ان کی وہ حدیثیں نہ لکھو جو بحوالہ ابو اسحاق از حارث ہیں۔ اور حدیث جابر جعفی بھی نہ لکھو۔(۱)

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان کی تعدیل کرتے ہوئے جہاں دوسرے اکابر نقاد کے تعدیلی کلمات درج کیے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوالزناد ربیعہ سے زیادہ عالم ہیں۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں ان سب سے پہلے امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات نقل کیے ہیں:

رأیت ربیعة واباالزناد و ابو الزناد افقه۔

میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابوالزناد زیادہ فقیہ ہیں۔(۲)

مشہور امام جعفر صادق سے کون واقف نہیں ہے حافظ ذہبی نے ان کی تعدیل کرتے ہوئے جہاں یحییٰ بن معین اور ابو حاتم سے ان کی توثیق نقل کی ہے وہاں امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات بھی نقل فرمائے ہیں:

عن ابی حنیفة مارأیت افقه من جعفر بن محمد۔

اسی بنا پر ہمیشہ اس فن کے اماموں کو جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کے سامنے سرتسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں:

اعلم ان الامام ابا حنیفة قد قبل قوله فی الجرح و التعدیل و تلقوه عنه علماء هذا الفن و عملوا به۔

---

(۱) المیزان: ص ۳۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابوالزناد

جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کی بات قبول کی گئی ہے اور اس فن کے علماء نے اسے اپنایا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔(۱)

یہی جابر جعفی جن کے بارے میں امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام اعظم سے یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ مارایت اکذب من جابر۔ دوسرے ائمہ کی اس کی نسبت آراء کو پیش نظر رکھ کر امام ابو حنیفہ کی قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ثوری کہتے ہیں کہ مارایت اورع فی الحدیث من جابر ۔میں نے جابر سے زیادہ حدیث میں محتاط نہیں دیکھا۔ امام شعبہ کہتے ہیں کہ جابر اگر حدیث میں سماع' تحدیث اور انباء کی تصریح کر دے تو قابل اعتبار ہے۔ ایک بار امام ثوری نے شعبہ سے کہا کہ تم جابر کے بارے میں کچھ کہو گے تو پھر میں تمہارے متعلق کچھ کہوں گا۔(۲)

ذرا غور فرمایئے کہ جابر کی توثیق کون لوگ کر رہے ہیں اور یہ کس شان کے اجلہ فن ہیں لیکن تحقیق کی بے لاگ عدالت نے جو فیصلہ دیا ہے وہ یہی ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ لیث بن ابی سلیم فرماتے ہیں کہ کذاب ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ متروک ہے۔ امام ابو داؤد نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور یحییٰ الحمانی کی رائے ہے کہ غالی قسم کا شیعہ تھا اور حضرت علیؓ کی رجعت کا معتقد تھا۔ سید الحفاظ یحییٰ بن معین کہتے ہیں جابر کچھ نہیں قطعاً کذاب تھا۔ بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ سبائی تھا اور رافضی یشتم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ رافضی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا گستاخ ہے۔ صرف جابر جعفی نہیں بلکہ دوسرے راویوں کے متعلق بھی امام اعظم سے تنقیدات منقول ہیں جن کو محدثین کے یہاں شرف قبول حاصل ہے مثلاً زید بن عیاش کے بارے میں امام اعظم اور امام مالک کے درمیان اختلاف ہے امام اعظم اسے مجہول قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک نے اس کے حوالہ سے مؤطا میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور چھوارے کو ملا کر بیچنے سے منع فرمایا ہے۔(۳)

---

(۱) الجواہر المضیۃ: ج ۱ ص ۳۰ (۲) میزان الاعتدال: ج ۱ ص ۱۷۶

(۳) تنویر الحوالک: ج ۲ ص ۵۳

بعد کو اگرچہ بعض محدثین نے امام مالک کی تقلید میں اس روایت کو صحیح قر...یا ہے۔ لیکن خود امام بخاری اور امام مسلم نے اس بارے میں امام ابو حنیفہ کے فیصلے سے موافقت کی ہے۔ چنانچہ محدث حاکم نے یہ حدیث درج کر کے امام بخاری اور امام مسلم کی جانب سے اس حدیث کی تخریج نہ کرنے پر معذرت اس طرح پیش کی ہے:

والشیخان لم یخرجاہ لماخشیا من جھالۃ زید بن عیاش۔

شیخین نے زید بن عیاش کے مجہول ہونے کے اندیشے سے اسے روایت نہیں کیا۔(۱)

حافظ ابن الہمام نے اسی موضوع پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

امام اعظم بغداد تشریف لائے وہاں کے ارباب روایت نے اس مسئلہ میں کہ رطب کی بیع تمر سے جائز ہے۔ یہ کہہ کر امام اعظمؒ کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے۔ ارباب روایت نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ بتایئے آپ کھجور کی بیع تمر سے کیسے جائز بتاتے ہیں؟ امام صاحب نے جواباً فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں کہ رطب تمر ہے۔ یا نہیں اگر ہے تو بیع جائز ہے۔ التمر بالتمر حدیث میں اس کی اجازت ہے۔ اور اگر تمر نہیں ہے تو پھر بھی اس کی بیع جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم۔ ارباب روایت نے لاجواب ہو کر حدیث سعد پیش کی جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع الرطب بالتمر سے منع فرمایا ہے۔ امام اعظم نے جواباً فرمایا کہ اس حدیث کا مدار زید بن عیاش ہے اس کی حدیث قابل پذیرائی نہیں ہے۔(۲)

اسماء الرجال اور امام اعظمؒ:

محدثین لکھتے ہیں کہ اسماء الرجال کا علم حدیث کے علم کا نصف ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے شرح الالفیہ میں امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے اور وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ حدیث

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ زید بن عیاش (۲) فتح القدیر: ص ۱۵۱

متن اور سند کے مجموعے کا نام ہے اور سند کا تعلق راویوں سے ہے اور راویوں ہی کے حالات کی واقفیت علم اسماء الرجال ہے۔ اور راویوں پر جرح وتعدیل ایک نہیں بلکہ دو عظیم الرتبت اور جلیل القدر فنون کے مجموعے کا نام ہے' نقد ونظر اس کی جان ہے۔ اگر ایک شخص کی ذات کو اس فن میں استدلالی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے تو اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اس کی رجال میں معرفت کی پختگی اور راویوں کے احوال سے واقفیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ علم الجرح میں جارح اور علم التعدیل میں معدل ہونے کی بنیادی شرط ہی یہی ہے۔ علماء نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاج الدین السبکی' علامہ بدر بن جماعہ اور حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح کی ہے کہ جو شخص جرح وتعدیل کے اسباب ووسائل سے واقف نہ ہو اس کی کوئی رائے اس فن میں کسی درجہ میں قبول نہ کی جائے گی اور حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

> وہ عالم وعارف جو حدیثوں کے راویوں کا تزکیہ یا ان پر جرح کرتا ہے نقاد خبیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تلاش وجستجو میں جان نہ کھپائے۔ اور بہت زیادہ مذاکرہ' شب بیداری' تیقظ اور فہم وفراست کے ساتھ دینداری' پارسائی اور انصاف سے ہم آغوش نہ ہو۔(۱)

دوسرے علماء نے بھی اسی قسم کی تصریحات پیش فرمائی ہیں:

اہل فن کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ ناقد کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضروری ہے ناقد کا فرض ہے کہ جس پر تنقید کر رہا ہے یہ جانے کہ کون ہے کیا کرتا ہے' اس کا چال چلن کیسا ہے' اس کی سمجھ بوجھ کس درجہ کی ہے ثقہ ہے یا غیر ثقہ' عالم ہے یا جاہل' ذہین ہے یا غبی' یادداشت کا کیا حال ہے' کہاں کا رہنے والا ہے' کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ان بنیادی امور سے پوری واقفیت نہ ہو کوئی شخص ناقدین میں شمار نہیں ہو سکتا۔ بلاریب اگر امام اعظم کا شمار معدلین رجال میں ہے اور نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جب کہ محدثین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے تو اس کے باور کرنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے کہ امام اعظم کو اسماء الرجال میں اونچا مقام حاصل تھا۔ امام اعظم اس موضوع پر بھی بعد میں آنے

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۵

والوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے ابوسلیمان الجوز جانی کے حوالہ سے مشہور امام حدیث حماد بن زید جو عبدالرحمٰن بن مہدی اور علی بن المدینی کے استاد ہیں ان کا جو بیان لکھا ہے:

سمعت حماد بن زید یقول ماعرفنا کنیۃ عمرو بن دینار الا بابی حنیفۃ کنافی المسجد الحرام و ابو حنیفۃ مع عمرو بن دینار فقلنالہ یا اباحنیفۃ کلمہ یحدثنا فقال یا ابا محمد حدثھم۔

میں نے حماد بن زید سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں عمرو بن دینار کی کنیت کا علم نہ تھا۔ ابوحنیفہ کے ذریعہ ہمیں ان کی کنیت کا علم ہوا۔ ایک بار ہم مسجد حرام میں تھے ابوحنیفہ عمرو بن دینار کے پاس ہی کھڑے تھے ہم نے امام صاحب سے کہا کہ آپ ان سے کہئے کہ حدیث بیان کریں آپ نے ان سے فرمایا کہ اے ابومحمد ان کو حدیث سناؤ۔(۱)

امام حماد بن زید کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ بیان پڑھیے فرماتے ہیں:

میں نے ان سے زیادہ سنت کا جانکار کوئی نہیں دیکھا ہے۔(۲)

حافظ ابن عبدالبر نے سلیمان بن حرب کے حوالہ سے جہاں ان کے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ حماد کہتے ہیں: بخدا مجھے ابوحنیفہ سے محبت ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ:

روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔(۳)

ان احادیث کثیرہ کی صحیح تعداد بھی سن لیجئے۔ امام عجلی فرماتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں یاد تھیں اور یہ آپ پہلے امام حسن بن زیاد کی زبانی سن چکے ہیں کہ امام اعظم کی مجموعی مرویات کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ امام ابوحنیفہ کی ساری مرویات حماد بن زید روایت کرتے تھے۔ واضح رہے یہ عمرو بن دینار ہی ہیں جن کے متعلق امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار کی حدیثیں بیان کرنے کے لیے مجھے

---

(۱) الجواہر المضیۂ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۲۲۵ (۳) الانتقاء: ص ۱۳۰

تحدیث کے لیے مقرر فرمانے والے بھی امام اعظم ہیں۔(۱) حماد بن زید کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن دینار کے پاس ہوتے جب امام اعظمؒ تشریف لاتے تو عمرو بن دینار ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف سراپا توجہ ہو جاتے ہم امام اعظمؒ سے پوچھتے وہ ہم سے حدیثیں بیان کرتے۔(۲)

تاریخ رجال میں امام اعظم کی مہارت اور برتری کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ جو داؤد بن المجبر نے بتایا ہے کہ امام اعظمؒ سے پوچھا گیا کہ احرام والے کو اگر تہہ بند نہ ملے تو کیا شلوار پہن سکتا ہے؟ فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اسے تہہ بند باندھنا چاہیے۔ پوچھا اگر اس کے پاس تہہ بند نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا شلوار فروخت کرے اور تہہ بند خرید لے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

المحرم يلبس السراويل اذالم يجد الازار۔

احرام والا شلوار پہنے جب اسے تہہ بند دستیاب نہ ہو۔

امام اعظم نے جواب میں فرمایا کہ:

لم يصح في هذا عندى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم شيء۔

میرے نزدیک اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔(۳)

اور فرمایا کہ ہمارے نزدیک تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت یہی ثابت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام والے کو شلوار پہننے سے منع فرمایا۔

کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی راویوں پر نظر ہو اور اسانید و طرق کا پتہ ہو اس لیے امام اعظم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ امام اعظم تاریخ رجال سے پورے طور پر واقف تھے۔

امام مالک سے جب اس حدیث کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تو امام مالک کو جواب یہ تھا:

لم اسمع بهذا ولا ارىٰ ان يلبس المحرم سراويل۔

(۲،۱) اوجز: ج ا ص ۶۱ (۳) الانتقاء

میں نے یہ حدیث نہیں سنی ہے اور احرام والے کے لیے میری رائے میں شلوار پہننے کی گنجائش نہیں ہے۔

الغرض امام مالک اور امام ابوحنیفہ دونوں ہی احرام والے کے لیے شلوار پہننے کے جواز کے قائل نہیں ہے لیکن حدیث کی حد تک ایک بار ایک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ امام مالک حدیث کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں۔ اور نہ سننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کو امام مالک کی جانب سے یہ معذرت پیش کرنے کا خیال آ گیا۔

كان حديث ابن عباس لم يبلغه۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو یہ حدیث نہیں پہنچی۔(۱)

برخلاف امام اعظم کے کہ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں ہے بلکہ فرمایا ہے:

لم يصح لی هذا عندی عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

اور دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے ایک میں بے خبری اور دوسری میں باخبری کا پتہ ان کے لم یصح کہنے سے چلتا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ حدیث تو موجود ہے لیکن اس کی صحت کا جو معیاری پیمانہ مقرر ہے اس پر پوری نہیں اترتی ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں عدم صحت اس کو مستلزم نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی اور موضوع ہے۔ علامہ زرکشی نے نکت علی ابن الصلاح میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد اور نتائج الافکار میں اور ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں تصریح کی ہے اور باخبر ہو کر روایت کی عدم صحت کا اعلان فنکار ہونے کی نشانی ہے اسی بنا پر اس حدیث پر علی الاطلاق امام احمد کے سوا کسی نے عمل نہیں کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

قال القرطبی اخذ بظاهر هذا الحديث احمد فاجاز لبس الخف و السراويل للمحرم الذی لا يجد النعلين والا زار على مالهما واشترط الجمهور قطع الخف و فتق السراويل۔

---

(۱) اوجز المسالک مع مؤطا: ج ۳ ص ۳۱۲

قرطبی فرماتے ہیں اس حدیث کے ظاہر پر امام احمد نے عمل کیا ہے انہوں نے خف اور شلوار کے پہننے کو جیسے بھی ہوں جائز سمجھا ہے لیکن جمہور نے خف کے لیے قطع اور شلوار کے لیے فتق کی شرط لگائی ہے۔(۱)

بہر حال امام اعظمؒ ابو حنیفہ علم الجرح و التعدیل کی طرح اسماء الرجال کے فن میں یکتائے روزگار تھے۔

تحمل روایت حدیث اور امام اعظمؒ:

امام اعظمؒ نے علم حدیث کے ہر شعبے میں خاص رہنمائی فرمائی ہے اور مستقبل میں جب کہ علوم و فنون میں بہار آنے والی تھی آپ نے راستے کے نشانات کا کچھ اس انداز سے پتہ دیا ہے کہ بعد میں آنے والوں نے ان ہی بتائے ہوئے نشانات پر پوری عمارت قائم کی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حزم نے بتایا ہے کہ اقوام دنیا میں کسی کو اسلام سے پہلے یہ توفیق میسر نہیں ہوئی ہے کہ اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے یہ شرف صرف امت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے اس کے برعکس اسلام نے اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک گوشہ پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا اور صرف اس سرمایہ علمی کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس علمی سرمایہ کو آگے پہنچانے' ایک دوسرے سے اسے حاصل کرنے کے طرق بھی مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ اسی کو محدثین کی اصطلاحی زبان میں تحمل روایت کہتے ہیں۔

تحمل روایت کے طرق:

تحمل روایت کے لیے ارباب روایت نے آٹھ صورتیں مقرر فرمائی ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

الاخذ للحدیث و تحمله عن الشیوخ ثمانیة اقسام ۔(۲)

---

(۱) فتح الباری: ج ۴ ص ۴۶ (۲) توضیح الافکار: ج ۲ ص ۲۹۵

پھر ان طرق سے حاصل کردہ احادیث کو بیان کرنے کے لیے تعبیر کا بھی ایک خاص پیانہ مقرر کیا ہے۔

محدثین نے تحمل روایت کی جو آٹھ صورتیں بتائی ہیں یہ ہیں:

سماع	عرض	اجازہ	مناولہ	مکاتبہ	اعلام	وصیۃ	وجادہ

سماع وعرض:

سماع یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے مشافہۃً احادیث سنے چاہے استاد اپنے حافظہ کے بھروسہ پر زبانی سنائے یا پھر کتاب سے دیکھ کر سنائے۔ لکھائے یا نہ لکھائے۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

سماع الشیخ وھو املاء وغیرہ من حفظ ومن کتاب۔(۱)

حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں:

سواء احدث من کتابہ اومن حفظہ باملاء اوبغیرا ملاء۔(۲)

عرض یہ ہے کہ شاگرد پڑھے اور استاد سنے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

القراءۃ علی الشیخ حفظا اومن کتاب و ھوالعرض عندالجمھور۔(۳)

سماع ہو یا عرض ان دونوں میں اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان دونوں طریقوں سے روایت کرنا صحیح ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں برابر ہیں یا ان دونوں میں اعلیٰ وادنیٰ کی نسبت ہے۔

جمہور محدثین نے سماع کو ارفع اقسام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں' حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں' امام نووی نے تقریب میں' حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں اس کی تصریح کی ہے لیکن اس موضوع پر دوسری صدی کے محدثین کی آراء ان بزرگوں سے مختلف ہیں۔ دوسری صدی میں امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام لیث بن سعد' امام ابن ابی ذئب' امام شعبہ' امام یحییٰ بن سعد الانصاری' امام عبدالعزیز

(۱) تقریب: ص ۲۳۷ (۲) توضیح الافکار: ج ۲ ص ۲۹۷ (۳) اختصار علوم الحدیث

بن جریج' امام سفیان ثوری اور امام سعید بن ابی عروبہ جیسے اساطین امت کی رائے میں تحمل روایت کی دوسری صورت یعنی شاگرد اور استاد سنے جسے قراءۃ علی الشیخ اور عرض کرتے ہیں: ارفع اقسام ہے۔ اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں۔

حافظ سیوطی نے امام بیہقی کی مدخل کے حوالہ سے مکی بن ابراہیم کا بیان درج کیا ہے۔

ابن جریج' عثمان بن الاسود' حنظلہ بن ابی سفیان' طلحہ بن عمرو' امام مالک' محمد بن اسحاق' سفیان ثوری' ابوحنیفہ' ہشام بن عروہ' ابن ابی ذئب' سعید بن ابی عروبہ' المثنیٰ بن الصباح' ان سب کا کہنا ہے کہ تمہارا استاد تمہارے سامنے پڑھے اور تم سنو۔(۱)

حافظ ابوبکر الخطیب نے مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے خاص امام ابوحنیفہ کی زبانی بیان لکھا ہے:

مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے کہ میں اگر استاد کے روبرو پڑھوں تو مجھے یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ استاد پڑھے اور میں سنوں۔(۲)

اسی سلسلے میں امام حسن بن زیاد کے حوالے سے امام اعظم کا جو بیان آیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔ اس سے امام صاحب کا موقف واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے۔ تمہارا محدث کے روبرو پڑھنا اس سے سننے کے مقابلے میں زیادہ ثابت اور مؤکد ہے کیونکہ جب استاد تمہارے سامنے پڑھے تو وہ صرف کتاب ہی سے پڑھے گا اور جب تم پڑھو گے تو وہ کہے گا کہ میری جانب سے وہ بیان کرو جو تم نے پڑھا ہے اس لیے یہ مزید تاکید ہوگی۔(۳)

حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کے اس موقف کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

وعن مالک و ابی حنیفة و ابن ابی ذئب انها اقوی۔

امام مالک' ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ یہی قوی ہے۔

امام نووی نے امام صاحب کے اس موقف کو ذرا اور طرح پیش کیا ہے:

والثابت عن ابی حنیفة و ابن ابی ذئب وهو روایة عن مالک۔

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۲۴۴ (۲) الکفایہ فی علوم الراویہ: ۲۷۶ (۳) اختصار علوم الحدیث: ص ۱۱۰

امام ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ قراءۃ علی الشیخ کو سننے پر ترجیح دی جائے۔(۱)

حافظ ابن الصلاح نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے:

فنقل عن ابی حنیفة وابن ابی ذئب وغیرھما ترجیح القرءة علی الشیخ علی السماع من لفظه۔(۲)

امام ابوحنیفہ امام ابن ابی ذئب نے قراءۃ علی الشیخ کو سماع پر ترجیح دی ہے۔

حافظ زین الدین عراقی نے امام اعظم اور ابن ابی ذئب کا نام لکھ کر بتایا ہے:

قد رجحا العرض وعکسهٔ اصح

وَجلُّ اھل المشرق نحوه' جنح۔(۳)

اس داستان کو طول دینے اور ارباب حدیث کی تصریحات کے تکرار سے میرا مقصود علم کے ان یتیم خانوں میں محدثین کی یہ صدائے غریب پہنچانا ہے جو بجلی کی روشنی اور پنکھوں کی ہوا میں بیٹھ کر یہ کہتے رہتے ہیں کہ ابوحنیفہ حدیث سے بے بہرہ تھے اور ابلہ فریبی کے لیے ڈھونڈورا پیٹتے ہیں کہ وہ فقیہ تھے اور صرف فقیہ.......... انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔

بہرحال تحمل روایت کا کوئی طریق ہو سماع ہو یا قراءۃ علی الشیخ اس پر سب کا ہی اتفاق اور لیا ہے کہ دونوں طرح سے روایت صحیح ہے لیکن بیان روایت کے لیے دوسرے طریق یعنی قراءۃ علی الشیخ میں جو تعبیری پیمانہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں اگرچہ اس حد تک تو سب یک زبان ہیں کہ تعبیریوں ہونی چاہیے قرأت علیه (میں نے اس کے سامنے پڑھا) یاقری علیه وانا اسمع (اس کے سامنے پڑھا گیا اور میں سن رہا تھا) وغیرہ۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طریق میں حدثنا یا اخبرنا کا تعبیری پیمانہ بھی استعمال کرنا درست ہے یا نہیں۔ عام ارباب روایت اور محدثین اس سے روکتے ہیں۔ امام احمد نسائی اور دوسرے محدثین کا یہی مذہب ہے خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

ھو مذھب خلق کثیر من اصحاب الحدیث۔

محدثین کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔

---

(۱) تقریب: ص ۲۴۳ (۲) مقدمہ: ص ۵۲ (۳) الفیہ: ص ۶۲

حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم، نسائی اور جمہور مشارقہ کا مذہب قرار دیا ہے لیکن اس موضوع پر امام اعظم ابو حنیفہ کا مذہب ان بزرگوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ امام اعظم اس صورت میں حدثنا کی تعبیر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابو بکر الخطیب فرماتے ہیں کہ:

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا کہ ایک شخص جس نے حدیث محدث کو سنا کر حاصل کی ہے کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ حدثنا کہے؟ فرمایا کہ ہاں اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ حدثنی فلان اور سمعت فلان۔ اور اس کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے سامنے اقراری دستاویز کو پڑھا جائے اور کہہ دے کہ اس نے میرے سامنے اس دستاویز کے سارے مندرجات کا اقرار کیا ہے۔(۱)

ایک دوسرے موقعہ پر خطیب بغدادی ہی رقمطراز ہیں:

امام ابو عاصم النبیل کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک، ابن جریج، سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا کہ ایک شخص اگر شیخ کے سامنے حدیث پڑھ رہا ہے تو کیا اسے نقل روایت کے موقعہ پر حدثنا کہنا درست ہے؟ سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

امام ابو عاصم ہی کا ایک اور بیان اس سے زیادہ واضح ہے فرماتے ہیں:

میں نے امام مالک ابن جریج، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ سے پوچھا کہ محدث کے سامنے ایک شخص خود حدیث پڑھتا ہے پھر وہ کہتا ہے کہ حدثنا فلان اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سب کا جواب یہ تھا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ابو عاصم کہتے ہیں کہ ان میں دو حجازی اور دو عراقی ہیں۔

مشہور محدث یحییٰ بن ایوب کہتے ہیں:

میں نے ابو قطن سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میرے سے امام ابو حنیفہ نے کہا میرے سامنے پڑھو اور حدثنا کہو۔ اگر میرے خیال میں اس میں کوئی بھی مضائقہ ہوتا تو میں ایسا کرنے کا تمہیں ہرگز حکم نہ دیتا۔(۲)

---

(۱) الکفایہ فی علوم الروایہ: ص ۳۰۷ (۲) الکفایہ: ص ۳۰۷

امام نووی نے تقریب میں اسے دوسری صدی کے محدثین کا مذہب قرار دیتے ہوئے اس موضوع پر امام بخاری کی ہمنوائی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

انه مذهب الزهری ومالک و ابن عیینه و یحییٰ القطان والبخاری و جماعة من المحدثین و معظم الحجازیین والکوفیین۔(۱)

قاضی عیاض، حافظ سیوطی، حافظ ابن کثیر بھی اس معاملے میں امام نووی کے ہم زبان ہیں۔

تحمل روایت اور اجازت:

تحمل روایت کے طریقوں میں سے اجازت بھی محدثین کے یہاں ایک طریق ہے محدثین کی زبان میں اجازت یہ ہے کہ شیخ کسی بھی شخص کو اپنی مرویات کی روایت کا زبانی یا تحریری پروانہ دیدے۔

اجازت کی ایک نہیں بلکہ محدثین کے نزدیک متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو کسی خاص حدیث کی اجازت دی جائے مثلاً یوں کہے کہ میں نے تم کو حدیث کی اجازت دی ہے۔ جمہور محدثین اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس طریق سے علمی سرمایہ کی روایت کو درست کہتے ہیں۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

والصحیح الذی قاله الجمهور من الطوائف واستقر علیه العمل جواز الروایة والعمل بها۔

سب کے نزدیک صحیح اور سب کا عمل جس پر ہے وہ یہی ہے کہ اس کی روایت اور اس پر عمل درست ہے۔(۲)

لیکن محدثین میں مشہور امام نقد ونظر شعبہ اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں امام آمدی کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کا اور قاضی عبدالوہاب کے حوالہ سے امام مالک کا بھی یہی موقف قرار دیا ہے۔ چنانچہ آمدی نے تصریح کی ہے:

قال ابو حنیفة و ابو یوسف لا تجوز الروایة بالاجازة مطلقاً۔(۳)

(۱) تقریب: ص ۲۳۵ (۲) تقریب: ص ۲۳۵ (۳) احکام الاحکام آمدی: ج ۲ ص ۱۹۲

تحمل روایت اور مناولہ:

تحمل روایت کے طریقوں میں سے ایک طریق مناولہ بھی ہے۔

مناولہ یہ ہے کہ محدث طالب کو اپنی مسموعات پر مشتمل کتاب دے اور کہہ دے کہ اسے تم میری جانب سے روایت کرو یا طالب کو کتاب کا مالک بنادے یا لکھنے کے لیے کتاب عاریۃً دیدے یا طالب شیخ کے پاس اپنی مسموعات کی کتاب لے کر آئے شیخ اسے دیکھ کر طالب کو کہہ دے کہ تمہیں اس کتاب کے مشتملات کی میری جانب سے روایت کی اجازت ہے اس کو عرض المناولہ کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر محدثین کے یہاں یہ سوال ابھر آیا ہے کہ بلحاظ قوت اس کا کیا حکم ہے؟ اس ابھرے ہوئے سوال کے جواب میں علماء مختلف الخیال ہیں۔ امام نووی نے بتایا ہے کہ امام زہری' ربیعہ' یحییٰ بن سعید' مجاہد' امام شعبی' علقمہ' ابراہیم' ابوالعالیہ' ابوالزبیر مکی' ابوالتوکل' مالک' ابن وہب' ابن القاسم۔ ان سب کی رائے یہ ہے کہ عرض مناولہ قوت میں تحمل روایت کی پہلی صورت سماع کے برابر اور ہم پلہ ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں امام ابوحنیفہ' سفیان ثوری' امام اوزاعی اور عبداللہ بن المبارک وغیرہ کہتے ہیں کہ عرض مناولہ کا درجہ سماع اور قرأت علی الشیخ دونوں سے کمتر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

والصحیح انھا منحطۃ عن السماع والقراءۃ وھو قول الثوری والاوزاعی و ابن المبارک و ابی حنیفۃ۔

صحیح یہی ہے کہ مناولہ عرض کا مقام سماع اور قرأت علی الشیخ سے نیچے ہے یہی ثوری' اوزاعی' ابن مبارک اور ابوحنیفہ کا کہنا ہے۔(۱)

اور امام حاکم نے اسی بات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے:

اما فقھاء الاسلام الذین افتوا فی الحلال والحرام فانھم لم یروہ سماعاً منھم الشافعی والاوزاعی و ابو حنیفۃ والثوری و ابن حنبل وابن المبارک۔

فقہاء اسلام جو اسلام میں حلال وحرام کا فتویٰ دیتے ہیں وہ عرض مناولہ کو سماع قرار نہیں دیتے جیسے شافعی' اوزاعی' ابوحنیفہ اور ثوری وغیرہ۔(۲)

(۱) مقدمہ ابن الصلاح (۲) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۲۰۶

بہرحال امام اعظم کا مذہب اس موضوع پر یہی ہے کہ عرض مناولہ سماع وقرأت کے ہم پلہ نہیں ہے۔ اور متاخرین محدثین نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

تحمل روایت کی باقی صورتیں یعنی مکاتبہ' اعلام' وصیت اور وجادہ پر بھی محدثین کے یہاں تفصیلی مباحث اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حدیث کی ہر شاخ میں امام اعظم کی جلیل القدر خدمات موجود ہیں اور محدثین نے ہمیشہ سے اس فن میں ان کی جلالت شان کا لوہا مانا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن عبدالبر نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے:

ادرکت الف رجل و کتبت عن اکثرھم مارایت فیھم افقہ ولا اورع ولا اعلم من خمسۃ اولھم ابو حنیفۃ۔

میں نے ہزار ہا محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ' سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں۔ ان میں اولین مقام ابو حنیفہ کا ہے۔(۱)

محدث صیمری نے شیخ الاسلام حافظ یزید بن ہارون سے بھی اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے۔

کان ابو حنیفۃ تقیاً زاھداً عالمًا صدوق اللسان احفظ اھل زمانہ۔(۲)

اور امام یحییٰ بن سعید القطان جو مشہور ناقد حدیث اور جرح وتعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں:

انہ واللہ لا علم ھذہ الامۃ بما جاء عن اللہ ورسولہ۔

واللہ امام ابوحنیفہ اس امت میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سب سے بڑے عالم تھے۔(۳)

امام ابوعبداللہ الحاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نوع التاسع والاربعین

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ' الانتقاء: ص ۱۶۳　(۲) ماتمس بہ الحاجہ　(۳) ماتمس بہ الحاجہ

میں ان ائمہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی حدیثوں کو حفظ و مذاکرہ اور برکت کے لیے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات المشهورين من التابعين و اتباعهم ممن يجمع حديثهم للحفظ والمذاكرة والتبرك بهم وبذكرهم من الشرق الى الغرب۔

یہ قسم علوم حدیث میں سے ان معتمد مشہور تابعین اور اتباع تابعین کے بتانے کے لیے ہے جن کی حدیثوں کو حفظ مذاکرہ کے لیے جمع کیا جاتا ہے اور جن سے برکت پائی اور مشرق سے مغرب تک جن کے ذکر سے برکت لی جاتی ہے۔(۱)

یہ عنوان قائم کر کے امام حاکم نے مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، الجزیرہ، بصرہ، واسطہ اور خراسان کے محدثین کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں امام ابوحنیفہ کا نمایاں تذکرہ کیا ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم محدث ہونے کی حیثیت سے محدثین کی برادری میں صرف جانے پہچانے نہیں بلکہ بارگاہ محدثین میں ان کی جلالت و امامت علم حدیث میں مسلم ہے۔

حدیث شاذ اور امام اعظمؒ:

یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی تدوین حدیث کے بعد حدیث کے نام پر جو علمی سرمایہ موجود ہے وہ تین قسم کا ہے: کچھ وہ حدیثیں ہیں جن کے الفاظ محفوظ ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں کہ الفاظ تو محفوظ نہیں لیکن ان کے معانی محفوظ ہیں۔ اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کے الفاظ میں اختلاف ہے اور ساتھ ہی ان کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ قسم اول اور قسم ثانی محدثین اور فقہاء کے یہاں مفہوم و مدلول کی تعیین میں اختلافی ہے اور آخری قسم خود محدثین کے یہاں صحت اور ثبوت کے لحاظ سے اختلافی ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر عقال الصقلی فرماتے ہیں:

احادیث محدثین کے یہاں دائرہ ضبط میں اس طرح آئی ہیں کہ کچھ ایسی ہیں جن کی نقل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعینہ الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہی وہ حدیثیں

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۲۴۰

ہیں جو ہر قسم کی علت سے پاک وصاف ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ نقل میں معانی تو محفوظ ہیں مگر اصل الفاظ تک محدثین کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ اور کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ جن کے الفاظ مختلف ہیں اور جن کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے یہی وہ حدیثیں ہیں جن میں علتیں ہوتی ہیں۔ فنکار ہی اصول صحیحہ کے مطابق ان میں صحیح ضعیف کی تمیز کر سکتے ہیں۔(۱)

محدثین نے صحیح حدیث کی تعریف یہ بتائی ہے کہ جس کے راویوں میں ضبط، عدالت کے ساتھ سند کا اتصال ہو اور اس میں شذوذ اور علت قادحہ نہ ہو۔ گویا حدیث کے صحیح ہونے کی ایک ناگزیر حتمی شرط یہ ہے کہ وہ شاذ نہ ہو لیکن شاذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں محدثین میں باہم اختلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے حافظ ابو یعلی الخلیلی سے شاذ کی یہ تعریف نقل کی ہے:

والذی علیہ الحفاظ ان الشاذ مالیس لہ الااسناد واحد یشذ بہ ثقة اوغیر ثقة۔

حفاظ کے نزدیک شاذ یہ ہے کہ اس کی صرف ایک ہی سند ہو اور اس طرح ثقہ یا غیر ثقہ اس میں شذوذ پیدا کر رہا ہو۔(۲)

اور امام حاکم نے شاذ کی یہ تعریف بتائی ہے:

ھو الذی ینفرد بہ الثقة ولیس لہ متابع۔

ثقہ راوی کا ایسا یگانہ بیان جس کا تبع کوئی نہ ہو شاذ کہلاتا ہے۔(۳)

لیکن حافظ ابن الصلاح نے دونوں پر بڑی کڑی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر شاذ یہی ہے۔ تو امام بخاری کی پہلی حدیث بھی شاذ ہے اور اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) شروط الائمة الخمسہ' ذکر الکوثری فی تعلیقہ ناقلا من ابی بکر بن عتال الصقلی فی مسندہ علی ما رواہ ابن بشکوال۔ (۲) اختصار علوم الحدیث: ص ۵۷ (۳) معرفۃ علوم الحدیث: ص ۱۱۹

اس تعریف کی بنیاد پر تو حدیث انما الاعمال بالنیات بھی شاذ ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک فرد ہے جسے حضرت عمرؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منفرداً روایت کرتے ہیں پھر حضرت عمرؓ سے علقمہ بھی منفرداً روایت کرتے ہیں اور علقمہ سے اسے روایت کرنے میں محمد بن ابراہیم اور محمد بن ابراہیم سے یحییٰ بن سعید منفرد ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہی ثابت ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال عبداللہ بن دینار کی یہ حدیث ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن بیع الولاء وھبتہ۔ اس میں بھی عبداللہ بن دینار منفرد ہے۔ ایسے ہی وہ حدیث جو بحوالہ مالک از زہری از انس آئی ہے جس میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپ کے سر پر ڈھال تھی۔ اس میں مالک امام زہری سے منفرد ہیں۔ یہ سب روایات صحیحین میں موجود ہیں اور ان کی سند بھی صرف ایک ہی ہے جس کا تعلق ثقہ کے تفرد سے ہے۔ غرائب صحیح میں اس کا وافر ذخیرہ ہے۔ امام مسلم کا اپنا اقرار ہے۔ کہ امام زہری کی نوے حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی اسناد میں وہ منفرد ہیں اور ان کی کوئی ہمنوائی نہیں کرتا ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے اس الجھن کا مداوی اور اس مشکل کا خود ہی حل بھی پیش فرمایا ہے لیجئے وہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے وہ فرماتے ہیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ راوی اگر کوئی روایت منفرداً پیش کرتا ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس کی یہ روایت اگر اس سے زیادہ کسی حافظ وضابط کی روایت کے خلاف ہو تو یہ شاذ مردود ہے۔ اور اگر اس کی روایت میں خلاف کا کوئی پہلو نہ ہو تو پھر اس منفرد کی حیثیت کو دیکھا جائے گا حافظ عادل اور ثقہ ہو تو اس کے تفرد کو شرف پذیرائی دیا جائے اور اس میں یگانت قادح نہیں ہوگی جیسا کہ پہلی مثالوں میں ہے اور اگر راوی کے حفظ و اتقان پر بھروسہ نہ ہو تو اس کی روایت دائرہ صحت سے خارج تصور کی جائے گی۔(۱)

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ص ۳۰

قاضی بدر الدین بن جماعہ نے حافظ ابن الصلاح کی اس پیش فرمودہ قرار داد کی تائید فرمائی ہے لیکن حافظ محمد بن ابراہیم نے اس پر بھی ایک سوال قائم کر دیا ہے اور بہت کچھ چنین و چناں کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

شاذ اور نکارت کی بنا پر حدیث میں محدثین کے لیے قدح بے حد مشکل ہوگئی۔(۱)

یہ خالص محدثانہ رنگ میں ان محدثین کا نقطہ نظر ہے جن پر اسناد و روایت کا غلبہ ہے۔ دوسری صدی میں شاذ کی تعریف اور اس کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے محدثین نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ ہر ایسی حدیث کو شاذ قرار دیتے ہیں جو اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے خلاف ہو۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے امام اعظمؒ کے نقطہ نظر کو ایک موقعہ پر محدثین کو جواب دیتے ہوئے اس طرح واضح کیا ہے:

کثیر من اهل الحدیث استجازوا الطعن علی ابی حنیفة لردہ کثیراً من اخبار الآحاد العدول لانه کان یذهب فی ذالک الیٰ عرضها علی ما اجتمع علیه من الاحادیث و معانی القران فما شذ من ذالک ردہ وسماہ شاذا۔

بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہ پر اس لیے اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے مجموعہ سے ملا کر دیکھتے۔ اگر خبر واحد کا مضمون ان سے مطابقت کھا جاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث فرماتے۔(۲)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام اعظمؒ اس حدیث کو شاذ بتاتے ہیں جو معانی قرآن اور اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں کے خلاف ہو۔ امام اعظمؒ کا شاذ کے

(۱) تنقیح الانظار: ج ۱ ص ۳۸۵ (۲) الانتقاء: ص ۱۴۹ الموافقات: ج ۲ ص ۲۳

موضوع پر یہ موقف قابل داد ہے اور امام مالک بھی امام صاحب کے ہمنوا ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک حدیث ولوغ کلب کی تضعیف فرماتے تھے۔ شاطبی فرماتے ہیں: کان مالک یضعفہ۔ امام مالک اسے ضعیف کہتے تھے۔(۱) لیکن حالات کے تحت طبیعتوں اور مزاجوں میں اختلاف رونما ہو گیا۔ جن کے مزاجوں میں تقلہ کا رنگ غالب تھا انہوں نے امام اعظمؒ کی ہمنوائی کی۔ چنانچہ امام شافعیؒ سے جو شاذ کی تعریف منقول ہے وہ بھی اس کے قریب قریب ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

شاذ یہ نہیں ہے کہ ثقہ راوی کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس کو اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا بلکہ شاذ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو عام لوگوں کی روایت کے مخالف ہو۔(۲)

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یخالف ماروی الناس سے امام اعظمؒ کے موقف کی تائید فرمائی ہے۔ لیکن چونکہ امام موصوف نے تیسری صدی کا کچھ حصہ پایا ہے اور اس دور میں جملہ بلاد اسلامیہ کے افراد و غرائب بازار میں عام ہو گئی تھیں اس لیے تعبیر اس ماحول کی علمی فضا سے متاثر ہو گئی ہے اور معاملہ صرف روایت و اسناد پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔

قاضی ابو یوسف نے ایسی روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہوں اور جو فقہاء مجتہدین میں معروف نہ ہوں۔

چنانچہ وہ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں:

فایاک وشاذ الحدیث و علیک بما علیہ الجماعۃ من الحدیث وما یعرفہ الفقھاء مایوافق الکتاب والسنۃ۔

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

وھو عندنا شاذ و الشاذ من الحدیث لا یوخذبہ۔

یہ حدیث شاذ ہے اور شاذ حدیث ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے۔(۳)

بہر حال دوسری اور تیسری صدی کے محدثین شاذ حدیث کے موضوع پر مختلف الخیال ہیں۔

---

(۱) الموافقات: ج ۳ ص ۲۱ (۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۳۷۷ (۳) الرد علی سیر الاوزاعی: ص ۱۰۵

روایت بالمعنے اور امام اعظمؒ:

اس نقطہ پر متقدمین اور متاخرین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ اگر روایت کرنے والا حافظ اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے روایت بالمعنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص حدیث بالمعنے روایت کرنا چاہے تو اگر الفاظ اور مقاصد روایت سے آشنا نہ ہو تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کے لیے روایت بالمعنے جائز نہیں ہے۔ اسے روایت بالالفاظ ہی کرنی چاہیے۔(۱)

امام نووی فرماتے ہیں کہ:

اگر الفاظ اور مقاصد سے ناآشنا ہو اور معانی کے ڈھانچہ سے ناواقف ہو۔ تو بالا اتفاق اس کے لیے روایت بالمعنے ناجائز ہے روایت باللفظ ہی کرنی چاہیے۔(۲)

حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں بھی تصریح فرمائی ہے۔ لیکن علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ اگر راوی عالم و عارف ہو تو کیا اس کے لیے روایت بالمعنے کی کوئی گنجائش ہے حافظ ابوبکر الخطیب نے اکثر سلف کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ اسے بھی ناجائز کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

سلف کی اکثریت اور حدیث میں ارباب تحقیق کہتے ہیں کہ روایت بالمعنے ناجائز ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ روایت باللفظ ہو اس میں کسی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی اور کسی طرح کی تقدیم اور تاخیر نہ کی جائے۔ اس موضوع پر کچھ روایات ہم پیش کر چکے ہیں ان اکابر نے عالم اور غیر عالم میں اس موضوع پر کوئی فرق نہیں کیا ہے۔(۳)

حافظ جلال الدین السیوطی نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمد امام ابن سیرین اور رجاء بن حیوہ کا مسلک قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کان القاسم بن محمد و ابن سیرین ورجاء بن حیوہ یعیدون الحدیث علی حروفہ۔(۴)

---

(۱) مقدمہ: ص ۸۵ (۲) تقریب: ص ۳۱ (۳) الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۱۹۸ (۴) تدریب الراوی ص ۳۱۶

قاسم ابن سیرین رجاء روایت باللفظ کرتے تھے۔
امام ذہبی نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اسی نظر کا علمبردار بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

كان ممن يتحرى في الاداء يشدد في الرواية ويزجر تلامذته عن التهاون في ضبط الالفاظ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ادائیگی میں تحری کرتے تھے اور روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ضبط الفاظ میں تہاون سے بڑے زور سے روکتے تھے۔
اگرچہ امام غزالی نے المستصفی میں، امام رازی نے محصول میں، علامہ قرافی نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہ نقل روایت میں روایت بالمعنے کے جواز کے قائل ہیں لیکن مشہور محدث ملا علی قاری نے شرح مسند امام میں امام اعظمؒ کے بارے میں حافظ ابوجعفر طحاوی کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظمؒ کسی درجے میں بھی روایت بالمعنے کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ حافظ ابو جعفر کی وہ روایت جس کو دلیل بنا کر انہوں نے امام اعظمؒ کا یہ موقف بتایا ہے یہ ہے:

حدثنا سليمان بن شعيب حدثنا ابى قال املأعلينا ابو يوسف قال قال ابو حنيفة لا ينبغي الرجل ان يحدث من الحديث الا ما يحفظ من يوم سمعه الى يوم يحدث به۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں بیان کرنی چاہیے جب تک اسے سننے کے دن سے لے کر بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔(۱)
اور اس سے ملا علی قاری نے امام اعظمؒ کا یہ مسلک مقرر فرمایا ہے کہ:

حاصله انه لم يجوز الرواية بالمعنے ولو كان مرادفاً للمعنى خلافاً لجمهور من المحدثين۔

امام اعظمؒ روایت بالمعنے کو ناجائز کہتے ہیں چاہے وہ مرادف الفاظ ہی میں کیوں نہ

(۱) شرح مسند امام: ص۳

ہو یہ جمہور محدثین کے خلاف ہے۔

یہی قرین قیاس ہے کیونکہ وہ جب یہ پابندی لگاتے ہیں کہ جب تک روایت سننے کے دن سے بیان کرنے تک زبانی یاد نہ ہو روایت بیان نہ کرے اور وہ حفظ کے ساتھ یہ قید بھی اضافہ کرتے ہیں کہ راوی روایت کا حافظ ہونے کے ساتھ عارف بھی ہو تو وہ یہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ بلکہ امام اعظمؒ نے تو اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ اگر حفظ و معرفت کا سرمایہ راوی کے پاس نہ رہا ہو چاہے وہ روایت باللفظ ہی ہو لیکن راوی کو یاد نہ ہو مگر لکھی ہوئی اس کے پاس موجود ہو تو صرف کتاب کے سہارے راوی کو روایت کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ امام نوی رقمطراز ہیں:

الو جد سماعه فی کتابه ولا یذکره فعن ابی حنیفة وبعض الشافعیة لایجوز روایته۔

اگر حدیث راوی کے پاس کتاب میں لکھی ہوئی ہو لیکن اسے زبانی یاد نہ ہو تو امام ابو حنیفہ اس کی روایت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔(۱)

اس سے محدث قاری ہی کی تائید ہوتی ہے۔ خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا جو بیان لکھا ہے اس سے امام اعظمؒ کے اس موقف پر جس کی نشاندہی ملا علی قاری نے کی ہے مزید روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

یحییٰ بن معین سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس اپنی لکھی ہوئی حدیث ہو لیکن وہ اسے زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا کہ ابو حنیفہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کا آدمی حافظ اور عارف نہ ہو اسے بیان نہ کرے۔(۲)

ظاہر ہے کہ حفظ کا الفاظ سے اور معرفت کا معانی سے ہی تعلق ہے یعنی راوی کو الفاظ بھی محفوظ ہونے چاہئیں اور الفاظ کے ساتھ معانی بھی اس کے جانے پہچانے ہوں۔ اس قید اور پابندی کے پیش نظر روایت بالمعنے کی امام اعظم کے یہاں کب گنجائش ہو سکتی ہے؟ صاحب کشف الاسرار نے اسی کو عزیمت قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الکفایہ: ص ۲۳۱ (۲) کشف الاسرار: ج ۲ ص ۴۳

العزیمة ان یحفظ المسموع من وقت السماع والفهم الیٰ وقت الاداء وهذا مذهب ابی حنیفة فی الاخبار والشهادت۔

عزیمت یہی ہے کہ سنی ہوئی بات کو سننے اور سمجھنے کے وقت سے نقل روایت کے وقت یاد رکھے یہی اخبار وشہادات میں ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔(۱)

اور عزیمت کے مقابلے میں رخصت بنا کر جس چیز کا ذکر کیا ہے وہ محدثین کی رخصت نہیں بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی حدیث معلوم ہو اور اس سے کوئی شخص علمی استفادہ کرنا چاہتا ہے۔تو یہ اپنے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ارشاد نہ صرف یاد ہو بلکہ اسے پورے طور پر سمجھے ہوئے بھی ہو۔لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ:

اول:۔ ارشاد کا تعلق محکمات سے ہو۔

دوم:۔ بیان کرنے والا وجوہ لغت سے آشنا ہو۔اس کا منشا یہ ہے کہ اگر ارشاد عام ہو تو پھر اس میں روایت بالمعنے کی اجازت نہیں ہے۔ایسے ہی اگر ارشاد مشکل، مشترک اور مجمل کا حال ہو تو پھر روایت بالمعنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔

چنانچہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رقمطراز ہیں:

والرخصة ان ینقله بمعناه فان کان محکمالا یحتمل غیره یجوز نقله بالمعنی لمن له بصیرة فی وجوه اللغة الالفقیه المجتهد و ماکان من جوامع الکلم او المشکل او المشترک او المجمل لایجوز نقله بالمعنی للکل۔

رخصت یہ ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنے کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محکم ہو اور روایت کرنے والا لغت وزبان کی گہرائیوں سے واقف ہو۔اور اگر حدیث عام ہو تو پھر بالمعنے روایت غیر مجتہد کے لیئے ناجائز ہے۔ایسے ہی وہ حدیثیں جن میں جوامع الکلم، مشکل، مشترک اور مجمل آئے ہوں ان سب میں روایت بالمعنے ناجائز ہے۔(۲)

(۱) کشف الاسرار: ج ۲ ص ۴۳ (۲) المنار: ج ۲ ص ۴۳

فقیہ مجتہد کی قید بھی یہ بتانے کے لیے لگائی ہے کہ وہ فتاویٰ میں روایت کے معانی کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس موقعہ پر حافظ ابن حزم بڑی عمدہ بات لکھ گئے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حکم تو یہی ہے کہ اس کی روایت باللفظ ہونی چاہیے۔ کسی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ ہو صرف ایک صورت میں روایت بالمعنے کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ راوی حدیث کا حافظ ہو اور ساتھ ہی حتمی طور پر اس کے معانی سے بھی پورا واقف ہو۔ اس حالت میں اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو یہ مفتی کی حیثیت میں حدیث کے معنے اور مدلول کو جواب میں اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے۔ یا کسی سے مباحثہ کر رہا ہو تو موقعہ استدلال میں اپنے لفظوں میں حدیث کے معنے پیش کر سکتا ہے۔ یہی قرآنی آیات کا حکم ہے۔ اس حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اگر راوی ہونے کی حیثیت میں حدیث بیان کرے اور ارشاد کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ الفاظ نبوت ویسے ہی پیش کرے جیسے سنے ہیں اس میں حرف کی بھی تبدیلی جائز نہیں ہے چاہے الفاظ میں معنوی ترادف بھی ہو۔(۱)

میں سمجھتا ہوں کہ ملا علی قاری نے امام اعظمؒ کے مذہب کی اس موضوع پر جو نقاب کشائی کی ہے اس کا مفاد بھی قریب قریب یہی ہے اور فقہاء اصولیین نے روایت بالمعنے میں جو رخصت دی ہے ان کا منشاء بھی اسی قسم کی رخصت کی نشاندہی ہے۔ بہرحال امام اعظمؒ، امام مالکؒ اور خطیب بغدادی کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد کو محدثین اس کی پابندی نہ کر سکے اور انہوں نے پہلے کتابت کے سہارے حفظ کی گرفت کو ڈھیلا کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹایا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث روایت کر سکتا ہے اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معانی کی حفاظت کا واحد ذریعہ معرفت ہے لیکن محدثین کو اس میں شدت معلوم ہوئی تا آنکہ حافظ سیوطی نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی:

---

(۱) احکام الاحکام: ج ۲ ص ۲۰۵

هذا مذهب شديد قد استقر العمل على خلافه۔

یہ مذہب بہت سخت ہے محدثین کا عمل اس کے خلاف ہے۔

اور اس شکایت کے بعد انہوں نے واشگاف لفظوں میں اقرار کیا کہ:

لعل الرواة في الصحيحين ممن يوصف بالحفظ لا يبلغون النصف۔

شاید صحیحین کے نصف راوی بھی حفظ کی قید پر پورے نہ اتریں۔

اس کے بعد محدثین کی بارگاہ میں روایت بالمعنے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں:

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

اگر راوی عالم ہو الفاظ اور اس کے مدلولات سے واقف ہو۔ جمہور علماء نے روایت بالمعنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی پر عمل ہے۔(۱)

حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی لکھتے ہیں:

جمہور فقہاء کہتے ہیں عالم بمواقع الخطاب کے لیے روایت بالمعنے جائز ہے اور علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ جاہل بمواقع الخطاب کے لیے یہ ناجائز ہے۔(۲)

حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

صحیح یہی ہے کہ سب صورتوں میں روایت بالمعنے جائز ہے بشرطیکہ راوی عالم ہو۔(۳)

امام نووی فرماتے ہیں:

جمہور سلف اور خلف مختلف گروہوں میں سے کہتے ہیں کہ سب میں روایت بالمعنے جائز ہے جبکہ قطعی طور پر معنے کی ادائیگی کر سکتا ہو۔(۴)

علامہ الجزائری نے اس موقعہ پر جو بیان قلم بند کیا ہے اس سے پوری صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ روایت بالمعنے مطلقاً ناجائز ہے یہی اکثر محدثین فقہاء

---

(۱) اختصار علوم الحدیث: ص ۱۴۶ (۲) الکفایہ: ص ۱۹۸

(۳) مقدمہ: ص ۸۵ (۴) تقریب: ص ۳۱۲

اور اصولیین اور ظاہر یہ کا مذہب ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے استاذ ابو اسحاق اسفرائنی اور ابو بکر رازی کا بھی یہی کہنا ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ امام مالک کا بھی صحیح مذہب یہی ہے اور امام مالک کا یہ ارشاد کہ لا اکتب الا عن رجل یعرف ما یخرج من راسہ (میں صرف اس شخص کی روایت قلم بند کرتا ہوں جو اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات کو جانتا ہے) اسی کا مؤید ہے۔ کیونکہ یہ بات آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ آپ نے زمانہ پانے کے باوجود بہت سے لوگوں سے روایت کیوں نہیں لی؟ نیز امام مالک نے ایسے بہت سے لوگوں سے بھی روایت نہیں لی ہے جو فضل و تقویٰ میں مشہور تھے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اکابر اپنی حدیثوں کے عارف نہ تھے۔ امام بیہقی اور خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ امام مالک حدیث میں روایت بالمعنے کے جواز کے قائل نہ تھے اور باقی میں اسے درست سمجھتے تھے۔ بعض بزرگوں نے روایت بالمعنے میں اتنا تشدد اختیار کیا ہے کہ وہ حرف کی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کرتے چاہے وہ مرادف ہی کیوں نہ ہو اور کلمات کی تقدیم و تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ بعض تو مشدد کو مخفف اور مخفف کو مشدد کرنے سے بھی روکتے ہیں اور ان کا موقف یہ ہے کہ اگر روایت میں کسی درجے میں بھی تبدیلی ہوگی تو اس سے راوی اس وعید کا مصداق ہو جائے گا۔ جو اس سلسلے میں آئی ہے اور اس لیے بھی روایت بالمعنے درست نہیں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وسلم کی ذات گرامی جوامع الکلم کی صفت سے موصوف ہے اور آپ کے سوا دوسرا کوئی خواہ فصاحت و بلاغت کے کتنے ہی اونچے مقام پر ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی گرد پا بھی نہیں پا سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بسا اوقات روایت بالمعنے کرنے والا اپنی جگہ مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے معنی کا حق ادا کر دیا لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوتا اس کا احادیث میں مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر امام شعبہ کا حدیث میں جو مقام ہے وہ سب ہی جانتے ہیں لیکن شعبہ ہی نے جب اسماعیل بن علیہ سے یہ حدیث سنی کہ نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم ان یتزعفر الرجل اور اسے اپنے لفظوں میں اس طرح پیش کیا کہ: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن التزعفر ۔ تو معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ شعبہ کی روایت بالمعنے نے ایک عمومی ضابطہ کی صورت اختیار کر لی جبکہ اسماعیل کی روایت اسے مردوں سے مخصوص بنا رہی تھی۔ معاملہ میں کتنی بڑی نزاکت ہے اور نزاکت بھی ایسی کہ شعبہ جیسا امام فن محسوس نہ کر سکا لیکن اسماعیل نے تاڑ لی اور شعبہ کو بتا دیا۔(۱)

اور پوری وضاحت اور قوت سے یہ بات لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

کان ینبغی ان یکون هذا المذهب هو الواقع ولکن لم یتفق ذالک۔

اچھا تو یہی تھا کہ یہی مسلک اختیار کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا؟ یہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

ذهب جمهور العلماء الیٰ جواز الروایة بالمعنے لمن یحسن ذالک بشرط ان یکون جازماً بانه ادی معنے اللفظ۔

جمہور علماء نے روایت بالمعنے کے جواز کو اپنا لیا ہے بشرطیکہ راوی کو مطلب کی ادائیگی پر یقین ہو اور اسے اس کا ڈھنگ آتا ہو۔(۲)

بے محل نہ ہو گا اگر اس موقعہ پر ۱۳۴۲ھ کے ایک محقق کی رائے پر بھی نظر ڈالی جائے۔ حدیث میں روایت بالمعنے کے جواز نے جو عام شکل اختیار کر لی تھی اس پر بحث کرتے ہوئے یہ قابل مصنف رقمطراز ہیں:

روایت بالمعنے میں یہ اختلاف صرف زمانہ صحابہ تک ہے صحابہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی روایت بالمعنے کی گنجائش نہیں ہے چاہے راوی معنے کو اپنے الفاظ میں کیسے ہی بھرپور انداز میں پیش کرے۔ اگر ہم صحابہ کے بعد اوروں کے لیے بھی اس کی گنجائش پیدا کر لیں تو ہم حدیث کی روایت پر اعتماد نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہر ایک

---

(۱) توجیہ النظر: ص ۳۰۵ (۲) توجیہ النظر: ص ۳۰۵

ہمارے زمانے تک منقول میں تبدیلی کرتا ہے اور اپنی رائے سے حرف کی جگہ حرف لے آتا ہے اس طرح خبر خبر نہیں رہتی۔ صحابہ کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے ان میں دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ ایک فصاحت و بلاغت' کیونکہ ان کی جبلت عربی ہے اور ان کی زبان میں صحیح سلیقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مشاہدہ معنے کے سمجھنے میں معین و مددگار ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مخبر اور معین میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ صحابہ احادیث میں جو یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ اَمر رسول اللہ اور نہیٰ رسول الله ھکذا۔ تو حضورؐ کے الفاظ ذکر نہیں کرتے بات حضور کی ہوتی ہے اور الفاظ کا جامہ صحابہ کا ہوتا ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اس میں کسی انصاف پسند کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(۱)　۱

اس حد تک دوسری صدی کے محققین میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ بات صحابہ کی حد تک ایک عقلی ضابطہ کی بات ہے۔ واقعی یہ بہترین مسئلہ کا حل ہے اور اس میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہوا کیا؟ کیا فی الواقع روایت بالمعنے حدیث میں صحابہ تک محدود رہی ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب محدثین کے یہاں نفی میں ہے۔ عربی تو عربی عجمی اور مولدین راویوں نے احادیث کو بالمعنے روایت کیا ہے حتیٰ کہ عربی ادب اور علماء بلاغت کے یہاں حدیث کی زبان بھی اس وجہ سے حجت و استدلال کی زبان نہ رہی۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تو زبان کی حد تک اس کے صرف اس حصے سے استدلال کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ روایت باللفظ ہوئی ہے اور یہ حدیث بے حد کم اور نادر ہے" وذالک نادر جداً " صرف چند گنتی کی چھوٹی چھوٹی حدیثوں کو چھوڑ کر اکثر حدیثوں کی روایت بالمعنی ہے اور یہ روایت بالمعنے بھی عجمیوں اور مولدین کے ہاتھوں تدوین حدیث سے پہلے ہوئی ہے۔

---

(۱) احکام القرآن ابوبکر بن العربی: ج ۱ ص ۱۰

ان لوگوں نے اسے اپنے انداز میں اپنی عبارت میں روایت کیا ہے انہوں نے کمی بیشی بھی کی ہے اور تقدیم و تاخیر بھی اور الفاظ کی تبدیلی بھی۔(۱)

اور اس آخری دور میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے بھی تشریح کی ہے کہ:

جمهور الرواة كانوا يعتنون برؤس المعاني لا بحواشيها۔

عام راوی صرف روایت بالمعنے کرتے ہیں اور بس۔(۲)

بلکہ علامہ جزائری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

روایت بالمعنے پر مشتمل حدیث سے صرف اصل مسئلہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے کسی کلمہ کی حدیث میں تقدیم و تاخیر یا حروف عطف وغیرہ سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا ایسے ہی الفاظ اور ان کی ترکیب سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ روایت بالمعنے کرنے والے راویوں کی اکثریت نقل روایت میں اس کا نہ کوئی اہتمام کرتی ہے اور نہ لحاظ۔ بلکہ احادیث کے کچھ راوی تو ایسے ہیں جن کو عربی زبان سے بھی پوری واقفیت نہیں چہ جائیکہ زبان اور ادب کے اسرار و لطائف سے۔(۳)

ہمیں چاہیے کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

یقیناً اگر روایت بالمعنے کا دائرہ کار صرف صحابہ تک ہی رہتا تو معاملہ میں اتنی سنگینی نہ آتی جس قدر السیوطیؒ الجزائری اور حکیم الامت نے محسوس کی ہے کہ روایت بالمعنے کی وجہ سے حدیث کی زبان حجت نہ رہی اور حدیث میں انداز کلام اور پیرایہ بیان سے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ صحابہ بہر حال عرب تھے ان کو لسانی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ متکلم کے مذاق سخن سے بھر پور واقفیت تھی۔ ان کے دلوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی۔ وہ آپ کی ایک ایک تقریر ایک ایک گفتگو اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو ان کو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے جاہل تھے اور یہ پاکیزہ ترین شخصیت ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر رہی ہے اس لیے

---

(۱) توجیہ النظر: ص ۳۱۳ (۲) حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ ص ۱۴ (۳) توجیہ النظر: ص ۳۱۳

وہ آپ کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنتے اور آپ کے ہر کام کو دیکھتے تھے کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں اسی کی کاپی کرنی تھی ظاہر ہے کہ اس احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہے اسے سمجھنے اور یاد میں وہ سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا۔ وہ قرآن کی رُو سے یہ بھی جانتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ نبوت کے ذمہ جھوٹ تراشنا ایک سنگین گناہ ہے۔ وہ اپنے اندر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کی ہدایت و تعلیمات کو پہنچانا قرآن کا عائد کردہ فریضہ ہے۔

لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا۔

اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے ان کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے ابوعمرو الشیبانی کی زبانی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس بیٹھتا سال سال بھر کبھی زبان پر قال رسول اللہ نہ آتا۔ اگر کبھی آتا تو کپکپی طاری ہو جاتی اور فرماتے کہ حضورؐ نے یوں فرمایا اس جیسا یا اس کے قریب فرمایا۔(۱)

پھر اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابہ کی احادیث روایت کرنے میں نگرانی کرتے ان کو روایت میں احتیاط کی تلقین کرتے تھے۔ امام ذہبی نے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ احادیث میں احتیاط اور تحری کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق بھی یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے محدثین کے لیے نقل روایت میں احتیاط کی شاہراہ قائم کی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے بارے میں خاص طور پر لکھا ہے کہ:

فقد زجر الامام علی عن روایة المنکر و حث علی التحدیث بالمشهور۔

حضرت علی نے منکر روایت سے منع کیا ہے اور مشہور روایات کو بیان کرنے کی ترغیب دی ہے۔(۲)

(۲،۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۵

اور ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ زمانہ صحابہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات کی نہیں تھی بلکہ صحابہ کے معاشرے میں ان کی شخصی زندگیوں میں' ان کے گھروں میں' ان کی معیشت اور حکومت و عدالت میں اس کی پوری حکمرانی تھی اور عملاً نافذ تھی۔ اس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے پورا معاشرہ اس کو استعمال کرتا تھا۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام السنۃ ہے اور حدیث اسی کی تاریخ ہے اور یہ السنۃ ہی زمانہ تابعین میں حدیث کی صحت کا ایک معیاری پیمانہ تھی۔

حافظ ذہبی نے دور تابعین کے بارے میں طبقہ خامسہ کے آخر میں جو نوٹ لکھا ہے اس کو پڑھ کر آپ دور صحابہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسلمان عزت و برتری میں اور علم کی گہرائی میں بہت اونچے مقام پر تھے۔ جہاد کے پھریرے لہرا رہے تھے' سنتیں شاہراہ عام پر تھیں اور بدعتیں سرنگوں۔ اعلان حق کرنے والوں کی کثرت تھی۔ عبادت گذاروں کا ہجوم تھا۔ پوری انسانیت زندگی میں سکھ اور چین کا سانس لے رہی تھی۔ اسلامی فوجیں اقصائے مغرب میں جبرالٹر حبشہ اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔(۱)

یہ دور تابعین کی نقاشی ہے صحابہ تو پھر صحابہ ہیں
قیاس کن زگلستان من بہار مرا

بہرحال صحابہ کی ذات گرامی کا موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر روایت بالمعنے کا دائرہ کار صحابہ کرام تک ہی محدود رہتا تو شاید معاملہ میں اتنی سنگینی ہرگز نہ آتی۔ اسی بنا پر امام اعظمؒ کے نزدیک روایت باللفظ کا اعتباری مقام صحابہ کے بعد ہے۔ چنانچہ ان کے یہ الفاظ صراحتہً اس کی دلیل ہیں کہ:

لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظہ من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۲۳ (۲) شرح مسند امام: ص ۳

سوال تو صحابہ سے لینے کے بعد روایت کرنے والوں کا ہے کیا ان کے لیے بھی روایت بالمعنے کی گنجائش ہے جب کہ ان میں عجمی اور مولدین بھی ہیں۔ اس بارے میں امام اعظم کا موقف وہی ہے جو ملا علی قاری نے پیش کیا ہے۔ اگرچہ محدثین کے دربار سے اس پر تشدید کا آوازہ کسا گیا ہے لیکن فی الحقیقت تاریخ ستہ کی یہ بڑی ہی دردانگیز بے انصافی ہے جو حدیث کے اس عظیم الشان امام کے ساتھ جائز رکھی گئی ہے۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح معتقدوں نے بھی اس کے فہم و بصیرت سے حدیث میں بے رخی اختیار کر لی۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فخر الاسلام بزدوی نے ضبط کی تشریح کرتے ہوئے جو یہ لکھ دیا ہے کہ:

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ کلام کو ایسے طریق سے سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے یا پھر اس کی مراد کو سمجھا جائے پوری کوشش سے اسے یاد کیا جائے پھر اس کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور اسے ادا کرتے وقت تک اس کے مذاکرہ کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے۔(۱)

تو اس سے ان کا مقصود بھی یہی سمجھانا ہے کہ ضبط میں الفاظ کا یاد رکھنا' ان کی حفاظت کرنا بنیادی شرط ہے۔ اس لیے یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک روایت بالمعنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور فخر الاسلام ہی سے روایت بالمعنے پر شدید پابندی جو حافظ ابن الہمام نے نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

والعزیمة فی الاداء باللفظ والرخصة معناه بلا نقص وزیادة للعالم باللغة و مواقع الالفاظ وقال فخر الاسلام الافی نحوا المشترک والمجمل والمتشابه بخلاف العام والحقیقة المحتملین للخصوص والمجاز اماالمحکم منهما فتکفی اللغة۔

عزیمت تو روایات میں باللفظ ہی ادائگی ہے اور رخصت روایت بالمعنے ہے بشرطیکہ راوی زبان دان اور مواقع الفاظ سے واقف ہو اور کمی زیادتی نہ کرے اور فخر الاسلام

(۱) اصول فخر الاسلام: ج ۲ ص ۱۶۷

نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ روایت کا تعلق مجمل' مشترک اور متشابہ سے نہ ہو ہاں اگر عموم و خصوص ہو تو اس سے مستثنیٰ ہے اور محکم اگر ہو تو صرف زبان دان ہونا کافی ہے۔(۱)

دوسرے اصولیین بھی فخر الاسلام کے ہموا ہیں۔ سعد الدین تفتازانی اور اصول بزدوی کے شارح علامہ عبدالعزیز بخاری نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے۔

مراتب حدیث اور امام اعظمؒ:

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قوت کے لحاظ سے ہر حدیث کا درجہ ایک نہیں ہے بلکہ ان میں فرق مراتب ہے۔ فقہاء اور محدثین دونوں کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ متواتر۔ مشہور اور اخبار آحاد علامہ فخر الاسلام بزدوی نے متواتر کی یہ تعریف کی ہے:

متواتر ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے لاتعداد ہوں اور ان کی عددی اکثریت' ان کی عدالت اور بعد مقامات کی وجہ سے اس احتمال کی گنجائش نہ ہو کہ یہ سب جھوٹ پر متفق ہو گئے اور اجماع ہر زمانہ میں موجود رہے اور اس کا آخری اور اوسط شہرت کے لحاظ سے یکساں ہو جیسے قرآن' پانچ نمازیں' تعداد رکعت' مقادیر زکوٰۃ وغیرہ۔(۲)

اتنے زیادہ لوگوں کی کسی محسوس کے بارے میں خبر جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔(۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے خبر کے متواتر ہونے کی چار شرطیں بتائی ہیں۔ اول بیان کرنے والوں کی تعداد کثیر ہو۔ دوم ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔ سوم جس کثرت سے بیان کرنے والے ہوں اسی جیسی کثرت از ابتدا تا انتہاز ہے۔ چہارم روایت کا انجام کسی محسوس و مشاہد معاملہ پر ہو۔ اور ان شرطوں کے ساتھ سننے والے کو اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو رہا ہو تو ایسی خبر متواتر ہے۔(۴)

حافظ جلال الدین السیوطی نے متواتر کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ لفظی اور معنوی

---

(۱) کتاب التحریر: ج ۳ ص ۹۷ (۲) اصول فخر الاسلام: ج ۲ ص ۳۸۱

(۳) توضیح النظر: ص ۸۲ (۴) نزہۃ النظر: ص ۸

تواتر لفظی کی حد تک حافظ ابن حبان بستی اور امام حازم کا دعویٰ یہ ہے کہ موجودہ ذخیرہ حدیث میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاح اور امام نووی بھی ان کے ہم نوا ہیں بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے تو حدیث عزیز کا بھی انکار کر دیا ہے۔ حدیث عزیز یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے والے سلسلہ سند میں کہیں بھی دو سے کم نہ ہوں اسے نادر الوجود ہونے کی وجہ سے عزیز کہتے ہیں لیکن حافظ حجر نے نزہۃ النظر میں اس کی تغلیط ہے اور ایسے ہی قاضی ابوبکر بن العربی کا یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے۔ کہ حدیث کا عزیز ہونا بخاری کی شرائط میں داخل ہے۔ ابن رشید نے صحیح کہا ہے کہ:

لقد كان يكفي القاضي في بطلان ما ادعى انه شرط البخاري اول حديث مذكور فيه۔

قاضی کے دعوے کی تغلیط کے لیے بخاری کی پہلی ہی روایت کافی ہے۔(۱)

بعض علماء نے تواتر معنوی کی بھی تین قسمیں بتائی ہیں:

تواتر اسناد	تواتر عمل	تواتر قدر مشترک

تواتر اسناد:

یہ کہ حدیث کو شروع سند سے لے کر آخر تک اتنی جماعت روایت کرنے والی ہو جس کا جھوٹ پر ایکا محال ہو۔ اس لحاظ سے محدثین نے حدیث من كذب علي متعمداً قرار دیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اس کے راویوں کی تعداد ۶۲ اور حافظ عراقی نے ۷۰ سے زائد لکھی ہے۔ حافظ سیوطی نے اسنادی تواتر پر مشتمل حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام "الفوائد المتکاثرۃ فی الاخبار المتواترۃ" ہے۔ اس کتاب کی تلخیص بھی ان کے ہی قلم سے "الازہار المتناثرۃ" کے نام سے نکلی ہے۔ محمد بن جعفر الکتانی نے اس کا ذیل "نظم المتناثر من الحدیث المتواترۃ" کے نام سے لکھا ہے۔ امیر یمانی فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی حدیثیں اسی تواتر کی مثال ہیں۔ کیونکہ ان کو روایت کرنے والے پچاس صحابہ ہیں

---

(۱) نزہۃ النظر: ص ۱۰

ان میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے راویوں کو اکٹھا کیا تو ان کی گنتی پچاس ہوئی۔ حافظ ابن مندہ اور امام حاکم نے دعویٰ کیا ہے کہ عشرہ مبشرہ اس کی روایت پر جمع ہیں۔ امام بیہقی امام حاکم کے حوالے سے فرماتے ہیں:

لانعلم سنة اتفق روايتها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم الخلفاء الاربعة ثم العشرة الذين شهد لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم بالجنة فمن بعدهم من اكابر الصحابة على تفرقهم فى البلاد الشاسعة غير هذه السنة۔

ہمارے علم میں ایسی کوئی سنت نہیں ہے جس کی روایت پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفاء راشدین عشرہ مبشرہ اور پھر اکابر صحابہ متفق ہوئے ہوں سوائے اس سنت کے۔(۱)

یاد رہے کہ یہ تواتر تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کو حاصل ہے امیر یمانی کی آپ تصریح پڑھ چکے ہیں حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہ بات صراحۃً لکھی ہے کہ:

فمن امثلة ذالک حديث رفع اليدين عندتكبيرة الاحرام بالصلاة۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین پر امت میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حافظ ابن حزم حافظ ابن المنذر اور علامہ السبکی کے حوالے سے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن عبدالبر کے حوالے سے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کو یہ کہہ کر پوری امت کا فیصلہ قرار دیا ہے کہ:

جميع العلماء علىٰ جواز رفع اليدين عند افتتاح الصلوٰة۔

تحریمہ کے وقت رفع یدین پر پوری امت کا اجماع ہے۔(۳)

یہ اسنادی تواتر ہے اور یہی محدثین کے یہاں زیر بحث آتا ہے۔ حافظ ابن کثیر اور علامہ شوکانی نے ختم نبوت سے متعلق حدیثوں کے بارے میں اسی تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ علامہ الجزائری نے یہاں ایک فیصلہ کن نوٹ لکھا ہے اس جگہ اس کا ذکر یقیناً فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) توضیح الافکار: ج ۲ ص ۴۴۱　(۲) تنقیح الانظار: ج ۲ ص ۴۱۲　(۳) فتح المغیث: ص ۱۲۰

جب علماء کے یہاں متواتر کا بلا قید ذکر آتا ہے تو ہر شخص کا ذہن متواتر کی قسم اول کی طرف ہی جاتا ہے یعنی متواتر لفظی۔ علماء کا کچھ حدیثوں کے بارے میں اختلاف ہے کچھ متواتر بتاتے ہیں اور کچھ انکار کرتے ہیں اس میں محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ نزاع محض لفظی ہے دونوں صحیح کہتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ متواتر ہے ان کی مراد تواتر معنوی ہے اور جو انکار کرتے ہیں ان کا منشاء تواتر لفظی ہے علماء اصول کہتے ہیں کہ قرآن تواتر ہی سے ثابت ہے لیکن سنت تواتر اور آحاد دونوں سے ثابت ہے لیکن سنت میں متواتر کم ہے۔ بلکہ راجح فیصلہ یہی ہے کہ سنت میں اگر ہے تو صرف تواتر معنوی ہے اور جو بھی سنت میں تواتر کا مدعی ہے اس کی مراد تواتر معنوی ہے۔

تواتر عمل:

اسی کو توارث کہتے ہیں۔ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کسی کام کو کرنے والے اس قدر ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ اسلامی عبادات امت کو اسی تواتر سے ملی ہیں اور فرائض نہیں بلکہ واجبات وسنن بھی اسی راہ سے آئے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو اولاً صحابہ کے معاشرے نے اپنایا۔ ان کی شخصی زندگیوں میں' ان کے گھروں میں' ان کی معیشت میں' ان کی تعلیم گاہوں میں' ان کی عدالت اور ان کی حکومت میں' غرض صحابہ کرام کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر گوشہ میں جس اسوۂ حسنہ کا ٹھپہ لگا تھا اور جس کو ان سے والذین اتبعوھم باحسان کی تعمیل میں تابعین نے لیا اور جس کی اتباع تابعین نے کاپی کی ہے اسی کو محدثین تابعین کی زبان میں السنۃ اور اسی کا نام فقہاء اتباع تابعین کے یہاں ماعلیہ الجماعۃ ہے۔ نماز پنجگانہ' نمازوں کی رکعتیں' رمضان کے روزے' تراویح کی رکعتیں' مقادیر زکوٰۃ' اعمال حج' وضو اور حتیٰ کہ وضو میں مسواک کا استعمال اسی تواتر عمل سے ثابت ہے اور یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ عمل میں قول سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس پر اجمالی تبصرہ تلقی الامۃ بالقبول کے ذیل میں گذر چکا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر سند کے لحاظ سے حدیث ضعیف بھی ہو لیکن اس کی پشت پر عمل کی قوت ہو تو وہ حدیث بھی صحیح قرار پائی ہے بلکہ حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ:

ینزل منزلۃ المتواتر فی انہ ینسخ المقطوع۔

اس کے ساتھ متواتر جیسا معاملہ ہوتا ہے یعنی اس سے قطعی منسوخ بھی ہو سکتا ہے۔(۱)
محدثین نے تواتر عمل کی وجہ سے ایک سے زیادہ ضعیف حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے۔
مثلاً حدیث "لا وصیۃ لوارث" الفاظ مختلفہ میں مروی ہے اور امام ترمذی نے اس کے کچھ طریقوں کی تصحیح اور کچھ کی تحسین بھی فرمائی ہے لیکن حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

لا یخلو اسناد کل منها عن مقال

اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے کہ:

جنح الشافعی فی الام الیٰ هذا الفن متواتر۔

اس کے متواتر ہونے کی وجہ خود امام شافعیؒ نے جو بتائی ہے وہ ان کی زبانی سنیئے:

وجدنا اهل الفتیا ومن حفظنا عنهم من اهل العلم بالمغازی من قریش لایختلفون فی ان النبی صلی الله علیه وسلم قال عام الفتح "لا وصیة لوارث" ویاثرونه ممن لقوه من اهل العلم فکان نقل کافة عن کافة فهو قویٰ من نقل واحد۔

ہم نے اہل فتویٰ کو اور ان اہل علم کو جن سے ہم نے اسلام کا علمی سرمایہ حاصل کیا ہے۔ پایا ہے کہ وہ اس میں متفق ہیں کہ حضور انورؐ نے فتح مکہ والے سال لا وصیۃ لوارث فرمایا ہے اور یہ لوگ اس ارشاد کو اپنے سے قبل اہل علم ہی سے نقل کرتے ہیں۔ اس لیے یہ نقل کافہ عن کافہ ہے یہ خبر واحد سے بھی قوی ہے۔(۲)
اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تواتر عمل کی کسی قدر طاقت ہے۔ اس پر تو تابعین صحیح حدیثوں کا جانچتے تھے اور حدیث کی صحت کا یہ ایک معیار تھا۔

تواتر قدر مشترک:

حافظ سیوطی اس کو تواتر معنوی کہتے ہیں۔ ایسی روایات جو متعدد طرق سے آئی ہوں، الفاظ مختلف ہوں، واقعات الگ الگ ہوں لیکن اس میں کوئی قدر مشترک ہو مثلاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) فتح المغیث: ص ۱۲۰　(۲) فتح الباری: ج ۵ ص ۲۸۷

کی شب بیداری کے سلسلے میں کوئی کہتا ہے کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی۔ کوئی سات' کوئی نو کوئی گیارہ' کوئی تیرہ' کوئی پندرہ اور کوئی سترہ بتاتا ہے تعداد کو چھوڑ کر رات کو نماز تہجد اس میں قدر مشترک ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ دعاء میں ہاتھ اٹھانے کی حدیثوں میں بھی اسی قسم کا تواتر ہے۔ اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سو سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

جیسے قرآن تواتر لفظی کے ذریعے امت کو ملا ہے۔ ایسے ہی سنت کا علمی سرمایہ بھی امت کو تواتر عمل' تواتر اسناد اور تواتر قدر مشترک کے ذریعے ملا ہے۔ اور میں کتاب کے آغاز میں بتا آیا ہوں کہ جیسے قرآن کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں۔ ایسے ہی سنت کے لیے محدثین کی روایات ہیں نہ تو قرآن پر روایات قراء اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اور نہ سنت پر روایات محدثین۔ اور نہ قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات محدثین پر موقوف ہے۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے۔ حدیث کے اس روایتی سلسلے سے پہلے بھی سنت موجود تھی اور اس کے بعد بھی ہے۔ العلامۃ الشیخ السید شاہ کشمیریؒ نے کیسی عجیب بات فرمائی ہے کہ:

كان الاسناد لئلا يدخل في الدين ماليس منه لا ليخرج من الدين ماثبت منه من عمل اهل الاسناد۔

روایت و اسناد کا سلسلہ اس لیے بروئے کار آیا تھا کہ دین میں وہ چیز نہ آنے پائے جو دین نہیں ہے اس لیے نہیں کہ دین سے ثابت شدہ چیز کو خارج کیا جائے۔(۱)

قرآن ہو یا سنت دونوں روایتی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ ایک علمی چیز ہے اس لیے اس کا تواتر بھی علمی ہے اور سنت ایک عملی چیز ہے اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے۔ اسی بنا پر احناف نے حدیث مشہور کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ تعریف کی ہے کہ:

ماكان احاد الاصل متواترا في القرن الثاني والثالث۔

اور حافظ ابوبکر نے اسی بنا پر مشہور کو متواتر کا قسیم نہیں بلکہ اس کی قسم قرار دیا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امام اعظمؒ سے جو صحیح کی تعریف

---

(۱) التعلیقات علی الاجوبۃ الفاضلۃ: ص ۲۳۸

نقل کی گئی ہے اس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب الشعرانی رقمطراز ہیں:

قد کان الامام ابو حنیفة یشترط فی الحدیث المنقول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل العمل بہ ان یرویہ عن ذالک الصحابی جمع اتقیاء عن مثلھم ھکذا۔

جو حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام اعظم عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی چلی آئے۔(۱)

یہ قید کہ "اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابی سے برابر نقل کرتی آئے" اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ حدیث اگرچہ صحابی کی ذات تک خبر واحد ہو مگر اس کے بعد اسے نقل کرنے والے بہت سے متقی اور پارسا راوی ہوں یعنی صحابہ سے گذرنے کے بعد قرن ثانی اور قرن ثالث میں وہ متواتر ہو اور جس قید کا امام شعرانی نے پتہ دیا ہے وہ خود امام اعظمؒ سے بصراحت منقول ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے امام یحیٰی بن معین کی سند سے امام اعظمؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

اخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنة رسول اللہ والاثار الصحاح التی فشت عنہ فی ایدی الثقات عن الثقات۔

اس پہ یہ فقرہ کہ "آپ کی وہ صحیح حدیثیں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعے شائع ہوئی ہوں" خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس میں آپ نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ آپ ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو ثقات میں مشہور ہوں۔ بلاشبہ امام اعظمؒ کا زمانہ دور تابعین ہے۔ اس میں سنت تواتر عمل سے آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور حدیث تواتر اسناد کے ذریعے نیکوکار لوگوں کی وساطت سے آئی تھی۔ کشف الاسرار میں ہے:

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم وسوم میں ہوگا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اخبار آحاد مشہور ہوگئی تھیں حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے۔

---

(۱) المیزان الکبریٰ: ج ۱ ص ۶۲

اخبار آحاد اور امام اعظمؒ:

خبر واحد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک دو یا اس سے زیادہ ہوں لیکن اس میں شہرت کے اسباب نہ ہوں۔ امام اعظمؒ اولین شخصیت ہیں جنہوں نے اخبار آحاد کو قابل استدلال قرار دیا ہے۔ چنانچہ خاص اس موضوع پر حافظ ابن حزم نے امام اعظمؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

هذا ابو حنيفة يقول ماجاء عن الله تعالىٰ فعلى الراس و العين وماجاء عن يقول ماجاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمعاً و طاعة وماجاء عن الصحابة تخيرنا من اقوالهم ولم نخرج عنهم وماجاء عن التابعين فهم رجال ونحن رجال۔

یہ ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ اللہ سبحانہ کی جانب سے آئے یعنی قرآن وہ سر آنکھوں پر اور جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے آئے اس کے لیے ہم سراپا شنید و طاعت ہیں اور صحابہ سے جو کچھ آئے تو ان کے اقوال میں سے ہم انتخاب کریں گے اور کسی درجہ میں ان کے ارشادات سے علیحدہ نہ ہوں گے اور اگر تابعی سے آئے تو ہم بھی آدمی ہیں وہ بھی آدمی ہیں۔(۱)

ابوحمزہ السکری نے امام اعظمؒ کا جو ارشاد نقل کیا ہے وہ اس سے بھی واضح ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح سند سے آئے ہم اسی کو لیتے ہیں اور اس سے آگے نہیں جاتے۔(۲)

ابوحمزہ کو امام حافظ الدین ابن البزاز کردری نے مناقب میں امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ حدیث کے طبقہ خامسہ میں ذکر کیا ہے ان کا نام محمد بن میمون مروزی ہے۔ اس لیے امام اعظمؒ کے بارے میں ان کی رائے بڑی قیمتی ہے۔ الغرض خبر واحد کے حجت ہونے اور قابل عمل ہونے میں امام اعظمؒ اور تیسری صدی کے محدثین کا موقف ایک ہے۔ حافظ ابوبکر الخطیب خبر واحد کے موضوع پر محدثین کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(۱) احکام الاحکام۔ ج ۱ ص ۹۵　(۲) الانتقاء: ص ۱۴۳

خبر واحد پر عمل کرنے کے موضوع پر تمام تابعین کا اتفاق ہے اور تابعین کے بعد آج تک کے فقہاء امار کا اس پر ایکا ہے۔

ہمارے علم میں اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے اور نہ اس پر آج تک کسی نے کوئی اعتراض کیا ہے۔ ان کا یہ اتفاق بتا رہا ہے کہ ان سب کے نزدیک اس پر عمل واجب ہے اگر کہیں بھی انکار کا کوئی کانٹا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔(۱)

اس اتفاق کے باوجود اخبار آحاد کے موضوع پر چند اہم مباحث فکر ونظر کی جولانگاہ ضرور رہے ہیں مثلاً یہ کہ اخبار آحاد کے لیے معیار صحت کیا ہے؟ اور اخبار آحاد موجب للعمل ہونے کے ساتھ مفید یقین بھی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں منصوص نہیں ہیں اس لیے ان میں فکر ونظر کا اختلاف ناگزیر ہے۔

اخبار آحاد کا معیار احتجاج:

جمہور محدثین کا موقف تو یہ ہے کہ اخبار آحاد اس وقت تک قابل احتجاج نہیں ہو سکتیں جب تک ان میں خاص خاص شرائط نہ ہوں۔ امام شافعی نے ایک سائل کے جواب میں ان شرائط کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا ہے۔

خبر واحد میں حجت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ شرائط ہوں۔ راوی میں ثقاہت اور صداقت کے ساتھ اتنا علم ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانتا ہو اور الفاظ سے ہٹ کر معنے کو دوسرے لفظوں کا لبادہ پہنانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا پھر روایت باللفظ کرتا ہو۔ اگر حافظہ کی مدد سے بیان کرتا ہے تو حدیث کا حافظ ہو اور اگر کتاب سے روایت کرتا ہے تو کتاب کا حافظ ثقات راویوں کا ہمنوا ہو مدلس نہ ہو اس طرح راویوں کی ساری لڑی اوپر سے نیچے تک ہو تا آنکہ حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔(۲)

دوسرے محدثین نے بھی اسی معیار کو اپنایا ہے چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

---

(۱) الکفایہ فی علوم الروایہ: ص ۳۱ (۲) الکفایہ: ص ۲۴

اما الحدیث الصحیح الحدیث المسند الذی یتصل اسنادہ بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الیٰ منتہاہ ولا یکون شاذا ولا معللاً۔

صحیح وہ باسند حدیث ہے جس کی سند میں اتصال ہو' جو عادل ضابط عادل ضابط کی وساطت سے تا آخر روایت کرے اور شاذ و معلل نہ ہو۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

فہذا الحدیث الذی نحکم لہ بالصحۃ۔

یہی وہ حدیث ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم فیصلہ کرتے ہیں۔(۱)

حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں کہ جب محدثین کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ صحیح ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس حدیث کی قطعیت بتا رہے ہیں چنانچہ علامہ عراقی فرماتے ہیں:

حیث یقول المحدثون ہذا حدیث صحیح فمرادہم فیما ظہر لنا عملاً بظاہر الاسناد لا انہ مقطوع بصحتہ فی نفس الامر۔(۲)

اور حافظ ابن الصلاح نے بھی یہی بات لکھی ہے:

لیس من شرطہ ان یکون مقطوعاً بہ۔

حافظ ابن ابراہیم الوزیر نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لجواز الخطاء والنسیان علی الثقۃ۔

مطلب یہ ہے کہ صحت سے ان بزرگوں کی مراد صرف اصطلاحی صحت ہے قرآن جیسی واقعی صحت نہیں ایک روایت پر اس اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں لگ جائیں لیکن بہرحال غیر معصوم انسانوں کی شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے حجت کا فائدہ دے سکتا ہے۔ مگر یقینیات اور قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے ٹکرا جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ سے نہ ہلیں گی۔ راوی کی شہادت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

---

(۱) مقدمہ علوم الحدیث: ص ۲۲　(۲) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۲۴

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں کا مزاج الگ الگ ہے ایک حدیث کی صحت اور دوسرے حدیث کی مقبولیت۔ حدیث کی صحت سے بحث کرنا اُسرار باب روایت کا کام ہے تو حدیث کی قبولیت کو بتانا مجتہدین کا فن ہے ہر گوشہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط کی دورائیں پیدا ہوگئی ہیں۔

کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک کسی بھی حدیث کا فقہ کی کتابوں میں آ جانا ہی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے اور ان کتابوں کے مؤلفین کی جلالت علمی سے دب کے حدیث کو صحیح مان لیتے ہیں۔ حالانکہ فقہ کی کتابیں بہرحال مسائل کی کتابیں ہیں ان میں حدیث کی صحت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے۔ نہ ان کا یہ فن ہے حدیث کے لیے محدثین ہی کی خوشہ چینی چاہیے۔ فقہ احناف میں معرکہ کی کتاب اگر ہدایہ ہے تو فقہ شافعی میں رافعی کی شرح الوجیز ہے۔ ان دونوں کتابوں کی حدیثوں کو دیکھنا ہو تو حافظ زیلعی کی نصب الرایہ اور حافظ ابن حجر کی التلخیص الحبیر کو دیکھنا ہوگا۔ یہ دونوں محدث ہیں اور یہ ان کا فن ہے۔

ملا علی قاری محدث نے اس حدیث کو جو جمعۃ الوداع میں قضائے عمر کے بارے میں آئی ہے موضاعات میں قطعاً باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

لا عبرة بنقل صاحب النهاية وغيره من بقية شرح الهداية لبسوا من المحدثين والا اسند والحديث الى احد من المخرجين۔(۱)

اس حدیث کو صاحب نہایہ اور ہدایہ کے دوسرے شارحوں کے نقل کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ نہ خود محدث ہیں اور نہ محدثین کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں۔(۲)

اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے عمدۃ الرعایہ کے مقدمہ میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے۔

ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے یہ عجیب بات معلوم ہوگئی کہ فقہ کی کتابیں اپنی جگہ مسائل کے لیے خواہ کتنی معتبر سہی اور ان کے مؤلفین بھی چاہے کتنے ہی صاحب کمال

اور معتمد ہیں لیکن فقہ کی کتابوں میں آمدہ حدیثوں پر محدثانہ نقطہ نظر سے بھرپور اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کتنی ہی حدیثیں ہیں جو فقہ کی معتبر کتابوں میں آئی ہیں لیکن فی الواقع وہ موضوع ہیں۔ ہاں اگر مصنف کتاب زمرہ محدثین سے ہو تو بے شک اس کی بیان کردہ حدیث پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا اگر مصنف حدیث کو کسی محدث کے حوالہ سے پیش کرے تو اس پر بھروسہ ہو سکتا ہے راز اس میں یہ ہے کہ اللہ نے ہر فن کے لیے فن کی شخصیتیں بنائی ہیں۔ اپنی مخلوقات میں سے ہر طبقہ کو کچھ نوعی خصوصیات سے مالا مال کیا ہے کچھ محدثین ایسے ہیں جن کو روایت و اسناد ہی سے کام ہوتا ہے فقہ ان کا میدان نہیں ہے اور کچھ فقہاء ایسے ہیں جن کا مقام بس فقہ میں ہے حدیث میں ان کو کوئی مہارت نہیں ہوتی۔(۱)

مولانا نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خود انسان کا وجدان بھی یہی باور کرتا ہے کہ فن والوں سے ہی فن کی بات معلوم ہو سکتی ہے اگر آپ شاعروں سے مسائل یا فقہاء سے اشعار کی تحقیق کریں تو یہ بے محل بات ہے۔

اس موقع پر حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

کہ اختلاف طبقات کے باوجود مسلمانوں کے سارے فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی بات سے استدلال کیا جا سکتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو سارے علوم حرف غلط ہو کر رہ جائیں کیونکہ جو فنکار نہیں وہ یا تو اس میں لب کشائی ہی نہ کرے گا اور کرے گا تو غیر تسلی بخش ہو گی۔ غور کرو قرآن و سنت کے غریب الفاظ کی تحقیق تم قاریوں سے کرو یا قرأت کے مسائل اہل لغت سے پوچھو معانی' بیان اور نحو کی باتیں تم محدثین سے دریافت کرو اور علم الاسناد' علل حدیث کی تحقیق کے لیے تم بارگاہ متکلمین کا رخ کرو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ علوم وفنون ملیا میٹ ہو کر رہ جائیں۔(۲)

دوسری طرف ارباب روایت ہیں جنہوں نے محدثین کی تصحیح کو ہی صرف حدیث کی

---

(۱) عمدۃ الرعایہ: ص ۳ (۲) الروض الباسم: ج ۱ ص ۷۹

مقبولیت کا معیار بنالیا ہے۔ انہوں نے ائمہ نقد میں سے دار قطنی وغیرہ پر محدثانہ نقطہ نظر غالب دیکھ کر اپنی توجہات کا مرکز صرف اسناد ہی کو بنالیا اور متن سے نظریں ہٹالی ہیں۔ حالانکہ حدیث استناد و متن دونوں کا نام ہے۔ حدیث کی صحت کی حد تک اسناد کی تحقیق کرنا ائمہ محدثین کا کام ہے تو حدیث کے متن کی حد تک قبولیت کو بتانا مجتہدین و فقہاء کا کام ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے حافظ ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

ان النظر ان کان للسند فالشیوخ اولی و ان کان لمتن فالفقهاء۔

اگر سند سے متعلق تحقیق کرنی ہو تو محدثین سے کرنی چاہیے اور اگر متن کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو فقہاء سے پوچھنا چاہیے۔(۱)

اس کی وجہ امام حازمی نے یہ بتائی ہے:

لان قصدهم اثبات الاحکام و مجال نظرهم فی ذالک متسع۔

فقہاء کا پیش نہاد احکام ثابت کرنا ہے اور اس میں ان کا میدان وسیع ہے۔(۲)

علامہ خطابی کی خاطر پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانے میں علماء کو دو گروہ میں منقسم دیکھا ہے۔ محدثین اور ارباب فقہ۔ ان دونوں طبقوں میں مقام اور محل کے لحاظ سے انتہائی قرب کے باوجود یہ دونوں طبقے باہم بچھڑے ہوئے بھائی معلوم ہوتے ہیں محدثین کی اکثریت کی تگ و دو تو صرف روایات سمیٹنے اور طرق یکجا کرنے میں لگی ہوئی ہے غرائب اور شواذ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں متون کا ان کو کوئی پتہ نہیں ہے۔ معانی سے نابلد اور استنباط سے بالکل ناآشنا ہیں۔ فقہاء پر زبان طعن و تشنیع استعمال کرتے ہیں فقہاء کے مقام علمی کی ان بیچاروں کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ زبان کی اس غلط کروٹ سے خود ہی گناہ کما رہے ہیں۔ فقہاء کا حال یہ ہے کہ حدیث کی حد تک ان کو قدرے علم تو ہے مگر ان میں صحیح، سقیم، کھری، کھوٹی میں تمیز کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔(۳)

---

(۱) الباعث الحثیث ص ۱۶۵ (۲) شروط الائمۃ الخمسۃ۔ ص ۴۷

(۳) معالم السنن: ج ا ص ۶ ۔ ۷

علامہ الجوائزری نے توجیہ النظر میں بھی اس قسم کی شکایت کی ہے۔ بہرحال یہ موضوع تفصیل طلب ہے لیکن چونکہ ایک اہم اصولی سوال ہے اس لیے اس باب میں تحقیق کی راہ یہ ہے کہ حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین سے اور حدیث کی قبولیت کے متعلق مجتہدین وفقہاء سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اخبار آحاد سے احتجاج کا مسئلہ صرف حدیث کی صحت سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا صحت کے ساتھ قبولیت سے بھی تعلق ہے۔ امام اعظمؒ محدث ہونے کے ساتھ چونکہ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں اس لیے حدیث کی صحت کے ساتھ حدیث کی قبولیت کی بھی شرطیں بتائی ہیں۔ حدیث کی صحت کے موضوع پر وہ بھی وہی کچھ فرماتے ہیں جو عام ارباب روایت کا مسلک ہے لیکن حدیث کے مقبول اور قابل عمل ہونے کے لیے انہوں نے کچھ شرائط پیش کی ہیں۔ ان میں اہم یہ ہیں کہ:

- روایت دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔
- معانی قرآن سے متضاد نہ ہو۔
- سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔
- صحابہ وتابعین کے عمل متوارث کے خلاف نہ ہو۔
- خبر واحد کا تعلق عموم بلوئی سے نہ ہو۔

مسلمہ اصولوں کے خلاف روایت:

امر اول یعنی یہ کہ روایت دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس کی اہمیت تمام ارباب اجتہاد نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز امام اعظمؒ کے اس معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شریعت کا علمی سرمایہ دو قسم کا ہے قوانین کلیہ اور حوادث جزئیہ۔ قوانین سے مقصود ضوابط عامہ ہیں مثلاً یہ کہ شہادت پیش کرنا مدعی کا کام ہے شریعت دراصل ان ہی قوانین کا نام ہے۔ مجتہد کا کام ہے کہ ان ضوابط کو حوادث جزئیہ سے متاثر نہ ہونے دے۔ (فتاوی عزیزی)

علامہ شاطبی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

قوانین عامہ پر جزئی اور خصوصی واقعات اثر انداز نہیں ہوتے۔ کیونکہ قواعد کلیہ قطعی ہوتے ہیں اور حوادث جزئیہ ظنی ہوتے ہیں۔ گمان ووہم سے یقین و اذعان کی عمارت منہدم نہیں ہوسکتی اور نہ ظن میں یقین کا مدمقابل بننے کی تاب ہے۔ نیز قواعد کلیہ دلائل قطعیہ سے غذا حاصل کرتے ہیں اس لیے ان میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی۔ برخلاف حوادث جزئیہ کے کہ ان میں ہر وقت اور ہمہ آن دوسرے احتمالات کا امکان رہتا ہے۔ احادیث واخبار کی حیثیت جزئیات کی ہے اور قواعد کا مقام کلیات کا ہے۔(۱)

شریعت میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں ہیں۔ صرف ایک مثال ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ قرآن وسنت میں وضو میں سر کے مسح کا ایک عمومی ضابطہ قرآن میں ہے۔

وامسحوا برؤسکم

اور سنت سے بھی اس ضابطہ کی کلیت معلوم ہوتی ہے لیکن کچھ حدیثوں میں سر کی جگہ عمامہ پر مسح کا ذکر آیا ہے۔ مسند احمد' بخاری' ابن ماجہ میں بحوالہ عمرو بن امیہ۔ ترمذی' ابن ماجہ' مسند احمد' مسلم' نسائی میں بحوالہ بلال۔ ترمذی میں بحوالہ مغیرہ۔ طبرانی میں بحوالہ ابی امام اور مسند احمد میں بحوالہ ثوبان اور سلمان عمامہ پر مسح کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

ان حدیثوں کی وجہ سے مسح راس کے اس ضابطہ حتمی کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑا جائے گا جو قرآن اور سنت متوارثہ سے ثابت ہے۔ اگر روایات مسح عمامہ صحیح بھی ہوں تو ان کو مطالب کا ایسا جامہ پہنایا جائے گا جس سے مسح راس کی قطعیت پر کوئی حرف نہ آئے۔ علامہ عبداللہ دراز دمیاطی رقم طراز ہیں:

جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح عمامہ کی روایات آئی ہیں۔ یہ روایات وضوء میں مسح راس کے قاعدہ عام پر ہرگز اثر انداز نہ ہوں گی۔ اگر روایات صحیح بھی ہوں تو ان کو کسی وقتی عذر پر محمول کیا جائے گا مثلاً سر میں زخم یا کسی اور بیماری کو اس قاعدہ عامہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔(۲)

---

(۱) الموافقات: ج ۳ ص ۳۲ (۲) التعلیقات علی الموافقات: ج ۳ ص ۲۶

علامہ شاطبی اس پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جب بذریعہ استقراء ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے پھر اگر کوئی جزئیہ سامنے آجائے جو اس قاعدہ کے خلاف ہو تو جزئیہ کے لیے ایسا محمل تجویز کرنا ہوگا جس سے وہ قاعدہ عام سے ہم آہنگ ہو جائے کیونکہ قاعدہ کی کلیت کا علم تو پوری شریعت کے سسٹم کو دیکھ کر ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس خاص جزئیہ کی وجہ سے قواعد کی عمارت کو مسمار کیا جائے۔(۱)

اس میں امام مالک بھی امام اعظم کے ہمنوا ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دوسری صدی کے فقہاء و محدثین کا مسلک ہے کہ اخبار آحاد کے قابل عمل اور قابل احتجاج ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قوانین کلیہ کے خلاف نہ ہوں اور ان بزرگوں کو یہ مسلک ابوبکرؓ، عمرؓ، عائشہؓ اور ابن عباسؓ سے ورثہ میں ملا ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر مستقل عنوان کے تحت بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ اور عمر بن الخطابؓ نے اخبار آحاد کو اصول اسلامیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے رد کر دیا تھا اور اس موضوع پر شاطبی نے امام مالک کا مذہب بھی کھول کر بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اس مسئلے کی سلف میں اصل موجود ہے حضرت عائشہؓ نے حدیث ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ کو اسی وجہ سے رد کر دیا کہ قرآن کے اس ضابطہ عام کے خلاف ہے لا تزر وازرۃ وزر اخری۔ نیز ابن عباسؓ کی اس روایت کو جس میں رویت باری کا ذکر ہے۔ حضرت عائشہؓ نے لا تدرکہ الابصار کے ضابطہ کی وجہ سے نامنظور کیا۔ ایسے ہی حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت پر تنقید کی جس پر برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کی ہدایت ہے۔ نیز حضرت ابن عمرؓ کی نحوست والی روایت کو ضابطہ قرآنی ان الامر کلہ للہ کے خلاف قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات نہیں کہ نحوست کا اسلام نے اعلان کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ ایام جاہلیت میں لوگوں کا اعتقاد یہ تھا۔(۲)

(۱) الموافقات: ج ۳ ص ۱۰ (۲) الموافقات: ج ۳ ص ۱۹-۲۰

الغرض دوسری صدی کے محدثین کا نقطۂ نظر اخبار آحاد کے بارے میں واضح اور صاف یہ تھا کہ خبر واحد اگر شریعت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں ہے۔ علامہ شاطبی نے امام مالک کا بھی یہی مذہب بتایا ہے اور علامہ ابن عربی نے بھی امام مالک کا راجح مسلک یہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

اذاجاء الخبر معارضاً لقاعدة من قواعد الشرع هل يجوز العمل به ام لا؟ فقال ابو حنيفة لا يجوز العمل به وقال الشافعي يجوز و تردد مالك في المسئلة قال و مشهور قوله و الذى عليه المعول ان الحديث ان عضدته قاعدة آخرى قال به وان كان وحده تركه۔

اگر خبر واحد کسی قاعدہ شریعت کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل جائز ہے؟ امام ابوحنیفہ تو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے امام شافعی کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ اور امام مالک کا قول مشہور اور قابل اعتماد یہی ہے کہ حدیث کی تائید میں اگر کوئی قاعدہ ہو تو عمل جائز ہے اور اگر تنہا ہو تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔

اس کے برعکس تیسری صدی کے محدثین نے اس اساس سے موافقت نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے اخبار آحاد کے ذریعے آنے ہونی ہر خبر واحد کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ہر صحیح حدیث بجائے خود ایک اصول ہے جس طرح قرآن حکیم ایک اصول ہے۔ اور صحیح حدیث وہ ہے جو محدثین کی طے کردہ اصطلاحی شرائط پر پوری اترے۔ چنانچہ علامہ خطابی رقمطراز ہیں۔

والاصل ان الحديث لما ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وجب القول به وصار اصلاً في نفسه۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنانا واجب ہے اور وہ خود ایک اصل ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ:

الحديث الصحيح اصل بنفسه۔ (حدیث صحیح خود ایک اصل ہے)(۲)

---

(۱) معالم السنن ج ۳ ص ۱۱۳ (۲)

ابن سمعون کے حوالے سے بھی یہی بتایا گیا ہے کہ

متی ثبت الحدیث صار اصلا من الاصول ولا یحتاج الی عرضه علی اصل آخر۔

جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ خود ایک اصل ہو جاتی ہے۔(۱)

غور و فکر کے اس انداز کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے مسلمات میں ترمیم کرنی پڑی اور یہ حدیث کے ثابت ہونے کے بعد تیسری صدی میں اسلام میں اصول ہی اصول ہو گئے۔ مثلاً فرض کرتا ہوں کہ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حدیث آئی ہے۔

عن ابی هریرة انه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یکذب ابراهیم الا ثلاث کذبات ثنتین منها فی ذات الله تعالی قوله انی سقیم و قوله بل فعله کبیرهم هذا و واحدة فی سارة۔

اگر اس معیار کو مان لیا جائے کہ ہر حدیث ثابت ہونے کے بعد ایک اصل ہے تو نبی کا کذب بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصل بن جائے گا۔ معاذ الله ثم الله حالانکہ نبی کی سچائی اور اس کی صداقت مانے ہوئے اصولوں میں سے ایک مسلمہ اصول ہے۔ وحی و نبوت کے سارے کارخانے کی رونق نبوت کے اسی وصف سے وابستہ ہے۔ اسی بناء پر علماء اور شراح حدیث کو اس حدیث کے لیے مطالب کے ماننے تلاش کرنے پڑے اور ایک نہیں بلکہ متعدد توجیہات کرنی ناگزیر ہوئیں کیوں؟ صرف اس لیے کہ حضرت ابراہیم کی یہ حدیث دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ نبوت ایک ایسی صفت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا لیکن اس بات سے کہ سچ نہ بولے وہ قطعی عاجز ہوتا ہے حقیقت اور سچائی کے خلاف جو چیز ہے کبھی وہ نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انبیاء کی سچائی اور عصمت دین کے یقینیات قطعیہ میں سے ہے۔ اور روایت چاہے کتنی ہی بلند قسم کی کیوں نہ ہوں لیکن بہر حال وہ راوی کی شہادت ہے اور راوی بھی غیر معصوم۔ اس کی شہادت ایک نبی کے لیے یقینیات قطعیہ اور دین

(۱) فتح الباری ج ۶ ص ۲۵۰

کے مسلمہ اصولوں کے مقابلے میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اور الجزائری نے جو بعض کی طرف منسوب کر کے اور امام رازی نے جسے امام اعظم کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ۔

هذا الحديث لا ينبغي ان يقبل لان فيه نسبة الكذب الى ابراهيم۔

اس حدیث کو شرف قبول حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ۔

جب ایک غیر معصوم راوی کی غلطی ماننے اور معصوم نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت میں تعارض ہو جائے تو ہم راوی کی غلطی مان لیں گے لیکن نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت گوارا نہ کریں گے۔(۱)

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے

انا لاندعي العصمة في الرواة۔ (ہم راویوں میں عصمت کے دعویدار نہیں ہے)

راویوں میں محدثین سے زیادہ عدالت کے مدعی ہیں اور عدالت اور عصمت میں جب بھی تعارض ہوگا تو عصمت کو راجح قرار دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

معانی قرآن سے متصادم روایت:

حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد دین کی زندگی میں اسے اپنانے اور اس کی مقبولیت کے لیے امام اعظم ایک شرط یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی درجے میں معانی قرآن سے متصادم نہ ہو اور اس شرط کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں قطعی نہیں ہے لیکن اپنے منطوق میں وہ حتمی اور قطعی ہے اور احادیث اخبار آحاد ہونے اور روایت بالمعنے کی وجہ سے اپنے منطوق اپنے مفہوم میں ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہیں۔ ایک روایت پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی کے ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

---

(۱) توضیح مختصر ص ۱۳

فقد یختلف صیغ حدیث لاختلاف الطرق و اذلک من جهة نقل الحدیث بالمعنی۔

حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف الفاظ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی روایت بالمعنے ہوئی ہے۔(۱)

امام اعظمؒ کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبدالبر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ:

امام اعظمؒ اخبار آحاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر پیش فرماتے تھے۔ ان حدیثوں میں جو اپنے معنے میں منفرد ہوتی تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار آحاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درجہ قبولیت نہ ملتا تھا۔ خواہ وہ معانی قرآن قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول۔ اگر خبر واحد ان کے خلاف ہوتی تو خبر کی صحت میں آپ اسے علت قادحہ قرار دیتے۔ دراصل اخبار آحاد میں تعلیق کا مسئلہ نہایت ہی نازک ترین مسئلہ ہے۔ محدثین کی نظر تو اس موضوع پر صرف اسناد اور الفاظ متن ہی پر ہوتی ہے لیکن مجتہدین کی نظر اس معاملہ میں الفاظ متن اور اسناد ہی پر نہیں ہوتی بلکہ ان کو تقابلی مطالعہ میں اسے شریعت کے پورے نظام کو سامنے رکھ کر جانچنا ہوتا ہے اسی لیے کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجوہ نہ صرف متعدد ہوتی ہیں بلکہ متبائین ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں:

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اخبار آحاد کے ضعیف ہونے کی وجوہ ایک سے زیادہ ہونے کے ساتھ مختلف بھی ہوتی ہیں اور اہل علم اس موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں فقہاء مجتہدین کے نزدیک حدیث کے ضعیف ہونے کی وجوہ مقرر ہیں اور ان میں بزرگ ترین یہ ہے کہ حدیث کی مقبولیت کا دارومدار ظاہر شروع کی ہمنوائی پر ہے۔ اور محدثین کے نزدیک دوسرے اسباب ہیں۔(۳)

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ (۲) الانتقاء: ص ۱۴۹ (۳) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے یہاں تعلیل اخبار کے جو پیمانے مقرر ہیں ان کا تعلق سرتاسر محدثانہ نقطہ نظر سے ہے۔ اور فقہاء کے یہاں صرف یہی پیمانہ نہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسرے سانچوں میں بھی اخبار کو رکھ کر جانچتے ہیں۔ ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔

شیخین اور دوسرے ارباب صحاح نے حدیث روایت کی ہے کہ:

عن ابن عمر ان النبی صلی الله علیه وسلم قال المتبایعان بالخیار مالم یتفرقا۔

یہ حدیث صحیح ہے اور حدیث کی کتابوں میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ محدثین نے اس حدیث پر غور کیا اور غور وفکر کے بعد ان کو اس کی سند میں ایک جگہ نازک ترین علت معلوم ہوئی۔ بتانے والوں نے اس کا سلسلہ سند یوں ظاہر کیا:

یعلی بن عبید عن سفیان الثوری عن عمرو بن دینار عن ابن عمر عن النبیؐ

حدیث متصل ہے لیکن الجزائری کہتے ہیں کہ اس میں علت موجود ہے اور اس علت کی وجہ سے بلحاظ سند صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وهو معلل غیر صحیح

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ علت کیا ہے؟ الجزائری نے بتایا ہے کہ:

والعلة فی قوله عن عمرو بن دینار انما هو عن عبدالله بن دینار عن ابن عمر هکذا رواه الائمة من اصحاب سفیان فوهم یعلی بن عبید وعدل عن عبدالله بن دینار الی عمرو بن دینار وکلاهما ثقة۔

اس میں علت یہ ہے کہ سند میں عمرو بن دینار آیا ہے حالانکہ عمرو بن دینار نہیں بلکہ عبداللہ بن دینار ہے۔ ائمہ نے ایسا ہی روایت کیا ہے یعلی بن عبید کو وہم ہو گیا اور عبداللہ کی جگہ عمرو مذکور ہو گیا۔(۱)

یہ محدثانہ تعلیل ہے لیکن حدیث میں جو فقہاء یعنی امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے علت قادحہ معلوم کی ہے وہ اس کے سوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث زمانہ فقہاء سبعہ میں

---

(۱) توجیہ النظر: ص ۲۶۶

منظر عام پر نہیں آئی اور ان کے معاصرین اس سے آشنا نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فرای مالک و ابو حنیفة هذ اعلة قادحة فی الحدیث۔(۱)

بہرحال امام اعظم اخبار آحاد کو معانی قرآن کے سانچے میں تول کر حدیث کی مقبولیت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:

خلاصہ یہ کہ حدیث جب شریعت کے موافق ہو قرآن اس کا مصدق ہو اور آثار اس کے مؤید ہوں تو ایسی حدیث کی تصدیق واجب ہے۔ لیکن اگر حدیث شریعت کے خلاف ہو قرآن اس کی تکذیب کرتا ہو تو ایسی حدیث کا رد کرنا ضروری ہے اور یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ فرمودہ نبوت نہیں ہے۔(۲)

مشہور محدث ابو بکر خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

اخبار آحاد کو مندرجہ ذیل صورتوں میں قبول نہ کیا جائے گا جب عقل صریح کے خلاف ہو۔ جب حکم قرآنی کے خلاف ہو۔ جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو اور جب کسی ایسے عمل کے خلاف ہو جو سنت کے قائم مقام ہو کر چل رہا ہے اور جب کسی بھی دلیل قطعی کے خلاف ہو۔(۳)

خطیب بغدادی ہی نے الفقیہ والمتفقہ میں یہ بات اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کی ہے۔ علامہ زاہد کوثری نے الفقیہ والمتفقہ کے حوالہ سے ان کا یہ بیان قلم بند کیا ہے اور اسے مولانا ابو الوفاء افغانی نے الرد علی سیر الاوزاعی کی تعلیق میں نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جب ثقہ مامون راوی کوئی حدیث متصل الاسناد روایت کرے تو اسے صرف ان وجوہ کی بنا پر رد کیا جا سکتا ہے۔

(اول) عقل کے صریح خلاف ہو۔ (دوم) حکم قرآنی یا سنت متواترہ کے خلاف ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو یقیناً حدیث بے اصل ہے اور یا پھر منسوخ۔ (سوم) اجماع کے خلاف ہو کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حدیث صحیح ہو اور امت کسی ایسی چیز پر مجتمع ہو جائے جو اس کے خلاف ہو۔ (چہارم) راوی کسی ایسی بات کے بیان میں منفرد ہو جسے سب

---

(۱) الانصاف: ص ۳۰　(۲) المعتصر: ص ۲۶۲　(۳) الکفایہ: ص ۴۳۲

کو جاننا چاہیے۔ (پنجم) راوی کوئی ایسا انکشاف کرے جسے عادۃً متواتر ہونا چاہیے۔ ان پانچوں صورتوں میں خبر واحد قابل پذیرائی نہ ہوگی۔(۱)

حافظ ابوبکر الجصاص نے قرآنی آیت اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم پر یہ نوٹ لکھا ہے:

اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا اتباع بہرحال واجب ہے اور قرآن پر اخبار آحاد کو بالادستی حاصل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی اتباع دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور آحاد کا ثبوت ظنی ہے اس لیے کسی حال میں کسی حدیث کی بنا پر قرآن کو نہ چھوڑا جائے گا اور نہ آحاد کی وجہ سے قرآن پر کوئی اعتراض ہوگا۔(۲)

اس موقعہ پر علامہ عبدالعزیز بخاری کے اس بیان سے چشم پوشی کرنا اس مقام سے بے انصافی ہوگی جو انہوں نے کشف الاسرار میں لکھا ہے

ثقہ راوی کی حدیث کو قرآن کی مخالفت کی بنا پر رد کرنا سب کے درمیان اتفاقی ہے۔ علاوہ ان ظاہریہ کے جو اخبار آحاد کو بھی متواتر کی طرح قطعی کہتے ہیں۔ ان کے کتب میں خبر واحد کو کتاب اللہ کو ایک ترازو میں تولا جاتا ہے ان سے اس موضوع پر بات ہی بیکار ہے۔(۳)

بہرحال امام اعظم اور امام مالک حدیث کی صحت کے بعد اس کی مقبولیت میں معانی قرآن کے خلاف ہونے کو علت قادحہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس بنا پر انہوں نے ایک سے زیادہ حدیثوں کو معلل قرار دے کرنا قابل پذیرائی بتایا ہے۔ ترمذی ابن ماجہ اور بیہقی میں حدیث آتی ہے۔

عن عبداللہ ان غیلان بن سلمۃ الثقفی اسلم ولہ عشرۃ نسوۃ فی الجاھلیۃ فاسلمن معہ فامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتخیر منھن اربعاً۔

امام ترمذی نے اسے بحوالہ زہری عن سالم عن عبداللہ روایت کیا ہے امام بخاری نے تو محدثانہ انداز میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

---

(۱) المنقیہ والحقعہ بحوالہ التعلیق الروطی سیر الاوزاعی: ص ۲۸)

(۲) احکام القرآن: ج ۲ ص ۲۸)　(۳) کشف الاسرار: ج ۳ ص ۱۰

هذا حديث غير محفوظ

اور صحیح روایت کی نشاندہی کی ہے۔ شیخ علاء الدین مغلطائی فرماتے ہیں کہ:

احاديث هذا الباب كلها معلولة وليست اسانيد هاقوية۔

لیکن قاضی ابو یوسف نے اس کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس سے ان کی حدیث وفقہ میں جلالت شان کا اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں:

هو عندنا شاذو الشاذ من الحديث لا يؤخذبه۔

یہ تو محدثانہ فیصلہ ہے لیکن اس کی جو توجیہ ارشاد فرمائی ہے اس سے ان کی مجتہدانہ جلالت قدر معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں:

لان الله تعالىٰ لم يحل الانكاح الاربع فما كان من فوق ذالك كله فحرام من الله في كتابه۔

کیونکہ اللہ سبحانہ نے ایک وقت میں چار سے نکاح حلال کیا ہے پانچ کا ایک کے نکاح میں اجتماع حرام ہے۔(۱)

دیکھ لیجئے معانی قرآن سے تصادم ہونے کو شاذ ہونے کی علت قرار دیا ہے۔

اسی قبیل سے حدیث مصراۃ ہے یعنی حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ ذیل حدیث:

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اونٹ' بکری کو مصراۃ نہ بناؤ جو کوئی ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے چاہے اسے رکھے اور چاہے تو اسے واپس کردے اور اس کے ساتھ بائع کو ایک صاع کھجور دیدے۔(۲)

امام اعظمؒ نے اس حدیث کو معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے غیر مقبول قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی رو سے سودے کی واپسی کی صورت میں خریدار کو دودھ کا تاوان کھجور کی صورت میں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے بلاشبہ عیب کی موجودگی میں مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن خریدار پر دودھ برتنے کی پاداش میں کھجور کا تاوان قرآن کے بتلائے

---

(۱) الرد علی سیر الاوزاعی: ص ۳۰ (۲) منتقی الاخبار مع نیل الاوطار: ج ۵ ص ۱۸۳

ہوئے ضمان کے خلاف ہے۔ قرآن نے حلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثل بتایا ہے۔ قرآن کی یہ آیات اس کی صریح شہادات ہیں۔

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔

پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ بالکل ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو۔

ایک اور ارشاد ہے:

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به

اور اگر تم سزا دو تو چاہیے کہ اتنی ہی سزا تم دو جیسی تمہیں دی گئی ہے۔

یہ آیات قرآنی صراحتہً کہہ رہی ہیں کہ عدوانات کی حدود میں تاوان مثلیات میں مثل ہوتی ہے۔ ان ارشادات ربانی کی روشنی میں دودھ کا تاوان دودھ ہونا چاہیے کیونکہ دودھ ذوات الامثال سے ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تاوان کے موضوع پر ایک ضابطہ کی صورت میں امت کو شہرت کی راہ سے ملا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے یہ آپ کا عدالتی فیصلہ ہے۔

عن عائشة ان النبی صلی الله علیه وسلم قضیٰ ان الخراج بالضمان۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ خراج ضمان کے ساتھ ہے۔

یہ قرآن وسنت کے واضح اصول ہیں اور یہ روایت ان کے معارض ہے اس لیے امام اعظمؒ اس روایت کو مقبول نہیں قرار دیتے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس روایت کا دوسرے پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

دودھ جسے خریدار نے گھر لا کا نکالا ہے اس میں خریدنے سے پہلے کچھ مالک کی ملک تھا اور کچھ خریدار کے یہاں آ کر پیدا ہوا ہے۔ وہ خریدار کی ملک ہے۔ کھجوروں کا جو صاع مالک کو دیا جا رہا ہے وہ اگر سارے دودھ کا بدل ہے تو یہ حدیث الخراج بالضمان کے خلاف ہے کیونکہ جو دودھ خود ملک مشتری میں پیدا ہوا ہے وہ تو اس کا ہے خریدار پر کھجور کا تاوان بلاوجہ ہے چنانچہ امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر خریدار نے صیر ورۃ کے علاوہ کسی اور وجہ سے جانور واپس کر دیا تو خریدار پر ضمان نہیں

ہے۔ اور اگر یہ صاع اس دودھ کا بدل ہے جو سودے کے وقت جانور کے پستانوں میں موجود تھا تو پھر بیع الکالی بالکالی ہے جس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دودھ خریدار کی ملک نہیں ہے نہ سودے کی وجہ سے اور نہ حدیث الخرج بالضمان کی رو سے۔ خریدار نے اگر پی لیا تو اس کے ذمہ دین ہے اس لیے دونوں میں سے کوئی صورت ہو ایک حدیث کا چھوڑنا ناگزیر ہے۔(۱)

علامہ خطابی نے جہاں اس حدیث پر گفتگو فرماتے ہوئے امام اعظمؒ کے موقف کا تذکرہ کیا ہے وہاں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ امام اعظمؒ اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں:

انه خبر مخالف للاصول لان فيه تقويم المتلف بغير النقد وفيه ابطال ردالمثل فيماله مثل۔

یہ حدیث اصول کے خلاف ہے اس میں تلف شدہ چیز کا ضمان بغیر نقدی کے دیا جا رہا ہے اور اس طرح یہ حدیث مثلیات میں مثل کے دینے کے اصول کو رد کرتی ہے۔

اور معلوم ہے کہ یہ اصول قرآن کا بتایا ہوا ہے۔ اس لیے یہ حدیث معانی قرآن کے معارض ہے علامہ ابن دقیق العید نے یہ فرما کر کہ:

لم يقل ابو حنيفة بهذا الحديث

لکھا ہے کہ ابوحنیفہ اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ حدیث ان کی رائے میں اصول معلومہ کے خلاف ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اخبار آحاد اگر اصول معلومہ کے مخالف ہوں تو ان پر عمل واجب نہیں ہے۔ حدیث کے اصول معلومہ کے مخالف ہونے پر امام اعظمؒ کے موقف کو جن آٹھ وجوہ سے منع کیا ہے ان میں اولین وجہ یہ بتائی ہے کہ:

یہ کہ مثلیات میں تاوان مثلی اور قیمتی اشیاء میں قیمت سے ہوتا ہے اس حدیث میں دودھ سے ہونا چاہیے اور اگر قیمتی ہے تو اس کی قیمت دی جانی چاہیے لیکن حدیث میں تاوان جو تجویز کیا گیا ہے نہ وہ مثلی ہے اور نہ قیمتی بلکہ تاوان میں کھجوریں دی گئی

(۱) شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۲۰۷

ہیں اس لیے یہ حدیث اس اصول کے مخالف ہے۔(۱)

امام اعظمؒ کے موقف کی وضاحت کے بعد ان لوگوں کی جانب سے جوابات بھی نقل کیے گئے ہی جو ظاہر حدیث پر عمل پیرا ہیں۔ مخالفین اس حد تک تو امام اعظم کے ہمنوا ہیں کہ اخبار آحاد اگر اصول معلومہ کے معارض ہوں تو قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ ابن دقیق العید رقم طراز ہیں:

خص الرد بخبر الواحد بالمخالفة للاصول لا بمخالفة قياس الاصول۔(۲)

یہی جواب امام شوکانی کی رائے میں سب سے زیادہ شاندار ہے یعنی حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے نہیں بلکہ قیاس اصول کے مخالف ہے لیکن علامہ ابن دقیق العید نے اس جواب کی یہ کہہ کر وفی هذا نظر (محل نظر ہے) کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ خطابی کو جب اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ملی کہ حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے خلاف ہے تو انہوں نے اصول اور قیاس اصول سے نظر ہٹا کر اپنے مخصوص ذہن کے تحت یہ جدت پیدا کر دی کہ محدثین کی اصطلاحی صحت کے بعد ہر حدیث خود ہی ایک اصل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ علامہ خطابی فرماتے ہیں:

ان الحديث اذا ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وجب القول به وصار اصلاً في نفسه۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنانا واجب ہے اور وہ حدیث خود اصل ہے۔(۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی میں بھی یہی بات دہرائی ہے:

الحديث الصحيح اصل بنفسه۔(۴)

لیکن یہ صرف ان ذہنوں کا تخلیقی کارنامہ ہے جو قرآن کے ساتھ بلحاظ ثبوت احادیث

---

(۱) احکام الاحکام: ج ۲ ص ۱۲۷ (۲) نیل الاوطار: ج ۵ ص ۱۸۵

(۳) معالم السنن: ج ۵ ص ۸۶ (۴) فتح الباری: ج ۴ ص ۲۹۱

کی قطعیت کو مانتے ہیں۔ یہ عامہ اہل علم کا موقف نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔

حدیث مصراۃ کے بارے میں امام اعظمؒ کا صحیح موقف تو یہی ہے کہ یہ حدیث معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود احناف نے بھی امام اعظمؒ کے موقف کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا اس لیے یہاں چند در چند سوالات ابھر آئے۔

عیسیٰ ابن ابان نے امام اعظمؒ کے موقف کی ترجمانی اس طرح کی کہ ایسی اخبار آحاد جن کے لیے کسی صورت میں بھی قیاس میں گنجائش نہ نکل سکے اور راوی فقیہ نہ ہو اسے رد کر دیا جائے اور یہ حدیث مصراۃ اسی قبیل سے ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں:

مذهب عیسیٰ بن ابان من اصحابنا اشتراط فقه الراوی لتقدیم الخبر علی القیاس وخرج علیه حدیث المصراة وتابعه اکثر المتاخرین۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن القیمؒ حافظ ابن تیمیہؒ علامہ ابن دقیق العید اور علامہ شوکانی نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تو یہاں تک فرما گئے:

هو کلام اذی قائله به نفسه وفی حکایته غنی عن تکلف الرد علیه۔(۲)

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظمؒ کی جو ترجمانی کی ہے وہ بھی بے شمار شبہات کی تخلیق کا ذریعہ بنی ہے انہوں نے صرف قیاس کا سہارا لیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ حدیث مصراۃ قیاس کے معارض ہے اس لیے اسے امام اعظمؒ نے نہیں اپنایا ہے چنانچہ وہ اس حدیث کے مقبول نہ ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دودھ کے عوض میں ایک صاع کھجور کا دینا ضروری سمجھا گیا ہے ظاہر ہے کہ دودھ خریداری اور بکری پر قبضہ کے بعد ہی دوہا گیا ہوگا لہٰذا وہ خریدار کی ذمہ داری میں داخل ہے کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اس لیے تاوان کا سوال ہی نہیں۔ دودھ مال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایسے ہے جیسے بکری کا بچہ۔ اس لیے مشتری پر تاوان کی کوئی وجہ

---

(۱) کتاب الجامع: ص ۴۱۷ (۲) فتح الباری: ج ۵ ص ۴۹۰

نہیں ہے۔ نیز اگر دودھ کو مال فرض بھی کر لیا جائے تو یہ اون کی طرح بکری کے تابع ہے پھر بھی خریدار اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر خریدار پر تاوان اس لیے ہے کہ اس نے عقد بیع کیا ہے تو دودھ کے مقابلے میں بکری کی قیمت اتنی کم ہو جانی چاہیے۔ اور اگر اس کی وجہ مشتری کی تعدی ہے تو وہ اتنا دودھ واپس کر دے یا اس کی قیمت دے۔ کسی بھی صورت میں ایک صاع تمر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔(۱)

اس بیان کی روح یہ اور صرف یہ ہے کہ حدیث مصراۃ قطعاً خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کو اپنی اپج ہے۔ ان کی یہ تخریجات امام اعظمؒ کے مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں۔ اور ان کے بیانوں سے امام اعظمؒ کے اصل مسلک کی تصویر سامنے نہیں آتی۔ چنانچہ امام ابوالحسن کرخی نے تصریح کی ہے کہ:

> ہمارے اصحاب ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ کتاب اللہ اور سنت کے خلاف ہیں نہ کہ اس لیے کہ راوی فقیہ نہیں ہے حدیث مصراۃ کتاب و سنت دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اس لیے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے اور یہی امام اعظمؒ کا موقف ہے کہ حدیث مصراۃ معانی قرآن اور سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ حدیث خلاف قیاس ہے جیسا کہ بزدوی کا خیال ہے اور اس لیے نہیں کہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور وہ غیر فقیہ ہیں جیسا کہ عیسیٰ بن ابان کی رائے ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ کی یہ بات بے حد وزنی ہے کہ واپسی کی علت حدیث میں عیب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی علت وہ جعل سازی اور تدلیس ہے جس کا مالک نے دودھ روک کر مظاہرہ کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف بھی خریدار کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ ایسا مویشی واپس کر دے۔ اگر فی الواقع حدیث میں جانور کی واپسی کا حکم دھوکے اور تدلیس کی بنا پر ہے تو پھر اس ارشاد نبوت کے ذریعے امام اعظمؒ کا موقف بے حد مستحکم اور پائیدار ہو جاتا ہے کیونکہ دھوکہ دو ہی طرح سے ہوتا ہے گفتار سے یا کردار سے۔

---

(۱) کشف الاسرار: ج ۲ ص ۷۰۲

اگر لین دین میں گفتار کے ذریعے دھوکہ دیا گیا تو عدالت کے ذریعے اس کا اقالہ ضروری ہے۔ اور اگر کردار کے ذریعے تدلیس کی گئی ہے تو قانونی طور پر تو اقالہ ضروری نہیں ہے لیکن از روئے دیانت ضروری ہے۔ قانون ہمیشہ کھلے اور صاف حقائق پر لاگو ہوتا ہے۔ پوشیدہ اور مستور کارروائیاں قانون کے احتساب سے باہر ہیں۔ مان لیا جائے کہ تصریہ دھوکہ اور تدلیس ہے اور اس میں بائع پر واجب ہے کہ معاملہ کو فسخ کرے لیکن یہ وجوب از روئے قانون۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جعل سازی اور تدلیس کرنے والوں کو ازروئے دیانت حسن معاشرت کی خاطر فرمارہے ہیں کہ اگر کوئی ایسی جعل سازی وجود میں آجائے تو اخلاق اور باہمی رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ جانور واپس لے لیا جائے اور مشتری کی مروت یہ ہے کہ وہ اسے ایک صاع کھجور دیدے یا اس کی قیمت ادا کردے جیسا کہ خطابی نے قاضی ابو یوسف کی رائے بتائی ہے۔ ورنہ جہاں تک معاملاتی نقطہ نظر سے اس کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے وہ تو وہی ہے جو قرآن اور سنت کی بنا پر ہو جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں تو نقصان عیب میں قرآن وسنت کا ضابطہ ہی ہے کہ متلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثلی ہوتا ہے۔

بہرحال اخبار آحاد کا معانی قرآن کے معارض ہو جانا امام اعظمؒ کے نزدیک علت قادحہ ہے۔

سنت مشہورہ سے معارض حدیث:

اخبار آحاد اگر سنت سے معارض ہوں خواہ ان پر اصطلاحی صحت کی محدثین نے کتنی ہی مہریں لگادی ہوں امام اعظمؒ اس کو بھی اخبار آحاد کے لیے علت قادحہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں امام اعظمؒ ہی کا نہیں بلکہ دوسری صدی کے سب محدثین کا موقف یہی ہے۔ ابوبکر الخطیب کی زبانی آپ اس کی پوری داستان پہلے سن چکے ہیں۔ ان ظاہر یہ کو چھوڑ کر جن کے یہاں ہر حدیث محدثین کی اصطلاحی صحت کا لبادہ پہن لینے کے بعد خود ہی اصل بن جاتی ہے اور جن کے یہاں آحاد کو جانچنے کا کوئی معیاری پیمانہ نہیں ہے سب کہتے ہیں کہ اخبار آحاد اگر سنت مشہورہ کے معارض ہوں تو یہ علت قادحہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کا جو محسوس پیانہ صحابہ میں چھوڑا ہے اور جسے جماعت صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اپنایا اور جسے خلافت راشدہ نے اپنے دور اقتدار میں تمام ممالک اسلامیہ میں قانونی طور پر نافذ کیا ہے اور جسے اسلام کہہ کر دنیا نے پکارا ہے۔ یہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مشہورہ ہے۔ چونکہ یہ عملاً متواتر ہے اس لیے اس کے خلاف سند کی بڑی سے بڑی قوت بھی بطور چیلنج قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر بھر کے عمل اور صحابہ کے تعامل سے امت کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ امامت کے لیے وہ شخص آگے ہونا چاہیے جو عاقل بالغ ہو اور اس ضابطہ کلیہ میں کہیں کوئی استثنا نہیں ہے۔ صرف عمرو بن سلمہ کی ایک منفرد روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ میں صرف چھ سال کی عمر میں امامت کی ہے۔

حدیث صحیح بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس طرح آئی ہے کہ عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ زمانہ فتح مکہ میں سب نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے والد نے ہماری قوم میں سے اسلام لانے میں پہل کی۔ مسلمان ہونے کے بعد جب میرے والد واپس تشریف لائے تو بتایا کہ میں تمہارے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حق لے کر آیا ہوں آپ نے فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں نماز پڑھا کرو۔ جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کرے لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ قرآن کسی کو یاد نہیں ہے کیونکہ میں آنے والے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا لوگوں نے مجھے ہی آگے کر دیا اس وقت میری عمر صرف چھ یا سات سال تھی۔ میں ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھا رہا تھا جب میں سجدے میں جاتا تو برہنا ہو جاتا۔ قبیلہ کی ایک عورت نے کہا۔ کیا تم اپنے امام کی جائے شرم نہیں ڈھانپتے۔ لوگوں نے میرے لیے کپڑا خرید کر قمیص تیار کی جس قدر مجھے اس روز خوشی ہوئی کبھی ایسی خوشی نہ ہوئی تھی۔ (۱)

(۱) منتقی الاخبار: ج ۳ ص ۱۴۰

تیسری صدی کے محدثین نے اس حدیث سے چھ سالہ بچے کے لیے امامت کے جواز کا پروانہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ مشہور محدث محمد بن نصر مروزی نے امام اسحاق بن راہویہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

اما امامة الغلام بعد ان یعقل الامامه ویفقه فی الصلوة فجائزة وان لم یحتلم وفیما قال النبی صلعم یؤم القوم اقرأهم وان کان اصغرهم دلالة علی ذالک۔(۱)

لڑکے کی امامت عقل وفہم کے بعد درست ہے اگرچہ نابالغ ہو اور حضور کا یہ ارشاد کہ لوگوں میں جو زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرے اس کی دلیل ہے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ:

فیه جواز امامة الصبی ووجه الدلالة مافی قوله لیؤمکم اکثرکم قرآنا من العموم۔(۲)

یہ حدیث بچے کی امامت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ اقرأکم الخ۔ کا جملہ عام ہے۔

لیکن دوسری صدی کے محدثین اور فقہاء نے اس موضوع پر سنت مشہورہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔ لیث بن سعد عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، شعبی، مالک اور ابوحنیفہ نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور اس جزئی واقعہ کی یہ تاویل کر دی کہ یہ ان نومسلموں کا اپنا اجتہاد تھا کہ معصوم بچے کو امام بنا لیا۔ اس لیے اس موضوع پر یہ حجت نہیں ہے۔ دین میں نبوت کا چھوڑا ہو ضابطہ اور محسوس و مرئی عمل کا پیمانہ امامت کے متعلق وہی ہے۔ جس پر ہمیشہ صحابہ نے عمل کیا ہے۔

تاریخ سنت میں یہی اس محسوس پیمانہ عمل کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد امت کو ملا ہے۔ مثلاً مالک بن الحویرث کہتے ہیں کہ:

ہم ایک وفد کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے بیس روز آپ کی خدمت میں رہے آپ بڑے ہی مہربان اور شفیق تھے جب

---

(۱) قیام لیل: ص ۱۰۱ (۲) نیل الاوطار: ج ۳ ص ۱۴۰

آپ نے ہم میں واپسی کا اشتیاق محسوس کیا تو ارشاد فرمایا کہ واپس جاؤ جہاں رہو تعلیم جاری رکھو اور نماز پڑھو جب نماز کا وقت آئے چاہیے کہ تم میں سے ایک اذان کہے اور لیئومکم اکبر کم جوتم میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔(۱)

اس واقعہ کو امام بخاری نے ایک جگہ نہیں بلکہ چھ جگہ اپنے مختلف اساتذہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ان میں زیادہ مبسوط وہ واقعہ ہے جو ابوالنعمان کے حوالہ سے لکھا ہے۔

منتقی الاخبار میں اس موضوع پر صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ بھی نقل کیے ہیں کہ بچے کے لیے امامت کی گنجائش نہیں ہے۔اور قیام لیل میں لیث بن سعد' یحییٰ بن سعید الانصاری' ابن جریج' مجاہد' سفیان ثوری' ابراہیم نخعی کے آثار بھی اسی موقف کی تائید میں آتے ہیں بلکہ عمر بن عبدالعزیز کا وہ مکتوب بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے گورنر کو اس حرکت پر ڈانٹ پلائی ہے کہ اس نے نماز کے لیے اپنے بچے کو امام بنادیا تھا۔لکھا ہے کہ:

قدمت غلاماً لم تحتکم السن ولم تدخله تلک النیة اماماً للمسلمین فی صلاتهم۔

تم نے چھوٹے بچے کو امام بنالیا۔

امام اعظمؒ نے ان صاف اور واضح ہدایات کی روشنی مین اپنی خداداد فقاہت سے امامت کے اس ضابطہ عام کو جو سنت کی راہ سے آیا ہے اپنی جگہ سے نہ ہلنے دیا۔

یہ تو اس خالص مجتہدانہ نظر تھی جس سے سنت کے معارض ہونے کی وجہ سے حدیث پایہ مقبولیت حاصل نہ کرسکی۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی علت قادحہ ہے اور اس حدیث کی صحت بالکل ٹکسالی ہے۔

محدثین نے اس کی صحت میں بھی کلام کیا ہے۔الخطابی فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کا واقعہ ضعیف ہے اور حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے۔ فیکم رجل مجهول فهو غیر صحیح اس میں ایک مجہول راوی ہے

(۱) رواہ الجماعۃ منتقی الاخبار: ج ۳ ص ۱۴۴

لہٰذا روایت صحیح نہیں ہے۔ اور تو اور حافظ ابن حزم بھی ظاہریت کے باوجود یہاں بول پڑے کہ:

اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے معلوم ہو جانے کے بعد اس پر نکیر نہیں فرمائی تو ہم بچے کی امامت ضرور جائز کہتے لیکن ہمارے علم میں یہ نہیں آیا۔ اگر مان لیا جائے کہ عمرو بن سلمہ بھی اپنے والد کے ساتھ حضورؐ کے پاس گئے تھے اور حضورؐ اس وفد کو جب حکم دے رہے تھے تو یہ بھی موجود تھے۔ پھر بھی اس عمر کا آدمی نا مامور ہے اور نہ مکلف ہے اس لیے عمرو امامت کے لیے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ اس حکم کے مخاطب صرف مامورین ہیں۔(۱)

اخبار آحاد کا توارث سے معارضہ:

امام اعظمؒ اخبار آحاد کو توارث کے پیمانے میں بھی تولتے ہیں اور ہر ایسی حدیث کو معلول قرار دیتے ہیں جو توارث کے خلاف ہو۔ اسی توارث کو السنۃ اور ماعلیہ الجماعۃ کہتے ہیں۔ اور اس موضوع پر امام اعظمؒ کو دوسری صدی کے محدثین کی ہمنوائی بھی حاصل ہے۔ چنانچہ مصر کے مشہور محدث وفقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح طور پر پیش فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس پر مصر، شام، عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلے کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ و تابعین میں ان کے اسلاف کے سرتاسر خلاف ہو۔(۲)

امام مالک عمل اہل مدینہ کی حجیت کے جو قائل ہیں اس کا معنیٰ بھی توارث ہے۔ حافظ ابن القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر وہ اعلام میں فرماتے ہیں:

---

(۱) المحلی۔ ج ۴ ص ۲۱۸ (۲) اعلام الموقعین: ج ۳ ص ۹۶

فھذا النقل وھذا العمل حجة یجب اتباعھا و سنة متلقاة بالقبول علی الراس والعینین واذاظفر العالم بذالک قرت عینه واطمانت الیه نفسه۔

یہ نقل اور یہ عمل واجب الا تباع دلیل ہے اور ایک ایسی سنت ہے۔ جسے تلقی بالقبول حاصل ہے اگر ایسی کوئی مل جائے تو دل کی ٹھنڈک اور اطمینان کا موجب ہے۔(۱)

واضح رہے کہ اگرچہ حافظ ابن القیم نے عمل اہل مدینہ کی حجیت سے اختلاف کیا ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں لیکن وہ زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کے عمل کی حجیت کے قائل ہیں۔ ہاں جب دور خلافت کے بعد صحابہ کی اکثریت مدینہ سے باہر چلی گئی ہے تو پھر وہ اہل حرمین کے عمل کی حجیت کو نہیں مانتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی بھی شہر میں صحابہ نے ڈیرا لگایا ہو اور وہاں صحابہ کا قائم کردہ جادہ عمل استمرار کے ساتھ امت کو ورثہ میں ملا ہو تو اس میں اور اہل مدینہ کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اگر کسی ایسے شہر والوں کا کہ جہاں صحابہ منتقل ہو گئے تھے وہاں صحابہ کی تعلیم کے مطابق کوئی عمل مستمر چلاتا ہے تو اس عمل میں اور اہل مدینہ کے عمل میں کیا فرق ہے۔(۲)

ان کو استمرار عمل اور توارث کی حد تک اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف کا مرکزی نقطہ مکان اور در و دیوار ہیں۔ توارث کو تو وہ اس حد تک طاقتور دلیل قرار دیتے ہیں کہ کتاب الروح میں ایک مقام پر تلقین میت فی القبر کے تذکرے میں ایک حدیث ضعیف لے کر آئے ہیں اور خود فرماتے ہیں کہ یہ اس موضوع پر ضعیف حدیث ہے مگر اس کے ساتھ جواز عمل کا پروانہ انہوں نے جس بنیاد پر دیا ہے۔ وہ بھی تعامل اور توارث ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فھذا الحدیث وان لم یثبت فاتصال العمل به فی سائر الامصار والاعصار من غیر انکار کاف فی العمل به۔(۳)

حدیث اگرچہ ثابت نہیں لیکن اس کی پشت پر اتصال عمل کی طاقت ہے اس لیے عمل کے لیے کافی ہے۔

---

(۱) اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۷۲ (۲) اعلام الموقعین ج ۳ ص ۹۲ (۳) کتاب الروح ص ۱۴

حافظ ابن عبدالبر نے الاستذکار میں امام مالک کے حوالے سے یہ تصریح کی ہے کہ:
جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف حدیثیں آئیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس پر عمل کیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا ہے وہ ہی صحیح اور مقبول ہے۔(۱)

حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی نے امام مالک کا ایک دوسرا بیان نقل کیا ہے۔
اگر یہ حدیث معمول بہ ہوتی کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھو تو اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر وعمر وعثمان ضرور عمل کرتے۔(۲)

اسی سلسلے میں امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں جو ضابطہ لکھا ہے وہ بھی سن لیجئے۔
جب دو حدیثیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف آئیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ آپ کے صحابہ نے کس پر عمل کیا ہے۔(۳)

امام عثمان دارمی محدث کے حوالے سے مشہور محدث امام بیہقی بیان کرتے ہیں کہ:
جب کسی موضوع پر احادیث مختلف ہوں اور راجح و مرجوح کا پتہ نہ ہو تو ہم یہ دیکھیں گے کہ خلفائے راشدین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس پر عمل کیا ہم اسی کو راجح قرار دیں گے جس پر خلفائے راشدین کا عمل ہے۔(۴)

مشہور مجتہد اور اصولی امام حافظ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں کہ:
جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ارشاد مروی ہوں اور ان میں سے ایک پر سلف کا عمل ہو تو اسی کو ثابت کہا جائے گا۔ جس پر سلف کا عمل ہے۔

دوسری صدی میں تعامل و توارث کی طاقت اس درجہ معلوم تھی کہ اس دور کے مصنفین اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو اپناتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

علیک من الحدیث ماتعرفه العامة۔

---

(۱) التعلیق الممجد: ص ۴۷ (۲) تاریخ بغداد: ج ۶ ص ۲۲۷

(۳) سنن ابی داؤد (۴) فتح الباری جلد اول

الغرض امام اعظم ابو حنیفہ اخبار آحاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہموا ہونے کی شرط لگاتے تھے اور اسی معیار پر خبار آحاد کو جانچتے تھے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی معیار سے اخبار آحاد کو ناپا گیا ہے نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہیے یا بلند آواز سے۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ انس بن مالک کی صحیح مسلم کی حدیث بھی ابو حنیفہ کی مؤید ہے۔ محدثین نے اس حدیث کو معلل قرر دیا ہے اور متن میں علت ہونے کی مثال میں سب نے اس حدیث کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ الجزائری لکھتے ہیں:

فعلل قوم رواية اللفظ المذكور لمارأ والاكثرين انما قالوا فيه فكانوا يستفتحون۔ الخ۔

کچھ لوگوں نے اس حدیث انس کو معلل قرار دیا ہے۔

اور صاحب دراسات البیب نے دعویٰ کیا ہے کہ:

هذا حديث البسملة قد علل رواية مسلم بسبع علل۔

بسملہ کی حدیث روایت مسلم میں سات علل موجود ہیں۔(۱)

اگر چہ اس کا واضح اور شافی جواب حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس موضوع پر حضرت انس کی حدیث میں کوئی اضطراب نہیں ہے سب کی سب ہم آہنگ ہیں چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ:

فاحاديث انس الصحيحة كلها موتلفة متفقة تبين انه نفى الجهر بالقراءة وانه لم يتكلم في قراءتها سراً لا بنفي ولا اثبات و حينئذ فلا اضطراب في احاديثه الصحيحة۔

حضرت انسؓ کی ساری حدیثیں ملی جلی اور ہم آہنگ ہیں سب یہ بتا رہی ہیں کہ قرأت میں بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھی گئی۔ آہستہ پڑھی گئی یا نہیں اس سے حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے حدیث انس مضطرب نہیں ہے۔(۲)

---

(۱) دراسات اللبیب: ص ۲۹۴ (۲) توجیہ النظر: ص ۲۶۷

لیکن حافظ زیلعی نے اس موضوع پر توارث اور تعامل کا سہارا لے کر جو فیصلہ کن بات فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجیے:

بسم اللہ کا نماز میں آہستہ پڑھنا صحابہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ میراث تھی جس پر لوگ چل رہے تھے اور صرف اتنی ہی بات اس مسئلہ میں اطمینان کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ جہری نمازیں صبح و شام ہمیشہ پڑھی گئی ہیں۔ اگر حضور انور کا اس موضوع پر کوئی بھی عمل ہوتا تو امت اس محسوس عمل میں کبھی مختلف نہ ہوتی۔ یہ بات ہر کس و ناکس کو معلوم ہوتی اور حضرت انسؓ یوں نہ فرماتے کہ نہ حضورؐ نے بسم اللہ نماز میں بلند آواز سے پڑھی اور نہ خلفاء نے۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آہستہ پر عمل نہ ہوتا۔ اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو ہماری معیشت میں مد اور صاع کی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری۔ کیونکہ نماز تو تمام مسلمانوں کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ نیز نمازیں رات دن میں پانچ بار پڑھی جاتی ہیں۔ ایسے اشخاص تو معاشرے میں مل سکتے ہیں جن کو صاع اور مد کی ضرورت نہیں لیکن ایسا کون مسلمان ہے جسے نماز کی ضرورت نہ ہو اور پھر اکابر صحابہ کے بارے میں کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ خلاف پیغمبر پر مواظبت کریں۔(۱)

اس موقعہ پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں۔ اس کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے۔

امور وجود یہ ہی وہ امور ہیں جن کی نقل کرنے اور یاد رکھنے کا عادات اور ہمتیں اہتمام کرتی ہیں اور ان کا نقل کرنا شرعاً ضروری ہے۔ باقی رہا امور عدمی اور منفی چیزیں۔ تو ان کے نقل کی نہ چنداں ضرورت ہوتی ہے اور نہ عادۃً اس کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔ اگر پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کی کوئی حدیث پیش کرے یا رمضان کے روزوں کے علاوہ کسی روزے کی فرضیت کا دعویٰ کرے یا رکعات نماز یا فریضہ زکوۃ میں کوئی انکشاف کرے تو ہم اس کو بلا ریب غلط اور جھوٹ کہیں گے اور دلیل

(۱) نصب الرایہ: ج ۱ ص ۳۳۳

ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا ہونا منقول ہوتا۔ منقول نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس یہی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہ پڑھنے کی دلیل ہے۔(۱)

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اسی معیار سے رفع یدین کے موضوع پر اخبار آحاد کو ناپ لیجئے۔ تکبیر تحریمہ کی حد تک تو روع یدین کا مسئلہ امت میں اتفاقی ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

لم یختلفوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حین یفتتح الصلوٰۃ۔

تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

اگرچہ حافظ ابن حزم نے مطلق رفع یدین میں تواتر کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے جیسا کہ ان سے علامہ محمد معین سندھی نے دراسات اللبیب میں نقل کیا ہے:

ان احادیث الرفع فی کل خفض و رفع متواترۃ توجب یقین العلم۔(۲)

لیکن جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں کہ دوسرے علماء کو ان کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ صرف تکبیر افتتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے تنقیح الانظار میں علامہ محمد بن اسماعیل یمانی نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی کی تصریحات اس موضوع پر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ چونکہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین متواتر ہے اس لیے اس میں علماء کی کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ رفع یدین کے موضوع پر اگر اختلاف ہے تو تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر ہے۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ہے۔ یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع پر رفع یدین کا تذکرہ ہے تکبیر تحریمہ، عندالرکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت۔ اور بطریق نافع میں قعدۂ اولی سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایت میں ایک پانچواں رفع یدین سجدہ میں جاتے وقت بھی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ۔ ج ا ص ۷۸ (۲) دراسات اللبیب: ص ۱۹۰

وعند الکبیر حین یھوی ساجدا۔

اور صاحب دراسات اللبیب نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے بین السجدتین رفع یدین کو حضرت انسؓ، الحسن اور ابن سیرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور علامہ ابن دقیق العید نے شرح العمدہ میں بیان السجدتین رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے اور علامہ عراقی نے بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اسے سراہا ہے وہ فرماتے ہیں:

ھی مثبتۃ وھی مقدمۃ علی النفی۔(۱)

امام اعظمؒ نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا اور ان تمام مواقع میں سے صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمالیا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توراث کی تائید حاصل ہے یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ امت کا عمل متوارث ہے۔ کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰؓ اور اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر مروزی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ:

لانعلم مصراً من الامصار ترکوا رفع الیدین باجماعھم عندالخفض والرفع الااھل الکوفۃ۔(۲)

کوفہ کے سوا تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جانے اور اٹھتے وقت رفع یدین چھوڑا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن رشد نے بدایہ میں اسی کو امام مالک کے روایت ترک کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

ان السبب لروایۃ الترک عن مالک ھو عمل المدینۃ اذ ذالک فھذا العدد العظیم لعلہ مبنی علی الترک۔(۳)

امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب اہل مدینہ کا عمل ہے۔

مکہ میں رفع یدین عبداللہ بن الزبیر کے زمانے میں شروع ہوا اس سے قبل اہل مکہ کا

---

(۱) دراسات اللبیب: ص ۱۹۰ (۲) فیض الباری: ج ۲ ص ۲۶۰ (۳) بدایۃ المجتہد لابن رشد

عمل ترک رفع یدین ہے جیسا کہ میمون کی کے سوال ابن عباس اور اس انداز بیان سے کہ لسم ار احداً یصلیها ظاہر ہے۔

جب کوفہ مدینہ اور مکہ کے فقہاء اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل اور توارث نہیں تو اور کیا ہے؟ بس اسی پیمانے پر احادیث رفع یدین کو امام اعظم نے ناپ کر صرف تکبیر تحریمہ والے رفع یدین کو اختیار فرما لیا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔ واضح رہے کہ رفع یدین میں اختلاف جواز اور عدم جواز میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ اور فتاویٰ میں اور حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے صرف اولویت اور عدم اولویت میں ہے۔

بہر حال امام اعظم اخبار آحاد کو توارث اور تعامل کی ترازو میں تولتے ہیں۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے اسے ائمہ فقہاء اور محدثین کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فضل علم السلف علی الخلف میں رقمطراز ہیں:

فاما الائمة و فقهاء اهل الحديث فانهم يتبعون الحديث الصحيح حيث كان اذا كان معمولا به عند الصحابة ومن بعدهم او عند طائفة منهم فاما اتفق على تركه فلا يجوز العمل به لانهم ما تركوه الا على علم انه لا يعمل به۔

ائمہ مجتہدین اور فقہاء محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو یا ان میں سے کسی گروہ کے نزدیک اگر حدیث ایسی ہو جس کے چھوڑنے پر وہ متفق ہو چکے تو اس پر عمل جائز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے بہر حال یہ جان کر ہی چھوڑا ہے کہ یہ نا قابل عمل ہے۔(۱)

امام ترمذی نے سنن میں اسی کو اپنایا ہے ترمذی کا مطالعہ کیجئے وہ قدم قدم پر ہر موضوع پر حدیث لکھتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں امت کا عمل یہ کہہ کر پیش فرماتے ہیں: والعمل على هذا عندى اهل العلم۔ اس سے ان کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس حدیث کو صحابہ و تابعین کی عملی تائید حاصل ہے اس لیے یہ صحیح ہے اور یہ ترمذی کی خصوصیت نہیں

(۱) المتعلیقات علی الدراسات: ص ۲۷۳

بلکہ تمام اہل علم کا مسلک یہی ہے۔ سکہ بند ظاہریہ کو چھوڑ کر سب یہی کہتے ہیں۔ علامہ محمد معین سندھی نے نہ معلوم کس دلیل کی قوت سے یہ دعویٰ کیا ہے۔

لیس احد من المحدثین یلتفت فی صحة الحدیث وحسنه الیٰ اشتراط اخذ اهل العلم له۔

محدثین میں سے کوئی بھی حدیث کی صحت یا حسن میں یہ شرط نہیں لگاتا کہ اسے اہل علم کی عملی تائید حاصل ہو۔(۱)

اس کے بعد خود ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ امام ترمذی کا سنن میں طرز عمل یہی ہے۔ اولاً امام ترمذی کے عمل کے لیے تاویل کا جامہ تلاش کرنا شروع کیا۔ جب تاویل چست نہ بیٹھی اور بات بنانے کے باوجود نہ بنی تو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ:

وان کان الترمذی یری ذالک فهو مما اختص به علی خلاف جماهیر العلماء۔(۲)

پتہ نہیں وہ جماہیر علماء کون سے ہیں جو اس موضوع پر امام ترمذی کے مخالف ہیں۔
امام مالک کی ترتیع خطیب بغدادی اور ابن عبدالبر کی زبانی' ابوداؤد صاحب سنن کی سنن میں' محدث عثمانی الدارمی کا بیان امام بیہقی کی معرفت' حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں بیان' حافظ ابن رجب کا وضاحتی نوٹ اور حافظ ابوبکر الجصاص رازی کا اعلان آپ پہلے اس موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں:

اتفاق سلف وتوارث ایشاں اصل عظیم است در فقہ

دراصل یہ بات جس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہی گئی ہے وہ کچھ اور ہے۔ اگر وہ واضح ہو کر سامنے آ جائے تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

اعمال واقوال صحابہ کا اسلام میں مقام:

اصل بات یہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے یہاں اعمال واقوال اور فتاویٰ صحابہ سب حجت ہیں۔ ان کو وہ قبول کرتے ہیں۔ ان میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں اگر کچھ

(۱،۲) دراسات اللبیب ص ۲۰۶

اختلاف ہے تو وہ انداز قبول میں ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں:

> اگر مجھے کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کر کے کسی اور کا قول لوں۔ (۱)

امام مالک تو صحابہ کے اعمال و اقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتوئ صحابی اور حدیث کے مابین موازنہ کرتے تھے۔ چونکہ ان اکابر کے یہاں صحابہ کے اعمال و اقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی صحت اور مختلف حدیثوں میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے۔ صرف شیعہ کو اس سے اختلاف ہے وہ صحابہ کے اعمال و اقوال کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتے ہیں۔ حافظ ابن القیم نے جمہور کے مذہب کو ۴۶ دلائل سے ثابت کیا ہے اور بلاشبہ وہ دلائل قوی اور مؤثر ہیں لیکن یہاں ان کی تفصیل موجب طوالت ہوگی۔ (۲) ہاں آخری دور میں علامہ شوکانی نے اپنی کتاب ارشاد الفحول میں محدثین و فقہاء کے اس مسلک پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقوال صحابہ حجت نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں:

> حق یہ ہے کہ قول صحابی حجت نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالی نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو امت کے لیے مبعوث نہیں فرمایا ہے اور ہمارا رسول ایک ہے کتاب ایک ہے اور جمیع امت اتباع کتاب و سنت پر مامور ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے دین میں بغیر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے یہ قول حجت ہے تو وہ دین میں ایسی بات کہتا ہے جو ثابت نہیں اور شریعت اسلامیہ میں ایسی شرع ایجاد کرتا ہے جس کی پیروی کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور ایسا کہنا بہت بڑی بات ہے۔ لہٰذا اللہ کے سوا کسی ایک یا چند بندوں کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ اس کا یہ ان کا قول مسلمانوں پر حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے غلط ہے۔ (۳)

---

(۱) الانتقاء: ص ۱۴۲ (۲) اس سلسلے میں حافظ ابن القیم کی اعلام الموقعین کی جلد چہارم از ص ۱۴۰ تا ص ۱۵۲ کا مطالعہ مفید ہے اس میں بے حد مفید علمی جواہر پارے ہیں۔

(۳) ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول: ص ۲۱۴

ظاہر ہے کہ اس ذہنی تخلیق کے بعد اخبار آحاد کو اعمال صحابہ میں تولنے اور جانچنے کی گنجائش کب گوارا ہوسکتی ہے۔ سندھ کے مشہور عالم محمد معین نے اسی بنا پر لکھ دیا ہے کہ

ویترک عمل الصحابۃ الثابت عنھم بالحدیث الضعیف۔

صحابہ سے ثابت شدہ اعمال کو حدیث ضعیف کی وجہ سے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔(۱)

اور تقلید کی تردید کے جوش میں یہاں تک فرما گئے کہ:

التمسک بالآثار الصحابۃ عند وجدان المرفوع الصحیح علی خلافہ تمسک ضعیف۔

جب حدیث مرفوع موجود ہو تو آثار صحابہ کو اختیار کرنا ایک غلط استدلال ہے۔(۲)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ اسلام کا سارا علمی سرمایہ روایت واسناد کی نپی تلی ترازو کے ذریعے صرف حدیث مرفوع کی صورت میں امت کو ملا ہے۔ حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم سنت کہتے ہیں وہ صحابہ کو محسوس اور مرئی زندگی کے ذریعے آئی ہے انہوں نے ہر سنی حدیث کو نہ روایت کیا ہے اور نہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقعہ پر حافظ ابن القیم مفید بات فرما گئے ہیں:

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنی ہوئی حدیث کو روایت نہیں کیا سوچئے حضرت ابوبکر الصدیقؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے کبار صحابہ نے جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۳ سالہ حیات نبوت میں سنا ہوگا اس کو کچھ بھی اس سے نسبت ہے جو حدیثوں کی مقدار ان سے مروی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے صرف سو حدیثیں مروی ہیں۔ دراں حالیکہ حضرت ابوبکرؓ وفات تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے حضرت ابوبکرؓ کو شرف حضوری اور آپ کے قول وفعل کا علم رہا۔ آپ کی سیرت وکردار کا ہر پہلو ان کی نظر کے سامنے تھا۔ امت میں سب سے زیادہ حضور انورؐ سے ابوبکرؓ ہی واقف تھے۔ یہی حال دوسرے کبار صحابہ

---

(۱) دراسات اللبیب: ص ۸۶　(۲) دراسات اللبیب: ص ۲۹۳

کا ہے یعنی جو کچھ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا جو آپ کے حالات مشاہدہ کیے تھے ان کے مقابلے میں ان کی مرویات کی تعداد بہت کم ہے اور اگر یہ اپنے مشاہدات اور مسموعات کو روایت کرتے تو ان کی روایات کی تعداد حضرت ابو ہریرہؓ سے کہیں زیادہ ہوتی۔(۱)

ان بزرگوں سے روایات کم آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سنت چونکہ صحابہ کی عملی زندگی میں موجود تھی۔ اس لیے اس کا کوئی داعیہ نہ تھا۔ اور یہ عمل زندگی ان سے منتقل ہو کر تابعین میں آئی ہے اور تابعین میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔

ذرا اس پہلو پر غور فرمایئے کہ ایک طرف امت کا عمل ہے اور دوسری طرف راوی کی شہادت ہے۔ امت کو یقیناً عصمت حاصل ہے لیکن راوی کی روایت کو عصمت نہیں بلکہ صرف اصطلاحی صحت کا مقام دیا گیا ہے۔ یہ مان لینا ہے کہ راوی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا یا حافظہ غلط ہو گیا لیکن یہ کہ خیر القرون میں پوری امت پیغمبر کے خلاف جمع ہو گئی ہو ناممکن ہے۔ یہ تواتر عمل ہے اور اس کے خلاف جب بھی ایک شخص کی روایت چیلنج بن کر آئے گی اس کی صحت مقدوح ہو جائے گی۔ یہ ارشاد نبوت کو رد کرنا نہیں بلکہ ارشاد ہی کے ثبوت کا ایک مستحکم اور محتاط معیار ہے۔

اخبار آحاد میں مفاہمت اور امام اعظمؒ:

اللہ سبحانہٗ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لایعلمون۔

پھر ہم نے تم کو الامر کی صاف راہ پر لگایا ہے اسی کی پیروی کیجئے اور بے علم لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

شریعۃ من الامر کے معنے ہیں امر کی راہ۔ امر یا امور کا واحد ہے اور یا اوامر کا۔ اگر امور کا واحد ہے تو مقصود یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے حقائق کو پورا کرنے کی راہ اللہ نے بتا دی ہے۔ اور اگر اوامر کا واحد ہے تو مطلب یہ ہے کہ آئینی اور قانونی اقدار کی راہ پر ہم نے تم کو لگا دیا ہے۔ شریعت کے معنے راہ کے آتے ہیں دونوں صورتوں میں آیت کا مدلول یہ ہے کہ اسلام

(۱) اعلام الموقعین: ج ۴ ص ۲۲۸

کی شریعت صاف اور واضح ہے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں۔ الشریعة لاتعارض فیھا البتة۔ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی زندگی کی پوری تاریخ ہم تک شہور وسنین کی تعیین اور ایام کی ترتیب سے نہیں پہنچی اور جو کچھ صحابہ کے ذریعے پہنچی اس میں بھی بعض کو راویوں نے راویت بالمعنے کی ہے اس لیے ہماری نگاہ میں تعارض محسوس ہوتا ہے۔ اور تعارض کا حاصل یہ ہے کہ:

ان یاتی حدیثان متضاد ان فی المعنی ظاھراً

اس تضاد کو دور کرنے کا موضوع اہم ترین موضوع ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کام صرف محدثین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فقیہ ہو۔ چنانچہ حافظ ابوبکر حازمی فرماتے ہیں:

ذالک من وظیفة الفقھاء لان قصدھم اثبات الاحکام ومجال نظر ھم فی ذالک متسع۔

یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ حدیث میں ان کا مطمحِ نظر احکام ثابت کرنا ہوتا ہے اور اس موضوع پر ان کی فکری جولانیاں وسیع ہیں۔ (۱)

اور امام نووی فرماتے ہیں:

انما یکمل لہ الائمة الجامعون بین الفقہ والحدیث والاصولیون الغواصون علی المعانی۔

یہ کام زیبا ہے ان ائمہ کے لیے جن میں حدیث وفقہ کی شان جامعیت پائی جاتی ہے اور وہ اصولیین جو معانی کی گہرائیوں میں اترے ہیں۔ (۲)

حافظ سخاوی کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم رقمطراز ہیں:

ھذا فن تکلم فیہ الائمة الجامعون بین الفقہ والحدیث وقواعدہ مقررة فی اصول الفقہ۔

اس موضوع پر ان اماموں نے لب کشائی فرمائی ہے جو حدیث وفقہ کے جامع ہیں اور اس کے قواعد اصول فقہ میں مقرر ہیں۔ (۳)

---

(۱) شروط الائمة الخمسہ ص ۲۷ (۲) التقریب ص ۳۶۲ (۳) تنقیح الانظار ج ۲ ص ۴۲۱

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اہم ہونے کے ساتھ بیحد نزاکت بھی رکھتا ہے اس کی نزاکت یہ ہے کہ یہ ایک کام نہیں بلکہ اس پر بیک وقت متعدد کاموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور مختلف احادیث میں مفاہمت کرانی پڑتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شریعت کے سارے احکام باہم ٹکرا جائیں اور شرعی و قانونی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت نہ رہے۔ حافظ ابن حزم نے اس سلسلے میں جس فراخدلی کا یہ فرما کر مظاہرہ کیا ہے کہ:

اذا تعارض الحدیثان ...... ففرض علی مسلم استعمال کل ذالک۔

اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو ہر مسلم کا فرض ہے کہ سب پر ہی عمل کرے۔(۱)

یقیناً ایک منفرد زندگی کے لیے آزادی کی حد تک یہ ایک خوبی کی بات ہے لیکن شریعت جب اجتماعی زندگی میں نظم کی مضبوطی، عمل کی پختگی اور توازن اور فکر کی استقامت قائم کرنا چاہے تو ان کی خوبیوں سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اس فراخدلانہ آزادی کے ساتھ یہاں حد بندی کا کوئی خط خود زندگی کا ایک اہم تقاضا ہے جو ان تمام کی پوری پوری ضمانت دے سکے۔ آئین و قانون کے تمام احکام ان ہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں یہ خطوط جونہی ملنے لگتے ہیں نظام قانون کی پوری عمارت مل جاتی ہے۔ بلاشبہ ہر حدیث پر عمل کرنے کی آزادی کا پروانہ ایک بہت بڑی فراخدلی ہے لیکن حیات اجتماعی میں یہی آزادی ہوائے نفس سے ہمدوش ہو کر بے راہ روی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ماننا پڑے گا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا ایک منفرد زندگی کے دائرہ کار کی حد تک حافظ ابن حزم نے سوچا ہے بلکہ یہاں زندگی کے حقائق کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں۔ کسی ایک گوشہ ہی کو سامنے رکھ کر نہ سوچنا چاہیے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی ضروری ہے۔ یقیناً اگر ہمیں اخبار آحاد میں آئین و قانون کی اقدار کو بچانے کے لیے کبھی مفاہمت کرنی پڑتی ہے تو کبھی دو حدیثوں پر راجح و مرجوح قرار دینا پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر ہماری نظر تاریخ احکام پر ہے اور ہمیں کسی طریق سے دونوں میں سے ایک کا پہلے ہونا اور دوسرے کا بعد میں ہونا معلوم ہو گیا ہے تو ایک کو کالعدم قرار دینا پڑتا ہے اور اس کے لیے ہمیں نبوت کی جانب سے نسخ کی صراحت کا انتظار ضروری نہیں ہے۔

---

(۱) احکام الاحکام: ص ۱۵۱

افسوس ہے کہ علامہ معین سندھی نے دراسات میں اتنی موٹی سی بات کو یہ کہہ کر پیچیدہ بنادیا کہ:

لیس نسخ الحدیث بالحدیث فان ذالک لا یتحقق الابصریح النسخ المرفوع الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

یہ حدیث کا حدیث سے نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کے ثابت ہونے کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتہً نسخ ثابت ہونا چاہیے۔(۱)

گویا موصوف نے یہ فرض کرلیا ہے کہ حدیث کے نام پر جو تاریخ سنت محدثین کی روایات سے مدون ہوئی وہ پوری کی پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب و مدون ہوئی ہے حالانکہ صورت معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضور انور کی پوری ۲۳ سالہ زندگی میں سنت کی یہ تاریخ کیفما اتفق امت کو ملی ہے اور وہ بھی صحابہ سے راویوں نے سن کر اپنے الفاظ میں محدثین تک پہنچائی ہے اور ہر محدث حافظ تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے مغز سخن کو سمجھ کر ہی کہہ رہا ہے۔ مشہور محدث محمد بن المثنی کو یہ حدیث یاد تھی۔

ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی الی عنزة

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنزہ (نیزہ) کو سترہ بنا کر نماز پڑھی۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ محمد بن المثنی جو ائمہ ستہ حدیث کے شیوخ میں سے ہیں یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ کے استاد ہیں۔ اور جن کا تعلق قبیلہ عنزہ سے ہے اور وہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عنزہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے اور اس غلط مطلب کے سہارے وہ اپنے عنزی ہونے پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے:

نحن قوم لناشرف نحن من عنزة صلی الینا رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

ہماری قوم کو شرف حاصل ہے نہ تم قبیلہ عنزہ سے ہیں ہماری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے۔(۲)

---

(۱) دراسات اللبیب: ص ۱۱۶　(۲) تقریب: ص ۲۹۶

امام احاکم نے اسی حدیث میں ایک اور راوی کی کہانی بتائی ہے کہ وہ اس میں عنزہ کو شاۃ (بکری) کے معنے میں سمجھتا تھا اور روایت بالمعنے اس طرح کرتا تھا کہ:

صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی شاۃ۔(۱)

ان حالات میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ جب تک نسخ کی صراحت نہ ہو نسخ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے تقاضوں اور قانونی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض جذباتی نعرہ لگانا اور کہنا کہ تعارض کے وقت میں دو حدیثوں میں سے ایک کو منسوخ کہنا شریعت کے مقابلے میں بے باکانہ جرأت ہے نعرے کی حد تک تو درست ہے لیکن حقائق اور واقعات کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ خود محدثین نے اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے البتہ اس میں علماء کے افکار مختلف ہیں کہ ان تینوں مفاہمت، ترجیح اور نسخ میں سے آحاد میں تعارض کے وقت کس کا پلڑا بھاری ہے لیکن اس قدر مشترک پر سب ہی متفق ہیں۔ کہ روایتی و اسنادی حیثیت سے اگر دونوں حدیثیں ایک جیسی ہوں اور تاریخ ادوام کے ذریعے ان کی تقدیم و تاخیر کا پتہ ہو یا خیر القرون میں امت نے کسی ایک کو عملاً اپنا لیا تو پھر ایک کو کالعدم اور دوسری کو معمول بہ قرار دیا جائے گا۔ اور ایسا ممکن نہ ہو تو مفاہمت اور ترجیح سے کام لیا جائے گا۔ مفاہمت یہ ہے کہ دو حدیثوں میں ہم آہنگی اس طرح پیدا کی جائے کہ دونوں زندگی کے حقائق کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ مفاہمت قانون کی ایک بنیادی ضرورت ہے بلکہ اخبار آحاد میں تشریعی زندگی سرتاسر مفاہمت ہی کا نام ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک سے زیادہ مقامات پر تصریح کی ہے کہ اہمال حدیث سے جمع بین الحدیثین زیادہ بہتر ہے۔ امام حازمی نے مفاہمت ہی کو عموم فائدہ کا حامل قرار دیا ہے۔

حافظ ابو جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں ایک مقام پر اسی سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے:

اولی الاشیاء اذا روی حدیثان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحتملا الاتفاق واحتملا التضاد ان تحملهما علی الاتفاق۔

اچھا یہی ہے کہ دو حدیثوں میں باہم مفاہمت کرائی جائے۔(۲)

حضرت مولانا عبدالحی نے علامہ ابن امیر الحاج کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

---

(۱) تدریب الراوی ص ۳۸۶ (۲) شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۵۸

الجمع معین عند الامکان اذا دار الامر بینہ وبین اھدار العمل باحد ھما بالکلیۃ۔

جب صورت حال یہ ہو جائے کہ مفاہمت ہو ورنہ دونوں میں سے ایک ہاتھ سے جائے گی تو مفاہمت ضروری ہے۔(۱)

مفاہمت کے موضوع پر امام اعظمؒ کی ذہانت اور فطانت کو سب نے سراہا ہے احکام تو احکام غیر احکام سے متعلق احادیث میں مفاہمت کے لیے بھی امام اعظمؒ کی ذات گرامی محدثین کے یہاں استدلالی ہے۔

دنیا میں اسلام کے رونما ہونے کے بعد اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کا سب سے پہلے شرف کسے حاصل ہوا ہے؟ یہ سیرت و تاریخ کا اہم مبحث ہے اور اختلاف روایات کی وجہ سے فقہاء مدینہ میں بھی اس میں اختلاف رہا ہے اور دور کبار تابعین میں فقہاء کوفہ بھی اس میں مختلف ہیں۔ کئی حدیثوں میں اولین مسلم حضرت علیؓ کو بتایا گیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کی حدیثوں میں یہ شرف حضرت ابوبکرؓ کو دیا گیا ہے کچھ روایات میں حضرت خدیجہ الکبریٰ کا نام آیا ہے اور بعض حدیثوں میں حضرت زید بن حارثہ کو سب سے پہلا مسلمان ظاہر کیا گیا ہے۔ محدثین نے ان روایات میں روایتی نقطہ نظر سے تحلیل کا کام کیا اور خالص محدثانہ نظر سے ان پر بحث فرمائی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس ساری داستاب کو لکھنے کے بعد جو فیصلہ کن بات فرمائی ہے وہ یہ نہیں کہ ان روایات میں راجح کون ہے؟ بلکہ اس موقعہ پر انہوں نے حضرت امام اعظمؒ کا وہ فیصلہ لکھ دیا ہے جس میں امام صاحب نے ان حدیثوں میں مفاہمت کا فارمولا پیش کیا ہے۔

قد اجاب ابو حنیفۃ بالجمع بین ھذہ الاقوال ان اول من اسلم من الرجال الاحرار ابوبکر و من النساء خدیجۃ ومن الموالی زید بن حارثہ ومن الغلمان علی بن ابی طالب۔

ابوحنیفہ نے ان سب میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کر دی ہے کہ آزاد مردوں میں سے اسلام لانے کی اولیت کا شرف ابوبکر کو عورتوں میں سے خدیجہ الکبریٰ کو غلاموں میں سے زید کو اور لڑکوں میں سے علی مرتضیٰؓ کو حاصل ہوا ہے۔(۲)

---

(۱) الاجوبۃ الفاضلۃ: ص ۱۹۷ (۲) البدایہ والنہایہ: ج ۳ ص ۲۹

احکام اور فقہ پر مشتمل حدیثوں میں مفاہمت کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں یہاں ہم تطویل سے بچتے ہوئے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ مفاہمت کے موضوع پر امام اعظمؒ کی خداداد ذہانت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

رفیع یدین کی صورت:

نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت جو رفع یدین کیا جاتا ہے اس کی کیفیت میں روایات مختلف آئی ہیں حافظ ابن حجر نے تلخیص میں ساری روایات سمیٹ دی ہیں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں بھی سب روایات کو یک جا کیا ہے۔ ان میں ابن عمرؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

کان رسول اللہ علیہ وسلم یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا افتتح الصلاۃ۔

حضور انورؐ نماز کے آغاز میں مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

ابوداؤد نسائی میں وائل کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

یرفع ابھامیہ إلی شحمۃ اذنیہ۔

ہاتھ اٹھاتے وقت دونوں ہاتھ کانوں کے سامنے ہوتے تھے۔

حذو منکبین یعنی مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کو علامہ ابن دقیق العید نے امام شافعی کا مذہب قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں: **ھو اختیار الشافعی فی منتھی الرفع** ۔ اور مذکورہ بالا حدیثوں میں سے محدثانہ نقطہ نظر سے بلحاظ قوت سند حدیث ابن عمرؓ کو راجح قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ورجح مذھب الشافعی بقوۃ السند الحدیث ابن عمرؓ ۔(۱)

امام شافعی کے مذہب کو قوۃ سند کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے۔

علامہ شوکانی نے بھی قوت سند ہی کو پیش نظر رکھ کر ان حدیثوں کے ساتھ ترجیح کا معاملہ فرمایا ہے لیکن امام اعظمؒ نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی جو صورت بتائی ہے کہ:

یرفع یدیہ حتی یحاذی بابھامیہ شحمتی اذنیہ۔

رفع یدین اس طرح کرے کہ ہاتھ کے دونوں انگوٹھے کانوں کی پاپڑیوں کے آمنے سامنے ہو جائیں۔(۲)

---

(۱) احکام الاحکام: ج ۱ ص ۲۵۲ (۲) ہدایہ: ج ۱ ص ۸۲

تو اس سے انہوں نے ان حدیثوں کے بارے میں اپنا موقف واضح فرما دیا کہ وہ اس موضوع پر آئی ہوئی حدیثوں میں ترجیح کو نہیں بلکہ مفاہمت کو اپناتے ہیں اور مفاہمت اس طرح ہے کہ جب انگوٹھے کان کی پاپڑی سے متصل ہوں گے تو ہاتھ کا بالائی حصہ اگر کانوں کے سامنے ہوگا تو ہاتھ کا زیرین حصہ مونڈھوں کے محاذ میں ہوگا اور اس طرح ابن عمرؓ وائل اور مالک بن الحویرث کی تمام مختلف روایات میں مفاہمت ہوگئی۔ اور یہ میری ذاتی رائے نہیں ہدایہ کے مشہور شارح حافظ ابن الہمام نے بھی رفع یدین کی اس صورت سے یہی نتیجہ نکالا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ولا معارضة فان محاذاة الشحمتين بالابهامين تسوغ حكاية محاذاة اليدين بالمنكبين والا ذنين۔

ان حدیثوں میں کوئی معارضہ نہیں ہے کیونکہ جب انگوٹھے پاپڑیوں کے سامنے ہوں گے تو ہاتھ کانوں اور مونڈھوں کے سامنے آجائیں گے۔(۱)

روایات میں ہر راوی کا بیان اپنی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کی مدت قلیل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی اضطراری نگاہ ہاتھ کے جس حصہ پر پڑی اسی کا روایت میں اظہار کر دیا۔

ہبہ کی واپسی پر احادیث میں مفاہمت:

حدیث میں آتا ہے:

عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم العائد فى هبته كالكلب يعود الىٰ قيئه۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ کتا قے کر کے چاٹے۔(۲)

یہ حدیث امام بخاری اپنی صحیح میں دو طریق سے لائے ہیں ایک بحوالہ سعید بن المسیب

---

(۱) فتح القدیر: ج ا ص ۱۹۸ (۲) فتح القدیر: ج ا ص ۱۹۸

اور دوسری بحوالہ عکرمہ۔ دونوں حدیثوں کی وجہ سے امام بخاری نے پوری قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ:

لا یحل لاحدان یرجع فی ھبتہ وصدقتہ

ہبہ اور صدقہ کو دیکر واپس لینا کسی کے لیے روا نہیں ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری حدیث بھی آتی ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لایرجع فی ھبتہ الاالوالد من ولدہ۔

ہبہ کر کے واپسی کا حق کسی کو نہیں ہے سوائے والد کے کہ وہ اپنے لڑکے سے دے کر واپس لے سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حدیث ابن عباسؓ کی صرف ظاہری سطح کو دیکھا کہ ہبہ دے کر واپس لینے کو کتے کے قے چاٹنے سے تشبیہ دی ہے انہوں نے ہبہ کی واپسی کے لیے حرمت کا فیصلہ کر دیا اس لیے کہ قے ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام ہے لیکن امام اعظمؒ نے یہاں صرف یہ نہیں دیکھا کے قے سے تشبیہ دی ہے بلکہ تشبیہ پر بڑے گہرے غور کے بعد بتایا کہ قے واقعی ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام بھی ہوتی ہے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تشبیہ دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹنے۔ بلکہ تشبیہ یہ ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹنے۔ ظاہر ہے کہ قے حرام ہے لیکن کتے کے لیے حرام نہیں ہے کیونکہ حلت و حرمت کا تعلق تکلیف سے ہے اور کتا مکلف نہیں ہے اس لیے حدیث کی روح یہ ہے کہ ہبہ کی واپسی مکروہ اور خلاف اولی ہوگی۔ اگر تشبیہ آدمی سے دی جاتی تو پھر ہبہ کی واپسی حرام ہوتی کیونکہ آدمی کے لیے حرام ہے اور یہ کراہت بھی اس وقت ہے جب کہ موہوب لہ ہبہ کنندہ کا قریبی رشتہ دار نہ ہو اور موہوب لہ کی جانب سے ہبہ کنندہ کو اس کا کوئی بدل نہ ملا ہو اور یہ دونوں شرطیں امام اعظمؒ نے دو حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر مقرر فرمائی ہیں۔ رشتہ داری کی شرط نسائی میں آئے ہوئے استثناء الاالوالد من ولدہ سے اخذ کی ہے اور بدل کی شرط دار قطنی اور ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے لی ہے:

الرجل احق بھبتہ مالم یثب منھا۔ (ہبہ کا حقدار ہے جب تک اس کا بدل نہ پائے)

دیکھیے لیجئے کس شاندار طریق سے تمام ارشادات کے درمیان مفاہمت ہوگئی۔

ارشاد نبوت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت:

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا شرب الکلب فی اناء احدکم فلیغسلہ سبعاً۔

تمہارے برتن میں جب کتا منہ ڈال دے تو چاہیے کہ اسے سات بار دھو ڈالے۔

سنن دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری حدیث ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغسل الاناء من ولوغ الکلب ثلاثاً او خمساً او سبعاً۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتے کے برتن میں منہ ڈالنے سے برتن کو تین یا پانچ یا سات بار دھویا جائے۔(۱)

حافظ زیلعی نے ابن عدی کے حوالہ سے ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ بھی لکھی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا ولغ الکلب فی اناء احدکم فلیھرقہ ولیغسلہ ثلاث مرات۔(۲)

برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے گرا کر تین بار دھوؤ۔

نیز دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ فتویٰ بھی روایت کیا ہے:

اذا ولغ الکلب فی الاناء فاھرقہ ثم اغسلہ ثلاث مرات۔(۳)

جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے اٹھاؤ اور اسے تین بار دھوؤ۔

اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ:

انہ کان اذا ولغ الکلب فی الاناء اھرقہ و غسلہ مرات۔(۴)

برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے گرا کر تین بار دھوتے تھے۔

---

(۱) نصب الرایہ: ج ا ص ۱۳۱ (۲،۳،۴) نصب الرایہ: ج ا ص ۱۳۱

حدثنا نعیم بن حماد قال سمعت وکیعاً یقول سمعت شعبۃ یقول لو روی عبدالملک بن ابی سلیمان حدیثاً اخر مثل حدیث الشفعۃ طرحت حدیثہ۔

شعبہ کہتے ہیں کہ اگر عبدالملک حدیث شفعہ کے علاوہ کوئی اور حدیث روایت کرے گا تو میں اس کی حدیث کو پھینک دوں گا۔

کیوں؟ اس کی وجہ کوئی نہیں بتائی گئی۔ شعبہ کا یہ بیان ہمیں نعیم کی وساطت سے ملا ہے۔ نعیم کی خود شخصیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابوداؤد کہتے ہیں کہ نعیم کی بیس حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام نسائی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ازدی لکھتے ہیں کہ:

کان نعیم یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ وحکایات زورۃ فلب نعمان کلھا کذب۔

نعیم سنت کی تقویت کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے اور امام ابوحنیفہ کے مثالب میں جھوٹی حکایتیں بناتے تھے۔(۱)

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ نعیم نے یہاں بھی اپنے گمان کے مطابق سات کے عدد کی سنت کو قوی سے قوی تر بنانے کے لیے مدافعانہ کارروائی کی ہے اور کوشش کی ہے کہ تین کی روایات کو مجروح کر دیا جائے اور اس کے لیے بیچارے عبدالملک کو نشانہ بنالیا ورنہ عبدالملک کو جملہ محدثین کی حمایت حاصل ہے اور سب کے نزدیک ثقہ ہیں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ:

کان من احفظ اھل الکوفۃ۔(۲) (یہ کوفہ کے حفاظ حدیث میں سے ہیں)

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ حافظ حدیث لوگوں میں یحیٰی بن سعید' عبدالملک بن ابی سلیمان اور اسماعیل بن خالد ہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ امام شعبہ عبدالملک کے حافظہ پر بے حد حیران ہوتے تھے۔ امام یحیٰی بن معین سے عبدالملک کی حدیث شفعہ کے بارے میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ لوگوں نے اس حدیث پر گرفت کی ہے لیکن عبدالملک ثقہ ہیں' صدوق ہیں۔ ان جیسوں پر گرفت نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) میزان الاعتدال: ج ۳ ص ۳۳۹ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۰ ص ۳۹۳

بہرحال محدثین نے اپنے نقطۂ نظر سے ان حدیثوں میں رد و قبول کا رویہ اختیار کیا ہے اور حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو تو یہاں تک جوش آ گیا کہ:

حدیث جب کسی موضوع پر صحیح ہو جائے اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسری حدیث صحیح نہ ہو ہمارا فرض یہی ہے کہ حدیث کو اپنائیں اور اس کے مخالف ہر چیز کو چھوڑ دیں اور ہم حدیث کو کسی کی بھی مخالفت کی وجہ سے نہ چھوڑیں گے خواہ وہ کوئی ہو راوی یا غیر راوی۔(۱)

اور علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

کسی حال میں بھی کسی کا قول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حجت نہیں ہے۔

اتباع سنت کی حد تک تو یہ بات بالکل درست ہے اور واقعی ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہی ہے لیکن یہاں یہ بحث بے محل ہے کیونکہ یہاں حضورؐ کے ارشاد کا مقابلہ حضورؐ کے ارشاد سے ہے ایک وہ ارشاد ہے جو بخاری میں بحوالہ ابو ہریرہؓ ہے اور دوسرا ابو ہریرہؓ ہی کے حوالہ سے سنن دارقطنی میں ہے اور اس کی تائید میں حضرت ابو ہریرہؓ کا عمل اور ان کا فتویٰ بھی ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان درست ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ برتن میں کتا منہ ڈال دے تو تین مرتبہ دھویا جائے اور درست نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ روایت صحیح ہے اور اس پر ابو ہریرہؓ کا عمل بھی ہے اور عمل کے ساتھ اسی پر ابو ہریرہؓ فتویٰ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان بھی درست ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ برتن کو سات بار دھویا جائے تو یہ سوال یہاں بیحد اہم ہے کہ اس سات بار والے بیان کے ہوتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ نے تین پر کیونکر عمل کیا اور اس پر فتویٰ کیوں دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے تو ارشاد نبوت کا درجہ قطعیت میں آیت قرآنی کا ہے کیونکہ وہ خود حضورؐ سے سنتے ہیں۔ یہاں حافظ ابو جعفر طحاوی کی یہ بات جی کو لگتی ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہؓ نے اس ارشاد کو عمداً ترک کیا ہے تو اس سے ان کی عدالت پر حرف آتا ہے اور ان کی روایات کا سرمایہ ہی ناقابل قبول ہو جاتا ہے اس لیے ہم ایسا سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

---

(۱) اعلام الموقعین

امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ان سب حدیثوں کو اور حضرت ابو ہریرہؓ کے فتویٰ اور عمل کو پیش نظر رکھ کر ان میں ایسی مفاہمت کر دی ہے کہ جس سے ان حدیثوں میں سے کوئی حدیث بھی اپنی جگہ سے نہیں ملی ہے فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات کا عدد استحباب کے لیے ہے۔ چنانچہ امام طحاوی فرماتے ہیں:

یحمل مازاد علی الثلاث فی المرفوع والموقوف علی ابی ھریرۃ کلیھما علی الاستحباب لورودنا لتثلیث فی المرفوع والموقوف عنہ۔(۱)

تین سے زیادہ عدد کو مستحب قرار دیا جائے گا۔

اور حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں:

طھارۃ الاناء الذی ولغ فیہ الکلب لا تتوقف علی السبع بل تثبت قبل السبع بالثلاث علی ماذکرہ الحاکم فی اشاراتہ وھو ایضاً مقتضی نقلھم عن ابی حنیفۃ وجوبھا واستحباب الاربعۃ بعدھا۔

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا اس کا پاک ہونا سات پر موقوف نہیں بلکہ وہ سات سے پہلے ہی تین سے پاک ہو چکا ہے جیسا کہ حاکم نے بتایا ہے اور یہی تقاضا ہے امام ابو حنیفہ کی اس روایت کا جس میں کہا ہے کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات بار مستحب ہے۔(۲)

اس طرح دونوں ارشاد نبوت میں اور راوی حدیث کے فتویٰ میں مفاہمت ہو گئی اور تمام حدیثوں پر اپنی اپنی جگہ عمل ہو گیا۔

جماعت کھڑی ہو جانے پر سنتیں پڑھنا:

اسی قسم کی ایک اور مثال سنیئے۔ صحیح مسلم میں حدیث آئی ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز قائم کر دی جائے تو فرض نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہے۔

---

(۱) معانی الآثار　(۲) التحریر: ج ۳ ص ۸۲

اگرچہ حفاظ حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اسے حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ ہی قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہ کا مصنف میں اور طحاوی کا شرح معانی الآثار میں بھی میلان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ شاید اسی اختلاف کی بنا پر امام بخاری نے اس کی اپنی صحیح میں روایت نہیں کی ہے۔

ظاہر جنیوں نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے کہ اگر جماعت کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص سنتیں وغیرہ پڑھ رہا ہو تو اس کی سنتیں کالعدم اور باطل ہوں گی۔ چنانچہ علامہ شوکانی نے ظاہریہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

واهل الظاهر انها لا تنعقد صلاة تطوع فی وقت اقامة الفريضة۔(۱)

ظاہریہ کی رائے میں فرض قائم ہونے پر کوئی نفل نماز نہیں ہوتی ہے۔

اور علامہ شوکانی کا اپنا میلان بھی یہی ہے وهذا القول هو الظاهر یہی قول ظاہر ہے۔ لیکن اس حدیث میں نماز کے باطل ہونے کے لیے دور کا بھی اشارہ نہیں ہے۔ نہ یہ اس کا منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ اسی بنا پر ائمہ اربعہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ توڑے نہیں بلکہ پوری کرے۔ امام اعظمؒ کا مذہب صحیح یہ ہے کہ اگر ایک رکعت ملنے کی توقع ہو تو سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے۔ رکعت کی قید اس حدیث سے لی گئی ہے۔

من ادرک الركعة من الصلاة فقد ادرک الصلاة۔ (رواه ابو داؤد)

جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔

امام اعظمؒ کا یہ مذہب امام محمدؒ نے جامع صغیر میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

رجل انتهى الى الامام فى الفجر ولم يصل ركعتى الفجر فخشى ان يفوته ركعة ويدرک الاخرى فانه يصلى ركعتى الفجر عند باب المسجد فان خشى فوتهما دخل مع الامام ولم يصل ركعتى الفجر۔

---

(۱) نیل الاوطار: ج ۳ ص ۲۷

اگر کوئی نماز میں آیا اور اس نے صبح کی سنتیں نہ پڑھی ہوں سے ایک رکعت جانے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت ملنے کی امید ہو تو اسے اجازت ہے کہ مسجد کے دروازے کے پاس صبح کی سنتیں پڑھے اگر دونوں رکعتوں کے نہ ملنے کا اندیشہ ہو تو جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتیں نہ پڑھے۔

صاحب ہدایہ نے باب ادراک الفریضہ میں اسی کو مختار قرار دیا ہے اور علامہ شوکانی نے امام صاحب کا یہی مذہب بتایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت میں نماز کھڑی ہونے پر نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اور اس کا منشا دوسری حدیثوں کو ملا کر صبح کی سنتوں اور فرض کو بلا فصل ادائیگی پر نکیر کرنا ہے کیونکہ دوسری حدیثوں میں جماعت کھڑی ہونے سے پہلے جماعت کھڑی ہونے پر اور جماعت سے فراغت کے بعد سب پر نکیر آئی ہے اور ہر جگہ منشاء یہی ہے کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں میں اتصال نہ کیا جائے بلکہ انفصال ہونا چاہیے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے سب کی روح یہ ہے کہ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں میں فصل کیا جائے بلکہ ایک موقعہ پر آپ نے یہ بات صراحۃً فرمائی ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بعبد اللہ بن مالک وھو منتصب یصلی ثمہ قبل صلوۃ الصبح فقال الا تجعلوھا بینھا فصلاً۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن مالک کے پاس سے گذرے وہ نماز صبح سے پہلے سنتیں پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اس نماز کو ظہر کی نماز سے پہلے اور بعد کی سنتوں جیسا نہ بناؤ ان میں کچھ فاصلہ کرو۔

اس میں وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ مقصود یہ ہے کہ صبح کے فرضوں اور سنتوں میں فاصلہ ہو۔ چاہے یہ فاصلہ زمانی ہو یا مکانی۔ حضورؐ ہی کے دوسرے اعمال سے مکانی فصل معلوم ہوتا ہے اس لیے امام اعظمؒ نے اس ارشاد کی روح سمجھ کر بتایا کہ سنتوں کی ادائیگی اگر مسجد میں نہیں بلکہ مسجد سے باہر ہو جائے تو منشاء نبوت پورا ہو جائے گا۔ تصریح کے بعد قیاس آرائی کا کوئی محل نہیں ہے جب فرما رہے ہیں کہ ان میں فاصلہ کرو تو منطوق کلام اسی کو قرار دیا جائے

ورنہ نماز سے قبل سنتوں پر ٹوکنے کے معنے کوئی نہیں ہیں۔ اور نماز کے بعد بھی سنتوں کی ادائیگی پر نکیر آئی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے نماز کھڑی ہو گئی میں نے جماعت سے صبح کی نماز ادا کی حضور انورؐ اٹھے تو مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔ فرمایا قیس چھوڑ! کیا دو نمازیں یک دم میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں پڑھی ہیں۔ فرمایا پھر بھی نہیں۔

نماز ہوتے ہوئے بھی سنتیں پڑھنے پر نکیر آئی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جماعت کھڑی ہو جانے پر نماز کی سنتیں پڑھتے دیکھا۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہو گئے تو حضور انورؐ نے اس سے فرمایا کیا صبح کی نماز چار رکعتیں ہیں؟ کیا نماز صبح چار رکعت ہے؟

ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے:

ایک شخص مسجد میں آیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ رہے تھے اس نے دو رکعت مسجد میں پڑھی پھر جماعت میں مل گیا۔ حضورؐ نے سلام پھیر کر فرمایا دونوں نمازوں میں کون سی نماز کو تو نے قرار دیا ہے؟ انفرادی کو یا جماعت والی کو؟

ان تمام ارشادات کو غور سے پڑھئے اور بار بار پڑھئے آپ کے سامنے یہ بات منقح ہو کر آ جائے گی کہ منشاء نبوت سنتوں اور فرضوں کو ایک ہی جگہ ملا کر پڑھنے سے روکنا ہے اور مقصد یہ ہے کہ دونوں میں فصل کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:

اس حدیث نے بتایا ہے کہ حضور انورؐ نے ابن بحینہ کے لیے جس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے وہ سنتوں کو ایک ہی جگہ پر فرضوں سے بغیر کسی فصل کے ملانا ہے۔ (۱)

اس لیے اگر صبح کی سنتوں کی ادائیگی مسجد سے باہر کر کے مکان کا فصل کر دیا جائے تو منشاء نبوت پورا ہو جاتا ہے صرف امام اعظمؒ ہی نے نہیں بلکہ خود صحابہ کرام نے بھی حضور انورؐ کا یہی منشاء سمجھا ہے۔ کیونکہ اذا اقیمت الصلوۃ میں اذا اگر ظرفیہ ہے تو دو ہی صورتیں ہیں ظرف زمان ہے یا ظرف مکان ہے۔ ظاہر ہے کہ ظرف مکان ہے۔ مکان ہونے کی صورت

میں اس کی حد بندی ناگزیر ہے موٹی سے موٹی عقل والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لاہور کی شاہی مسجد میں صبح کی جماعت کھڑی ہونے پر تمام روئے زمین پر ہر قسم کی نماز حرام ہے اگر یہ واقعہ ہے تو پھر اذا اقیمت الصلوٰۃ میں مکان سے مکان یعنی مسجد ہی مراد ہے اس لیے نماز کھڑی ہو جانے پر مسجد میں سنتیں نہ پڑھنی چاہئیں۔ یہی امام ابو حنیفہ کا اصل مذہب ہے صحابہ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ محمد بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بتایا ہے:

خرج عبداللہ بن عمرو بن بیتہ فاقیمت صلوٰۃ الصبح فرکع رکعتین قبل ان یدخل المسجد وھو فی الطریق ثم دخل المسجد فصلی الصبح مع الناس رکعتین۔

عبداللہ بن عمرؓ گھر سے نکلے صبح کی نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے سنتیں مسجد میں داخل ہونے سے پہلے راستہ ہی میں ادا کیں بعد ازیں مسجد میں آئے اور جماعت سے نماز پڑھی۔ (۲)

یہ اور اس قسم کے ایک سے زیادہ آثار صحابہ آئے ہیں امام ابوبکر بن شیبہ نے انیس صحابہ کے آثار پیش کیے ہیں جن سے بیرون مسجد صبح کی نماز کھڑی ہو جانے کے باوجود اداء سنت کا پتہ چلتا ہے۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظمؒ کو صبح کی سنتوں کی ادائگی پر اس قدر اصرار کیوں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اصرار بھی امام اعظمؒ کا اپنا نہیں بلکہ براہ راست سراج رسالت منیر کا اصرار ہے۔ مسند احمدؒ ابو داؤد میں ارشاد ہے:

لاتدعوا رکعتی الفجر ولو طر دتکم الخیل

صبح کی سنتیں نہ چھوڑو چاہے تمہیں گھوڑے روند ڈالیں

حضرت عائشہؓ نے حضور انورؐ کے عمل کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی سن لیجئے۔

لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی شیئی من النوافل اشد تعاھدا منہ علی رکعتی الفجر۔

(۱،۲) معانی الاثار: ج ا ص ۱۱۸

نبوت کے اسی اسرار کی بنا پر امام اعظمؒ فجر کی سنتوں کی ادائیگی کو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود دو شرطوں کے ساتھ جائز بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ بیرون مسجد ہو۔ دوم یہ کہ دونوں رکعتوں کے جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ایسا اندیشہ محسوس کرتے تو جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتوں کو طلوع آفتاب کے بعد پڑھے۔ صبح کی نماز کے بعد نہ پڑھے کیونکہ صبح کی نماز کے بعد حضور انورؐ کا بتایا ہوا عام ضابطہ یہ ہے۔

عن عمر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن الصلوۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس و بعد العصر حتی تغرب الشمس۔ (متفق علیہ)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک نماز سے منع فرمایا ہے۔

صرف حضرت عمرؓ ہی سے نہیں بلکہ التلخیص الحبیر میں حافظ عسقلانی نے بتایا ہے کہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے یہ ضابطہ نقل کیا ہے۔ ارباب ظاہر نے ترمذی کی ایک روایت میں اپنا خود ساختہ مطلب ڈال کر اسے اس مشہور ضابطہ سے متصادم کر دیا۔

ترمذی میں قیس بن فہد کا یہ واقعہ منقول ہے:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقیمت الصلوۃ فصلیت معہ الصبح ثم انصرف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجدنی اصلی فقال مھلاً یا قیس اصلاتان معاً قلت یا رسول اللہ انی لم اکن صلیت رکعتی الفجر قال فلا اذن۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے جماعت کھڑی ہو گئی میں نے آپ کے ہمراہ نماز صبح ادا کی بعد ازیں حضورؐ نے نماز سے فراغت کے بعد مجھے نماز پڑھتے پایا تو فرمایا اے قیس چھوڑ! کیا دو نمازیں اکٹھی؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں ادا کی تھیں فرمایا پھر بھی نہیں۔

اس حدیث میں فلا اذن کے معنے فلا باس اذن یعنی تب کوئی مضائقہ نہیں بتا کر اس روایت کو پہلی روایت عمر کے معارض بنا دیا اور بطور خود صبح کی نماز کے بعد سنتیں پڑھنے کا پروانہ دے دیا۔ اور اس واقعہ ہی میں مھلاً یا قیس (چھوڑ! اے قیس) کی گرفت سے ایسے بے

خبر ہو گئے گویا یہ بات زبان نبوت نے فرمائی ہی نہیں۔ لیکن امام اعظمؒ نے مھلاً یا قیس کے زور کی وجہ سے فلا اذن کے معنے فلا اذن اذن تب بھی اجازت نہیں ہے متا کر مراد نبوت کو مقرر فرمایا اور اس طرح اس واقعہ کو دوسرے ارشادات کے ساتھ متصادم ہونے سے بچالیا۔ اور فلا اذن کے معنے بھی امام اعظمؒ نے صرف سیاق کلام کی مدد سے نہیں بلکہ حدیث ہی میں آمدہ دوسرے شواہد سے لیے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں واقعہ یا ہے کہ نعمان بن بشیر نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ مال دے دیا۔ ان کی خواہش ہوئی کہ اس معاملہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی گواہ ہو جائیں۔ نعمان حضور انور کی خدمت میں آئے۔ آپ نے دریافت کیا اھل نحلت سائر ابنائک مثله کیا تم نے اپنے سارے بیٹوں کو اسی طرح دیا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ فلا اذن۔ یہاں معنے صاف ہیں کہ پھر اجازت نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں امام اعظمؒ نے صبح کی نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی سے منع فرمایا اور طلوع آفتاب کے بعد ان کی ادائیگی کو جائز قرار دیا۔ طلوع آفاب کے بعد کے متعلق خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی آیا ہے جو حاکم نے مستدرک میں، دار قطنی، بیہقی اور ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں بحوالہ حضرت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے۔

من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلھما بعد ماتطلع الشمس۔

جس شخص نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں اسے چاہیے کہ آفتاب نکلنے پر پڑھ لے۔

اس طرح امام اعظمؒ نے اس موضوع پر آئی ہوئی مختلف حدیثوں میں شاندار طریق پر مفاہمت کر دی کہ ایک ارشاد نبوت بھی امت کے عمل سے بیگانہ نہ رہا اور سب حدیثوں پر عمل ہو گیا یہ چند مثالیں بطور گلے از گلزار عرض کر دی گئی ہیں تا کہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ مختلف حدیثوں میں مفاہمت کے موضوع پر سیدنا ابو حنیفہ سے اعلیٰ ہوئی فقاہت کیا ہے؟

وجوہ ترجیح اور امام اعظمؒ:

اگر دو صحیح حدیثوں میں تعارض ہو اور ان میں باہم مفاہمت کی کوئی صورت نہ ہو تو ان میں ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دیا جاتا ہے۔ ترجیح کی حقیقت یہ ہے کہ دو حدیثیں اگر صحت و قوت کے لحاظ سے یکساں اور ہم پلہ ہوں لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے باہم

متعارض ہوں تو ان دونوں میں سے ایک کو دوسری کی مقابلہ میں کسی ایسے سہارے کے ذریعے جس میں خود مستقل طور پر حجت بننے کی صلاحیت نہ ہو راجح قرار دیا جائے۔ جن سہاروں کے ذریعے ترجیح کا عمل کیا جاتا ہے محدثین کی اصطلاحی زبان میں ان کو وجوہ ترجیح کہتے ہیں۔ علماء نے ایک سے زیادہ وجوہ ترجیح کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ حازمی نے دوسرے علماء کے بارے میں بتایا ہے کہ:

قد اورد بعض الائمۃ فی باب الترجیحات نیفاً و اربعین وجھاً فی ترجیح احد الحدیثین علی الاخر۔

ہمارے بعض ائمہ نے وجوہ ترجیح چالیس سے زیادہ بتائے ہیں۔(۱)

خود علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں جن وجوہ ترجیح کا پتہ دیا ہے ان کی تعداد پچاس ہے اور آخر میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

فھذا القدر کاف فی ذکر الترجیحات و ثم وجوہ کثیرۃ اضربنا عن ذکرھا کیلا یطول ھذا المختصر۔

وجوہ ترجیح کی یہ مقدار کافی ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں لیکن ہم نے طوالت کے اندیشہ سے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔(۲)

حافظ سیوطی نے وجوہ کثیرۃ کے چہرۂ ابہام سے یہ کہہ کر نقاب ہٹائی ہے کہ:

وو صلھا غیرہ الی اکثر من مائۃ کما استوفی ذالک العراقی فی نکتہ۔

حازمی کے علاوہ اوروں نے اس تعداد کو ایک سو تک پہنچا دیا ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تفصیل کی ہے۔(۳)

علامہ جمال الدین قاسمی نے تمام وجوہ ترجیح کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

جو شخص صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے حالات کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ بزرگ اس پر متفق تھے اور ان کی اس موضوع پر کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ راجح پر عمل کیا جائے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجیح کے طریقے

---

(۱) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۴۸ (۲) کتاب الاعتبار: ص ۲۳ (۳) تدریب الراوی: ص ۳۸۸

بہت ہیں لیکن ترجیح کی بنیاد یہ ہے کہ وجہ ایسی ہو جو مسالک شرعیہ کے مطابق اور مزاج نبوت کے موافق ہو۔ جس میں یہ چیز موجود ہو وہ وجہ معتبر ہے۔ ترجیح کبھی بلحاظ اسناد، کبھی باعتبار متن، کبھی بحیثیت مدلول اور کبھی کسی بیرونی چیز کی وجہ سے ہوتی ہے۔(۱)

ان وجوہ ترجیح کا یہاں موقعہ نہیں ہے جو محدثین کرام نے قلم بند فرمائی ہیں اور جن کو فقہاء کرام نے اسلام کی قانون سازی کے مختلف مرحلوں پر استعمال کیا ہے۔

ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہونے کے باوجود باہم متعارض ہو جائیں تو کیا ان میں سے کسی ایک کو اس بنا پر راجح قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس کے بیان کرنے والے علم و ... اور فقہ و نظر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس حد تک سب متفق ہیں کہ راویوں میں فقاہ ... بینا وجہ ترجیح ہے۔ چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں:

وجوہ ترجیح میں سے تیسویں وجہ یہ ہے کہ دو حدیثوں میں سے کسی ایک کے بیان کرنے والے اگر حفظ و ضبط میں ہم پلہ ہوں لیکن ان میں سے ایک کے راوی فقہاء ہوں تو فقہاء کی روایت کو ترجیح ہو گی۔ علی بن خشرم محدث کہتے ہیں کہ ہم سے امام وکیع نے کہا کہ ان دو سندوں میں سے تمہیں کون سی سند پسند ہے؟ اعمش عن ابی وائل عن عبداللہ۔ یا سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ۔ ہم نے جواباً عرض کیا کہ ہمیں تو اعمش عن ابی وائل عن عبداللہ کا سلسلہ سند زیادہ پسند ہے۔ امام وکیع نے بتایا کہ اس سند میں اعمش اور ابووائل شیوخ حدیث ہیں۔ اور دوسری سند میں سفیان، منصور، ابراہیم اور علقمہ فقہاء ہیں اور وہ حدیث جو فقہاء کی راہ سے آئے بلاشبہ اس حدیث سے بہتر ہے جو محدثین کی وساطت سے آئے۔(۲)

علامہ ابوالسعادات مجدالدین ابن الاثیر نے جامع الاصول میں اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

یہ سلسلہ روایت فقہاء کی راہ سے عبداللہ بن مسعود تک رہا ہی ہے اور محدثین کی رائے سے چنائی ہے یعنی فقہاء کے طریق میں عبداللہ تک چار راوی ہیں اور محدثین

---

(۱) قواعد التحدیث: ص۳۱۳ (۲) کتاب الاعتبار: ص۱۵، معرفۃ علوم الحدیث: ص۱۱۱، الکفایہ: ص۳۶۲

کے سلسلے میں صرف دو راوی ہیں۔ اس کے باوجود صرف راویوں کی فقاہت کی وجہ سے فقہاء کی روایت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو جائے اور بلحاظ سند دونوں قوی ہوں لیکن ایک کے سلسلہ سند میں شیوخ حدیث ہوں اور دوسری فقہاء کی وساطت سے آرہی ہو تو خود ارباب حدیث کے نزدیک بھی فقہاء کی روایت کا پلڑا بھاری ہوگا۔ چاہے فقہاء کی روایت کے مقابلے میں محدثین کی روایت کو "علو" کا مقام بھی حاصل ہو۔ یعنی فقہاء کے سلسلے میں راویوں کی تعداد زیادہ اور محدثین کے طریق میں راویوں کی تعداد کم ہو۔ علامہ محمد معین سندھی نے اس مقام پر یہ کہہ کر کہ:

فقه الرواة لا اثر له فی صحة المروی وانما مدار ها علی العدالة والضبط۔

راویوں کی فقاہت کا روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے روایت کا دارومدار تو راویوں کی عدالت وضبط پر ہے۔(۲)

اختلاط سے کام لیا ہے۔ گفتگو روایت کی صحت میں نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی شرط نہیں ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ اگر دو صحیح روایتوں میں تعارض ہو جائے' دونوں روایتوں کے راویوں میں عدالت و ضبط یکساں ہو اور ان میں باہم کسی طرح مفاہمت نہ ہو سکے تو کسے راجح قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ محدثین فقہ راوی کو ترجیح میں سبب مؤثر قرار دیتے ہیں۔ آپ امام حازمی کی تصریح پڑھ چکے ہیں حافظ سیوطی اور حافظ عراقی جیسے اساطین حدیث بھی امام حازمی کے ہم زبان ہیں۔ چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں:

ثالثها من وجوه الترجیح. فقه الراوی سواء کان الحدیث مروی بالمعنی اوباللفظ. لان الفقیه اذا سمع ما یمتنع حمله علی ظاهره بحث عنه حتی یطلع علی مایزول به الاشکال۔

وجوہ ترجیح میں سے تیسری وجہ فقہ راوی بھی ہے چاہے حدیث کی روایت باللفظ ہو یا

(۱) جامع الاصول: ج ۱ ص ۶۲ (۲) دراسات اللبیب

بالمعنی ہو کیونکہ فقیہ جب کوئی ایسی بات سنتا ہے۔ جسے ظاہر پر محمول کرنا دشوار ہو تو اس کے بارے میں بحث و تمحیص سے کام لیتا ہے تا آنکہ وہ ایسی چیز پر مطلع ہو جاتا ہے جسے سے راہ کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔(۱)

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

ویرجح بان یکون رواته فقهاء لان عناية الفقيه بما يتعلق من الاحكام و مثله من عناية غيره بذالک۔

کسی حدیث کو اس کے راویوں کے فقیہ ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے گی کیونکہ فقہاء کی مرکزی توجہ احکام پر دوسری کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔(۲)

بہرحال علامہ معین الدین سندھی نے یہ کہہ کر اپنے مخاطبوں کو ایک سنگین غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ روایات کی صحت کے لیے فقہ راوی کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے۔ فقہ راوی صحت کے لیے نہیں بلکہ صرف دو صحیح رواتوں میں ترجیح کا سبب ہے۔ ترجیح روایت اور صحت روایت دو الگ الگ موضوع ہیں ان کو باہم غلط ملط کرنا سنگین مغالطہ ہے۔

بہرحال فقہ راوی کی ترجیح روایت کے لیے وجہ ہونے میں محدثین اور فقہاء کا نقطہ نظر ایک ہے اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ شیخ عبداللطیف سندھی کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ:

لا يرتاب احد في ان فقه الراوى مما يثبت به الترجيح۔

راوی کی فقاہت روایت کی ترجیح کے لیے مثبت ہے اور اس میں کوئی بھی شبہ نہیں ہے۔(۳)

ہاں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں اور دونوں میں تعارض ہو اور دونوں میں ایک کے راوی فقہاء ہوں اور دوسری متعدد طرق سے مروی ہو۔ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ محدثین اور ارباب روایت کا موقف یہ ہے کہ کثیر الطرق روایت کو راجح قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ امام حازمی رقم فرماتے ہیں:

---

(۱) تدریب الراوی: ص ۳۹۹ (۲) الکفایہ فی علوم الروایہ: ص ۴۳۶

(۳) ذب ذبابات الدراسات: ج ۱ ص ۶۵۱

کسی حدیث کو راجح قرار دینے کے وجوہ میں سے ایک وجہ کثرت عدد ہے اس کا روایت پر خاص اثر ہوتا ہے اس طریق سے روایت کے بارے میں علم میں پختگی آتی ہے۔(۱)

خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

ویرجح بکثرۃ الرواۃ لاحد الخبرین۔(۲)

لیکن اس موضوع پر امام اعظمؒ کو محدثین سے اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسی دو روایتوں میں ترجیح اس روایت کو دی جائے گی جس کے بیان کرنے والے فقہاء ہوں۔ چنانچہ رفع یدین کے موضوع پر انہوں نے امام اوزاعی سے مناظرے کے وقت اسی اصول کو اپنایا ہے۔ امام اوزاعی سے امام اعظمؒ کا یہ مناظرہ امام موفق نے امام الحارثی کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں امام حارثی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

عالم ماوراء النہر ومحدثہ الامام العلامہ ابو محمد عبداللہ بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاذ جامع مسند ابی حنیفہ۔(۳)

امام حارثی نے اس واقعہ کی سند یہ لکھی ہے:

حدثنا محمد بن ابراھیم بن زیاد الرازی حدثنا سلیمان بن الشاذ کوفی قال سمعت سفیان بن عیینہ یقول اجتمع ابو حنیفۃ والاوزاعی بمکۃ۔

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں، علامہ اکمل الدین نے عنایہ میں، ملا علی قاری نے شرح نخبہ میں، الشیخ ابوالطیب سندھی نے ترمذی کے حاشیہ میں اور السید مرتضیٰ زبیدی نے عقود الجواہر المنیفہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف ومشہور داستان کے بارے میں راویوں کی معاصرانہ چشمک سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے اصل ہونے کا دعویٰ کرنا فن کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ علامہ محمد معین سندھی نے اس قصہ کے معلق ہونے کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے۔

---

(۱) کتاب الاعتبار: ص۹ (۲) الکفایہ: ص۴۳۶ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ص۸۵۴

ان هذه الحكاية عن سفيان بن عيينة معلقة و لم ار من اسندها۔(۱)

اور ساتھ ہی یہ چیلنج بھی دیا ہے:

ومن عنده السند فليات به

حالانکہ یہ واقعہ نہ تو غیر مسند ہے جیسا کہ آپ امام حارثی کی زبانی سن آئے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے مسند میں اسے باسند لکھا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں:

فقد اسندها ابو محمد عبدالله بن محمدبن يعقوب بن الحارث الحارثی البخاری المعروف بالاستاذ تلميذ ابی حفص الصغير بن ابی حفص الكبير تلميذ الامام محمد بن الحسن فی مسنده بقوله حدثنا محمد بن ابراهيم بن زياد۔الخ۔(۲)

اور نہ معلق ہے جیسا کہ امام موفق نے لکھا ہے۔ آیئے اب اصل واقعہ گوش گذار فرمالیجئے:

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور امام اوزاعی مکہ کے دارالحناطین میں جمع ہوئے گفتگو کے دوران امام اوزاعی نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا آپ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اس لیے کہ رفع یدین رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا یہ کیونکر ہو سکتا ہے مجھے زہری نے بتایا۔ انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت رکوع کو جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا مجھے حماد نے بتایا۔ انہوں نے ابراہیم سے سنا ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے سنا اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور پھر اسے نہیں دہراتے تھے۔ امام اوزاعی نے پھر جواب میں کہا۔ میں آپ کو زہری' سالم اور ان کے والد ابن عمر کی روایت سناتا ہوں اور آپ

---

(۱) دراسات اللبیب: ص ۳۰۵ (۲) الاجوبۃ الفاضلۃ: ص ۲۱۴

مجھے حماد اور ابراہیم کی روایت سناتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ جواباً بولے حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے۔ ابراہیم سالم سے بڑھ کر عالم تھے۔ اور اگر صحابی ہونے کا پاس نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمر سے زیادہ عالم فقہ تھے اور عبداللہ تو آخر عبداللہ ہیں۔(۱)

عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں یعنی ان راویوں میں کوئی شخص بھی عبداللہ بن مسعود کا ہم پلہ نہیں ہے۔

حافظ ابن الہمام نے یہ واقعہ درج کر کے لکھا ہے کہ:

رفع یدین کے موضوع پر آثار صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بہت ہیں اور ان میں گفتگو بڑی طویل الذیل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں رفع اور عدم رفع ثابت ہیں اور دونوں کے ثابت ہونے کی صورت ہم باہم ترجیح کی ضرورت ہے کیونکہ تعارض موجود ہے۔ عدم رفع ہمارے نزدیک اس لیے راجح ہے کہ نماز اس موجودہ صورت میں مختلف احوال سے گذر کر آئی ہے۔ اقوال و رفع یدین کی جنس کے افعال ایک وقت میں نماز میں مباح تھے اور وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ حرکتیں بھی اسی درجے میں آجائیں تو کوئی بعید نہیں ہے۔ رفع یدین چونکہ وجودی حرکت کا نام ہے اس لیے اس میں اس کا احتمال ہے۔ برخلاف عدم رفع کے کہ وہ ایک منفی چیز ہے اس میں اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے عدم رفع حرکت نہیں بلکہ سکون کا نام ہے وہ بلا اجماع نماز میں خشوع کے عموم کی وجہ سے مطلوب ہے اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ عدم رفع کی روایت کے راوی فقاہت کی وجہ سے رفع یدین کے راویوں پر برتری رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

رفع یدین اور عدم رفع دونوں قسم کی روایتوں میں موازنہ کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ

(۱) الاجوبۃ الفاضلہ: ص ۲۰۲

نے عدم رفع کی روایات کو راویں کی فقاہت کی بنا پر اور امام اوزاعی نے مسند کے عالی ہونے کی بنا پر ترجیح دی ہے۔(۱)

امام اعظمؒ نے روایت کے اسنادی علوم سے ہٹ کر فقاہت کو ترجیح کے لیے کیوں وجہ قرار دیا ہے؟ اس لیے کہ:

فقاہت کے ذریعے فقیہ میں صحیح اور غیر صحیح کا شعور اور سلیقہ ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے جس کا ظاہر مزاج شریعت سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ اس کو اول نظر میں ہی روایت نہیں کرتا بلکہ اس کی حقیقت کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے معنے میں سرگرداں رہتا ہے جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے تو روایت کرتا ہے برخلاف غیر فقیہ کے کہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ہے۔ وہ سنی ہوئی بات کو آگے چلا دیتا ہے۔ اس تعلیل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ افقہ کی روایت کو فقیہ کی روایت پر ترجیح دی جائے۔(۲)

ترجیح روایت کے بارے میں دراصل امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے اور فقاہت ان کے نزدیک دو صحیح حدیثوں میں ترجیح کا سبب مؤثر ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے تصریح کی ہے کہ ھذا منھجنا فی الترجیح۔ اور حافظ ابن الہمام نے اسی کو فتح القدیر میں مذہب منصور قرار دیا ہے اور ملا علی قاری نے واشگاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ:

والمذھب المنصور عند علماء نا الحنیفۃ الا فقھیۃ دون الاکثیرۃ۔

کامیاب مذہب احناف کے نزدیک افقہیت ہے اکثریت نہیں ہے۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ عددی طاقت اور ووٹوں کی زیادتی سے کسی روایت کو راجح نہ قرار دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ معنویت کہاں ہے؟

ظاہر بین بزرگوں نے امام اعظمؒ کے اس زرین ضابطہ کو تخریجی قسم کا ضابطہ قرار دے کر بے جان بنانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن شاید ان کو علم نہیں ہے کہ محدثین کے علم حدیث کے متعلق سارے ہی اصول وضوابط تخریجی ہیں۔ اصول حدیث کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ بھی منصوص

(۱) فتح القدیر: ج ۱ ص ۲۶۶ (۲) فواتح الرحموت بحوالہ الاجوبۃ الفاضلہ: ص ۲۱۱

نہیں ہے۔ یہ بات کہ تعدد طرق کی بنا پر روایت کو ترجیح دی جائے خود تخریجی ہے اور اس کا پس منظر افراد و غرائب کے لیے گنجائش نکالنا ہے یعنی اس کو افراد و غرائب کے لیے بنایا گیا ہے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ورنہ اللہ کے دین میں احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ دین میں فکر و نظر اور فقہ و بصیرت رکھنے والوں کی بات کا پلڑا بھاری ہو۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ نماز کی صف اول کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم تھا جو بحوالہ ابو مسعود انصاری اور بحوالہ عبداللہ بن مسعود مسند احمد، مسلم، ابو داؤد اور ترمذی میں ان الفاظ میں موجود ہے۔

لیلینی اولوا الاحلام النھیٰ منکم

مجھ سے قریب نماز میں تم میں سے اہل عقل و فہم ہوا کریں

اہل علم و فضل کو صف اول میں رکھنے کی اس کے سوا وجہ کیا ہو سکتی ہے جو علامہ شوکانی نے بتائی ہے۔

لیاخذوا عن الامام ویاخذ عنھم غیرھم لانھم امس بضبط صفۃ الصلاۃ و حفظھا ونقلھا و تبلیغھا۔

تاکہ وہ امام کے اعمال و افعال کی کاپی کریں اور رائے عامہ ان کے اعمال و افعال کی کاپی کرے۔ کیونکہ اہل علم ہی نماز کے طریقہ کو زیادہ ضبط اور حفظ کر سکتے ہیں اور ان میں اسے آگے نقل کرنے اور پہنچانے کی صلاحیت ہے۔(۱)

امام اعظمؒ نے اوزاعی کے سامنے رفع یدین کے موضوع پر یہی کسوٹی پیش فرمائی ہے۔ رفع یدین کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے اور عدم رفع کے موضوع پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے۔ ان دونوں حدیثوں کی روایتی اور اسنادی حیثیت دونوں کو مسلم ہے اور ان دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ امام اعظمؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کو راجح قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کبار صحابہ سے ہیں۔ نماز میں یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف اول میں ہوتے تھے۔ حضور انورؐ نے معلمین قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس چیز کو تمہارے لیے ابن

---

(۱) نیل الاوطار: ج ۳ ص ۱۵۵

مسعود پسند کرے میں تمہارے لیے اسی پر راضی ہوں۔(۱) اور فرمایا کہ ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کی مضبوطی سے قائم رکھو اور اس پر جمے رہو۔(۲) حضرت عمرؓ نے ان کو علم کا انبار کہا ہے اور کوفہ والوں کی طرف معلم قرآن و سنت بنا کر روانہ کیا' امام نووی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود خلفائے راشدین سے بھی زیادہ عالم تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حضور انورؐ کے پاس رہتے تھے اور حضور انورؐ ان سے کسی وقت حجاب نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات ساٹھ سال کی عمر میں ۳۲ھ میں ہوئی ہے مسلمان ہونے والوں میں یہ چھٹے مسلمان ہیں اس لیے ان کا شمار ابوبکر و عمرؓ عثمان و علی کے ساتھ السابقون الاولون میں ہے۔ ان کا بیان امام اعظمؒ کو پہنچا ہے کہ حضور انورؐ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بے شک بزرگ ترین صحابی ہیں لیکن حضور انورؐ کی ہجرت کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی اور وفات کے وقت یہ عمر کی چوبیسویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار نہ السابقون الاولون میں ہے۔ اور نہ ابوبکر و عمر کے علم و فضل میں ہم پلہ ہیں۔ نماز میں حضورؐ کے پیچھے جو مقام عبداللہ بن مسعودؓ کا ہے وہ یقیناً عبداللہ بن عمر کا نہیں ہے اس لیے امام اعظمؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے بیان کو راجح قرار دیا ہے۔

حدیث ضعیف اور امام اعظمؒ:

محدثین نے حدیث ضعیف کی یہ تعریف کی ہے کہ:

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حسن اور صحیح کی صفات نہ ہوں۔(۳)

اور کچھ نے یہ بتایا ہے کہ:

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جو حسن کے پائے کی نہ ہو۔

لیکن حدیث ضعیف کی یہ تعریف ان بعد میں آنے والے محدثین کرام کی اختراعی ہے جن کے نزدیک حدیث تین قسموں پر مشتمل ہے۔ صحیح' حسن اور ضعیف۔ ورنہ متقدمین حدیث کی اس ثلاثی تقسیم سے آشنا نہ تھے۔ ان کے یہاں حدیث کی تقسیم ثنائی تھی یعنی حدیث

(۱) مستدرک حاکم: ج ۳ ص ۳۱۹ (۲) الاستیعاب: ج ا ص ۳۵۹ (۳) تقریب: ص ۵۰

کی دو ہی قسمیں بتاتے تھے صحیح اور ضعیف۔ چنانچہ امام احمد کے زمانے تک حدیث دو ہی قسموں میں منحصر تھی ان دو کے درمیان حسن کا کوئی درجہ نہ تھا لیکن بعد نے محدثین نے ان دونوں کے درمیان حسن کی صورت نکال لی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حدیث کی یہ تقسیم صحیح، حسن اور ضعیف امام ابو عیسیٰ ترمذی کی بنائی ہوئی ہے ترمذی سے پہلے یہ تقسیم کسی سے مروی نہیں ہے اور ترمذی نے اس سلسلے میں اپنی مراد بھی واضح کردی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ ہی شاذ ہو۔ یہ مرتبہ میں اس صحیح سے کم ہے جس کے راویوں کی عدالت اور ضبط معلوم ہوتا ہے۔ ضعیف وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو یا ردی الحفظ ہو۔ (۱)

علامہ خطابی نے حسن کی یہ تعریف کی ہے:

جس کا مخرج معلوم ہو اور جس کے راوی مشہور ہوں۔ (۲)

لیکن حافظ ابن تیمیہ کو علامہ خطابی سے اختلاف ہے وہ امام ترمذی کے ہمنوا ہیں۔

حدیث حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ وہ شاذ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں وہ متقدمین کے یہاں ضعیف ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لیس المراد بالحدیث الضعیف فی اصطلاح السلف هو الضعیف فی اصطلاح المتاخرین بل ما یسمیه المتاخرون حسناً قد یسمیه المتقدمون ضعیفاً۔

ضعیف کے بارے میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحیں الگ الگ ہیں۔ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں متقدمین کی زبان میں اس کا نام ضعیف ہے۔ (۳)

اسی ضعیف کے بارے میں محدثین نے امام اعظمؒ کا یہ موقف بتایا ہے کہ وہ اسے رائے

---

(۱) توضیح الافکار (۲) معالم السنن: ج ۱ ص ۱۵ (۳) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۸۳

اور قیاس کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ حدیث ضعیف رائے اور قیاس پر مقدم ہے بشرطیکہ اس موضوع پر صحیح حدیث نہ ہو۔(۱)

اصحاب ابی حنیفة مجمعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث اولی عنده من القیاس و الرای۔

ابوحنیفہ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ:
ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔(۲)

بلکہ حافظ ابن القیم ہی نے اس موضوع پر امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کی ہم آہنگی کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فتقدیم الحدیث الضعیف و اثار الصحابة علی القیاس و الرای قوله وقول الامام احمد بن حنبل۔

حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا قول ہے۔(۳)

لیکن ضعیف سے متاخرین کی مراد اصطلاحی ضعیف نہیں ہے بلکہ حسن مراد ہے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ہمارا یہ کہنا کہ حدیث ضعیف رائے اور قیاس سے بہتر ہے اس سے ضعیف متروک مراد نہیں ہے بلکہ حسن اور اصطلاح میں ترمذی سے قبل حدیث کی دو ہی صورتیں تھیں صحیح یا ضعیف اور ضعیف کی دو قسمیں تھیں ضعیف متروک اور غیر متروک۔ چنانچہ ائمہ حدیث کی زبان پر یہی اصطلاحیں جاری تھیں اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کو صرف اصطلاح ترمذی ہی کا پتہ تھا جب ان کے کان میں بعض ائمہ حدیث کا یہ قول پڑا کہ حدیث ضعیف قیاس سے بہتر ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ ایسی حدیث سے

---

(۱) الاحکام (۲) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۸۲ (۳) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۴۷

حجت لائی جا رہی ہے جو یہ اصطلاح ترمذی ضعیف ہے تو یہ ان لوگوں کے طریقہ کو ترجیح دینے لگے جو حدیث صحیح کے اتباع کا اظہار کرتے ہیں۔(۱)

حافظ ابن القیم نے یہی بات پوری صراحت سے لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

ضعیف سے باطل و منکر مراد نہیں ہے اور نہ وہ روایت ہے جس کے راویوں میں کوئی متہم ہو بلکہ حدیث ضعیف ان کے یہاں صحیح کی قسیم ہے قسم نہیں ہے ان کے یہاں حدیث کی ثلاثی نہیں بلکہ ثنائی تقسیم ہوتی ہے اور ضعیف ان کے یہاں مراتب والی تھی۔(۲)

علامہ ابن علان صدیقی نے امام احمد کے اس ارشاد پر کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا بشرطیکہ اس موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ہو۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

حدیث ضعیف کے بارے میں امام احمد سے جو منقول ہے تو اس میں ضعیف سے مراد وہ ضعیف ہے جو صحیح کے مقابلے میں ہو یہ خود امام احمد اور متقدمین کا عرف ہے کیونکہ ان کے یہاں حدیث کی دو ہی قسمیں صحیح اور ضعیف ہیں اور یہ ضعیف حسن کو بھی شامل ہے اور باقی متاخرین کی اصطلاحی ضعیف تو وہ امام احمد کی ہرگز مراد نہیں ہے۔(۳)

اور یہ صرف امام احمد ہی کی نہیں بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ کے ارشاد میں بھی ضعیف سے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے چنانچہ علامہ ابن علان ہی نے علامہ زرکشی کے حوالہ سے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

وقریب من ھذا قول ابن حزم الحنیفۃ متفقون علی ان مذھب ابی حنیفۃ ان ضعیف الحدیث عندہ اولیٰ من الرای والظاھر ان مرادھم بالضعیف ماسبق۔(۴)

الغرض صرف امام اعظمؒ ہی کا نہیں بلکہ تمام ائمہ کا مذہب یہی ہے کہ قیاس و رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

لیس احد من الائمۃ الا وھو موافقہ علی ھذا الاصل من حیث الجملۃ۔

---

(۱) التوسل والوسیلہ: ص ۷۸ (۲) اعلام: ج ۱ ص ۳۱ (۳) شرح الاذکار: ج ۱ ص ۸۶

(۴) شرح الاذکار: ج ۱ ص ۸۷

اماموں میں سے ہر ایک بہر حال اس موضوع پر امام احمد کا ہمنوا ہے۔(۱)

لیکن یہاں اتنی بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ یہ ائمہ جس حدیث ضعیف سے استدلال کرتے ہیں وہ ضعیف الاسناد تو محدثین تک پہنچنے میں ضرور ہوتی ہے مگر ضعیف المعنی نہیں ہوتی ہے۔ اتصال عمل کی کسی شاہد صحیح کی ظاہر قرآن کی اور بالآخر کثرت طرق کی اسے یقیناً تائید حاصل ہوتی ہے۔

اسنادی کمزوری کی حد تک حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

ایک شخص محدثین کے یہاں حدیث میں غلطیوں کی وجہ سے ضعیف قرار پا جاتا ہے لیکن اس کی حدیثوں میں زیادہ تر صحیح ہوتی ہیں۔ وہ اس سے محض اعتبار(۲) واعتضاد کی خاطر حدیثیں روایت کرتے ہیں کیونکہ تعدد طرق اور کثرت اسانید سے روایت میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ اس کے ذریعے علم حاصل ہو جاتا ہے چاہے۔ روایت کرنے والے فاسق و فاجر ہی ہوں اور اگر روایت میں غلطیوں کے باوجود بیان کرنے والے علماء اور عادل ہوں تو پھر کیا ہی کہنے ہیں جیسے عبداللہ بن لہیعہ۔ یہ اکابر علماء میں سے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی روایات میں غلطیاں ہوتی ہیں حالانکہ ان کی روایات بیشتر صحیح ہوتی ہیں۔(۳)

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ا ص ۳۱۔ (۲) اعتبار اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روایت کی مختلف سندیں جمع کر کے دیکھی جائیں تا کہ پتہ چل جائے کہ قدر مشترک کے طور پر سند و متن کا کتنا حصہ درست اور صحیح ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اعتبار سے متابعت اور شاہد محدثین کی خاص اصطلاحی زبان ہے اس کے ذریعے وہ احادیث کے مختلف احوال معلوم کرتے ہیں سب سے یہ جانتے ہیں کہ راوی اپنے بیان میں منفرد ہے یا نہیں پھر یہ کہ معروف ہے یا مجہول و مستور۔ اعتبار یہ ہے کہ کسی روایت کی مختلف سندیں یکجا کی جائیں اور دیکھا جائے کہ سند میں کسی اور کی ہمنوائی بھی اسے حاصل ہے یا نہیں اس ہمنوائی کے بہم پہنچانے کا نام اعتبار ہے۔ پھر اس تلاش میں اگر راوی کی یا راوی کے استاد کی یا استاد کے استاد کی آخر سند تک ہمنوائی مل جائے تو اس کا نام متابعت ہے اور پھر اگر اس روایت کے ہم معنے کوئی اور روایت بھی دستیاب ہو جائے تو اس کا نام شاہد ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اعتبار کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث کے لیے توابع اور شواہد معلوم ہو سکیں۔ (۳) قواعد التحدیث: ص ۱۱۵

آیئے سرِراہے چند مثالیں بھی سن لیجئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ائمہ دین نے دین کی زندگی میں ضعیف حدیثوں سے کس طرح اور کس انداز میں فائدہ اٹھایا ہے۔

حدیث قہقہہ سے وضو کے ٹوٹنے پر استدلال:

مسئلہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں اگر قہقہہ مار کر ہنسا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

اس موضوع پر احادیث مسندہ اور مرسلہ دونوں آتی ہیں۔ احادیث مسندہ میں ابی موسیٰ اشعریؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن عبداللہؓ، عمران بن الحصین اور ابی الملیح کی احادیث آتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی روایت بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اصطلاحی صحت کے معیار پر پوری نہیں ہے۔ ابی موسیٰ کی روایت طبرانی میں ہے اگرچہ حافظ ہیثمیؒ نے اس کے رجال کی توثیق کی ہے لیکن ان میں محمد بن عبدالملک مختلف فیہ ہے۔ حدیث ابی ہریرہ سنن دارمی میں ہے مگر منقطع ہونے کے ساتھ عبدالعزیز اور عبدالکریم کی وجہ سے ضعیف ہے۔

حافظ ابن عدی فرماتے ہیں۔

والبلاء فی هذا الاسناد من عبدالعزیز و عبدالکریم وهما ضعیفان۔(۲)

عبداللہ بن عمر کی حدیث کے بارے میں ابن الجوزی کا العلل المتناحیہ میں فیصلہ یہ ہے کہ:

هذا حدیث لا یصح۔

حدیث انس سنن دارقطنی میں ہے اس میں بھی داؤد متروک الحدیث اور ایوب ضعیف ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں:

رواه داؤد بن المحبر و متروک یضع الحدیث عن ایوب وهو ضعیف۔(۲)

حدیث جابر بھی سنن دارقطنی میں ہے لیکن اس میں یزید بن سنان ضعیف ہے۔

عمران بن الحصین کی روایت عمر بن قیس اور عمرو بن عبید کی وجہ سے پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہے۔ ابو الملیح کا اس موضوع پر بیان اپنے اضطراب کی وجہ سے محدثین کے دربار میں مخدوش ہے

---

(۱) نصب الرایہ: ج ا ص ۴۸ (۲) سنن دارقطنی: ص ۵۹

یہی حال ان روایات کا ہے جو مسندہ نہیں بلکہ مرسلہ ہیں ان پر تفصیلی کلام حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں فرمایا ہے۔ بہرحال نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کے موضوع پر جس قدر روایات آتی ہیں چاہے وہ مسند ہوں یا مرسل۔ محدثین کے یہاں متکلم فیہ ہیں۔ اور حافظ ابن القیم کا یہ کہنا درست ہے کہ:

اجمع اهل الحديث على ضعفه۔(۱)

اس کے باوجود کہ عقلیت کا تقاضا بھی ہے اور قیاس بھی چاہتا ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے امام ابوحنیفہ نے قہقہہ کو وضو کے لیے ناقض قرار دیا ہے۔ اس باب میں بہت سے امور تفصیل طلب ہیں لیکن یہاں مزید اطناب کا موقعہ نہیں ہے۔

نبیذ تمر سے وضو کی حدیث:

اگر اور کوئی پانی نہ ہو اور صرف کھجوروں کی نبیذ ہی ہو تو نبیذ ہی سے وضو جائز ہے اس لیے کہ تیمم روا نہیں ہے۔ اس موضوع پر دو حدیثیں آتی ہیں۔ ایک حدیث ابن مسعودؓ اور دوسری حدیث ابن عباسؓ حدیث ابن مسعودؓ پر محدثین نے خاص محدثانہ اور مؤرخانہ کلام کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں حافظ ابوزرعہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

حديث ابى فزارة فى الوضوء ليس بصحيح وابوزيد مجهول۔

حافظ ابوجعفر طحاوی فرماتے ہیں:

ان حديث ابن مسعود روى من طرق لا تقوم بمثلها حجة۔(۲)

اگرچہ حدیث ابن مسعود کو ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے لیکن محدثین کے یہاں اس کی صحت مخدوش ہے۔ خود صاحب ہدایہ کو اس کے اضطراب کی شکایت ہے۔ حافظ منذری نے مشہور محدث ابو احمد الکرابیسی سے نقل کیا ہے۔

لايثبت فى هذا الباب من هذه الرواية حديث بل اخبار الصحيحة عن عبدالله ناطقة بخلافه۔

---

(۱) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۸۲ (۲) نصب الرایہ: ص ۱۴۶

اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے بلکہ عبداللہ سے صحیح حدیثیں اس کے خلاف ہیں۔(۱)

عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے لیکن حافظ بزار کا فیصلہ ہے:

هذا حديث لا يثبت۔ (یہ حدیث ثابت نہیں ہے)(۲)

حدیث مقدار ایام حیض:

حیض کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کے موضوع پر جو حدیث تی ہے وہ اگر چہ ابو امامہ، واثلہ بن الاسقع، معاذ بن جبل، ابو سعید، انس بن مالک اور عائشہ کے حوالہ سے آتی ہے اور حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے لیکن ان کے راویوں میں مجاہیل ضعفاء کا اتنا ہجوم ہے کہ محدثین کے معیار کے مطابق اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ملتی ہے لیکن اس کے باوجود قابل قبول سمجھ لی گئی۔

بہرحال امام اعظم قیاس اور رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر بھی عمل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام اعظمؒ کے زمانے میں معاشرے کی علمی تائید کی وجہ سے ان حدیثوں کا درجہ حسن ہو جاتا ہے۔ علامہ بابرتی نے شاید اسی بنا پر لکھا ہے کہ:

والحديث مشهور لبت بطرق مختلفة و عملت به الصحابة۔(۳)

حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں:

فهذه عدة احاديث عن النبی صلعم متعددة الطرق وذالک يرفع الضعيف الی الحسن۔(۴)

یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ہیں اور متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ حسن کو پہنچ گئی ہیں۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں:

حسن وغیرہ بھی قابل احتجاج ہو جاتی ہے جب وہ متعدد طرق سے آئے۔

---

(۱) معالم السنن: ج ۱ ص ۸۳ (۲) نصب الرایہ: ج ۱ ص ۱۴۳
(۳) عنایہ: ج ۱ ص ۸۰ (۴) فتح القدیر: ج ۱ ص ۱۱۲

امام نووی بھی علامہ سخاوی کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

حدیثوں کی سندیں اگر الگ الگ ہوں چاہے وہ ضعیف ہوں ان کا مجموعہ باہم تقویت کی وجہ سے حدیث کو حسن اور قابل احتجاج بنا دیتا ہے۔

امام بیہقی کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث ضعیف کثرت طرق سے آئے تو قوی ہو جاتی ہے۔ بلکہ عون الباری میں امام نووی کے حوالہ سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ:

حدیث ضعیف اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ ضعیف سے حسن اور مقبول و معمول بہ ہو جاتی ہے۔(۱)

ارباب روایت کے یہاں عمل کے بارے میں تین مسلک ہیں:

اول یہ کہ ضعیف پر قطعاً عمل نہ کیا جائے۔ ابن سید الناس نے اسی کو یحییٰ بن معین کا مسلک قرار دیا ہے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ابوبکر بن العربی کا یہی میلان بتایا ہے بلکہ صاحب قواعد التحدیث کی تصریح کے مطابق محدثین میں بخاری اور مسلم کا بھی یہی مسلک ہے۔

دوم یہ کہ حدیث ضعیف پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں:

عزی ذالک الی ابی داؤد واحمد لا نھما یریان ذلک اقوی من رای الرجال۔(۲)

سوم یہ کہ صرف فضائل میں ضعیف پر عمل کیا جائے احکام میں ضعیف پر عمل نہ کیا جائے۔ چنانچہ امام حاکم رقمطراز ہیں:

میں نے ابوبکر زکریا عنبری سے سنا وہ فرماتے تھے کوئی حدیث اگر حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کرتی ہو اور کسی حکم کو واجب نہ کرتی ہو اور صرف ترغیب و ترہیب سے تعلق رکھتی ہو تو اس سے چشم پوشی کی جائے گی اور اس کے راویوں پر جرح میں تساہل سے کام لیا جائے گا اور جیسا کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کی روایت کرتے ہیں تو اسانید کے بارے میں سختی برتتے ہیں اور رجال پر نقد کرتے ہیں اور جب فضائل و عقاب کی روایت کرتے ہیں تو اسانید میں نرمی اختیار کرتے ہیں اور احادیث میں

---

(۱) قواعد التحدیث: ص ۱۱۰ (۲) تدریب الراوی: ص ۸۲

تسامح سے کام لیتے ہیں۔ میمونی نے امام احمد کا بھی ایسا ہی بیان بتایا ہے کہ رقاق کی حدیثوں میں تساہل مناسب ہے لیکن امام احکام میں نہیں۔(۱)

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ:

اگر حدیث ضعیف ہو لیکن موضوع نہ ہو تو محدثین اس کی اسناد میں تساہل کو جائز سمجھتے ہیں اور یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ ضعف کی تصریح کے بغیر بیان بھی کر سکتا ہے جب کہ حدیث کا تعلق احکام و عقائد سے نہ ہو بلکہ مواعظ، قصص اور فضائل میں ترغیب و ترہیب سے ہو۔ اگر حدیث احکام و عقائد سے متعلق ہو تو اس میں تساہل قطعاً ناجائز ہے۔ ائمہ حدیث میں عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن المبارک اور احمد بن حنبل کی یہی رائے ہے۔(۲)

حافظ ابن الہمام نے تصریح کی ہے کہ:

حدیث اگر ضعیف ہو اور موضوع نہ ہو تو اس سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔(۳)

لیکن حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور حافظ سخاوی نے القول البدیع میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حدیث ضعیف کی قبولیت کے لیے تین شرطیں ہیں:

- اول یہ کہ حدیث میں ضعف زیادہ نہ ہو یعنی حدیث کے راوی ایسے نہ ہوں جو جھوٹ میں شہرت رکھتے ہوں یا ان پر دروغ گوئی کی تہمت ہو یا کھلم کھلا غلطیوں کا شکار ہوں۔
- دوم یہ کہ حدیث جس مضمون پر مشتمل ہے اس کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو بات محض بے اصل اور من گھڑت نہ ہو۔
- سوم یہ کہ عمل کے وقت میں اس کے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ از روئے احتیاط اس پر عمل ہو۔ آخری دو شرطیں حافظ عزالدین بن عبدالسلام اور علامہ ابن دقیق العید کی بتائی ہوئی ہیں۔ اور پہلی شرط کو علائی نے اتفاقی قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالحی نے ظفر الامانی فی شرح مختصر الجرجانی میں ان سہ گانہ شرطوں کا تذکرہ کر کے مثالیں بھی دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) قواعد التحدیث: ص ۱۱۳　(۲) شرح الالفیہ: ص ۲۹۱　(۳) فتح القدیر: ج ۱ ص ۳۶۷

فقہاء احناف کا فیصلہ ہے کہ اذان کے کلمات آہستہ آہستہ دوہری آواز سے اور تکبیر جلدی اکہری آواز سے کہی جائے اور ایسا کرنا مستحب ہے اور اس پر انہوں نے ترمذی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو بحوالہ حضرت جابرؓ ان الفاظ میں آئی ہے کہ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا ہے کہ اے بلال جب اذان دو تو آہستہ آہستہ دو اور جب تکبیر کہو تو جلدی کرو۔ الخ............ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ ھو اسناد مجھول۔ امام دارقطنی نے اس کے راوی عبدالمنعم کی تضعیف کی ہے اس کے باوجود چونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کافی ہو جاتی ہے اس لیے فقہاء نے اس پر عمل کو مستحب قرار دیا ہے۔ نیز فقہاء حنفیہ وضو میں گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں اور اس پر وہ ایک ایسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ضعیف ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ طلحہ بن مصرف اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا تا آنکہ آپ نے قذال تک مسح کیا۔ قذال گردن کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں۔ یہ روایت معانی الاثار میں بھی ہے لیکن یہ سب روایات طلحہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ ابن القطان نے طلحہؒ ان کے والد اور ان کے دادا کو مجہول قرار دیا ہے۔(۱)

علامہ دوانی کا شبہ اور اس کا جواب:

علامہ دوانی نے انموذج العلوم میں یہاں ایک شبہ اٹھا کر ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ علامہ موصوف کے اس شبہ کو مولانا عبدالحی نے الاجوبۃ الفاضلہ میں' مولانا صدیق حسن خاں نے الحطہ میں اور علامہ جمال الدین القاسمی نے قواعد التحدیث میں بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے۔ ان کے شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ........ فقہاء ایک طرف فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب اور جواز معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ان کا ہی ارشاد ہے کہ استحباب ہو یا جواز۔

(۱) ظفر الامانی: ص ۹۸

یہ بھی احکام شرعیہ میں سے ایک حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف احکام سے استحباب و جواز ثابت ہوا گا تو اس کے نتیجے میں اس سے حکم شرعی کا اثبات ہو گا۔ اس لیے ایک طرف یہ کہنا کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ حدیث ضعیف سے احکام ثابت نہیں ہوتے دونوں میں اس لحاظ سے یقیناً تضاد ہے کہ استحباب اور جواز بھی خود حکم شرعی ہے۔ اگر حدیث ضعیف سے حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا تو لازماً استحباب بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

علماء نے اس شبہ کے متعدد جوابات دیئے ہیں اور خود علامہ دوانی نے بھی اس کے ازالہ کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔

علامہ احمد الخفاجی نے نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

حدیث ضعیف سے فضیلت کا ثابت ہونا کسی حکم کے ثابت ہونے کو مستلزم نہیں ہے ایسا عمل جس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت ہو اس کا ثواب یا اسے کران کی ترغیب یا صحابہ کی فضیلت یا اذکار ماثورہ کی فضیلت اگر کسی ضعیف حدیث سے معلوم ہو جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل حکم ہی ضعیف سے ثابت ہو رہا ہے۔ اعمال اور فضائل اعمال میں بہت بڑا فرق ہے۔(۱)

علامہ خفاجی کی بات بڑی گہری ہے اور اپنے اس بیان کے ذریعے وہ پڑھنے والوں کے کوزۂ ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے کسی عمل کا وجود ثابت نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ثابت شدہ موجود عمل جس کا وجود دلائل شرعیہ سے پہلے ثابت ہو چکا ہے صرف اس کی فضیلت کو حدیث ضعیف کے ذریعے ظاہر کیا جا سکتا ہے مثلاً نماز تہجد کی سنیت دلائل شرعیہ سے ثابت ہے اب اس ثابت شدہ سنت کی ترغیب کے لیے یا اس کی بزرگی کے اظہار کے لیے حدیث ضعیف کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف نے اس طرح علامہ دوانی کی اٹھائے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ مولانا صدیق حسن خاں نے صرف علامہ موصوف کے جواب پر

---

(۱) نسیم الریاض: ج ا ص ۵۴

ہی اکتفا فرمایا ہے اور اس سلسلے میں اپنی کوئی قیمتی رائے ظاہر نہیں فرمائی ہے۔ جمال الدین القاسمی نے علامہ موصوف پر بہت بڑی برہمی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور مولانا عبدالحی نے یہ فرما کر علامہ خفاجی کی بنائی ہوئی عمارت کو بے جان کر دیا ہے کہ خفاجی کا یہ موقف فقہاء اور محدثین دونوں کے خلاف ہے۔ فقہاء کے اس لیے کہ وہ ضعیف حدیث سے بلاشبہ ایسے عمل کے استحباب کو ثابت کرتے ہیں جس کا استحباب احادیث صحیحہ سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ محدثین کے اس لیے کہ وہ حدیث ضعیف کا فضائل' مناقب اور ترغیب و ترہیب کے موضوع پر ذکر کرتے ہیں۔ اگر فضائل اعمال سے وہی کچھ مراد ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو اس کا مقابلہ ترغیب و ترہیب میں قبولیت سے نہیں ہوسکتا۔ علامہ کا یہ ارشاد امام نووی کی اس تصریح کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے الاذکار میں کی ہے۔

اذا ورد حدیث ضعیف بکراهیة بعض البیوع او الانکحة فالمستحب ان یتنزه عنه۔(۱)

جب کوئی ضعیف حدیث نکاح یا سودے کی کراہت کو بتائے تو اس سے بچنا ہی اچھا ہے۔

اور حافظ ابن الہمام کے اس نظریہ کے بھی خلاف ہے۔

یثبت الاستحباب بالحدیث الضعیف۔(۲)

استحباب حدیث ضعیف سے ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اگر بالفرض وہی کچھ امر واقعہ ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو پھر ان شرائط میں کوئی افادیت نہیں رہتی جو قبول ضعیف کے لیے محدثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے قائم فرمائی ہیں کیونکہ اگر ضعیف سے صرف ان اعمال کی فضیلت ہی بیان ہوسکتی ہے جو احادیث صحیحہ کے ذریعے ثابت ہو چکے ہوں تو پھر یہ قید بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کہ حدیث ضعیف جس مضمون پر مشتمل ہو اس کی کوئی اصل موجود ہو اور یہ شرط بھی بالکل بے جان ہو جاتی ہے کہ عمل کے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الاذکار: ص ۷ (۲) فتح القدیر کتاب الجنائز

اس مقام پر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کا جواز یا استحباب کسی خاص حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس موضوع پر کوئی ضعیف حدیث آ جائے لیکن اس کا ضعف شدید نہ ہو تو اس سے جواز و استحباب ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کام کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو اور یہ کام اصول شرعیہ اور دلائل صحیحہ کے منافی نہ ہو۔(۱)

خود علامہ دوانی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ اگرچہ ذرا طویل ہے لیکن اسے یہاں نظر انداز کرنے سے بات ادھوری رہ جائے گی اس لیے یہاں اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

اس موضوع پر قابل اعتماد یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کی خوبی کسی حدیث سے معلوم ہو جائے اور وہ کام ناجائز اور مکروہ ہونے کے اندیشے سے بالا ہو تو ایسے موقعہ پر ضعیف پر عمل جائز اور مستحب ہے کیونکہ یہ ناجائز ہونے کے اندیشے سے پاک ہے اور اس پر ثواب کی توقع ہے اور اس توقع کی وجہ کام میں اباحت اور استحباب کی کشش ہوتا ہے بنا بریں ثواب کی وجہ کام کی امید پر عمل ہی میں احتیاط ہے۔ اور اگر خود کام ہی ناجائز اور استحباب کے درمیانی مقام پر ہو تو پھر ناجائز ہونا راجح ہے۔ اور اگر کام کراہت اور استحباب سے دوچار ہو تو اس میں فکر و غور کے لیے کافی گنجائش نکل سکتی ہے عمل کی صورت میں مکروہ کا شکار ہو سکتا ہے اور ترک کی حالت میں مستحب سے دستبرداری کی راہ ہے۔ اگر کراہت کا اندیشہ قوی ہو اور استحباب کا احتمال کمزور ہو تو ایسی حالت میں ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر کراہت کا اندیشہ کمزور ہو تو عمل میں احتیاط کا پہلو ہے۔ اور اگر طرفین برابر ہوں تو پھر بھی عمل میں استحباب کو اپنایا جائے گا۔ ان تمام صورتوں میں حدیث ضعیف پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ عدم جواز کا احتمال نہ ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کسی کام کا جواز ان صورتوں میں حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ باہر سے معلوم ہوتا ہے اور استحباب کا پتہ بھی حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ ان قواعد شرعیہ سے ہوتا ہے جو دین کی زندگی میں احتیاط کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے احکام میں سے کوئی چیز بھی حدیث

---

(۱) الاجوبۃ الفاضلۃ: ص ۵۵

ضعیف سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں حدیث ضعیف کے ذریعے استحباب کا احتمال رونما ہوتا ہے۔ اس لیے احتیاطاً اس پر عمل کیا ہے اور احتیاطاً عمل کا استحباب خود قواعد شرعیہ سے معلوم ہے۔(۱)

مولانا عبدالحی نے اس موضوع کے تفصیلی مباحث اور ان کی گہرائیاں ظفر الامانی میں سمیٹ دی ہیں۔ بہرحال متقدمین ہوں یا متاخرین۔ ضعیف میں اختلاف کے باوجود عمل بالضعیف پر متفق ہیں۔ اگرچہ اس کی وجوہات میں اختلاف ہے۔

متقدمین حدیث ضعیف پر عمل تابعین اور اتباع تابعین کی عملی تائید کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اور متاخرین تعدد طرق سے آنے کی بنا پر۔

متاخرین کے مابین جس حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں اختلاف ہے وہ ان کی اپنی اصطلاحی ضعیف ہے۔ اس کا متقدمین کی ضعیف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حدیث و قیاس میں تعارض اور امام اعظمؒ:

قانون کی اصول کی کتابوں میں قیاس کی جو تعریف کی گئی ہے ہم آپ کو بس اس میں الجھانا نہیں چاہتے۔ اس کی تفصیل مباحث آپ کو انشاء اللہ "امام اعظمؒ اور علم الشرائع" میں ملیں گے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام متناہی ہیں اور حوادث و واقعات جو روزانہ نت نئے پیش آ رہے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ اشہرستانی رقمطراز ہیں:

ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے۔ بے حساب اور بے شمار ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں پتہ ہے کہ ہر ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ حوادث و واقعات ان گنت اور احکام مقررہ ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ لامتناہی متناہی کی گرفت میں نہیں آ سکتا اس لیے یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ اسلام میں اجتہاد و قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش پا افتادہ حال کے لیے اجتہاد کے ذریعے راستہ معلوم ہو سکے۔

---

(۱) الملل والنحل: ج ۱ ص ۲۲

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار اور نبوت نے اجتہاد کا امت کو پروانہ دے کر ایک طرف اسلامی قانون کو بازیچہ اطفال بننے سے محفوظ کر لیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو بے راہ روی' آوارگی اور بے قید زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر چند گنے چنے لوگوں کو چھوڑ کر پوری امت نے قیاس کی شرعیت کو مانا ہے۔

امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد امام مزنی رحمہ اللہ قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہاء قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہٰذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیاء پر مماثل احکام کا نام ہے۔(۱)

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے وہ ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے۔(۲)

امام ابوبکر(۳) سرخسی نے اس موضوع پر مفید اور بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

---

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ　　(۲) اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۱۷۶

(۳) ان کا نام محمد بن احمد کنیت ابوبکر اور لقب شمس الائمہ ہے۔ ۴۸۳ھ ان کی تاریخ وفات ہے اصول فقہ میں ان کی یہ کتاب اب مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ حاجی خلیفہ نے ان کی اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب السرخسی نے خوارزم کے جیل خانہ میں لکھی ہے جب باب شروط پر پہنچے تو رہائی ہو گئی آپ فرغانہ پہنچے اور اس کتاب کی تکمیل کرائی (کشف الظنون: ص ۹۰) فرغانہ کو آج کل تاشقند کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حتی نے اپنی تاریخ ادب العرب میں اس کی تصریح کی ہے۔ مولانا عبدالحئی نے مدینۃ العلوم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصول فقہ کی اس کتاب اور شرح السیر الکبیر ان دونوں کو شمس الائمہ نے قید میں تصنیف کیا۔ حکام وقت کو نصیحت کی پاداش میں قید کیے گئے تھے۔ الفوائد البہیہ: ص ۵۷) اس مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے

﴿باقی صفحہ ۷۴۲ پر﴾

قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے بغداد کے کچھ متکلمین نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بعد ازیں ایک سادہ لوح شخص داؤد نامی آئے اور انہوں نے متقدمین کے اس سے متعلق انکار معلوم کیے بغیر ہی قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا۔ اور لوگوں کو بتایا کہ شریعت میں قیاس حجت نہیں ہے۔ ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہر یہ جو غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح بے نیاز ہیں بھی کچھ کہنے لگے۔ اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قتادہ، مسروق اور ابن سیرین کی طرف منسوب کی ہے۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان ہے۔ ان کا مقام اس سے کہیں بالا ہے کہ وہ اس قسم کی بات کہیں۔ (۱)

﴿بقیہ صفحہ ۷۴۱﴾ جس کا خود شمس الائمہ نے اپنی کتاب مبسوط کے مختلف مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ ان کو یہ تکلیف مسئلۃ النوائب کے سلسلہ میں اٹھانی پڑے۔ یعنی حکومت کی جانب سے بلاوجہ بھاری ٹیکس لگائے گئے اس کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا ان ٹیکسوں کا فتح القدیر میں اس طرح ذکر آیا ہے کالجبایات فی زماننا ببلاد فارس علی الخیاط والصباغ وغیرهم للسلطان فی کل یوم او الشهر او ثلاثة اشهر یعنی جیسے ہمارے زمانے میں بادشاہ فارس کے لیے درزی رنگریز وغیرہ روزانہ اور ماہانہ اور سہ ماہی ٹیکس لیا کرتے ہیں۔ (ج ۵ ص ۳۳۶) اس کے بعد حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ شمس الائمہ نے ان ٹیکسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ اکثر النوائب تؤخذ ظلماً و من تمكن من دفع الظلم عن نفسه فهو خير له زیادہ تر ٹیکس ظلماً ہی لیے جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات سے ظلم دور کر سکتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔ اور ان کو صرف اسی پر اصرار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص یہ ٹیکس دینا ہی چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو دے جو ظلم کی خود مدافعت نہ کر سکتا ہو یا ایسے فقیر کو دیدے جو کسی ظلم کا مقابلہ اس کے ذریعے کر سکے۔ اس طرح دینے والا ثواب کا مستحق ہوگا (فتح القدیر: ج ۵ ص ۳۳۶) بظاہر جیل میں قید کی مدت بہت لمبی تھی کیونکہ مبسوط شرح السیر الکبیر نیز اصول فقہ کا اکثر حصہ جیل ہی میں لکھا گیا ہے۔ شمس الائمہ کی تحریک کامیاب ہوئی۔ ابن خلکان نے ملک شاہ سلجوقی کے بارے میں لکھا ہے وابطل المكوس والخفارات فی جميع البلدان تمام ٹیکس وغیرہ ختم کر دیئے۔

(۱) اصول سرخسی: ص ۱۱۸، ص ۱۱۹

علامہ شوکانی بھی انکار قیاس کی خشت اول کی نشاندہی میں السرخسی کے ہمزبان ہیں۔
اولین شخص جس نے قیاس کا کھلم کھلا انکار کیا ہے نظام (۱) ہے اور اس کی معتزلہ میں سے کچھ لوگوں نے پیروی کی ہے مثلاً جعفر بن حرب، جعفر بن حبشہ، محمد بن عبداللہ۔
ان ہی کے پیچھے تاگے داؤد ظاہری نے بانٹے ہیں۔ (۲)

حافظ ابن عبدالبر مغربی نے حافظ ابو القاسم بغدادی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

ماعلمت احد اسبق النظام الی القول بنفی القیاس

نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے۔

اور اپنا یہ تاثر ظاہر کیا ہے:

لاخلاف بین فقهاء الامصار وسائر اهل السنة فی نفی القیاس فی التوحید واثباته فی الاحکام الاداود الظاهری فانه نفاه۔

فقہاء اور تمام اہل السنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے اور احکام میں درست ہے داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے۔ (۳)

تمام اہل السنت کی قید پر حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ شیعہ کا موقف اس موضوع پر اہل السنت سے بالکل جدا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں:

ایک طبقے نے قیاس کے موضوع پر شدید مخالفت کی ہے ان میں سب سے مخالف شیعہ ہیں وہ اسے قطعاً حجت نہیں مانتے ہیں۔ ان کے بعد اہل الظاہر ہیں اور ان کے سرگروہ داؤد ظاہری اور مذہب ظاہریہ کے مشہور ناشر حافظ ابن حزم ہیں۔ (۴)

---

(۱) ابراہیم بن سیار نظام غالی معتزلی ہے اس کے حالات کے لیے الفرق بین الفرق: ص ۱۱۳ تا ص ۱۳۶ دیکھئے۔ لسان المیزان: ج ۱ ص ۶۷، تاریخ بغداد: ج ۶ ص ۹۷۔ خطیب لکھتے ہیں: کان احد فرسان اهل النظر والکلام علی مذهب المعتزلة۔ الجاحظ بھی ان کے ہی شاگرد ہیں۔ شعر میں صرف ملکہ ہی نہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ دقت معانی کے مالک تھے۔ المرزبانی کا بیان ہے کہ ترقیق شعر اور تدقیق معانی میں نظام ایک مثالی شخصیت تھے۔ (تاریخ بغداد)　(۲) ارشاد الفحول: ص ۱۸۶

(۳) جامع بیان العلم وفضلہ: ج ۲　(۴) تاریخ الفقہ الاسلامی: ص ۲۴۴

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلافی نہیں ہے اور جن کو اختلاف ہے ان کی مخالفت اجماع میں قادح نہیں ہے جیسا کہ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

البتہ محل بحث یہ ہے کہ اگر قیاس اور خبر واحد میں تعارض ہو جائے تو کیا کیا جائے۔

کیا خبر واحد کو مخالف قیاس ہونے کی وجہ سے رد کر دیا جائے اور یا پھر خبر واحد کو قبول کر کے قیاس کو رد کر دیا جائے۔

اس موضوع پر امام اعظمؒ کی ترجمانی کرتے ہوئے بیگانوں نے نہیں بلکہ یگانوں نے کچھ پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

فخر الاسلام بزدوی علی بن محمد کا کہنا یہ ہے کہ اگر خبر واحد کے راوی اصحاب کبار ہوں مثلاً؟ خلفائے راشدینؓ عبداللہ بن مسعودؓ زید بن ثابتؓ معاذ بن جبلؓ ابو موسیٰ اشعریؓ عائشہ اور دیگر صحابہ جو علم و فضل میں شہرت رکھتے ہوں تو ان کی روایت کردہ حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ خود فخر الاسلام نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے:

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کا حفظ و ضبط بڑا کٹھن کام ہے آپ کو اللہ کی جانب سے شان جامعیت ملی تھی۔ صحابہ میں روایت بالمعنے کا عام رواج تھا اگر راوی حدیث کے معلوم کرنے اور اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو تو اس بات کا خطرہ درپیش ہوتا ہے کہ حدیث کا کوئی جز اس سے رہ نہ جائے اور اس طرح حدیث میں قیاس سے ایک شبہ زائد داخل ہو جائے گا لہٰذا اس میں احتیاط بھی زیادہ چاہیے۔ اور اس قصور فہم سے ہمارا مطلب صرف مقابلے کے وقت میں فقہ حدیث ہے صحابہ کی تحقیر ہرگز مقصود نہیں ہے۔ امام محمد متعدد مواقع پر امام ابوحنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالک کی روایت کو اپنایا ابو ہریرہ تو ان سے بڑھ کر ہیں اس باب میں ہمارے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ ایسے راویان حدیث کی روایت اس وقت ترک کی جائے گی جب اس کے قبول کرنے میں کسی طرح کی گنجائش نہ ہوگی۔ جب قیاس کے سب دروازے بند ہو جائیں گے اس وقت وہ حدیث کتاب اور سنت مشہورہ کی مخالف تصور کی جائے گی اور اجماع کی بھی۔ (۱)

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظمؒ کا جو موقف قرار دیا ہے یہ دراصل امام اعظمؒ کا نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان کا موقف ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری قمطراز ہیں:

هذا مذهب عيسىٰ بن ابان وتابعه اكثر المتاخرين

یہ عیسیٰ ابن ابان کا مذہب ہے اور اسی کی اکثر متاخرین نے پیروی کی ہے۔

ورنہ جہاں تک امام اعظمؒ کے اس موضوع پر موقف کا تعلق ہے وہ نہیں جو فخر الاسلام بتا رہے ہیں بلکہ وہ ہے جو ان کے بھائی صدر(۱) الاسلام سے صاحب تحقیق نے نقل کیا ہے کہ حدیث اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے تو حدیث کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا بشرطیکہ حدیث صحیح ہو اور کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔ صدر الاسلام نے امام اعظمؒ کے اس مسلک کی توجیہ فرمائی ہے کہ:

راوی کی عدالت اور ضبط ثابت ہو جانے کے بعد روایت میں تغیر وتبدل کا خیال ایک امر موہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ راوی جو کچھ پیش کرتا ہے یہ اس کی سنی ہوئی بات ہے بالفرض اگر الفاظ میں اس کی جانب سے کوئی تغیر بھی ہوتا ہے تو یہ ایسا تغیر نہیں ہوتا

---

(۱) یہ دو بھائی ہیں ایک کا نام علی بن محمد لقب فخر الاسلام کنیت ابوالحسن ہے اور ان کے چھوٹے بھائی کا نام محمد بن محمد لقب صدر الاسلام اور کنیت ابوالیسر ہے دونوں بھائی اپنے وقت کے امام ہوئے۔ ان کے جد امجد علامہ عبدالکریم صرف یہی نہیں کہ امام الہدیٰ ابومنصور الماتریدی کے تلامذہ میں سے تھے بلکہ اپنے وقت میں درس وتدریس کا حلقہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا۔ فخر الاسلام سمرقند کے قاضی تھے اور صدر الاسلام کا مستقر بخارا تھا۔ آخر زمانے میں بڑے بھائی کے انتقال کے بعد صدر الاسلام کو بھی سمرقند کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا **كان قاضى القضاة بسمرقند** (الجواہر: ج ۲ ص ۲۷۱) دونوں صاحب تصنیف ہیں۔ صدر الاسلام کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب "اصول دین" ہے۔ علامہ قاسم بن قطلوبغا نے ان کی تصانیف کے بارے میں ان کے شاگرد رشید نجم الدین محمد نسفی صاحب عقائد نسفیہ کا یہ تاثر لکھا ہے کہ **قد ملأ الشرق والغرب بمؤلفاته فى الاصول والفروع**۔ فخر الاسلام کی تصانیف میں ایک سے زیادہ کتابیں ہیں۔ مؤرخین نے ان کو امام فی الدنیا فی الفروع والاصول لکھا ہے۔ فخر الاسلام کی وفات بخارا میں رجب ۴۸۲ھ میں ہوئی۔ اور صدر الاسلام کی وفات رجب ۴۹۳ھ میں ہوئی ہے۔

جس سے مطلب بدل جائے کیونکہ ارباب عدالت راویوں کے بارے میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اہل زبان ہیں اور زباندانی کے ساتھ معنے کی تبدیلی کا گمان محض ایک خیال ہے۔ اور ان کی عدالت وتقویٰ مان کر ان پر زیادتی اور کمی کا شبہ کرنا بھی بے محل ہے۔ نیز جس قیاس کی بنا پر روایت کو رد کیا جا رہا ہے خود اس قیاس کی صحت ہی کی کیا ضمانت ہے؟ قیاس صحیح سے واقفیت بھی دشوار سے دشوار تر ہے لہٰذا حدیث کو اپنانا ضروری ہے۔(۱)

شیخ ابوالحسن کرخی نے بھی امام اعظمؒ کے مسلک کی یہی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں۔

شیخ ابوالحسن کرخی اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک حدیث کے قیاس پر مقدم کرنے کے لیے راوی کی فقاہت شرط نہیں ہے بلکہ روایت کی قبولیت کے لیے صرف راوی میں عدالت اور ضبط ہونا کافی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ حدیث قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو بلاشبہ ایسی حدیث کو قیاس پر بھی مقدم کیا جائے۔(۲)

حافظ ابن الہمام نے بھی امام اعظمؒ کا یہی مسلک بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اذا تعارض خبر الواحد والقیاس بحیث لا جمع قدم الخبر مطلقا عندالاکثر منھم ابو حنیفۃ والشافعی واحمد۔

حدیث اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے اور کسی طرح بھی دونوں کا باہم جمع کرنا ممکن نہ ہو تو پھر حدیث کو بلاشرط مقدم کیا جائے گا اکثر کی رائے یہی ہے ان ہی میں ابوحنیفہ شافعی اور احمد ہیں۔(۳)

دوسرے اکابر نے امام اعظمؒ کے اس موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں لیکن علامہ عبدالعزیز بخاری نے اسی سلسلے میں جو بات پوری قوت سے بتائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۱) کتاب التحقیق: ص ۱۶۴ (۲) کشف الاسرار: ج ۲ ص ۱۴ (۳) تیسیر التحریر: ج ۳ ص ۱۱۶

جو بات فخر الاسلام نے پیش فرمائی ہے یہ ہمارے اصحاب سے قطعاً منقول نہیں ہے ان سے اس کے برعکس جو کچھ روایۃً ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے اور اس بارے میں تفصیلاً ان سے کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ واقعات بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں۔ چنانچہ حدیث ابی ہریرہ کی وجہ سے بھول کر کھانے پینے سے روزہ نوٹنے کا فیصلہ ابو حنیفہؒ نے اسی بنا پر کیا ہے حدیث اگرچہ خلاف قیاس ہے لیکن اس کے باوجود اسی پر عمل ہے حتی کہ امام اعظمؒ سے منقول ہے کہ لولا الروایة لقلت بالقیاس۔ اس موضوع پر اگر یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کام لیتا۔ اور یہ بھی امام اعظمؒ سے منقول ہے کہ ماجاء نا عن اللہ والرسول فھو علی الراس والعین۔ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جو کچھ ہمارے پاس آئے وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ اس بنا پر ہمارے اسلاف میں سے کسی سے بھی روایت کی صحت کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط منقول نہیں ہے بلاشبہ یہ بات بعد کو گھڑی گئی ہے۔(۱)

فقہ احناف میں جن روایات پر عمل نہیں کیا گیا ہے مثلاً حدیث عرایا' حدیث مصراۃ' اور حدیث قرعہ۔ اور جن کے متعلق لوگوں نے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ خلاف قیاس ہیں۔ ان کا جواب دیتے ہوئے امام علامہ ابوالحسن کرخی رقمطراز ہیں:

یہ غلط ہے کہ ہمارے اصحاب نے ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ یہ خلاف قیاس ہیں بلکہ ان حدیثوں پر عمل نہ کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ہیں اور یہ وجہ بھی نہیں کہ ان کے راوی فقاہت کی نعمت سے محروم ہیں۔ حدیث عرایا سنت مشہورہ کے خلاف ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ التمر بالتمر مثل بمثل کیل بکیل۔ کھجور کے بدلے کھجور برابر برابر ہے۔ ہم یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ابو ہریرہ فقیہ نہیں تھے۔ آپ زمانہ صحابہ میں فتویٰ دیتے تھے حالانکہ اس زمانے میں غیر فقیہ کے فتویٰ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱) کتاب التحقیق: ص ۱۶۵

آپ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی ہے اور آپ سے روایت کردہ حدیثوں کو کافی شہرت ہوئی ہے۔(۱)

بہر حال یہ حقیقت بے غبار ہے کہ امام اعظمؒ اور آپ کے اصحاب سنت بلکہ اخبار آحاد تک کو قیاس کے مقابلے میں راجح قرار دیتے تھے اور یہی امام اعظمؒ کے موقف کی صحیح ترجمانی ہے۔

حدیث میں امام اعظمؒ کے اصول:

حدیث کی صحت اور اس کی قبولیت کے بارے میں امام اعظمؒ نے جو اصول مقرر فرمائے ہیں اور اس فن میں جو ایک فن کار کی حیثیت سے علمی خدمت سرانجام دی ہے اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک آپ بالاصفحات میں دیکھ چکے ہیں اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ تیسری صدی میں امام شعبہ اور یحییٰ بن معین کے زمانے تک امام اعظمؒ کی ذات گرامی اس فن میں ارباب حدیث کے یہاں صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت تھی۔

امام اعظمؒ کے وضع فرمودہ اصولوں کے بارے میں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کے نتیجے میں یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ امام اعظمؒ کے نام سے اس موضوع پر جو بھی سرمایہ ہے وہ سب یار لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اور تو اور مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے خاص خطیبانہ انداز میں برملا کہہ دیا کہ:

امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین کو ان اختراعی اصول وقواعد کا وہم وخیال بھی نہ گذرا ہوگا۔(۲)

میرے خیال میں یہ ان بزرگوں کی جانب سے بہت بڑی زیادتی ہے۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنے مزاج کے لحاظ سے الگ الگ ہیں۔

صحت حدیث اور قبولیت حدیث۔

صحت حدیث کے لیے اصول وقواعد اور قوانین وضوابط بنانا اگر محدثین کا کام ہے تو قبولیت کے لیے شرائط اور قوائد مرتب کرنا ارباب اجتہاد اور فقہاء کا کام ہے۔ حدیث کی صحت

(۱) کشف الاسرار ج ۲ ص ۳۳ (۲) تذکرہ: ص ۱۰۰

کے لیے بخاری اور مسلم کے نام سے جو شرائط' جو اصول وقواعد اور جو ضوابط متاخرین نے بتائے ہیں اور بتائے ہیں ان میں ایک بھی معاصرت اور لقاء کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری اور امام مسلم سے صراحۃً منقول نہیں ہے۔ بلکہ بتانے والوں نے کھلے بندوں یہ انکشاف کیا ہے:

اعلم ان البخاری و مسلماً ومن ذکر نابعد هم لم ینقل عن واحدمنهم انه قال شرطت ان اخرج فی کتابی مایکون علی الشرط الفلانی وانما یعرف ذالک من سبر کتبهم فیعلم بذالک شرط کل رجل منهم۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ سے ایسی کوئی مثبت تصریح نہیں آئی جس میں ان بزرگوں نے یہ بتایا کہ کتاب میں تخریج روایت کی فلاں شرط کی میں نے پابندی کی ہے ان کی شرائط کا پتہ ان کی کتابوں کا مطالعہ سے ہوتا ہے اور بس۔(۱)

الجزائری بھی علامہ مقدسی کے ہمزبان ہیں۔فرماتے ہیں:

اعلم ان البخاری لم یوجد عنده تصریح بشرط معین وانما اخذ ذالک من تسمیة الکتاب والا ستقراء من تفرقه۔

خود بخاری کی کسی شرط کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے ان کی کتاب کے نام اور کتاب میں ان کے تفردات سے لوگوں نے خود یہ اخذ کرلیا ہے۔(۲)

اگر حدیث کی صحت کے لیے شرائط وضوابط کا پیانہ ان بزرگوں کے طرز عمل سے معلوم کر کے بتایا جاسکتا ہے اور اسے ان بزرگوں کی طرف منسوب بھی کیا جاسکتا ہے تو پھر ائمہ مجتہدین ابوحنیفہ' ابو یوسف اور محمد کی کتابوں میں طرز عمل سے اگر متاخرین نے کچھ قواعد معلوم کر کے ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیئے تو اس میں کون سی قباحت ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر قوانین کی تخریج کو صرف برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر تحسین وآفرین کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔لیکن قبولیت حدیث کے میدان میں ائمہ اجتہاد کی طرف منسوب اصول وقوانین طبع نازک پر گراں ہوتے ہیں اور ان پر تخریجی ہونے کی پھبتی اور اختراعیت کا آوازہ کسا جاتا ہے۔فیاللاسف ویاللعلو والی الله المشتکی۔

---

(۱) شروط الائمۃ الستۃ: ص ۱۵ (۲) توجیہ النظر: ص ۸۸

دوسرے علوم وفنون کی طرح حدیث بھی ایک فن ہے اس کے بھی دوسرے علوم کی طرح تقاضے ہیں بتایا جائے آخر وہ کون سا علم ہے جس میں قواعد وضوابط تخریجی نہیں ہوتے۔ اشتقاق، تصریف، معانی، بدیع، بیان، نحو وغیرہ زبان اور لغت سے متعلق اصول وقوانین کا نام ہے۔ کیا ان میں کوئی بھی منصوص ہے؟ سب کے سب بعد میں آنے والوں کے اختراعی اور تخریجی قوانین وضوابط ہیں۔ اس طرح کی تخریج اگر ی طور پر غلط ہے تو علوم وفنون کی پوری دنیا مشکوک ہو کر رہ جائے گی اور کسی فن کے قواعد وضوابط کو بھی اعتماد ووثوق کا پروانہ نہیں مل سکتا۔

اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا اسم گرامی بھی پیش کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور انصاف میں ان اصول وضوابط کے تخریجی ہونے کی تصریح کی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا اختلاف بزدوی وغیرہ کی کتابوں میں بیان شدہ اصولوں پر مبنی ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اصول زیادہ تر ان کے اقوال پر تخریج کیے گئے ہیں۔(۱)

شاہ صاحب کی اس عبارت سے یہ سمجھنا کہ جملہ قواعد کا علمی سرمایہ تخریجی ہے اور چونکہ تخریجی ہے اس لیے یہ سرمایہ ناقابل اعتبار ہے بہت بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ شاہ صاحب تو اس عبارت کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے دماغوں میں مقدسی اور حازمی کی طرح ان قواعد کی تاریخی حیثیت پیش فرما رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ قوانین تخریجی ہیں اور صاحب مذہب سے خود مروی نہیں ہیں اور اس موضوع پر شاہ صاحب کے اس انکشاف کی حیثیت حرف بحرف وہی ہے جو مقدسی اور حازمی کے اس انکشاف کی ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر شرائط وغیرہ کا سرمایہ بخاری ومسلم کا خود ساختہ اور پرداختہ نہیں ہے بلکہ ان کے بعد میں آنے والے محدثین کا اختراعی اور تخریجی ہے جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں۔

---

(۱) الانصاف: ص۸۲

انصاف ہی میں شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ:

ان قواعد کی پابندی اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات میں تکلف سے کام لینا جیسا کہ بزدوی کا کام ہے متقدمین کا ہرگز شیوہ نہیں ہے۔

شاہ صاحب کے اس ارشاد کی حیثیت بھی بالکل اس محاکمہ کی ہے جو حافظ ابن الہمام نے ان متاخرین محدثین کے جواب میں پیش کیا ہے جنہوں نے حدیث کی اصحیت کو بخاری و مسلم کے دائرے میں محدود کر دیا تھا۔ حافظ ابن الہمام نے بتایا کہ:

یہ خواہ مخواہ کی اُپج ہے اس میں کسی کی تقلید روا نہیں ہے کیونکہ اصحیت کا مدار تو صرف ان شروط پر ہے جو ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ اگر یہی شرطیں ان دو کتابوں کے علاوہ کہیں اور بھی پائی جائیں تو پھر اصحیت کو ان میں محدود کرنا بالکل بے معنے ہے۔(۱)

یہ بات حافظ ابن الہمام نے ان سے کہی ہے کہ جو صحیحین کی حدیثوں کی اصحیت کا صرف صحیحین میں ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں۔ اور تو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو شیخ ابن الہمام کے خلاف استغاثہ کرنا پڑا۔ وہ فرماتے ہیں:

ابن الہمام نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیئے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں بلکہ محض ان شروط کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اگر دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر اتر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے۔ اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے۔(۲)

اتفاق امت' شہرت اور قبول کی پوری داستان محدثین کی زبانی آپ پہلے سن چکے ہیں اس لیے یہاں اس کا تکرار بے معنے ہے۔

بہر حال اگر شاہ صاحب اور حافظ ابن ہمام دونوں کا آپ موازنہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں ایک روح کام کر رہی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ شاہ صاحب

(۱) توضیح الافکار: ج ۱ ص ۸۹ (۲) ترجمان القرآن: ج ۲ ص ۵۰۰

متاخرین فقہاء کے بارے میں وہی بات کہہ رہے ہیں جو ابن الہمام نے متاخرین محدثین کے بارے میں کہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اصول و قواعد صحت حدیث سے متعلق ہوں یا قبولیت سے۔ دونوں تخریجی اور اختراعی اور بعد میں آنے والوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ نہ تو محدثین کے یہاں صحت حدیث کے اصول بذریعہ وحی آئے ہیں اور نہ فقہاء کے پاس قبولیت حدیث سے متعلق قوانین منصوص ہیں۔ اگر قواعد وضوابط کو یہ کہہ کر پس انداز کر دیا جائے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں تو تمام نظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا۔

اس میں علمی طور پر کوئی تک نہیں کہ اصول و قواعد تخریجی ہیں اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اس کی جگہ یہ بات عقل کو اپیل کرتی ہے کہ فن کے قواعد اہل فن کے بنائے ہوئے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کسی فن میں غیر فنکاروں سے استفادہ فن سے اعتماد ہٹا دیتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے۔

> تمام اسلامی فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی بات حجت ہو گی۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو علوم وفنون کی دنیا ختم ہو جائے کیونکہ اناڑی اول تو فن میں بات نہ کر سکے گا اور اگر بات کرے گا تو غلط کرے گا۔(۱)

یہ بات تو مبنی برانصاف ہے لیکن اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے کہ اصول و قواعد کو تخریجی بتا کر غیر معتبر قرار دے دیا جائے۔ اسے اگر بطور اصل تسلیم کر لیا جائے تو فن قرأت میں تجوید کے اصول، ادب ولغت میں لغت وزبان کے قواعد، فقہ میں اصول فقہ، حدیث میں اصول حدیث، تفسیر میں اصول تفسیر سب ہی انسانوں کے وضع کردہ اور تخریجی ہیں۔ ان کو اگر یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ وضعی اور تخریجی ہیں تو اسلام کے پورے علمی سرمایہ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اصول و قواعد حدیث کے ہوں یا فقہ کے۔ سب انسانی محنتوں کے مرہون منت ہیں اس لیے یہ کہنا کچھ وزن نہیں رکھتا کہ احناف نے کچھ شرطیں لگا لی ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے مجموعۃ الرسائل میں لکھا ہے:

---

(۱) الروض الباسم: ج ا ص ۷۷

بہت سے اہل الرائے نے اکثر احادیث کا ایسی شرطوں کی وجہ سے انکار کر دیا جو انہوں نے خود لگا ئیں۔(۱)

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ حدیث کی صحت کے لیے اگر محدثین متاخرین شرطیں مقرر کریں تو یہ درست اور علم کی خدمت سمجھی جائے اور حدیث ہی کی قبولیت کے میدان میں اللہ کے دین میں احتیاط کی خاطر اگر احناف شرطیں بتائیں تو ان کو خود لگائی ہوئی شرطیں قرار دیا جائے۔ دونوں امتی ہیں دونوں فن کی خدمت اللہ کے دین کی خاطر کر رہے ہیں دونوں کا پیش نہاد دین کی حفاظت ہے دونوں میں یہ امتیاز کچھ قرین انصاف نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ اصول وضوابط بخاری ومسلم کی طرح امام اعظمؒ سے صراحۃً منقول نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدوین قانون کے موقعہ پر حدیث کے بارے میں کچھ ضوابط ان ائمہ مجتہدین کے ضرور پیش ہوں گے جن کی روشنی میں انہوں نے حدیث وسنت کو قانون سازی میں استعمال کیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے حدیث کی تصنیف کے موقعہ پر کچھ قوانین وضوابط ضرور ائمہ ستہ حدیث کے پیش نظر تھے جن کی روشنی میں انہوں نے حدیث کے یہ مجامیع تیار کر کے اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان سے اگر صراحۃً اصول وضوابط کا کوئی سرمایہ منقول نہیں ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت حدیث کے لیے ان بزرگوں کے پیش نظر کوئی ضابطہ ہی نہ تھا ایسے ہی حدیث کی قبولیت کے بارے میں اگر ائمہ مجتہدین ابوحنیفہؒ ابو یوسفؒ اور محمدؒ سے اصولی سرمایہ صراحۃً منقول نہیں تو اس کا بھی ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تدوین شریعت کے میدان میں یہ بزرگ حدیث کی حد تک کسی قاعدے اور آئین کے پابند نہ تھے۔ یقیناً آپ کچھ قواعد کے ضرور پابند ہوں گے۔ باقی ان کا مدون نہ کرنا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اصول وقوانین کا وجود ہی نہ تھا اور تدوین شریعت کا سارا کام محض جزاف سے ہو رہا تھا۔

جن علماء نے اصول وقوانین پر تدوین کی خدمت انجام دی ہے انہوں نے اس کو ائمہ مذہب سے منقول فروعی علمی سرمایہ سے اخذ کر کے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ قاضی ابو سف

(۱) مجموعۃ الرسائل والمسائل: ج ۵ ص ۲۱

کی کتاب الخراج' اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ' الرد علی سیر الاوزاعی اور امام محمد کی الحجۃ علی اہل المدینۃ' موطا' کتاب الآثار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر امام اعظمؒ کے استدلال کے قواعد عامہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا منشاء:

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اپنے مطالعہ میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہ صاحب انصاف اور حجۃ اللہ میں ان اصول وقوانین کے خلاف نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان جیسے حضرات کی ان آراء کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر حنفی فقہ میں داخل ہو گئی ہیں اور جن کو بعض جامد قسم کے فقہاء نے جدل ومناظرے کے لیے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اس احتجاج میں شاہ صاحب منفرد نہیں بلکہ امام ابوالحسن کرخی اور حافظ ابن الہمام کی زبانی آپ پہلے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ جن قواعد کا نام لے کر شاہ صاحب نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ صاحب مذہب سے منقول نہیں ہے اور ان کے لیے جن محققین کا حوالہ دیا ہے وہی آراء ہیں جن کو متاخرین نے اصول کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ان قواعد کے ائمہ مذہب سے منقول نہ ہونے پر محققین کا یہ قول کافی ہے کہ یہ قاعدہ کہ ایک راوی جو ضبط وعدالت میں معروف ہو مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو تو اس کی وہ روایت واجب العمل نہ ہوگی جس سے رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جاتا ہو جیسے حدیث مصراۃ۔ یہ عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین اس کے قائل ہیں۔ لیکن امام کرخی اور بہت سے علماء کے نزدیک راوی کا فقیہ ہونا ضروری نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث قیاس پر مقدم ہے۔(۱)

یہ تصریح اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ شاہ صاحب اصول وقواعد کی مطلق نفی نہیں فرما رہے ہیں جو ائمہ نے ارباب مذاہب کی فروعات سے اخذ کیے ہیں بلکہ ان آراء کی تردید کر

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ: ج ۱ ص ۱۶۱

رہے ہیں جن کا نام اصول رکھ لیا گیا ہے اور جن کا ارباب مذاہب سے تعلق نہیں ہے۔ ورنہ جہاں تک ان اصول وقواعد کا تعلق ہے جو ہم نے کتاب میں حدیث کے موضوع پر امام اعظمؒ کا نام لے کر پیش کیے ہیں وہ امام اعظمؒ نے دلیل و برہان کے تحت اختیار کیے ہیں اور ان پر آج تک کسی بھی محدث نے یہ تنقید نہیں کی ہے کہ یہ اختراعی ہیں اور امام اعظمؒ سے ثابت نہیں ہیں۔ اس موضوع پر امام اعظمؒ کو دوسری صدی کے محدثین کی پوری پوری حمایت حاصل ہے بلا ریب جیسے معانی قرآن سے تصادم کے موقعہ پر کسی حدیث کو قبول نہیں کیا ایسے ہی انہوں نے صرف خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے کبھی کسی حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس سے متعلق بحث واجتہاد کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ حکیم الامت نے امام اعظمؒ کے اس موقف کی یہ کہہ کر وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ روزے دار اگر بھول کر کھا پی لے تو امام اعظمؒ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے ہیں حالانکہ روایت ابی ہریرہ قطعاً خلاف قیاس ہے اس موقعہ پر امام اعظم فرماتے تھے کہ اگر روایت نہ ہوتی تو میں قیاس کے مطابق فتویٰ دیتا۔(۱)

اسی سے ان تمام اصول وضوابط اور قواعد وقوانین کا اندازہ لگا لیجئے جو حدیث سے متعلق آپ پیچھے اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔

اصول وضوابط صحت وقبولیت حدیث:

ارباب روایت اور ائمہ اجتہاد کے نقطہ نگاہ میں چونکہ بنیاد ہی پر ایک عظیم فرق ہے اس لیے ان کے پیش فرمودہ اصول وضوابط میں بھی اختلاف ناگزیر ہے۔ جو حیثیت محدثین کی حدیث کی صحت اور رجال اسناد میں ہے وہ ہی حیثیت مجتہدین کی حلال وحرام کے احکام کی معرفت میں ہے اور دونوں میں ایسے بھی ہیں جن کو دونوں فنوں میں امامت حاصل ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کی تردید میں لکھی ہے، رقمطراز ہیں:

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ: ج ۱ص ۱۶۱

امام یحییٰ بن معینؒ' بخاریؒ' مسلمؒ' ابو حاتمؒ' ابو زرعہؒ' نسائیؒ' ابن عدیؒ' دار قطنیؒ اور ان جیسے حضرات کے کلام کی حیثیت رجال اور صحیح وضعیف احادیث کے بارے میں وہی ہے جو امام مالکؒ' سفیان ثوریؒ' اوزاعیؒ' شافعیؒ اور ان جیسے حضرات کے کلام کی احکام اور حلال وحرام کی معرفت کے باب میں ہے۔ اور ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو محدثین میں بھی امام ہیں اور فقہاء میں بھی اور دونوں جماعتوں میں شامل ہیں۔ گو ان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے۔ اور حدیث وفقہ کے اکثر امام جیسے مالکؒ' شافعیؒ' احمد اور اسحاق ابن راہویہ اور اسی طرح اوزاعیؒ' ثوری اور لیث ایسے ہی تھے اور اسی طرح ابو یوسف صاحب ابی حنیفہ اور خود امام ابو حنیفہ کا بھی وہی مرتبہ ہے جو ان کے شایان شان ہے۔(۱)

محدثین کا خاص موضوع اخبار آحاد وآثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا ہے اور بس۔ اس لیے ان پر اخباری نقطہ نظر غالب ہے اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں صرف اس کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اسناد ورجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہے؟

اس کے برعکس مجتہدین کے پیش نظر صرف اسناد ورجال ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کا پورا سسٹم ہوتا ہے اس بنا پر حدیث کی قبولیت کے ضوابط ان کے یہاں اس کے زیر اثر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حازمی فرماتے ہیں:

اما الفقهاء فمدارك الضعف عندهم محصورة وجلها منوط بمراعاة ظاهر الشرع۔

فقہاء کے یہاں اسباب ضعف حدیث محدود ہیں اور ان میں عظیم تر یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث ظاہر شریعت سے کس قدر موافق ہے۔(۲)

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شریعت کے پورے سسٹم پر نظر ہونے کا یہ مطلب بتایا ہے کہ:

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرأت اور تفسیر'

(۱) الرد علی البکری: ص ۱۳' ص ۱۴ (۲) شروط الائمۃ الخمسہ: ص ۵۱

احادیث کا علم مع اسانید اور صحیح وضعیف کی معرفت' مسائل میں سلف کے ارشادات سے واقفیت' عربی زبان کا علم' استنباط مسائل اور نصوص میں تطبیق کا علم۔(۱)

مولانا محمد اسماعیل الشہید نے مجتہدین کو شریعت کے پورے سسٹم پر بحیثیت مجموعی نظر ہونے میں انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

پس مشابہ بانبیاء دریں فن مجتہدین متبولین اند۔ پس ایشاں را راز ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ۔ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گذشتہ فاما مقبول درمیان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ۔ بنا علیہ درمیان جماہیر اسلام از خواص وعوام بلقب امام معروف گردیدند۔

اس فن میں انبیاء سے مشابہت رکھنے والے مجتہدین ہیں ان کو اس فن کا امام سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ۔ اگر چہ مجتہدین بہت ہوئے ہیں لیکن جمہور امت میں مشہور یہی چند ہستیاں ہیں۔ اس لیے گویا پوری پوری مشابہت اس فن میں ان کے ہی حصہ میں آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور امت کے خواص وعوام میں یہی بزرگ امام کے لقب سے مشہور ہوئے ہیں۔(۲)

اور امامت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ:

امامت در ہر کمال عبارت است از حصول مشابہت تامہ بانبیاء اللہ دراں کمال۔

اور علامہ شاطبی نے اسی کمال کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ:

انما تحصل درجة الاجتهاد ولمن اتصف بوصفين احدهما فهم مقاصد الشريعة على كما لها والثانى من الاستنباط۔

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف ہوتا ہے ایک یہ کہ پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو دوسرے یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔(۳)

اسی کی جھلک آپ ان اصولوں میں دیکھیں گے جو ان بزرگوں نے ردو قبولیت روایات کے لیے وضع فرمائے ہیں اور جن کے پیش نظر ان بزرگوں کی یہ حیثیت نہیں وہ ذرا سے

---

(۱) ازالۃ الخفاء (۲) منصب امامت: ص ۵۳ (۳) الموافقات: ج ۱ ص ۳۴

فکری اختلاف کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جس طرح روایت واسناد کو شب و روز کنگھالتے کنگھالتے محدث کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اور غیر صحیح سند کو اپنے ذوق سے پہچان لیتا ہے۔

چنانچہ بتانے والوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے:

میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے دریافت کیا کہ آپ سلسلہ روایت میں جھوٹے کا پتہ کیسے لگا لیتے ہیں؟ فرمایا جیسے حکیم مجنون کا پتہ لگا لیتا ہے۔

اور اسی کمال کو وہ اپنے الفاظ میں یوں تعبیر کرتے تھے کہ:

معرفة الحدیث الھام۔ (حدیث کی معرفت الہام ہے)۔(۱)

ٹھیک ٹھیک اسی طرح مجتہد کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ متن حدیث پر نظر ڈالتے ہی یہ بتا دیتا ہے کہ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔ احادیث پر نظر ڈالتے وقت مجتہد کا یہی ملکہ رد وقبول کا معیار بن جاتا ہے۔ شریعت کا مزاج عین مزاج نبوت ہے۔ جو شخص شریعت کے مزاج کو سمجھتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ متون احادیث کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ ان میں سے کون سا ارشاد اور کون سا عمل صاحب نبوت کا ہو سکتا ہے۔ بہر حال صحیح اور غیر صحیح سند کو پہچاننے کا ملکہ ہو جو محدثین کو ہوتا ہے یا متن حدیث کے رد وقبول کا ملکہ ہو جو مجتہدین کو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حالتیں سرتا سر ذوقی ہیں اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی ہیں اس لیے ان میں باہم اختلاف کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے متن حدیث کی حد تک جیسے ائمہ مجتہدین میں بکثرت مسائل میں اختلاف ہوا ہے ایسے ہی صحت اسناد کی حد تک ائمہ روایت کے درمیان بھی روایات میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔

ایک حدیث کو امام مسلم اس تحدی کے ساتھ اپنی صحیح میں لاتے ہیں کہ:

لیس کل شیٔ عندی صحیح وضعتہ ھھنا انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ۔

---

(۱) تذکرة الحفاظ: ج ۱ص ۳۰۲

ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا۔ میں نے صحیح مسلم میں صرف ان حدیثوں کو درج کیا ہے کہ جن کی صحت پر شیوخ کا اجماع ہے۔(۱)
لیکن اس کے باوجود بہت سی حدیثیں ہیں جن کو کسی علت قادحہ کی بنا پر امام بخاری نے روایت نہیں کیا۔ یہاں حافظ عبدالقادر قرشی کا بہت قیمتی بیان پڑھنے کے لائق ہے جو انہوں نے ایک ناقد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

حافظ رشید عطار نے اُن حدیثوں پر ایک کتاب لکھی ہے جو صحیح مسلم میں مقطوع آئی ہے۔ اس کتاب کا نام "الفوائد المجموعہ فی شان ماوقع فی مسلم من الاحادیث المقطوعہ" ہے۔ اور یہ جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیث کو اگر شیخین روایت کر لیں تو بس معاملہ پار ہے۔ فنی لحاظ سے یہ محض ادعاء ہے اور حدیث کی قوت کی یہ کوئی قانونی ضمانت نہیں ہے۔ آخر یہ مسلم ہی تو ہے جس میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے بھی روایات آتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلم میں اس قسم کے راویوں کی روایات کا درجہ محض شواہد توابع اور اعتبار کا ہے درست نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ شواہد اور توابع کی مدد سے کسی حدیث کا حال معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ امام مسلم نے کتاب میں اگر صحت کا التزام کیا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ وہ حدیث جو خود ان راہوں سے آتی ہو وہ صحیح کیسے ہوگی؟ سب مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ محدثین کے یہاں حدیث میں ان اور عــن کی تعبیر انقطاع کی نشاندہی کرتی ہے لیکن بخاری اور مسلم دونوں اپنی کتابوں میں عنعنہ پر مشتمل روایات لائے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کوئی معنویت نہیں رکھتا کہ عنعنہ صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں میں منقطع ہونے کی نشانی ہے۔ امام مسلم نے بحوالہ ابی الزبیر عن جابر بہت سے معنعن حدیثیں روایت کی ہیں حالانکہ حفاظ کا فیصلہ ہے کہ ابو الزبیر مدلس ہے۔ حافظ ابن حزم اور حافظ عبدالحق نے لیث بن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے ابو الزبیر سے دریافت کیا کہ مجھے وہ حدیثیں سناؤ جو تم نے خود جابر سے سنی ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب التشہد

انہوں نے صرف سترہ حدیثیں سنائیں۔ اس بنا پر حفاظ کہتے ہیں کہ لیث کی حدیثیں بحوالہ ابی الزبیر عن جابر صحیح ہیں لیکن مسلم میں جابر کی بحوالہ ابی الزبیر ایسی بھی حدیثیں ہیں جو لیث کی وساطت سے نہیں آئی ہیں اور جن میں عنعنہ ہے۔

نیز امام مسلم نے جابر اور ابن عمر کے حوالہ سے حجۃ الوداع کے موضوع پر یہ روایت پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دسویں ذی الحجہ کو مکہ تشریف لے گئے آپ نے وہاں طواف افاضہ کیا پھر مکہ ہی میں نماز پڑھ کر منیٰ واپس تشریف لائے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ طواف افاضہ کر کے منیٰ تشریف لائے اور نماز ظہر منیٰ میں ادا کی۔ دونوں رواتیوں کو جمع کرنے کے لیے یہ توجیہ کرتے ہیں کہ نماز تو مکہ ہی میں ادا کی مگر منیٰ میں بیان جواز کے لیے دوبارہ پڑھی۔ مگر حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان دونوں رواتیوں میں سے ایک بلاشبہ جھوٹ ہے۔ ایسے ہی مسلم میں حدیث اسراء میں یہ اضافہ آیا ہے کہ واقعہ اسراء آپ کو وحی آنے سے پہلے پیش آیا ہے۔ حفاظ حدیث نے اس پر بڑی لے دے کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

ایسے ہی مسلم کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت باتفاق حفاظ ضعیف ہے۔(۱)

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے ائمہ مجتہدین قبولیت حدیث کی حد تک مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں اور ایسے ہی محدثین بھی روایت حدیث کی حد تک صحت حدیث میں اختلاف رکھتے ہیں اور قبولیت وصحت میں ان کے فکری اختلاف کا مظاہرہ ان اصول وضوابط میں بھی ہوا ہے جو اس موضوع پر ان بزرگوں سے منقول ہیں۔

تلامذۂ حدیث اور امام اعظمؒ:

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو پھر جیسا کہ امام ابن حجر مکی نے لکھا ہے کہ امام اعظمؒ کی عظمت شان کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کو ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کرنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الجواہر المضیہ: ص ۴۳۰

مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء محدثین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظمؒ کی شاگردی اختیار کی ہے مثلاً امام جلیل عبداللہ بن المبارک جن کی جلالت قدر پر اتفاق عام ہے۔ اور جیسے امام لیث بن سعد اور مالک بن انس۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ناھیک بھولا الائمۃ ابوحنیفہ کو سمجھنے کے لیے بس یہ ائمہ کافی ہیں۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حدیث میں امام اعظمؒ کے یہ تلامذہ بتا ہیں:

روی عنہ ○ عباد بن العوام ○ ابن المبارک ھشیم و وکیع و مسلم بن خالد ○ وابو معاویہ ○ والمقری۔(۱)

شیخ الاسلام ابو محمد عبدالرحمن بن ابی حاتم رازی نے ان پر عبدالرزاق بن ہمام اور ابو نعیم کا اضافہ اور کیا ہے۔(۲) حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔

حماد ○ ابراہیم بن طہمان ○ حمزۃ بن حبیب الزیات ○ زفر بن الہذیل ○ ابو یوسف القاضی ○ ابو یحیٰی الحمانی ○ عیسٰی بن یونس ○ یزید بن زریع ○ اسد بن عمرو البجلی ○ حکام بن یعلی الرازی ○ خارجہ بن مصعب ○ عبدالمجید بن ابی رواد ○ علی بن مسہر ○ محمد بن بشیر العبدی ○ مصعب بن المقدام ○ یحیٰی بن یمان ○ نوح بن ابی مریم ○ ابو عاصم۔(۳)

حافظ عسقلانی نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ و آخرون یعنی ابوحنیفہ کے حدیث میں صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی تلامذہ ہیں۔

خطیب بغدادی نے ان ناموں کی اور نشاندہی کی ہے:

یزید بن ہارون ○ علی بن عاصم ○ یحیٰی بن نصر ○ عمرو بن محمد ○ ہوذہ بن خلیفہ۔(۴)

حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے والے دو قسم کے تلامذہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جنھوں نے فقہ میں امام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور دوسرے وہ ہیں جنھوں نے حدیث میں امام صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور دونوں کے لیے حافظ ذہبی نے جو تعبیری زبان اختیار کی ہے وہ الگ الگ ہے قسم اول کے لیے وہ لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) تاریخ کبیر: ج ۴ ص ۸۱　(۲) کتاب الجرح والتعدیل: ج ۴ ص ۴۴۹
(۳) تہذیب التہذیب: ج ۱۰ ص ۴۴۹　(۴) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۲۴

تفقه به جماعة من الكبار منهم زفر بن الهذيل و ابو يوسف القاضي الى اخره۔

اور قسم ثانی کے لیے وہ فرماتے ہیں۔

روى عنه من المحدثين والفقهاء عدة لا يحصون۔

اس کے بعد ان گنت محدثین میں سے چند محدثین کا بطور مشتے از خروار تذکرہ کیا ہے۔ خود ان کی زبانی یہ نام گوش گذار فرمایئے:

فمن اقرانه مغيرة بن مقسم وذكريا بن ابي زائده ومسعر بن كدام وسفيان الثوري ومالك بن الحسن بن صالح وابوبكر بن عياش وحفص بن غياث ○ جرير بن عبدالحميد المحاربي ○ ابواسحاق الفزاري ○ اسحاق بن يوسف الازرق ○ المعافى بن عمران ○ زيد بن الحباب ○ سعد بن الصلت ○ حفص بن عبدالرحمن ○ عبيدالله بن موسى ○ محمد بن عبدالله الانصاري ○ ابو اسامه ○ ابن نمير ○ جعفر بن عون ○ اسحاق بن سليمان الرزاي۔(۱)

ہم نے بالارادہ تکرار سے بچنے کے لیے ان ناموں کو چھوڑ دیا ہے جو پہلے آ چکے ہیں۔ حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ سارے تلامذہ کا استقصا نہیں کیا ہے اس کے باوجود انہوں نے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں تلامذہ کی بہتات کا تذکرہ کرنے اور نمونہ کے چند نام ذکر کرنے کے بعد "وبشر كثير" اور مناقب میں "وخلائق" فرما کر تلامذہ کی کثرت کو بتایا ہے۔

اس بہتات کے اجمال تذکرے کو حافظ عبدالقادر قرشی نے یہ کہہ کر بے نقاب کیا ہے کہ:

روى عن ابى حنيفة نحو من اربعة الاف نفر۔(۲)

تلامذہ کی اسی کثرت اور بہتات کے تذکرے میں حاشیہ نسائی میں حافظ ابن حجر کے حوالے سے بعض ائمہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ:

---

(۱) مناقب ذہبی۔ ص ۱۲ (۲) الجواہر المضیۂ

اسلام کے مشہور اماموں میں سے کسی کے اتنے اصحاب اور شاگرد نہیں ہوئے جس قدر امام ابو حنیفہ کے ہوئے اور جس قدر علماء نے آپ سے استفادہ کیا ہے کسی اور سے نہیں کیا۔

امام اعظمؒ کے تلامذہ کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود مملکت بھی اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ امام حافظ الدین بن البزار الکردریؒ نے امام اعظمؒ کے مخصوص تلامذہ کا تفصیلی تذکرہ لکھنے کے بعد سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور صوبہ وار ان کو شمار کیا ہے۔ چنانچہ جن صوبہ جات و ممالک کا اس سلسلے میں انہوں نے نام لیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

مکہ معظمہ ○ مدینہ منورہ ○ کوفہ ○ بصرہ ○ واسطہ ○ موصل ○ جزیرہ ○ رقہ ○ نصیبین ○ دمشق ○ رملہ ○ مصر ○ یمن ○ یمامہ ○ بحرین ○ بغداد ○ اہواز ○ کرمان ○ اصفہان ○ حلوان ○ استرآباد ○ ہمدان ○ نہاوند ○ رے ○ دامغان ○ قومس ○ طبرستان ○ جرجان ○ نیشاپور ○ سرخس ○ نسا ○ مرو ○ بخارا ○ سمرقند ○ کش ○ صغانیاں ○ ترمذ ○ بلخ ○ ہرات ○ قہستان ○ بجستان ○ رم ○ خوارزم ○

من روی عنه الحدیث والفقه شرقاً و غرباً بلداً بلداً۔(۱)

حافظ الدین بن البزار الکردری نے ان امکنہ کے جن خاص خاص تلامذہ کا تذکرہ زیر عنوان لکھا ہے ان کی تعداد سات سو تیس مشاہیر علماء ہیں۔

علامہ ابن الندیم نے الفہرست میں اسی بہتات کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

العلم برا وبحرا شرقا و غربا بعد اوقر بتدوینه رضی الله تعالیٰ عنه۔(۲)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسری صدی کے نصف ثانی میں امام اعظمؒ کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل چکے تھے اور ہر جگہ علم کی اشاعت میں مصروف تھے۔ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جہاں ان کا پرچم نہ لہراتا ہو۔ اقتدار حکومت سے مدرسوں اور خانقاہوں تک ان ہی کا پھریرا اڑ رہا تھا۔ بلکہ بہتوں کے لیے ان کی یہ مقبولیت اور ہر گوشہ حیات پر قبضہ سامان رشک بنا ہوا تھا۔

---

(۱) مناقب الکردری (۲) الفہرست لابن الندیم: ص ۲۹۹

اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان شہروں میں آپ نے مرو کا نام پڑھا ہے۔ یہاں عرصہ سے فقہ حنفی کی حکمرانی تھی اور امام اعظمؒ کے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت یہاں قضا' افتاء اور تدریس میں مشغول تھی۔ علامہ نضر بن شمیل جب بصرہ سے مامون کی علمی قدردانیوں کی شہرت سن کر یہاں آئے تو امام اعظمؒ کے علوم کی یہ قبولیت عام اور اشاعت عام دیکھ نہ سکے اور کچھ نوعمر محدثین کو اپنے ساتھ ملا کر امام اعظمؒ کے علوم کے خلاف ایک منظم اسکیم بنالی۔ چنانچہ صدرالائمہ نے بہ سند لکھا ہے کہ فتح بن عمر کہتے ہیں:

نضر بن شمیل جس زمانے میں مرو میں مقیم تھے میں وہیں تھا۔ انہوں نے امام اعظمؒ کی کتابوں کو آب رواں میں بھیج کر دھونا شروع کیا۔ خالد بن صبیح نے جوان دنوں مرو کے قاضی تھے یہ کہانی سنی تو وہ خود اور خانوادۂ صبیح کے دیگر افراد فضل بن سہل کے پاس پہنچے۔ یہ مامون کا وزیراعظم تھا۔ وراق کہتے ہیں کہ اس زمانے میں خانوادۂ صبیح میں پچاس یا اس سے بھی زائد ایسے علماء موجود تھے جو عدلیہ میں کام کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ خالد کے ساتھ ابراہیم بن رستم اور سہل بن مزاحم بھی تھے ان سب حضرات نے آکر فضل بن سہل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ فضل نے واقعہ سن کر جواب دیا کہ اس وقت تک اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتا جب تک کہ صورت واقعہ کو خلیفہ کے روبرو پیش نہ کروں۔ یہ کہہ کر فضل مامون الرشید کے پاس گیا اور اسے سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ مامون نے فریقین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فضل نے بتایا کہ یہ نوخیز تو اسحاق بن راہویہ اور احمد بن زہیر ہیں مگر نضر بن شمیل ان کے ساتھ ہیں اور دوسرے خالد بن صبیح' سہل بن مزاحم اور ابراہیم بن رستم ہیں۔ مامون نے دوسرے روز دونوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اسحاق اور ان کے ساتھیوں کو مامون کی گفتگو معلوم ہوئی تو اسحاق بن راہویہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ مامون سے گفتگو کون کرے گا۔ آخر شورے سے یہ طے پایا کہ احمد بن زہیر مامون سے گفتگو کریں۔ چنانچہ دوسرے روز دربار میں حاضری ہوئی مامون نے آتے ہی سلام کیا اور نضر بن شمیل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ امام ابو

حنیفہ کی کتابوں کے متعلق آپ لوگوں نے یہ کیا رویہ اختیار کیا ہے؟ نضر تو خاموش رہے مگر احمد بن زہیر بولے کہ امیر المؤمنین اگر اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔ مامون نے کہا ہاں فرمایئے وہ بولے امیر المؤمنین! ہم نے ان کی کتابوں کو کتاب اللہ وسنت کے خلاف پایا ہے۔ مامون نے کہا کتاب وسنت کے خلاف کیسے؟ اتنا کہہ کر خالد بن صبیح سے ایک مسئلہ دریافت کیا کہ اس کے بارے میں ابو حنیفہ نے کیا کہا ہے؟ خالد نے امام موصوف کے قول کے مطابق فتویٰ بتایا۔ احمد بن زہیر اس کے خلاف روایت بیان کرنے لگے مگر مامون نے امام ابو حنیفہ کی تائید میں وہ احادیث پیش کیں جو ان لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ آخر میں مامون نے کہا کہ لو وجدناها مخالفاً لكتاب الله و سنة رسوله ما استعملناه اگر ہم ان کو کتاب وسنت کے خلاف پاتے تو ان پر عمل کرانے کے خواہش مند ہی کیوں ہوتے۔ خبردار اب آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اگر نضر بن شمیل تم میں نہ ہوتے تو میں تم کو ایسی سزا دیتا کہ یاد رکھتے۔(۱)

الغرض امام اعظمؒ کے تلامذہ کی ہمسری دیکھی نہ جا سکی۔ ان تلامذہ میں ایسی گرامی قدر شخصیتیں ہیں جو اپنے وقت میں نہ صرف حافظ حدیث بلکہ علم حدیث کے آفتاب ہوئے۔ ان کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے مگر ہم یہاں صرف تقریب کی خاطر چند کا تعارف بطور گلے از گلزار لکھتے ہیں:

الحافظ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ:

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابو سعید کنیت اور کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ الخطیب نے امام علی بن المدینی کے حوالہ سے ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ:

حدیث میں روایت واسناد کے سارے سلاسل کا محور صرف چھ بزرگ ہیں۔ ان کے نام بتائے ان کے بعد ان چھ بزرگوں کا علم ارباب تصانیف کے حصے میں آیا ہے۔

(۱) مناقب الامام: ج ۲ ص ۵۵، ۵۶

بعد ازیں ان ارباب تصنیف کا سارا علم دو یحییٰ نامی شخصیتوں میں سمٹ کر آیا ہے اول یحییٰ بن زکریا دوم یحییٰ بن سعید۔(۱)

اور یہ بھی امام علی بن المدینی ہی کا تاثر ہے کہ:

زمانہ ابن عباس میں علم ابن عباس پر زمانہ شعبی میں شعبی پر اور زمانہ ثوری میں ثوری پر اور زمانہ یحییٰ میں یحییٰ پر ختم ہے۔(۲)

صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ حافظ ذہبی نے تو صرف اس قدر بتایا ہے کان احد اصحاب التصانیف لیکن ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ کوفہ میں کتابوں کے سب سے پہلے مصنف یہی ہیں۔ خطیب بغدادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ:

انه اول من صنف الکتاب فی الکوفة و کان یعد فی فقهاء محدثی الکوفة۔

لیکن بات ابھی نا تمام اور ادھوری ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس کی پوری وضاحت فرمائی ہے وہ بسند متصل اسد بن الفرات سے ناقل ہیں کہ:

امام اعظم ابو حنیفہ کے وہ تلامذہ جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا ہے ان کی تعداد چالیس ہے۔ ان دس حضرات میں جو تمام میں اولین صف کے سمجھے جاتے تھے امام ابو یوسف، امام زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اور یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ اور یحییٰ کے سپرد لکھنے کا کام تھا اور یحییٰ تیس سال تک اس مجلس میں لکھنے کا کام کرتے رہے۔(۳)

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا نے تدوین کا یہ کام پورے تیس سال امام اعظمؒ کی نگرانی میں کیا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یحییٰ کا تصنیفی کارنامہ ہے کیونکہ وہ کتابت کا کام کرتے تھے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ یحییٰ کا کارنامہ نہیں بلکہ امام اعظمؒ کا تصنیفی کارنامہ ہے۔ یحییٰ تو صرف کتابت کا کام کرتے تھے کتابت کی بنا پر بعد کو محدثین نے یحییٰ کی طرف نسبت کر دیا۔ امام اعظمؒ کے یہاں تصنیف کا طرز یہی تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کو املا کرایا کرتے تھے اور تعلیم و تصنیف کا سارا کام زبانی تھا۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلو بغا نے

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۴ ص ۱۱۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۲۴۷ (۳) الجواہر المضیۃ: ج ۲ ص ۲۶۲

منیۃ الالمعی میں تصریح کی ہے۔

ان المتقدمین من علمائنا کانوا یملون المسائل الفقفیة و ادلتها من الاحدیث النبویة باسانیدهم۔

ہمارے علماء متقدمین مسائل اور ان کے دلائل کا احادیث نبویہ سے اپنی اسانید کے ساتھ املا کراتے تھے۔(۱)

حال کے غیر مسلم محققین میں سے ڈاکٹر فلپ حتی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے۔

فدرها ابو حنیفة فی الکوفة وبغداد و توفی ۷۶۷ء وکان قد احترف التجارة ثم مال عنها الی الفقه فاصبح اعظم علمائه فی الاسلام وقد افضی بتعالیمه شفهاً لتلامیذه۔

ابوحنیفہ کوفہ اور بغداد میں پروان چڑھے ۷۶۷ھ میں وفات پائی پہلے کاروبار کرتے تھے پھر شرائع کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام کے علماء میں عظیم ترین شخصیت بن کر سامنے آئے آپ نے اپنی تعلیمات کو اپنے تلامیذ تک زبانی پہنچا دیا۔(۲)

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی زمانے میں امام اعظمؒ نے اختلاف الصحابہ' کتاب السیر' کتاب لآ ثار جیسی کتابیں اپنے شاگردوں کو املا کرائی ہیں۔ ان کے اولین کاتب یحییٰ ہیں۔ بعد میں یہی کتابیں ان کے شاگردوں سے موسوم ہو گئی ہیں مثلاً کتاب السیر امام حسن بن زیاد' کتاب السیر امام محمد وغیرہ وغیرہ۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن وکیع بن الجراح کا نام لے کر تو خطیب بغدادی نے علانیہ اور برملا لکھ دیا ہے کہ:

وکیع انما صنف کتبه علی کتب یحییٰ بن ابی زائدہ۔(۳)

یحییٰ بن زکریا کے سامنے جن ائمہ حدیث نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے حافظ ذہبی نے ان میں امام احمد' ابراہیم بن موسیٰ' ابوکریب اور زیاد بن ایوب کا نام لیا ہے لیکن حافظ ابوبکر الخطیب نے یحییٰ بن آدم' قتیبہ بن سعید' ہناد بن السری' محمد بن عیسیٰ' یحییٰ بن معین' ابوبکر بن ابی شیبہ' عثمان بن ابی شیبہ اور سریج بن یونس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

---

(۱) منیۃ الالمعی: ص ۹ (۲) تاریخ العرب: ج ۲ ص ۳۸۴ (۳)

كان على قضاء المدائن و بعد من حفاظ الكوفيين للحديث مفتيا مثبتا۔

مدائن کے قاضی تھے اور ان کا شمار کوفہ کے حفاظ حدیث میں ہے۔(۴)

ان کی جلالت علمی کا اندازہ کرنا ہو تو یحییٰ بن سعید القطان کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ

سارے کوفہ میں مجھے یحییٰ سے زیادہ اپنی مخالفت کا کسی سے اندیشہ نہ تھا۔(۱)

ارباب صحاحؒ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔اور بمقام مدائن ۶۳ سال وفات پائی ہے۔

امام ابوعبدالرحمٰن المقری:

عبداللہ بن یزید نام ابوعبداللہ الرحمن کنیت اور المقری لقب ہے سن ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔علم قرات میں امام نافعؒ کے شاگرد ہیں۔حدیث میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔حافظ ذہبی رقمطراز ہیں:

سمع من عون و ابی حنيفة

بصرے میں ۳۶ سال اور مکہ معظمہ میں ۳۵ سال قرآن پڑھایا ہے اسی لیے مقری کر کے مشہور ہیں حدیث کی ساری کتابوں میں ان کی روایات ہیں۔

حافظ ابوبکر الخطیب نے بسند متصل ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

بشر بن موسیٰ کا بیان ہے کہ امام ابوعبدالرحمٰن المقری ہم سے حدیثیں روایت کرتے تھے لیکن امام موصوف امام اعظمؒ ابوحنیفہ کے حوالہ سے روایات پیش فرماتے تو ان کا دستور یہ تھا کہ تعبیر کا پیرایہ اختیار فرماتے تھے کہ حدثنا شاھنشاہ یعنی محدثین کے ملک معظم نے ہم سے بیان کیا۔(۲)

حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کے حوالہ سے بسند متصل ایک حدیث روایت کی ہے جس میں نہ صرف ان کو امام اعظمؒ کا شاگرد ظاہر کیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ قطعیات میں یہ سند عالی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

(۳،۴) تاریخ بغداد ج ۱۴ص ۱۱۶ (۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۲۷۴)(۲) تاریخ بغداد ج ۱۳ص ۳۴۵

انبانا ابن ابن قدامة اخبرنا ابن طبرزد انا ابو غالب بن البناء انا ابو محمد الجوهری انا ابوبكر القطيعی فابشر بن موسیٰ انا ابو عبدالرحمن المقری عن ابی حنيفة عن عطاء عن جابر انه راه يصلی فی قميص خفيف ليس عليه ازار ولا رداء قال ولا اظنه صلی فيه الاليرينا انه لاباس بالصلاة فی الثوب الواحد۔(۱)

ابن ابی حاتم کا مغالطہ:

کتاب الجرح والتعدیل میں امام مقری کے ترجمہ میں امام مقری کا ایک ایسا بیان درج کیا ہے جو نہ صرف امام مقری کی شان جلالت کے خلاف ہے بلکہ تاریخی طور پر ثابت بھی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں کہ ابو عبدالرحمٰن مقری کہتے ہیں کہ ہم سے ابو حنیفہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور جب احادیث کے بیان سے فارغ ہو جاتے تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یوں فرماتے: هذا الذی سمعتم کله ريح و باطل ۔یعنی تم نے مجھ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات سنے ہیں وہ ہوائی اور باطل ہیں۔ بیان کی رکاکت ہی بتا رہی ہے کہ ذہنوں نے امام اعظمؒ کی شان محدثانہ سے مرعوب ہو کر یہ افسانہ تراشا ہے۔ امام اعظمؒ تو امام اعظمؒ ہیں ایک فاسق سے فاسق تر مسلمان کی زبان پر بھی ارشادات نبوت بتا کر یہ کلمات نہیں آتے۔ آیئے ذرا تاریخی طور پر بھی اس کا تجزیہ کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس کی روایتی پوزیشن کیا ہے۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے ابراہیم الجوزجانی نے ایک خط میں امام ابو عبدالرحمٰن کا یہ بیان لکھا ہے:

کیا ابراہیم الجوزجانی نے خود یہ بیان امام مقری سے سنا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے یعنی ان کو کسی نے بتایا ہے۔ یہ بتانے والا کون ہے؟ جوزجانی نے اس کا نام نہیں بتایا۔ سند کا یہ انقطاع ہی زبان حال سے بول رہا ہے کہ کسی نے نہیں بتایا ہے بلکہ یاروں کا بنایا ہوا افسانہ ہے؟ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے؟ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ خود ابراہیم جوزجانی کے ہاتھوں کی صفائی ہے۔ کیونکہ اسمٰعیل بن ابان کہتے ہیں کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ص ۱۶۰

جوز جانی حق سے منحرف اور روگردان تھے اور ناصبی مذہب رکھتے تھے(۱) حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام حبان فرماتے ہیں کہ جوز جانی حروری تھے یعنی حضرت علیؓ کے مخالف تھے۔ حافظ صاحب نے یہی تہذیب میں واقعہ لکھا ہے کہ ان کے دروازے پر ایک بار محدثین کا مجمع تھا۔ جوز جانی کی کنیز چوزہ باہر لے کر آئی کہ اسے کوئی ذبح کر دے مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان کے تمام شاگردوں میں کسی کو اسلامی زندگی برتنے کا اتنا بھی سلیقہ نہ تھا کہ کوئی چوزہ ہی ذبح کر دے۔ کنیز نے جوز جانی کو صورت حال سے آگاہ کیا تو بولے واہ آج چوزہ کو ذبح کرنے والا کوئی نہیں ایک وقت وہ تھا کہ علی مرتضیٰ صرف چاشت کے وقت میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔(۲)

اما الجوزجانی فلا عبرہ بحطه علی الکوفیین

اور صرف تہذیب میں نہیں بلکہ لسان المیزان میں اس موضوع پر ایک فصل قائم کی ہے اور یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ کوفہ والوں کے بارے میں جوز جانی کے جارحانہ اقدامات ناقابل برداشت ہیں۔

الحاذق اذا تامل ثلب ابی اسحاق الجوزجانی رای العجب و ذالک لشدۃ انحرافه فی النصب۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کون ہے جس کے دامان تقدس پر جوز جانی کے لگائے ہوئے دھبے نہیں ہیں۔ امام اعمش، امام ابونعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ بات کو مختصر کر کے فرماتے ہیں۔ کہ اس کی چیرہ دستیوں سے اساطین حدیث اور ارکان روایت نالاں ہیں(۳) ...... اس بنا پر اگر جوز جانی نے امام اعظمؒ کے خلاف یہ بے پر کی اڑائی ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں بلکہ میں حافظ عسقلانی سے ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ آپ اس شخص کی زبان قلم سے دامان امامت کی حفاظت چاہتے ہیں جس کی زبان دہن سے دامان خلافت محفوظ نہیں ہے۔ فانا للہ والی المشتکی۔ حیرت جوز جانی پر نہیں بلکہ ان کی سادہ لوحی پر ہے جو جانتے بوجھتے اس قسم کی من گھڑت کہانیوں کو بلا تنقید نقل کر جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں سے ابوحنیفہ کے فضل

---

(۱) میزان الاعتدال (۲) تہذیب التہذیب: ج ۱ ص ۱۸۲ (۳) لسان المیزان: ج ۱ ص ۱۶۱

اور علم کو دیکھا نہیں گیا ہے۔ سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ جب کتابیں خورد برد کرنے کی سازش میں ناکامی ہوئی تو اس راہ سے دل کی بھڑاس نکالنے میں لگ گئے۔ عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ لوگ امام اعظمؒ کے متعلق صرف از راہ حسد چہ مگوئیاں کرتے ہیں؟ حافظ ابن ابی داؤد محدث کہتے ہیں کہ امام اعظمؒ کے بارے میں چہ مگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے ہیں۔ حاسد اور ناواقف۔ میرے نزدیک ناواقف دونوں میں غنیمت ہے۔ ناواقفیت کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے:

عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی ہے جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور امام اعظمؒ کی کتاب سے کچھ مسائل کا انتخاب کیا۔ تیسرے روز کتاب ہاتھ میں لے کر اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوا امام اوزاعی مسجد میں تھے دریافت کیا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے ان کو کتاب دے دی اس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے گذرے جن کی پیشانی پر میں نے لکھ دیا تھا کہ نعمان اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اوزاعی نے اذان دے کر کھڑے کھڑے نماز سے پہلے جب کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ لیا تو کتاب رکھ دی اور نماز سے فراغت کے بعد کتاب کا پھر مطالعہ کیا تا آنکہ کتاب ختم کر دی۔ پھر مجھ سے دریافت کیا اے خراسانی! یہ نعمان کون ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک بزرگ ہیں میری ان سے عراق میں ملاقات ہوئی ہے۔ فرمایا یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں جاؤ ان سے ملو اور علم حاصل کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو وہی ابو حنیفہ ہیں جن کے پاس جانے سے مجھے آپ روکتے تھے۔(۱)

بہر حال امام ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن یزید المقری امام اعظمؒ کے حدیث میں تلامذہ میں سے ہیں اور بعد کے محدثین کے بالواسطہ یا بلاواسطہ استاذ ہیں حتیٰ کہ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب بھی ان کی روایات سے خالی نہیں ہے۔ امام عبداللہ بن المبارک ان کی امانت' ثقاہت' عدالت اور دیانت کو کھرے سونے سے تعبیر کرتے تھے۔(۲)

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۸ (۲) تہذیب التہذیب: ج ۷ ص ۸۳

امام عبداللہ بن المبارک:

حافظ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ذہبی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ میں اور امام بخاری نے تاریخ میں عبداللہ بن المبارک کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

عبداللہ بن المبارک کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو امام الحسن بن عیسیٰ کا یہ بیان پڑھیے وہ فرماتے ہیں کہ:

عبداللہ بن المبارک کے تلامذہ نے ایک میٹنگ اس ارادے سے منعقد کی کہ امام موصوف کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ جن خوبیوں پر سب کا اتفاق ہوا یہ تھیں......

فقہ ○ ادب ○ نحو ○ لغت ○ زہد ○ شجاعت ○ شعر ○ فصاحت ○ قیام لیل ○ حج ○ جہاد فی سبیل اللہ ○ گھوڑے کی سواری ○ ترک مالا یعنی ○ انصاف ○ رفقاء سے کم اختلاف ○ یہ سب خوبیاں آپ کی ذات گرامی میں جمع ہیں۔(۱)

حافظ ذہبی نے ؛ . ہے کہ امام بخاری نے بچپنے میں عبداللہ کی کتابوں کو ازبر کرلیا تھا۔ لیکن حافظ ابن حجر نے مقد میں سولہ سال کی قید لگائی ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے سامنے ایک بار امام اعظمؒ کا تذکرہ ہوا فرمایا اس شخص کے بارے میں کیا کہا جائے جس کے سامنے دنیا اور اس کا پورا سرمایہ آیا مگر اس نے لات ماردی۔ کوڑے کھائے تکلیفیں برداشت کیں مگر اس چیز کو ہرگز قبول نہیں کیا جس کے لیے اس وقت لوگ تمنائیں کررہے تھے اور درخواستیں لیے پھر رہے تھے۔(۲)

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے زیادہ پارسا کوئی نہیں دیکھا ہے اور ایک نظم میں جو انہوں نے امام اعظمؒ کی شان میں لکھی ہے امام اعظمؒ کی محدثانہ شان کو سراہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام ابن المبارک کے قلب میں امام اعظمؒ کا کیا مقام تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

روی اثارہ فاجاب فیھا کطیران الصقور من المنیفۃ

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۱۲۲ (۲) مناقب ذہبی: ص ۱۵

انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاری پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

ولم یکن له بالعراق نظیر ولا بالمشرقین ولا بالکوفة (۱)

نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفی میں

امام اعظمؒ کے فقہ کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا جو تاثر حافظ عبدلقادر نے سوید بن نصر کے حوالہ سے لکھا ہے اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو لوگوں کو فقہ ابی حنیفہ کے بارے میں عبداللہ کی طرف منسوب کر کے افسانے سناتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لا تقولوا رای ابی حنیفة ولکن قولوا انه تفسیر الحدیث۔

اسے ابوحنیفہ کی رائے نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر ہے۔ (۲)

اور یہ بھی عبداللہ بن المبارک ہی کا کہنا ہے کہ حدیث سے چمٹ جاؤ اور حدیث کی خاطر امام اعظمؒ سے کیوں؟ اس کی وجہ بھی خود عبداللہ بن المبارک کی زبانی سنئے:

یعرف تاویل الحدیث ومعناه

اور خود ابن المبارک کا اپنی ذاتی تربیت کے بارے میں امام اعظمؒ کے متعلق تاثر یہ تھا کہ:

لولا ان الله اعاننی بابی حنیفة وسفیان کنت بدعیاً۔

امام ابوحنیفہ کے علوم سے پورے طور پر سیراب ہونے کے بعد سفیان ثوری سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔ امام ذہبی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ:

مالزمت سفیان حتی جعلت علم ابی حنیفة بکذا واشار بقبض یده۔

میں سفیان کے پاس اس وقت گیا جب میں نے ابوحنیفہ کے علم کو پورے طور پر سمیٹ لیا۔ (۳)

ان کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کا عالم یہ تھا کہ مشہور محدث سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ:

---

(۱) جامع المسانید: ج ۲ ص ۴۰۸ (۲) الجواہر المضیہ: ج ۱ ص ۴۶۰ (۳) مناقب ذہبی: ص ۲۵

میں نے صحابہ اور عبداللہ بن المبارک دونوں کے حالات کا مطالعہ کیا مجھے صحابہ میں عبداللہ سے زائد صرف دو چیزیں معلوم ہوئی ہیں ایک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور دوسرے غزوات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت۔(۱)

امام اعظمؒ نے ان سے ان کی زاہدانہ زندگی کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کہ ایک روز میں اپنے بھائیوں کے ہمراہ ایک باغ میں تھا۔ رات تک سارا وقت کھانے پینے میں گذر گیا۔ میں اس زمانے میں گانے بجانے کا بہت دلدادہ تھا۔ سحری کے وقت میں سو رہا تھا۔ کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ درخت پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ کہہ رہا ہے۔

الم یان للذین امنو ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ومانزل من الحق۔

میں نے اس سوال پر ہاں کہہ کر جواب دیا۔ آنکھ کھل گئی باجے وغیرہ توڑ کر نذر آتش کر دیئے یہ میری زاہدانہ زندگی کا روز اول ہے۔(۲)

ان علوم کا منبع تو آپ ان کی زبانی سن چکے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے علم کو پورے طور پر سمیٹ لیا تھا۔ آیئے اب ان کی اس علم پر مشتمل تصانیف کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں ان کی کتابوں کو زبانی یاد کیا تھا۔ علمی طور پر ان کتابوں کا کیا مقام تھا اور ان میں کس قسم کے مسائل تھے؟ مشہور محدث یحییٰ بن آدم سے خطیب بغدادی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ:

جب میں دقیق مسائل کی تلاش میں ہوتا اور مجھے عبداللہ بن المبارک کی کتابوں میں بھی نہ ملتے تو میں مایوس ہو جاتا۔(۳)

ان کی کتابوں میں حدیثوں کی تعداد کس قدر تھی؟ ذہبی نے یحییٰ بن معین کی زبانی بتایا ہے کہ۔

ان کی کتابیں تقریباً بیس ہزار حدیثوں پر مشتمل تھیں۔(۴)

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۰ ص ۱۶۳ — (۲) الفوائد البہیہ: ص ۳۹

(۳) تاریخ بغدا — (۴) تذکرۃ الحفاظ: ج ا ص ۲۵۴

بزرگوں نے ان کو بھی معاف نہیں کیا اور امام اعظم کے متعلق ان کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کو غلط معنے پہنا کر ہنر کو عیب بنا دیا۔ بعد کو ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی ابو حنیفہ کے بارے میں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ غلط معنے پہنانے کی کوشش کرتے تھے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے حماد بن احمد مروزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے ایک بار عبداللہ بن المبارک کو یہ کہتے سنا کہ:

کان ابو حنیفة اية

ایک شخص بول پڑا اے ابو عبدالرحمن! یہ بتایئے کہ آیت کس میں تھے شر میں یا خیر میں۔ عبداللہ بن المبارک نے فوراً ڈانٹ کر کہا کہ خاموش رہو۔ تمھیں پتہ نہیں ہے کہ آیت کا لفظ خیر ہی کے لئے آتا شر کے لیے آیت نہیں غایت آتا ہے۔ یوں بولا جاتا ہے اية فی الخیر اور غاية فی الشر اور بعد ازیں قرآن کی یہ آیت تلاوت کی:

وجعلنا ابن مریم و امه' ايةً۔(۱)

جیسے اس شخص نے عبداللہ کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے فقرے کو جس میں وہ امام اعظم کو اللہ سبحانہ کی نشانی بتا رہے تھے عبداللہ ہی کے سامنے غلط معنے پہنا دیئے ٹھیک اسی طرح عبداللہ ہی کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کان ابو حنیفة یتیماً فی الحدیث کو یار لوگوں نے ایسے معنے پہنا دیئے جس سے ان کا جی تو خوش ہوا ہوگا۔ لیکن متکلم کی روح تڑپ کر رہ گئی ہوگی اور اسی پر بس نہیں بلکہ روایت بھی بالمعنے شروع کردی کہیں یتیماً کہیں مسکیناً روایت کیا۔ خطیب بغدادی اور محمد بن نصر مروزی کی روایت میں یتیم آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں یتیم کی جگہ مسکین لکھا ہے اور ابن عبدالبر نے جو روایت بحوالہ ابو الموجہ پیش کی ہے اس میں نہ یتیم ہے نہ مسکین بلکہ جہم آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب بات نہ بنی تو اسے بنانے کی دوبارہ کوشش میں روایت میں نیرنگی آگئی ہے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ جن راہوں سے یہ روایت گذر کر آئی ہے اور جن جن سندوں اور طرق سے عبداللہ بن المبارک کا یہ بیان

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۶

آیا ہے ان میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں جسے صحیح کہہ دیا جائے لیکن اگر ہم روایت کا محدثانہ نقطہ نظر سے پوسٹ مارٹم نہ کریں اور مان لیں کہ واقعی حضرت عبداللہ نے یہ بات فرمائی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے غلط معنے پہنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ امام اعظمؒ کو حدیث نہ آتی تھی۔ کیونکہ لفظ یتیم دو معنے میں استعمال ہوتا ہے ایک لغوی۔ اور دوسرے محدثین کے اصطلاحی۔

لغت میں یتیم کے معنے صاحب قاموس نے یگانہ اور اندر کے لکھے ہیں۔ الیتیم الفرد وکل شیئی یعز نظیرہ۔ یگانہ اور ہر ایسی چیز جو نادر المثال ہو۔ زمخشری رقمطراز ہیں کہ درۃ یتیمۃ بیت یتیم اور حرمۃ یتیمۃ کے محاورات بے مثال اور نادر الوجود کے لیے بولے جاتے ہیں۔ بچہ بے باپ ہو کر فرد رہ جاتا ہے اس لیے وہ یتیم کہلاتا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ امام اعظمؒ حدیث میں نادرۃ الدہر اور عدیم النظیر شخصیت ہیں اور ہے بھی یہ بات ٹھیک۔ عبداللہ بن المبارک کے دوسرے بیان بھی اس کے مؤید ہیں۔

اصلاح محدثین میں یتیم وہ شخص کہلاتا ہے جو ایک حدیث کو کم از کم ایک سو سندوں سے روایت نہ کرے۔ چنانچہ مشہور محدث ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں:

کل حدیث لم یکن عندی من مائۃ وجہ فانا فیہ یتیم۔

جو حدیث مجھے سو سندوں سے نہ ملے تو میں اس میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔(۱)

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہی بات الروض الباسم میں نقل کی ہے۔

اگر اس معنے کے لحاظ سے امام اعظمؒ حدیث میں یتیم ہیں تو یہ بات نہ امام اعظمؒ کے لیے قدح ہے اور نہ کسی کے لیے قابل مدح ہے۔ امام اعظمؒ کا زمانہ اکثار طرق کا زمانہ نہ تھا اس لحاظ سے تو سارے تابعین اور سارے صحابہ حدیث میں یتیم ہیں کیونکہ صحابہ اور تابعین میں کسی کو بھی کوئی ارشاد نبوت سو سو طرق سے معلوم نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ حدیث تو دراصل نام ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال۔ افعال اور آداب و احوال کا۔ نہ کہ اکثار طرق کا۔ اسلام کی زندگی میں مسائل کے لیے ضرورت کی چیز حدیث ہے نہ کہ طرق۔ اور امام اعظمؒ کو یہ چیز

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۲ ص ۸۹

بخوبی حاصل تھی جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ امام اعظمؒ چار ہزار احادیث روایت کرتے تھے اور یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ احادیث کی کل تعداد بھی چار ہزار ہی ہے یہی تعداد بعد کو فن پیدا ہونے پر محدثین کے زمانے میں تیسری صدی میں چار ہزار سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس فن کے مشہور محدث اسرائیل اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ:

نعمان کیا ہی مزے دار شخص تھے فقہ سے متعلق ہر حدیث ان کو خوب یاد تھی اس کی ان کو بے حد جستجو تھی اور اس میں جو کچھ فقہ ہوتا اس کے خوب ہی عالم تھے انہوں نے حماد سے حدیثیں یاد کی تھیں اور خوب یاد کی تھیں اس لیے ان کی خلفاء' امراء اور وزراء سب عزت کرتے تھے۔(۱)

بہرحال عبداللہ بن المبارک امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے تھے بعد کے تمام محدثین ان سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔ امام احمد کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور یہی وہ مثالی شخصیت ہے جو زہد وتقویٰ میں امام اعظمؒ سے پوری پوری مشابہت رکھتی تھی۔ جودو زہد' تھوڑی پونجی پر گذر بسر کرنا' بادشاہوں اور ارباب اقتدار سے دور رہنا' دین کو اپنے رزق کے لیے راہ نہ بنانا' دین کے معاملات میں پستی اور وفاءت کا اظہار نہ کرنا۔ یہ تمام باتیں عبداللہ بن المبارک کی ذات گرامی میں پائی جاتی تھیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام ابراہیم بن طہمان:

حافظ ذہبی نے ان کا حفاظ حدیث کے پانچویں طبقے میں ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے کبار تلامذہ میں سے تھے۔ اور ان کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام اعظمؒ نے استاد ہونے کے باوجود ان سے روایت لی ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے:

حدث عنه من شيوخه صفوان بن سليم و ابو حنيفة الامام۔(۲)

محدثین کے عرف میں اس قسم کی روایات کو روایة الاكابر عن الاصاغر کہتے ہیں۔

اور ایک محدث کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بالا اور کمتر اور اپنے جیسوں سے روایت کرے۔ علامہ ترمذی نے محدثین کبار کا فیصلہ لکھا ہے کہ:

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۳۳۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۱۸۸

لایکون محدثا حتی یاخذ عمن فوقه و مثله و دونه۔

محدث ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے سے برتر' کمتر اور مثیل سے روایت لے۔(۱)

اور اسی بنا پر محدثین نے اس کی عظمت شان اور جلالت قدر کا اقرار کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

نوع مهم تدعوالیه الهم العالیة والا نفس الزکیة۔

بہرحال امام اعظمؒ نے استاد ہونے کے باوجود ابراہیم بن طہمان سے روایت لی ہے۔ ابراہیم کی جلالت قدر کا اندازہ ان کے تلامذہ سے ہوسکتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں ابوبکر الخطیب نے عبداللہ بن المبارک' سفیان بن عیینہ' خالد بن نزار' وکیع بن الجراح' عبدالرحمن بن مہدی' ابو عامر العقدی' محمد بن سابق' یحییٰ بن ابی بکیر کا نام لیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الامام کے لقب سے نواز ہے۔ مشہور محدث اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کی حدیث میں ثقاہت مسلم ہے ہمیشہ سے ائمہ ان کی حدیثوں کے خواہاں رہے ہیں اور سب نے ان کی ثقاہت کی منادی کی ہے۔(۲)

افسوس ہے کہ ایسا باکمال اور بلند پایہ محدث بھی ارباب ظواہر کی فرقہ وارانہ چشمک سے بچ نہ سکا۔ چونکہ امام اعظمؒ کے شاگرد تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ایمان و عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس بنا پر بزرگوں نے ان پر بھی مرجیٔ ہونے کی تہمت لگادی۔ یہاں بھی نعیم بن حماد اور ابو اسحاق الجوز جانی نے اپنی جولانی طبع کا ان کو نشانہ بنایا۔ لیکن ان کو پھر بالآخر منہ کی کھانی پڑی۔ اور حافظ ذہبی کو کہنا پڑا۔

فلا عبرة بقول مضعفه

اس مزعومہ کے خلاف تمام ارباب صحاح ان کی حدیث سے احتجاج پر متفق ہیں اور مشہور محدث اقرار کرتے ہیں کہ:

انه حسن الحدیث یمیل شیئا الی الارجاء فی الایمان حبب الله حدیثه الی الناس۔(۳)

---

(۱) شیخ ذوی النظر: ص ۲۴۲ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱ ص ۱۰۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱۹۸

ذرا ٹھہر جایئے اور یمیل شیئا الی الارجاء فی الایمان کی حقیقت بھی گوش گذار فرما لیجئے خدا بھلا کرے محدث خطیب بغدادی کا کہ وہ اس مقام پر ارجاء کی حقیقت ابوالصلت کے حوالہ سے یہ کہہ کر بے نقاب کر گئے۔

قال علی :- قال ابو الصلت لم یکن ارجاء ھم ھذا المذھب الخبیث ان الایمان قول بلا عمل وان ترک العمل لا یضر بالایمان بل کان ارجاء ھم انھم کانوا یرجون لا ہل الکبار الغفران ردا علی الخوارج وغیرھم الذین یکفرون الناس بالذنوب فکانوا یرجون ولا یکفرون بالذنوب و نحن کذالک۔

ان کا ارجاء یہ مذہب خبیث نہ تھا کہ ایمان قول بغیر عمل ہے اور ترک عمل سے کچھ نہیں بگڑتا ہے بلکہ ان کا ارجاء تو صرف یہ تھا کہ وہ گنہ گاروں کے لیے امیدوار مغفرت تھے وہ خوارج کی تردید کرتے تھے جو لوگوں کو صرف گناہ کی پاداش میں دائرہ اسلام سے نکال دیتے ہیں وہ بخشش کی امید کرتے تھے اور کسی کو گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہتے تھے اور ہم بھی ایسے ہی ہیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ خطیب نے بتایا ہے کہ امام وکیع بن الجراح اور سفیان ثوری جیسے محدثین کا بھی یہی مذہب ہے۔

وکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے بھی آخر میں یہی سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہم سارے مسلمان گنہ گاروں کے لیے جو ہماری نماز پڑھتے ہیں امیدوار مغفرت ہیں خواہ وہ کیسا ہی عمل کریں۔(۱)

اور واقعہ یہ ہے کہ مانتے تو سب تھے لیکن محدثین فقہاء کی یہ تعبیر سننے کو تیار نہ تھے کہ ایمان وعمل جدا جدا ہیں اور ان میں ہر ایک کا حکم مختلف ہے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان وعمل کو جدا جدا سمجھنا مرجیہ کا مذہب ہے اس کی تردید کرتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں اس کے خلاف عنوان پر عنوان لاتے ہیں۔ حالانکہ مرجیہ کے نزدیک عمل کی حیثیت ہی کوئی نہیں جب ان

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۶ ص ۱۰۹

کا تو کھلا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص سچے دل سے توحید و نبوت پر ایمان رکھتا ہے تو پھر اسے گناہ کی کوئی پرواہ نہیں اور وہ سارے گناہوں کے باوجود آخرت کی باز پرس سے آزاد ہے لیکن محققین اہل السنت جو عمل کو جزو ایمان نہیں بتاتے ان کے نزدیک ایک گنہگار مسلمان کا معاملہ اللہ سبحانہ کے اختیار میں ہے چاہے تو اپنے فضل سے بخش دے اور چاہے تو اپنے عدل کے مطابق سزا دے اور خود امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ بہرحال ابراہیم بن طہمان کی برگزیدہ شخصیت اس سے برتر تھی۔

امام احمد بن حنبل کے دل میں ان کی اس قدر عظمت تھی کہ ایک بار ان کی مجلس میں ابراہیم کا ذکر ہوا تو امام احمد بیماری کی وجہ سے ڈھاسنا لگائے بیٹھے تھے۔ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا:

لا ینبغی ان یذکر الصالحون فیتکأ۔(۱)

صالحین کا ذکر ہو تو ڈھاسنا لگانا اچھا نہیں ہے۔

ولادت ہرات میں ہوئی اور وفات ۱۶۳ھ میں حرم محترم میں ہوئی۔ رحمہ اللہ۔

الامام الحافظ مکی بن ابراہیم:

حافظ ذہبی نے ان کا ذکر اس طرح شروع کیا ہے۔ الحافظ الامام شیخ خراسان۔ اور ان کے اساتذہ میں یزید بن ابی عبید اور بہز بن حکیم کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

حدث عن یزید ب ابی عبید و جعفر الصادق و بھزبن حکیم و ابی حنیفۃ وھشام۔

امام مکی بن ابراہیم امام اعظمؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ صدر الائمہ رقمطراز ہیں کہ مکی بن ابراہیم کوفہ آئے اور امام اعظمؒ کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے اور آپ سے فقہ و حدیث حاصل کیا اور بکثرت روایتیں لیں۔(۲)

امام مکی علم حدیث میں بہت بڑے امام ہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۶ ص ۱۹۲ (۲) مناقب صدر الائمہ: ج ۱ ص ۲۰۳

تہ کیا ہے۔ خود امام مکی کا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے دس سال تک حرم محترم کا مجاور رہا ہوں اور سترہ تابعین سے حدیثیں لکھی ہیں اور یہ بھی فرماتے تھے کہ ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا اور سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی۔ (۱) حافظ عسقلانی نے تہذیب میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پیش آئے گی تو میں سوائے تابعین کے کسی سے بھی حدیث نہ لیتا۔ (۲) ان کے آغاز علم کی داستان بھی بڑے مزے دار ہے کیونکہ ان کو تحصیل علم کے لیے امام ابوحنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ امام حارثی عبدالصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ میں کاروبار کرتا تھا ایک بار امام اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم تجارت کرتے ہو مگر تجارت میں علم کے بغیر سرتاسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ تم علم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث کیوں نہیں لکھتے۔ امام موصوف مجھے برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے حتیٰ کہ میں نے اس وادی میں قدم رکھ دیا اور کتابت علم کی طرف متوجہ ہو گیا اور اللہ سبحانہ نے مجھے علم کی دولت مرحمت فرمائی۔ اس لیے میں ہر نماز کے بعد اور جب بھی امام ممدوح کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

لان اللہ تعالیٰ ببرکتہ فتح لی باب العلم۔

کیونکہ آپ ہی کی برکت سے اللہ سبحانہ نے میرے لیے علم کا دروازہ کھولا ہے۔ (۳)

ظاہر ہے کہ آپ امام اعظمؒ سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں کاروبار ہی کے سلسلے میں ملے ہوں گے اسی عمر کے لڑکے کو علم کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سال ڈیڑھ سال سوچ بچار میں گذر گیا اور بالآخر آپ نے سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور اس سلسلے میں اولین استاد آپ کے امام اعظمؒ ہوئے اور آپ ۱۴۳ھ سے ۱۵۰ھ تک امام اعظمؒ کے علوم سے خوشہ چینی کرتے رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ نے حجوں کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ آپ نے ساٹھ حج کیے ہیں۔ اگر آپ کی وفات جیسا کہ محمد بن سعد نے بتایا ہے ۲۱۰ھ میں ہوئی ہے تو حجوں کی یہ تعداد اسی طرح پوری ہو جاتی ہے کہ آپ کا پہلا حج ۱۵۰ھ میں ہو۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۳۳۳ (۲) تہذیب التہذیب: ج ۱ ص ۲۹۵

(۳) مناقب صدر الائمۃ: ج ۲ ص ۱۶۱

امام اعظمؒ کے علم کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ کان اعلم اھل زمانہ اور محدثین کی اصطلاحی زبان میں علم سے مراد حدیث ہی ہوتا ہے۔

امام مکی کے دل میں امام اعظمؒ کی حدیث دانی کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو صدر الائمہ نے اسماعیل بن بشیر کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے انہوں نے درس شروع کیا کہ حدثنا ابو حنیفة الخ۔ حاضرین میں سے ایک بول پڑا کہ حدثنا عن جریج ہم سے ابن جریج مکی کی روایات بیان کیجئے۔ اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمانے لگے:

انا لانحدث السفهاء حرمت علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی

ہم بیوقوفوں سے حدیثیں بیان نہیں کرتے تمہیں میرے سے حدیث لکھنا روا نہیں ہے میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ جب تک اس شخص کو اپنی مجلس سے نہ اٹھا دیا حدیث بیان نہیں کیا اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدثنا ابو حنیفة کا سلسلہ شروع کر دیا۔

امام مکی کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں صرف حافظ ذہبی نے ہی نہیں بلکہ حافظ ابو الحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں امام بخاری کے اساتذہ و مشائخ حدیث کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کی ہے کہ مکی بن ابراہیم کا تعلق امام بخاری کے اساتذہ میں اس طبقہ اولیٰ سے ہے جنہوں نے تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے گویا مراتب شیوخ میں امام بخاری کے اساتذہ اتباع تابعین ہیں۔ اور ان اتباع تابعین میں جو امام بخاری کے طبقہ اولیٰ کے شیوخ ہیں سب سے اونچا اور بالا مقام مکی بن ابراہیم کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری کی مرویات جو روایات سب سے عالی ہیں اور جن کو ثلاثیات کہا جاتا ہے جن کی تعداد بائیس ہے ان میں زیادہ تعداد امام بخاری کو مکی بن ابراہیم ہی کے حوالہ سے ملی

ہے یعنی بائیس میں سے گیارہ۔ اور باقی گیارہ دوسرے مختلف اساتذہ سے آئی ہیں جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ اور مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے جو ثلاثیات امام بخاری کو ملی ہیں وہ صحیح بخاری کے مندرجہ ذیل ابواب میں آئی ہیں:

باب اثم من كذب على النبى صلى الله عليه وسلم. باب قدر كم ينبغى ان يكون بين المصلى والسترة. باب الصلوة الى الاسطوانته. باب وقت المغرب. باب صوم عاشوراء. باب اذا احال دين الميت. باب البيعته فى الحرب. باب من راى العدد. باب غزوة خيبر. باب آنيته المجوس. باب اذاقتل نفسه خطأ.

الامام الضحاک بن مخلد ابو عاصم النبیل:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں' حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں' حافظ ابو الحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اور محدث صیمری نے مناقب میں ان کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ان کو فخر ہے کہ ان کے حلقہ تلمذ میں امام احمد بن حنبل' امام اسحاق بن راہویہ' امام علی بن المدینی اور امام بخاری جیسے اساطین علم حدیث داخل ہیں۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ امام ابو عاصم کو ایک ہزار صحیح حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مجھے جب سے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی ہے میں نے کبھی غیبت نہیں کی۔(۱)

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا سارا علم ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ چنانچہ ابن خراش کہتے ہیں: لم یر فی یدہ کتاب ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔

حافظ ذہبی نے بھی ان کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا ہے کہ:

لم یحدث قط الامن قبل حفظہ۔(۲)

حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ ان کے زہد' علم و دیانت پر علماء کا اتفاق کہتے ہیں۔

ان کو نبیل کیوں کہتے ہیں۔

اس میں علماء کے مختلف خیالات ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کے زیرکی اور

(۱) تہذیب التہذیب: ج ۴ ص ۴۵۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۳۳۴

فراست کی وجہ سے ان کو نبیل کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ شہر میں ایک روز ہاتھی آ گیا عام شہری اسے دیکھنے گئے لیکن ابو عاصم اس نظارہ سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔ ابن جریج نے نہ جانے کی وجہ دریافت کی تو جواب میں فرمایا کہ مجھے آپ کا بدل نہیں ملتا۔ ابن جریج نے یہ سن کر فرمایا کہ انت النبیل تو ہی عقلمند ہے۔ لیکن امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

امام زفر کے یہاں ان کی اکثر حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں ان کا ہم نام ایک اور شخص بھی آتا تھا جن کی وضع قطع بالکل گئی گذری تھی۔ یہ حسین وجمیل اور خوش پوش تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔ لونڈی نے آ کر دریافت کیا کون؟ جواب ملا کہ ابو عاصم۔ کنیز نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عاصم دروازے پر حاضر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کون سے ابو عاصم ہیں؟ لونڈی کی زبان سے بے ساختہ نکلا النبیل (معزز) ابو عاصم اندر آئے تو امام زفر فرمانے لگے کہ اس لونڈی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ اس نے تمہیں نبیل کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ ابو عاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔(۱)

حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل نقل کیا ہے۔ بصرے میں ابو عاصم النبیل ہی امام اعظمؒ کے مذہب کی نشر واشاعت کا باعث بنے ہیں۔ ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال کی تھی۔ فقاہت میں یگانہ روزگار تھے۔ ابن سعد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ کان ثقة فقیها۔ ائمہ ستہ میں امام بخاری تو ان کے بلاواسطہ شاگرد ہیں اور امام ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ اور نسائی بواسطہ حافظ بدر عبداللہ بن اسحاق ابو محمد الجوہری ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔

حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں نے خود امام ابو عاصم کی زبانی سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ ہم امام اعظمؒ کی خدمت میں

---

(۱) الجواہر المضیۃ: ج ۱ ص ۲۶۴

حاضر تھے آپ کے پاس فقہ و حدیث کے تشنگان علوم کا بیحد ہجوم ہوتا تھا ایک روز آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو صاحب خانہ سے جا کر کہے کہ وہ اس ہجوم کا بندوبست کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جاتا ہوں لیکن ذرا مجھے کچھ مسائل کے بارے میں پوچھنا ہے۔ فرمایا پاس آؤ اور پوچھ لو۔ میں آگے بڑھ گیا اور مسائل دریافت کیے۔ اسی اثنا میں اوروں نے بھی کچھ سوالات کیے اور آپ نے ان کو جوابات دیئے۔ میں ان میں کچھ ایسا محو ہوا کہ مجھے صاحب خانہ کے پاس جانا یاد نہ رہا۔ پھر آپ ہجوم سے کچھ پریشان ہوئے اور فرمایا کہ ابھی ابھی یہاں کسی شریف آدمی نے صاحب خانہ کے پاس جانے کا وعدہ کیا تھا وہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ فرمایا کیا تم جاؤ گے نہیں؟ تم نے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ عرض کیا کہ میں نے بلا قید وقت جانے کو کہا تھا جب چاہوں جا سکتا ہوں فرمایا کیا کہہ رہے ہو؟ مخاطبات اور محاورات میں کلام کا محل ارادہ سے مقرر نہیں ہوتا ہے۔ اس کا محل فی الفور ہے۔(۱)

حافظ ابن حجر نے ابو عاصم النبیل کو بھی امام بخاری کے اساتذہ میں صف اول اور طبقہ اولیٰ کا درجہ دیا ہے۔ یہ بھی اتباع تابعین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جن کی وساطت سے امام بخاری کو ثلاثیات ملی ہیں۔ ان کی وساطت سے آئی ہوئی ثلاثی حدیثوں کی تعداد صحیح بخاری میں چھ ہے۔

امام اعظمؒ سے ان کو جو گہری اور بے پایاں عقیدت تھی اس کا اندازہ کرنا ہو تو امام نصر بن علی کا یہ بیان پڑھیے کہ:

میں نے ایک بار ابو عاصم سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ۔ فرمایا سفیان سے مقابلہ کرتے ہو۔ بخدا ابو حنیفہ کا فقہ میں مقام تو میرے نزدیک ابن جریج سے بھی بالا ہے۔ میری آنکھوں نے آج تک علم پر اتنا قابو یافتہ شخص کوئی نہیں دیکھا۔(۲)

بہر حال ابو عاصم النبیل کی شخصیت امام اعظمؒ کے تلامذہ میں جیسے گرامی قدر ہے ایسے ہی ان کی ذات گرامی بعد میں آنے والے محدثین کے اساتذہ میں عظیم ترین ہستی ہے۔ سارے محدثین کا شجرہ علمی بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سے جا کر ملتا ہے۔

---

(۱) الجواہر المضیہ: ج ۲ ص ۶۵۶ (۲) مناقب صدر الائمہ: ج ۲ ص ۶۵

الامام الحافظ یزید بن ہارون:

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مبسوط ترجمہ لکھا ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ الحافظ القدوہ شیخ الاسلام۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے چہرے کا آغاز اس طرح کیا ہے احد الحفاظ المشاہیر الاعلام۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا ابن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ ہم نے یزید بن ہارون سے زیادہ حفظ میں کسی کو پکا نہیں دیکھا۔ علی بن عاصم کا بیان ہے کہ یزید رات بھر نوافل پڑھتے انہوں نے کچھ اوپر چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔(۱) حافظ ابوبکر الخطیب نے بسند متصل یحییٰ بن ابی طالب کا بیان لکھا ہے کہ میں نے بغداد میں ان سے حدیث کا سماع کیا ہے اس وقت ان کے درس میں ستر ہزار حاضرین کی تعداد بتائی جاتی تھی۔(۲) حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیۂ میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ یزید بن ہارون نے امام اعظمؒ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ امام صاحب کے فضل و کمال اور حفظ حدیث کے نہایت معترف تھے۔ ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ان میں ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں۔
حافظ ابن عبدالبر نے یزید بن ہارون کے حوالہ سے لکھا ہے:

ادرکت الف رجل فکتبت عن اکثرهم مارایت فیهم افقه ولا اورع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنیفة۔

میں ایک ہزار اکابر سے ملا ہوں اور ان میں اکثر سے حدیثیں لکھی ہیں لیکن میں نے ان پانچ سے زیادہ پارسا، فقیہ اور عالم کوئی نہیں دیکھا ہے ان میں اولین ابوحنیفہ ہیں۔(۳)
ان کی حدیث دانی کا حال یہ ہے کہ علی بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے خود ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے بالاسناد چوبیس ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۹۲ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۴ ص ۱۳۶

(۳) جامع بیان العلم وفضلہ (۴) تہذیب: ج ۱۱ ص ۳۶۸

ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے یزید بن ہارون منشی رہے ہیں یعنی جس زمانے میں ابو شیبہ واسط میں قاضی تھے تو یزید ان کے منشی تھے۔ ان کے بارے میں یزید کا بیان ہے کہ:

اپنے زمانے میں ابوشیبہ سے زیادہ عادلانہ فیصلہ کوئی نہ کرتا تھا۔(۱)

یہ امام یزید کے حدیث میں استاد بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ابوشیبہ کے بعد کے محدثین نے جرحی تیروں کا نشانہ بنالیا ہے اور اس کی بنیاد محض ایک افسانے پر رکھی ہے ورنہ یزید بن ہارون تک ان کی ثقاہت اور دیانت میں کسی کو کوئی کلام نہ تھا۔

یزید نے اپنے علمی جلال میں اس قدر اونچا پایہ رکھتے تھے کہ مامون جیسا عظیم المرتبت خلیفہ بہت بڑے علمی جلال کے باوجود ان سے خائف تھا۔ حافظ ذہبی نے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک بار ہم سے مامون نے کہا کہ اگر مجھے یزید کی جانب سے اندیشہ نہ ہوتا تو میں اعلان کر دیتا کہ قرآن مخلوق ہے دریافت کیا گیا یہ یزید کون ہیں؟ جن سے آپ کو اندیشہ ہے۔ جواب دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اعلان کروں اور یزید میری تردید کریں اور لوگوں میں اختلاف ہو کہ رائے عامہ فتنہ کا شکار ہو جائے۔ مامون کی یہ باتیں سن کر ایک شخص یزید بن ہارون کے پاس واسط پہنچا اور کہا کہ امیر المؤمنین آپ کو سلام کہتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ ہے کہ میں قرآن کے مخلوق ہونے کا اعلان کروں۔ امام یزید نے سنتے ہی فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو امیر المؤمنین نے یہ بات نہیں کہی اور نہ امیر المؤمنین سے یہ توقع ہے کہ وہ رائے عامہ کے سامنے ایسی بات رکھیں جس سے عوام آشنا نہیں ہیں۔(۲)

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مامون الرشید نے یزید کی زندگی میں اس بات کا اعلان نہیں کیا۔ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یزید کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی اور مامون نے یزید بن ہارون کی وفات کے پورے چھ سال بعد ۲۱۲ھ میں اس کا اعلان کر دیا۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۶ ص ۱۱۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۹۲

ابھی صرف اعلان تھا اور ۲۱۸ھ میں اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوت سے کام لے کر لوگوں کو خلق قرآن کا مسئلہ ماننے پر مجبور کرے چنانچہ اس فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اللہ اکبر! یزید کی شخصیت میں کس قدر برتری ہوگی جو ایک فتنہ کے لیے تا حین وفات روک بنی رہی۔

بہرحال امام یزید بن ہارون کی ذات گرامی محدثین کے یہاں ایک استدلالی شخصیت ہے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے جیسے امام احمد بن حنبلؒ امام علی بن المدینیؒ امام ابوخیثمہؒ امام ابوبکر بن ابی شیبہؒ خلف بن سالمؒ امام احمد بن منیع وغیرہ وغیرہ۔ اس لحاظ سے بعد کے تمام محدثین کے لیے امام یزید بن ہارون استاد الاساتذہ ہیں۔

الامام الحافظ وکیع بن الجراح:

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدیؒ نام ابوسفیان کنیت۔ نسباً الرداسی اور بلحاظ بود و باش کوفی ہیں۔ علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الثبت الحافظ محدث العراق کے القاب سے یاد کیا ہے۔ مشہور ناقد رجال یحییٰ بن معین علم حدیث میں ان کا پایہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں وکیع فی زمانہ کالا وزاعی فی زمانہ۔ عبداللہ بن المبارکؒ امام احمد بن حنبلؒ امام علی بن المدینیؒ امام یحییٰ بن معینؒ امام اسحاق بن راہویہؒ امام زہیرؒ امام ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابوکریب نے ان کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔(۱)

یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ بخدا میں نے اللہ کی خاطر وکیع کے علاوہ حدیث روایت کرنے والا کوئی نہیں دیکھا اور مجھے وکیع سے زیادہ حافظ بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ اور فرماتے تھے کہ محدثین تو چار ہیں۔ وکیعؒ یعلی بن عبید الطنفسی اور احمد بن حنبل۔ امام احمد بن حنبل وکیع کا ذکر فرماتے تو کہتے کہ میرے مشاہدے میں وکیع سے زیادہ حدیث کا ضابطہ اور حافظ کوئی نہیں ہے۔ ان کا ہی ایک اور بیان ہے کہ میں نے وکیع جیسا علمؒ حفظ وضبط میںؒ روایت واسنادؒ فقہ واحکام میں اور پارسائی و تقویٰ میں کوئی نہیں دیکھا۔(۲) جسم کے ذرا بھاری بھرکم تھے۔ مکہ تشریف لائے فضیل بن عیاض

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ص ۲۸۲ (۲) تاریخ بغداد: ج ۱۳ص ۴۷۴

سے ملاقات ہوئی سعید بن منصور کہتے ہیں کہ فضیل نے ان سے پوچھا کہ راہب عراق ہو کر یہ موٹاپا کیسا؟ جواب بڑا ہی مسکت دیا فرمایا کہ مسلمان ہونے کی خوشی میں پھول گیا ہوں۔

حافظہ اس قدر غضب کا تھا کہ ابوداؤد کہتے ہیں کہ وکیع کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔(۱) صرف یہی نہیں کہ امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے ترجمہ ابی حنیفہ میں تصریح کی ہے بلکہ یہ امام اعظمؒ کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کے بارے میں خود امام صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا ہے:

تم میرے دل کی مسرت اور میرے رنج وغم کا جلا ہو فقہ و شرائع کی زین میں نے تمہارے لیے کس دی ہے اور لگام تمہارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ رائے عامہ تمہارے پیچھے چلے گی اور تمہارے الفاظ کی متلاشی ہوگی تم میں سے ہر ایک عدلیہ میں کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا تم سے اللہ کے نام پر اور اس علم کی بزرگی کے نام پر مطالبہ ہے کہ علم کو کرایہ پر چلانے سے بچنا۔ اگر تم میں سے کوئی عدلیہ کی آزمائش میں پڑ جائے اور اسے اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو اس کے لیے عہدۂ قضا ہرگز روا نہیں ہے اور اگر ناگزیر حالات میں طبیعت کے خلاف یہ کام کرنا ہی پڑ جائے تو لوگوں سے علیحدگی ہرگز اختیار نہ کرنا۔ نماز پنجگانہ مساجد میں عوام کے ساتھ ادا کرنا اور نماز کے بعد اعلان کے ذریعے ارباب ضرورت کو تلاش کرنا اور نماز عشاء کے بعد خصوصاً اس مقصد کے لیے تین بار اعلان کرنا۔ اگر بیمار ہو جاؤ تو بیماری کے زمانے کی تنخواہ نہ لینا۔ اور اگر سربراہ مملکت خزانہ حکومت میں بددیانتی کرے اور ظلم و جور کا رویہ اختیار کرے تو اس کی سربراہی باطل اور اس کی حکومت ناجائز ہے۔(۲)

وکیع کے والد اگرچہ سرکاری ملازم تھے یعنی سرکاری خزانہ کے نگران تھے اور حکومت کا مالیاتی مسئلہ ان سے متعلق تھا۔ خود امام وکیع کے حوالہ سے خطیب رقمطراز ہیں کہ:

میں امام اعمش کے پاس گیا اور ان سے احادیث روایت کرنے کی درخواست کی انہوں نے مجھ سے میرا نام دریافت کیا۔ بتایا کہ وکیع ہے۔ فرمایا کہ نام تو بڑا پرعظمت ہے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۸۳ (۲) المناقب للذہبی: ص ۱۷

میرا خیال ہے کہ مستقبل میں تمہارا نام ہوگا۔ بتاؤ کوفہ میں کہاں رہتے ہو؟ میں نے بتایا کہ بنی اماس میں۔ بولے کہ جراح بن ملیح کے گھر سے کتنی دور؟ میں نے عرض کیا کہ وہ تو میرے والد ہیں۔ بولے جاؤ پہلے ان سے میرا ماہانہ لے آؤ وہ کیشیر ہیں۔ میں بعد ازیں تمہیں پانچ حدیثیں سناؤں گا۔ میں گھر آیا اور صورت حال سے والد کو مطلع یا۔ والد نے کہا کہ آدھا روزینہ لیجاؤ اور پانچ حدیثیں سن آؤ پھر آدھا لے جانا اور پانچ حدیثیں سن آنا اس طرح تمہیں دس حدیثیں آجائیں گی۔ چنانچہ میں آدھا روزینہ لے کر پہنچا امام اعمش نے لے لیا اور مجھے نقد دو حدیثیں سنا دیں میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھ سے پانچ حدیثوں کا وعدہ کیا تھا فرمایا پورا ماہانہ کہاں ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے والد نے تمہیں یہ ترکیب سمجھائی ہوگی۔ لیکن ان کو پتہ نہیں کہ اعمش جہاں دیدہ گھاگ ہے جاؤ پورا روزینہ لے کر آؤ اور پوری پانچ حدیثیں سن لو میں واپس آیا وظیفہ لے گیا اور پانچ حدیثیں سنیں۔(۱)

اس کے باوجود ان کے والد کا سرکار میں اس قدر عمل دخل تھا اور اتنی اونچی کلیدی ملازمت پر تھے اور ہارون الرشید سربراہ مملکت عباسی نے امام وکیع کو عدلیہ میں لانے کی کوشش بھی کی لیکن لکھا ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

اراد الرشید ان یولی وکیعاً قضاء الکوفۃ فامتنع۔(۲)

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ امام وکیع نے اپنے استاد ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس راہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے استاد کی نصیحت پر عمل کیا تھا۔

امام وکیع صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف کا گذشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۵۰۱　(۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۸۲

امام ذہبی نے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ با آواز بلند کو بدعت کہتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابوبکر الخطیب، دونوں اس پر متفق ہیں کہ امام وکیع نے حدیث میں امام اعظمؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ چنانچہ الخطیب نے اگر یہ بتایا ہے کہ:

کان قد سمع منه شیأ کثیرا۔(۱)

تو حافظ ابن عبدالبر نے بھی یہی لکھا ہے کہ:

و کان قد سمع من ابی حنیفة حدیثا کثیرا...... و کان یحفظ حدیثه کله۔(۲)

اور صرف حدیث میں ان کو نسبت تلمذ ہی حاصل نہ تھی بلکہ امام اعظمؒ کے علم پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں، الخطیب نے تاریخ بغداد میں اور ابن عبدالبر نے الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء، اور جامع بیان العلم میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے کان یفتی بقول ابی حنیفة۔ ان کی وفات ۱۹۷ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ علی بن مسہر:

علی بن مسہر نام، ابوالحسن، کنیت۔ نسبت ولا کی وجہ سے قرشی اور سکونت کے لحاظ سے کوفی ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کا ترجمہ الامام الحافظ کے القاب سے شروع کیا ہے۔ ان کے تلامذہ میں مشہور محدثین میں ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن حجر اور ہناد ہیں۔ یہ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابوزرعہ، نسائی اور ابن حبان ان سب نے متفقہ طور پر ان کو ثقہ کہا ہے۔ امام عجلی کے ان کے بارے میں الفاظ یہ ہیں: کان ممن جمع الحدیث و الفقه۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ کان ثقة کثیرا الحدیث۔

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظمؒ کی مجلس درس میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام اعظمؒ کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے اور سفیان ثوری نے اپنی کتاب جامع کی تصنیف میں بھی زیادہ تر ان سے ہی مدد لی ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی نے مشہور محدث صیمری سے جو خطیب بغدادی کے علم حدیث میں استاد ہیں نقل کیا ہے:

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۳ ص ۴۷۱　(۲) جامع بیان العلم: ج ۲ ص ۱۴۹

وھو الذی اخذ عنہ سفیان علم ابی حنیفۃ و نسخ منہ کتبہ۔(۱)

اسی بنا پر سفیان ثوری کی جامع کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر نے قاضی ابو یوسف کا یہ تاثر بتایا ہے۔

سفیان الثوری اکثر متابعۃ منی لابی حنیفۃ۔(۲)

علی بن مسہر آرمینیا میں عدلیہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قاضی کہلاتے تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۸۹ھ میں کوفہ ہی میں وفات ہوئی۔ محدثین نے ان کی ثقاہت دیانت اور امانت کے بہت گن گائے ہیں۔

الامام الحافظ حفص بن غیاث:

حفص بن غیاث نام' ابو عمر و کنیت' نسباً نخعی اور وطناً کوفی ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان کے تلامذہ میں جن اجلہ محدثین کا ذکر کیا ہے ان میں ابو نعیم' عفان بن مسلم' احمد بن حنبل' یحیٰی بن معین' علی بن المدینی' زہیر بن حرب اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔

اولاً بغداد پھر کوفہ میں منصب قضا پر فائز رہے ہیں۔

حفص بن غیاث بھی امام اعظمؒ کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کو امام اعظمؒ نے قلبی مسرت قرار دیا ہے۔ ان کے قاضی بننے کی داستان خطیب بغدادی نے جو لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بکراہت قاضی بننا گوارا کیا تھا۔ چنانچہ حمید بن الربیع کہتے ہیں کہ:

جب عبداللہ بن ادریس' حفص بن غیاث اور وکیع بن الجراح کو ہارون الرشید نے عدلیہ میں کام کرنے کے لیے بلایا تو مجلس میں پہنچتے ہی عبداللہ بن ادریس نے ہارون الرشید کو سلام کیا اور اسلام کے بعد جان کر زمین پر گر پڑے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دورہ پڑ گیا۔ وکیع نے اپنے کو آنکھ پر ہاتھ رکھ کر یک چشم بنالیا۔ ہارون نے یہ صورت حال دیکھ کر دونوں کو نااہل قرار دے دیا۔ حفص کہتے ہیں کہ اگر مجھ پر قرض اور اولاد کا بار نہ ہوتا تو میں کبھی بھی یہ عہدہ قبول نہ کرتا۔(۳)

---

(۱) الجواہر المضیۂ: ج ۲ ص ۳۷۸ (۲) الانتقاء: ص ۱۳۸ (۳) تاریخ بغداد: ج ۸ ص ۱۸۹

قاضی بن گئے لیکن ان کی عدلیہ کی پوری زندگی زہد و پارسائی کی مثالی زندگی ہے۔
چنانچہ ابوہشام الرفاعی کہتے ہیں کہ حفص بن غیاث ایک روز عدالت میں مقدمہ سن رہے تھے کہ رئیس مملکت نے بلا بھیجا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عدالت کا وقت ہے میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ ایک روز آپ بیمار ہو گئے اور پورے پندرہ دن بیمار رہے۔ حفص بن غیاث کے پوتے عبید کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ایک سو درہم دیئے اور کہا جاؤ یہ رقم خزانہ حکومت میں داخل کر آؤ اور بتاؤ کہ یہ ان پندرہ دنوں کی تنخواہ واپس کر رہا ہوں جن میں میں نے کام نہیں کیا۔ یہ میرا حق نہیں ہے۔(۱)

ان کی حدیث دانی، حدیث میں ثقاہت اور حفظ و ضبط کا سب محدثین لوہا مانتے ہیں۔ چنانچہ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:

وہ تمام احادیث جو امام حفص بن غیاث نے کوفہ و بغداد میں بیان کی ہیں وہ سب زبانی یادداشت کے سہارے روایت کی ہیں ان میں کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی اور ان حدیثوں کی تعداد جو لوگوں نے ان سے لکھیں تین ہزار ہے اور چار ہزار حدیثیں ان کی یاد تھیں۔(۲)

زہد و پارسائی اور اس شان محدثانہ کے ساتھ آپ جذبۂ سخاوت سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ ابوجعفر المسندی نے ان کو اخی العرب کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان سے ان کا یہ اعلان بھی نقل کیا ہے:

من لم یا کل من طعامی لا احدثہ۔

محدثین کے لیے تاریخ رجال سے واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ بیشتر احادیث اخبار آحاد ہیں اور آحاد کا تمام تر مدار رجال اسناد پر ہے۔ لہٰذا جب تک راویان حدیث کے حالات پر بخوبی اطلاع نہ ہو اس کی سند کی صحت و ضعف کا پتہ نہیں چل سکتا۔ پہلی صدی میں تو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں حدیثوں کے راوی تمام تر صحابہ کرام اور اکابر تابعین ہی تھے۔ قرن اول گذر جانے پر بے شک ضعیف راویوں کا کچھ پتہ ملتا ہے لیکن

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۸ ص ۱۹۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۷۴

ان کا ضعف بیشتر بددیانتی کی بنا پر نہیں بلکہ حافظہ کی کمزوری' قلت ضبط یا روایت میں تساہل کی وجہ سے ہے۔ بہرحال اس دور تک حدیث کے راویوں میں کسی دروغ گو کا وجود نادر اور ضعیف الروایۃ بہت کم تھے۔ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کی اکثر و بیشتر حدیثیں اسی طبقہ کے راویوں سے منقول ہیں۔ اسی لیے وہ صحت و وثوق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ دوسری صدی میں کچھ لوگوں نے روایت حدیث میں کذب بیانی سے کام لیا تو ائمہ جرح و تعدیل نے تاریخ کی روشنی میں روایتوں کو جانچا۔ چنانچہ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:

اور امام حفص بن غیاث نے وقت کے اس تقاضے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسی سلسلے میں بڑے پتے کی بات فرمائی ہے۔

اذا اتهمتم الشيخ فحاسبوه بالسنين۔

جب کسی شخص کو متہم کرو تو دونوں کی عمروں کا حساب لگالو۔(۱)

یعنی اس راوی کی عمر کا اس شخص کی عمر سے حساب لگالو جس سے یہ روایت کر رہا ہے کہ یہ اس سے ملا بھی ہے یا ویسے ہی اس سے روایت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ بہرحال امام حفص بن غیاث امام اعظمؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ ہشیم بن بشیر:

ہشیم بن بشیر بن ابی خازم القاسم بن دینار نام' ابو معاویہ کنیت' نسبت ولا کی وجہ سے سلمی' اصلاً بخاری' وطناً واسطی اور بلحاظ بود و باش بغدادی ہیں۔ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے اجلہ تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے مثلاً عمرو بن دینار اور زہری۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظمؒ کے ترجمہ میں جن ائمہ کے متعلق تصریح کی ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے حدیث روایت کی ہے ان میں ہشیم بن بشیر کو بھی شمار کیا ہے۔ امام ذہبی نے مناقب میں بھی اس کی تصریح کی ہے اور یہ بھی تذکرہ میں لکھا ہے کہ لا نزاع فی انه من الحفاظ الثقات۔(۲)

ان کے والد حجاج بن یوسف ثقفی کے باورچی تھے مچھلی پکانے میں خاص مہارت تھی۔

(۱) الاعلان بالتوبیخ: ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۴۸

اس خاندان میں ہشیم پہلے منفرد فرزند ہیں جنہوں نے اپنے لیے خاندان سے الگ ہوکر علم کی راہ تجویز کی۔ اولاً والد نے علم حاصل کرنے سے روکا لیکن ہشیم علم کے نشہ سے چور تھے وہ بالکل خاموشی سے والد کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت سہتے رہے اور علم میں لگے رہے۔

حافظ ہشیم قاضی ابو شیبہ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور ان سے علم حدیث حاصل کرتے۔ ایک بار ہشیم بیمار ہو گئے اور قاضی ابو شیبہ کے درس میں نہ جا سکے قاضی صاحب نے اپنے شاگرد کی غیر حاضری کا لوگوں سے سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ ابوبکر الخطیب بغدادی نے بسند متصل یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ:

ایک بار ہشیم بیمار ہو گئے ابو شیبہ نے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بیمار ہیں۔ فرمایا کہ چلو ہشیم کی عیادت کریں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کی ہمرکابی میں ہشیم کی عیادت کے لیے بشیر طباخ کے گھر پہنچے۔ ان کو گھر پر کھڑا دیکھ کر ایک شخص بھاگا ہوا بشیر کے پاس آیا اور بتایا کہ تیرے گھر شہر کا قاضی آیا ہوا ہے والد گھر آئے تو قاضی صاحب ہشیم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب قاضی صاحب واپس چلے گئے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے کہا یا بنی قد کنت امنعک من الحدیث فاما الیوم فلا۔ بیٹے میں تم کو حدیث پڑھنے سے روکتا تھا لیکن آج سے نہیں روکوں گا۔ ابو شیبہ جیسا میرے گھر آئے واور ے میرے نصیب بھلا میں اس کی کبھی آرزو بھی کرسکتا تھا۔(۱)

بغداد میں علم حدیث کی اشاعت میں امام ہشیم کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے امام ذہبی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

بغداد جو عراق کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی تابعین کے آخری دور میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں جس نے حدیث کی اشاعت کا کام کیا وہ ہشام بن عروہ اور انکے بعد شعبہ اور ہشیم ہیں۔(۲)

ان کی حدیث دانی کا حال معلوم کرنا ہو تو حماد بن زید کا وہ بیان پڑھیے جو خطیب بغدادی نے بسند متصل پیش کیا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۸۷ (۲) الاعلان بالتوبیخ ص ۹۲

محدثین میں ہشیم سے زیادہ میں نے بلند پایہ کوئی نہیں دیکھا ہے کچھ محدثین تو ان کو سفیان ثوری سے بھی برتر کہتے تھے۔ امام مالکؒ ان کی بیحد تعریف کرتے تھے وہ اسے تسلیم ہی نہ کرتے تھے کہ عراق میں ان کے سوا کوئی محدث ہے وہ فرماتے تھے کیا ہشیم سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے؟(۱)

ہشیم امام اعظمؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں اور ہشیم کے تلامذہ میں دوسرے محدثین کے ساتھ امام احمد بن حنبل کو خاص مقام حاصل ہے اس لحاظ سے جیسے ہشیم اور ابو یوسف کا باہم رشتہ استاد برادر ہونے کا ہے۔ ایسے ہی امام احمد کا رشتہ بھی ہشیم اور قاضی ابو یوسف سے نسبت تلمذ میں ایک ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل علم کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں۔ فن حدیث میں اگر قاضی صاحب کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے دو شاگرد امام احمد اور امام یحییٰ بن معین کی ان کے بارے میں آراء پڑھیے۔ افسوس کہ یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔

بہرحال ہشیم بن بشیر علم حدیث کے امام اور امام ابو حنیفہ کے تلمیذ ہیں۔ الخطیب نے ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ بتائی ہے۔

یہاں امام اعظمؒ کے تمام تلامذہ کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں اور جن کے بارے میں خود امام ذہبی کی تصریح ہے کہ یہ امام اعظمؒ کے تلامذہ ہیں یا پھر جن کا امام علی بن المدینی، امام بخاریؒ حافظ عسقلانی نے امام اعظمؒ کے تلامذہ حدیث میں ذکر کیا ہے۔

اگر ہم یہاں حافظ الدین المیز از اور علامہ خوارزمی کی تصریح کی مطابق امام اعظمؒ کے تمام تلامذہ بیان کریں تو ایک طول طویل داستان ہو جائے گی۔ اس لیے ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ج ۱۴ ص ۹۱

امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حفص بن غیاث
اسحاق ابن ابراہیم : بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی
عثمان بن ابی شیبہ، ابویعلیٰ جعفر الفریابی، نسائی، ابن ماجہ
ابراہیم بن طہمان
بخاری ، محمد بن نصر مروزی، ابن خزیمہ، صالح بن حمزہ
نسائی : ابوبشر الدولابی، ابوالقاسم الطبرانی
وکیع بن الجراح
علی ابن المدینی : ذہلی، بخاری، ابویعلیٰ
ابوبکر بن ابی شیبہ ، ابوزرعہ، بقی بن مخلد، الفریابی
علی بن مسہر
علی بن حجر : بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی
ہناد بن السری : ابوزرعہ، ابوالعباس، عبدان
مسعر بن کدام
یحییٰ ابن آدم : احمد، اسحاق، عبد بن حمید، الحسن بن علی
ابونعیم : محمد بن یحییٰ الذہلی، بخاری، دارمی، القتات

امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
مکی بن ابراہیم
ابو عاصم النبیل
یزید بن ہارون
وکیع بن الجراح
علی بن مسہر
۱۔ الکدیمی
۲۔ یحییٰ بن معین
۳۔ الذہلی
۴۔ عباس الدوری
۱۔ الدارمی
۲۔ ابو مسلم الکجی
۳۔ الحارث ابن ابی اسامہ
۱۔ عبد بن حمید
۲۔ ابو خیثمہ
۳۔ ابوبکر بن ابی شیبہ
۱۔ ابو کریب
۲۔ علی بن المدینی
۱۔ علی بن حجر
۲۔ ہناد بن السری
۳۔ سوید بن سعید

امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
عبداللہ
ابن المبارک
امام داؤد
الطائی
یحییٰ بن سعید
القطان
عبدالرزاق
امام محمد
زفر
قاضی ابویوسف
حسن بن زیاد
یزید بن ہارون
امام احمد بن
حنبل
امام شافعی
امام مزنی
امام طحاوی
امام طبرانی
ابونعیم اصفہانی
خطیب البغدادی
علی بن المدینی
یحییٰ بن معین - امام بخاری - امام مسلم - امام ابوداؤد
ترمذی
نسائی

امام اعظم
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
عبداللہ المبارک
عبدالرحمٰن بن مہدی، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، محمد بن یحییٰ الذہلی
یحییٰ بن معین: امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، ابوزرعہ
عبداللہ بن یزید المقری
امام احمد: امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ، ابوالقاسم البغوی
امام بخاری: محمد بن نصر مروزی، جزرہ، مطین، ابن خزیمہ
ابوعاصم النبیل
الدارمی، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، جعفر الفریابی
ابومسلم الکجی: ابوبکر القطیعی، ابوالقاسم الطبرانی، النجاد، القزاز
الکدیمی: ابن الانباری، ابوبکر القطیعی، ابوبکر الشافعی
مکی بن ابراہیم
الذہلی، ابوزرعہ، ابن خزیمہ، السراج، بخاری
ابوکریب، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ
یحییٰ بن زکریا
یعقوب بن ابراہیم: یحییٰ بن صاعد، قاسم المطرز، بقی بن مخلد

امام بیہقی
دار قطنی
ابن خزیمہ
بخاری
ابن ماجہ
ترمذی
امام احمد
مسلم۔ ترمذی
عبد بن حمید
احمد بن حنبل
یزید بن ہارون
مسلم ابوداؤد۔ ترمذی
دارمی
ابوعاصم
ابویعلی موصلی
یحیی بن معین
عبدالرزاق
ابوداؤد
ابوعبدالرحمان
المقری
امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حماد
عبدالرحمن بن ہرمز
عطاء بن ابی رباح
عمرو بن دینار
عامر بن شراحیل
ابراہیم
علقمہ
عبداللہ بن مسعود
ابوہریرہ
ابوسعید خدری
عبداللہ بن عمر
ام سلمہ
عائشہ
ابن عباس
ابن عباس
ابن عمر
جابر
علی
عمران بن حصین
جریر۔ عدی
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
یزید بن زریع
ابراہیم بن طہمان
محمد بن الحسن
ابو عاصم النبیل
شعیب دمشقی
ابو یوسف
یوسف بن خالد
عبداللہ بن ادریس
اسد بن عمر
قاسم بن معین
اصحاب ستہ
اصحاب ستہ
یحییٰ بن اکثم
اصحاب ستہ
بخاری
علی بن الجعد - احمد
علی بن المدینی، بشر بن الولید
امام شافعی
ابن مبارک، امام مالک
اصحاب ستہ
احمد بن منیع
احمد بن حنبل
یحییٰ القطان
یحییٰ بن معین
بخاری
ترمذی
امام شافعی
امام احمد
معلی بن منصور
بخاری
علی بن المدینی
علی بن معبد
یحییٰ بن معین — محمد بن اسحاق
قاسم بن سلام — ابو حاتم — ابن ابی حاتم
ابو یعلیٰ - ابو نعیم - ابن خزیمہ
امام مزنی
امام طحاوی
الطبرانی
ابو یعلیٰ
ابو الشیخ - ابن عدی - ابن حبان
ابن مردویہ
ابو عوانہ

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حفص بن غیاث
فضیل بن دکین
حکام بن یعلیٰ
سفیان بن عیینہ
مسعر بن کدام
زفر بن الہذیل
عبد اللہ بن المبارک
علی بن مسہر
مکی بن ابراہیم
وکیع بن الجراح
یحییٰ القطان
یحییٰ بن معین
علی بن المدینی
احمد بن حنبل
دارمی
ذہلی
اسحاق بن راہویہ
ابن ابی شیبہ
یحییٰ بن معین
امام شافعی
حمیدی
بخاری
سفیان الثوری
اصحاب ستہ
محمد بن عبد اللہ انصاری
اصحاب ستہ
امام احمد
یحییٰ بن معین
مسلم، ابو زرعہ
بخاری
اصحاب ستہ
بخاری، ابو عوانہ
طبرانی
مسلم، ترمذی، ابن خزیمہ
بیہقی، حاکم، ابو احمد، دار قطنی
شیخ الاسلام الہروی
اصحاب ستہ

امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
عبداللہ بن المبارک
یحییٰ بن زکریا
حفص بن غیاث
عبداللہ بن یزید
ابراہیم بن طہمان
۱۔ عبدالرحمٰن بن مہدی
۲۔ یحییٰ بن معین
۳۔ ابوبکر بن ابی شیبہ
۴۔ احمد بن حنبل
۱۔ ابوکریب
۲۔ یعقوب
۳۔ ابراہیم بن موسیٰ
۱۔ اسحاق بن راہویہ
۲۔ عثمان بن ابی شیبہ
۳۔ علی بن المدینی
۴۔ یحییٰ بن معین
۱۔ احمد بن حنبل
۲۔ بخاری
۳۔ الحارث بن محمد
۴۔ اسحاق
۱۔۲۔ بخاری و مسلم
۳۔ ابوداؤد
۴۔ ترمذی
۵۔ نسائی
۶۔ ابن ماجہ

مصنف

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ انعامیہ

دکان نمبر 24، قاسم سینٹر، اُردو بازار، کراچی

021-32216814, 0345-2151205

ہماری دیگر مطبوعات

Rs. 450